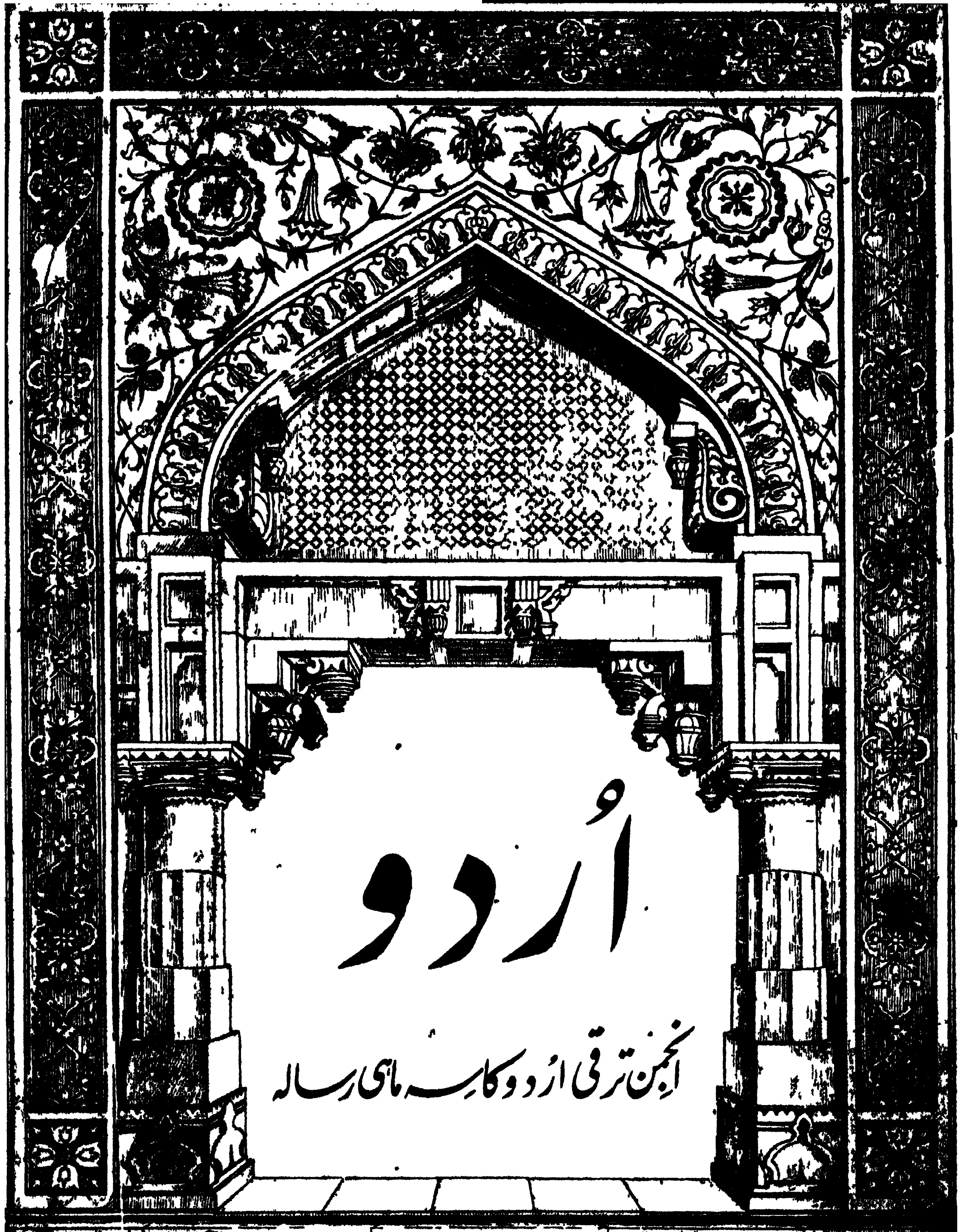
رسائل ۸ کی کتاب نمبر



اردو

جولائی سنہ ۱۹۳۲ع حصہ ۴۷

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

روسی ناول

پہلا دور

پہلا باب

نکولائی وسیل یوچ گوگول

(۱۸۰۹ - ۱۸۵۲)

از

جناب مولوی محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)

روسی انشاپردازی کی پہلی کوششوں کا ذکر ایک گذشتہ باب میں ہوچکا ہے - گوگول کی تصانیف میں روسی ناول اور ڈراما پہلی مرتبہ اپنی مخصوص اور دلفریب شکل میں نظر آتے ہیں - اس وقت تک روسی ادیب یورپی مذاق کی پیروی کرتے رہے تھے ' گوگول نے ہمت سے کام لے کر اپنی بات اپنے انداز سے کہی ' اور تعلیم یافتہ روسیوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھہ لیا - اس کے زمانے میں رومانیت کا اثر زائل نہیں ہوا تھا ' پشکن کے قصے اور اکثر نظمیں اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں ' اس کی ایک جھلک تورگنیف کے افسانوں میں بھی ملتی ہے ' لیکن گوگول کے افسانوں میں اس کی بو بھی نہیں ' تربیت اور مذاق کے اعتبار سے وہ ٹھیٹھہ دیسی آدمی تھا ' اور بعد کی زندگی بھی اس کی طبیعت کو بدل نہ سکی ' وہ صوبہ اوکرائن کے ایک گانوں میں پیدا ہوا -

اس کا باپ کوسک نسل کا ایک چھوٹا زمیندار تھا ' اور اس کا بچپن ایک ایسی فضا میں گذرا ' جس پر پرانی کوسک وضع اور فلسفۂ زندگی کا اثر اس وقت تک نمایاں تھا ' گوگول کی ذہنیت اس دیہاتی کی سی تھی جو شہری زندگی کی نفاستوں سے مرعوب نہیں ہوتا ' اسکول اور کالج میں اس کی آزاد خود مختار اور مغرور طبیعت نے اس کی تعلیم میں بہت خلل ڈالا - اکثر مضمون جو پڑھائے جاتے تھے نا پسند تھے یونانی اور روسی ادب کو وہ حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا ' اور جرمن اور فرانسیسی انشا پردازی کی بھی اس کے دل میں زیادہ عزت نہیں تھی اس لئے اس نے ان چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی - عام معیار کے لحاظ سے اس کی تعلیم خراب رہی ' لیکن اس خرابی کا نتیجہ اچھا نکلا - اس نے طالب علمی کے زمانے ہی سے ناولیں ' افسانے اور ڈرامے لکھنا شروع کر دئیے ' اور یہ مشق آگے چل کر بہت کار آمد ثابت ہوئی - اٹھارہ برس کی عمر میں وہ اپنا وطن چھوڑ کر پیٹر برگ پہنچا ' اور وہاں اُسے وزیر زراعت کے دفتر میں ملازمت مل گئی - لیکن اس کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ ایک طریقے پر زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا - دو سال کے اندر اس نے ملازمت ترک کر دی ' اور یورپ کا سفر کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا ' مگر آدھے راستے سے واپس آ گیا - اس کی تعلیم کی طرح اُس کے اس سفر کا ناسکمل رہ جانا بھی اس کی ذہنی آزادی کی علامت تھی اور یہ اس کے حق میں بہت اچھا ہوا ' اگر وہ یورپ جاتا تو ممکن ہے اپنے خلقی ذوق اور آزادی کو وہیں چھوڑ آتا ' سفر سے واپس آنے کے بعد اس نے انشا پردازی کا شغل اختیار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ دیکھا ' اور ۱۸۳۱ میں اس کی پہلی کامیاب تصنیف شائع ہوئی ' جس کا عنوان " ڈکانکا کے قریب ایک باڑی میں سنی ہوئی کہانیاں " تھا - افسانوں کے اس مجموعے نے

گوگول کو مشہور کر دیا ' کیونکہ ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جنھوں نے گوگول کو روسی ادب میں اس کے بلند درجے پر پہنچایا ہے —

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے - ان افسانوں میں دیہاتی زندگی کے قصے سنائے گئے ہیں - یہ بجائے خود ایک جدت تھی ' مگر ان افسانوں کے اور اوصاف کے مقابلے میں یہ بہت ادنیٰ صفت معلوم ہوتی ہے - گوگول نے اُوکرائن کے مناظر قدرت کی نہایت دلکش تصویریں کھینچی ہیں ' اسے زبان پر اتنی قدرت تھی کہ اس کی باریک بین نظر اس کا نازک احساس اور اس کی ہمدردی بھری ظرافت اپنا پورا کمال دکھا سکی ' اس کے افسانوں میں مافوق الفطرت قوتوں کا اکثر ذکر آتا ہے ' ان میں بھوت پریت ' چڑیلیں اور شیطان بے تکلفی سے انسانی زندگی میں شریک ہوتے ہوئے اور مداخلت کرتے دکھائے گئے ہیں ' لیکن جن لوگوں کا رہنا سہنا اور فلسفۂ زندگی بیان کیا گیا ہے ' وہ ان سب چیزوں کو مانتے تھے اور اس عقیدے کو ان کے کردار سے بہت گہرا تعلق تھا ' اس لئے در اصل بھوت پریت کے ذکر سے افسانوں کی حقیقت نگاری پر حرف نہیں آتا ' گوگول کی طبیعت میں دیہاتی فضا اور دیہاتی لوگوں کی سرشت کے ہر رنگ اور ہر کیفیت کے سمجھنے کی وجدانی قوت تھی ' اس کی زبان کی شستگی ' شیرینی اور روانی ' پڑھنے والے کے سامنے ایسی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر دیتی ہے کہ حقیقت اور افسانے کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے '

" اوکرائن کی رات دیکھئے : بیچ آسمان سے چاند زمین کو تک رہا ہے ' آسمان کا گنبد جس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں ' معلوم ہوتا ہے پھیل کر اور وسیع ہو گیا ہے - اور اب گرم ہے اور سانسیں بھر رہا ہے ' ساری زمین پر سیمیں روشنی چھٹکی ہوئی ہے : پرنا ثیر ہوا میں خنکی ہے '

وہ آدمی کو گلے مل کر بھیجتی ہے اس کی رفتار متوالی اور خوشبوؤں کے سمندر کو جنبش دیتی ہے ، جانفزا رات ، مسحور کن رات ! جنگل ، کسی روحانی کیف میں ڈوبے ہوئے ساکت کھڑے ہیں ، اندھیرے میں لپٹے ہیں ، اور اپنے سائے سے دور دور تک اندھیرا پھیلا رہے ہیں ، تالاب خاموش اور ساکن ہیں ، ان کی سطح پر ایک لہر تک نہیں ، ان کے پانی کی ٹھنڈک اور تاریکی باغوں کی سیاہی مائل سبزدیواروں میں قید ہے ، اور قید ہونے سے کچھ اداس ہوگئی ہے ، جنگلی پھلوں کی گھنی جھاڑیاں جن میں کسی انسان نے آج تک قدم نہیں رکھا ہے ڈرتی ڈرتی اپنی جڑوں کو چشمے کے ٹھنڈے دھارے کی طرف پھیلاتی ہیں ، اور ان کی پتیاں چپکے سے کچھ کہتی ہیں ، ایسے لہجے میں جس سے ناراضگی اور خفگی ظاہر ہوتی ہے ، جب رات کی ہوا کا کوئی شریر جھونکا آہستہ آہستہ آتا ہے اور آنکھ بچا کر ان کا بوسہ لے لیتا ہے ، ساری زمین پر نیند طاری ہے ، مگر آسمان پر چاند اور تارے سب آنکھیں کھولے جاگ رہے ہیں ، اور اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں - انسان کی روح میں اس وقت عجیب وسعت پیدا ہوجاتی ہے ، اور اس کی تہ سے ہزارہا چاندی کی طرح چمکتے ہوے خیالی پیکر نکل کر دنیا کو آباد کر دیتے ہیں - جانفزارات ! مسحور کن رات ! یکبارگی خاموشی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے ، اور جنگل اور تالاب اور میدان سب جاگ اٹھتے ہیں ، ہر طرف سے اُکرائنی بلبلوں کے نغموں کی بارش ہونے لگتی ہے ، اور خیال ہوتا ہے کہ چاند تک ان کے سریلے راگوں کو محویت سے سن رہا ہے .... ٹیلے پر گانو اونگھ رہا ہے ، جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو - چاندنی میں اس کے جھونپڑے چمکتے ہیں ، اور رات کے ساتھ ان کی چمک بڑھتی جاتی ہے .... گانو والے سب جی بھر کر گیت گا چکے ہیں ، اب ہر طرف خاموشی ہے ، بھلے آدمی سب سو گئے ہیں ، صرف کہیں کہیں تنگ کھڑکیوں میں چراغ کی روشنی نظر آتی ہے یا کسی گھرانے کے لوگ جنھیں کسی وجہ سے دیر

ہوگئی ہے دروازے کے باہر بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے ہیں ...."

یہ منظر " مئی کی رات " سے لیا گیا ہے ' جو اس مجموعے کا ایک افسانہ ہے ' اسی افسانے کے دو اشخاص سراپا ملاحظہ ہو : ایک گانو کا مکھیا ہے' دوسرا شراب ساز جو گانو میں شراب کا کارخانہ قائم کرنے کے لئے آیا ہے —

" مکھیا کے ماتھے پر ہمیشہ بل رہتے ہیں' اس کا چہرہ روکھا ہے' وہ زیادہ بک بک پسند نہیں کرتا' بہت زمانہ ہوا........ جب ملکہ کیتھورین اللہ بخشے' دارالسلطنت سے کریمیا جارہی تھیں تو وہ ان کے ہمراہ بوتی گارڈ کے طور پر جانے کے لئے اپنے گانو والوں میں سے منتخب کیا گیا تھا' اور اسے شاہی کوچوان کی بغل میں بیٹھنے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا . اسی زمانے سے مکھیا نے عقلمندی اور اہمیت کے احساس سے سر جھکانا' اپنی لمبی اور جھکی ہوئی مونچھوں پر تاؤ دینا اور ہر چیز کو ترچھی' شکرے کی سی تیز نظر سے دیکھنا سیکھا' اسی زمانے سے مکھیا میں اس کی قابلیت پیدا ہوگئی کہ چاہے جس مسئلہ پر گفتگو ہو وہ باتوں کو ایر پھیر کر اپنی اس داستان کی طرف لے آئے کہ وہ ملکہ کی ہمراہی کے لئے کس طرح سے منتخب ہوا' اور اسے شاہی کوچوان کی بغل میں بیٹھنے کا شرف کیونکر حاصل ہوا . مکھیا کو کبھی کبھی بھولا بننے میں مزہ آتا ہے' خصوصاً جب اسے ایسی باتیں سنائی جاتی ہیں' جنھیں وہ سننا نہیں چاہتا ہے' مکھیا لباس میں کسی قسم کا بانکپن برداشت نہیں کرسکتا .... مکھیا رنڈوا ہے' مگر اس کے گھر میں اس کی سالی رہتی ہے' جس کا کام دونوں وقت کھانا پکانا ' بنچیں دھونا ' مکان پر سفیدی کرنا' کپڑوں کے لئے سوت کاتنا' اور گھر گرہستی کی

دیکھه بھال کرنا هے' گانو میں مشہور هے که مکھیا سے اس کی کوئی عزیز داری نہیں' لیکن هم کو معلوم هے که مکھیا کے بہت سے بدخواہ هیں' جو هر قسم کی افواہ خوشی سے پھیلانے پر تیار رهتے هیں .... یه بھی ممکن هے' لوگوں کو بات بنانے کا موقع اس وجه سے ملا هو که مکھیا کی سالی کو همیشه برا لگتا هے' اگر مکھیا کسی ایسے کھیت میں چلا جائے جہاں گانو کی عورتیں کام کرتی هوتی هیں' یا ایسے کوسک سے ملنے جاتا هے' جس کے گھر میں جوان لڑکی هوتی هے' مکھیا کانا هے' مگر اس کی اکیلی آنکھه — بڑی شریر هے' اور دور سے خوبصورت عورت کو پہچان لیتی هے - هاں' مگر وہ خوبصورت چہرہ کی طرف توجه کرنے سے پہلے اچھی طرح اِدھر اُدھر دیکھه لیتا هے' که کہیں اس کی سالی کی نظر تو اس پر نہیں پڑ رهی هے ...."

شراب ساز مکھیا کے یہاں مہمان آیا هے . " ایک ٹھنگنا' موٹا سا آدمی جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں هر وقت هنستی رهتی هیں' غالباً وہ اس خوشی کو ظاهر کرنے کے لئے جو اُسے اپنا چھوٹا سا پائپ پینے میں هوتی هے . وہ هر مدت تھوکتا رهتا هے' اور اس کے ساتھه هی انگلی سے پائپ میں تمباکو کی راکھه دبا تا جاتا هے . دھوئیں کے بادل اس کے منھه اور اس کے پائپ سے نکل کر هر طرف چھاگئے هیں' اور خود اسے بھی سرمئی رنگ کے کہرے نے لپیٹ لیا هے . معلوم هوتا هے کسی شراب کے کارخانے کا دود دان جو چھت پر بیٹھے بیٹھے تھک گیا هے' سیر کے شوق میں نکلا هے اور مکھیا کے گھر میں آکر ادب سے میز کے پاس بیٹھه گیا هے شراب ساز کی ناک کے نیچے اس کی گھنی اور چھوٹی مونچھیں هیں' جن کے سارے بال کھڑے هیں' لیکن پائپ کے دھوئیں میں وہ بہت دھندلی نظر

آرهی هیں' اور خیال هوتا هے وہ مونچهیں نهیں هیں بلکه ایک چوها جسے شراب ساز منہ میں دبائے هوئے هے......''

" باڑی میں سنی هوئی کهانیوں " کے بعد هی گوگول نے ایک مجموعه " میر گوروو " کے عنوان سے شائع کیا - میر گوروو نام هے پولتاوا کے پاس ایک گانو کا جس میں گوگول پیدا هوا تها' اس مجموعے میں گوگول کی انشا پردازی کی خوبیاں اور نکهر آئیں - اور اس میں ظرافت کے ساتهه درد هے جو پہلے مجموعے میں نهیں پایا جاتا - ' ایک آنکهه سے هنسنا ' ایک سے رونا ' گوگول کی انشا پردازی اور حقیقت نگاری کا خاص وصف هے ' اور اس مجموعے میں یه وصف اپنی پوری شان سے نظر آتا هے - لیکن' گوگول کی طبیعت نه معلوم کس وجه سے ناول نویسی سے هٹ گئی ' اور اس نے روس کوچک * کی تاریخ لکهنے کا ارادہ کرکے قدیم کتابوں اور تاریخی داستانوں کا مطالعه شروع کیا - اس میں مورخ بننے کی صلاحیت بہت کم تهی ' اور اس کے مطالعے کا پہلا نتیجه - " تراس بلبا " ایک تاریخی ناول کی صورت میں نکلا - ناول کی تاریخی بنیاد بہت کمزور هے ' کبهی کبهی مصنف بهول جاتا هے که اسے زمانه زیر بحث کے ذهنی معیار کا لحاظ رکهنا چاهئے ' اور اس لئے بعض تقریریں جو ناول کے اشخاص کرتے هیں مصنوعی معلوم هوتی هیں ' مگر رزمیه داستان کی حیثیت سے ناول نهایت قابل قدر هے ' اور کوسک نسل کی مردانگی ' بہادری ' جفا کشی اور سادگی کی جو تصویریں

---

* روس کا جنوب مغربی حصه جس میں " چهوٹے " روسیوں کی نسل آباد هے - " چهوٹے " اور " بڑے " روسیوں میں قد کے علاوہ سیرت اور مزاج کا بهی کچهه فرق هے ' " چهوٹا " روسی فطرتاً هنس مکهه هوتا هے " بڑا " روسی غمگین اور یاس مشرب ـــ

کھینچی گئی ھیں بہت ھی ھمت افزا اور سبق آموز ھیں ' ایک بوڑھے باپ کا اپنے بیٹوں کی طاقت آزمائی کے لئے ان سے کشتی لڑنا ' اس کے ایک لڑکے کا شائستگی اور نفاست پسندی کی تحقیر کرنے کے لئے بہت اچھے کپڑے پہن کر زمین میں لوٹنا ' اس ماں کے دل کی کیفیت جو اپنے بچوں کی ھمت جواں مردی پر فخر کرتی ھے مگر دل سے خوف اور اندیشہ نہیں نکال سکتی ھے یہ سب پہلے صفحوں ھی میں بیان کیا گیا ھے ' اور سارے ناول میں یہ فضا قائم رھتی ھے ' " تراس بلبا " کی تصنیف کے بعد گوگول کا تاریخی مطالعہ کچھ دن جاری رھا ' مگر روس کو چک کی تاریخ محض خیال ھی کی صورت میں رھی - چند مضامین کی بنا پر جو بظاھر بہت عالمانہ تھے گوگول کو تاریخ کے پروفیسر کی جگہ مل گئی ' مگر اس کے علم کا سارا سرمایہ پہلے لکچر میں ختم ھو گیا اور تقرر کے ڈیڑھ سال بعد اسے مجبوراً استعفا دینا پڑا —

اس کے بعد پھر گوگول نے عالم فاضل سمجھے جانے کی ھوس نہیں کی اور ناول نویسی میں مشغول ھو گیا ' دو تین سال کے اندر اس نے " گل کاریوں اور کہانیوں " کے عنوان سے افسانوں کا تیسرا مجموعہ شائع کیا جس کے بہترین قصے " پرانی وضع کے زمیندار " " اوان اوان کی لڑائی " نفسکئی پروسپکٹ " اور " لبادہ " ھیں —

" پرانی وضع کے زمیندار " ایک بڈھے اور بڑھیا افناسی ئی اوانوونچ اور پلخیریا اوانوفنا کی کہانی ھے - دونوں چین سے رھتے تھے ' ایک دوسرے سے اور ساری دنیا سے خوش تھے - لیکن اگر زندگی کے معنی حرکت اور تغیر ھیں تو وہ دونوں جوانی میں بھی " زندگی " کی نعمت سے محروم تھے - گوگول کو ان سے بہت محبت ھے - ان کے سفید بالوں سے اور ان

کے معصوم دلوں سے ' مگر ان کی تصویر کھینچنے میں اس کا اصل مقصد روسیوں کی ذہنی بے مائیگی اور ان کی زندگی کا جمود دکھانا ہے ' اور اس لحاظ سے یہ افسانہ ایک ادبی کارنامہ ہے افناسی اوانووچ دن بھر کھاتے رہتے ہیں ' ان کی بیوی پلشیریا اوانوفنا کا دن میٹھے اچار اور مربے تیار کرنے میں گزرتا ہے ' گفتگو بھی کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق ہوتی ہے البتہ " کبھی کبھی آسمان صاف ' دن اجالا اور کمرے خوب گرم ہوئے تو افناسی اوانووچ کی طبیعت خوش ہو جاتی ہے ' اور وہ پلشیر یا اوانوفنا کا مذاق اُڑاتے ہیں ... .. "

پلشیر یا اوانوفنا ' اگر ہمارے گھر میں ایک بارگی آگ لگ گئی تو پھر ہم کہاں جائیں گے ؟ "

" یہ لو - خدا نہ کرے ! " بڑی بی کہتی ہیں اور صلیب کا نشان بناتی ہیں —

" پھر بھی ' فرض کرو کہ ہمارے گھر میں آگ لگ گئی تو ہم کہاں بھاگ کر جائیں گے ؟ "

" خدا جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں - افناسی اوانووچ ! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمارے گھر میں آگ لگ جائے ؟ خدا کو یہ ہرگز منظور نہ ہوگا . "

" پھر بھی اگر سب کچھ جل گیا ؟ "

گھر سب جل جائے تو میں باورچی خانہ میں چلی جاؤں گی ' اور آپ اس کمرے میں جہاں چوکی دارنی رہتی ہے . "

" اگر باورچی خانے میں آگ لگ گئی اور سب جل گیا ؟ "

" لو اور سنو ! خدا ہمیں ایسی مصیبت سے بچائے کہ گھر میں آگ لگ جائے اور باورچی خانے میں بھی ' اگر ایسا ہوا تو ہم گودام میں

جاکر رہیں گے ' جب تک دوسرا مکان نہ بن جائے ."

" اور اگر گودام میں بھی آگ لگ گئی ؟ "

" خدا جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں ' بس اب میں بہت سن چکی ' ایسی باتیں کرنا گناہ ہے ' ایسی باتوں کی خدا کے یہاں سے سزا ملتی ہے ! "

افناسی اوانووچ ' اس بات سے خوش ہوکر کہ اُنھوں نے پلخیر یا اوانوفنا کا مذاق اُڑایا ہے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے مسکراتے رہتے ."

ایسی زندگی کا انجام بھی بہت مناسب ہوا : پلخیر یا اوانوفنا کی بلی کھوگئی ' کچھہ دنوں کے بعد انھیں اسی طرح کی بلی باغ میں دکھائی دی ' اور وہ اسے چمکار پکار کر گھر ساتھہ لائیں ' اور پیالہ بھر دودھ اس کے سامنے پینے کے لئے رکھدیا ' مگر جیسے ہی اُنھوں نے اس کی پیٹھہ سہلانے کے لئے ہاتھہ بڑھایا بلی زن سے کھڑکی سے کود کر نکل بھاگی ' پلخیر یا اوانوفنا کو یقین ہوگیا کہ در اصل یہ ایک بلی نہیں تھی بلکہ ان کی موت جو بلی کی شکل میں آئی تھی ' انھوں نے گھر کا سب سامان ٹھیک کیا ' افناسی ڈی اوانووچ کے لئے اتنے مربے اور اچار تیار کردئے کہ وہ برسوں تک کھاتے رہیں اور یہ وصیت کی کہ ان کا کفن ململ کا ہو ' اس لئے کہ وہ سستا ہے ' اور اسی کا سا جو دوسرا کپڑا رکھا ہے اس کی افناسئی اوانووچ کے لئے عبا تیار کرائی جائے . یہ وصیت کرنے کے کچھہ دنوں بعد وہ سرگئیں ' افناسئی اوانوچ چار پانچ سال اور زندہ رہے ' اور پھر خوشی خوشی اپنی پلخیر یا اوانوفنا سے ملاقات کے لئے چل دئے —

" اوان اوان ' کی لڑائی " عام روسی زندگی کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالتی ہے . دو اوسط درجے کے زمیندار ذرا سی بات پر ایک دوسرے

سے بگڑ جاتے ہیں - ان میں صلح کرانے کی بہت کوشش کی جاتی ہے، دونو چاہتے ہیں کہ پھر آپس میں دوستی ہوجائے، مگر عین اس وقت جب وہ بغل گیری کے لئے طیار ہوتے ہیں، تو ذرا سی بات پر لڑائی ہو جاتی ہے، اور مفاہمت کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی —

" نفسکئی پر اسپکٹ " میں گوگول نے روسی شہر کی ایک درد ناک داستان سنائی ہے - دو نوجوان، ایک فوجی افسر، اور دوسرا مصور جن کی آپس میں جان پہچان تھی، پیٹر برگ کی مشہور سڑک نفسکئی پر اسپکٹ پر چلے جارہے تھے، ان کے سامنے سے دو عورتیں گذریں، جونہایت حسین تھیں، ان میں سے ایک کے بال سیاہ تھے، دوسری کے سنہرے، فوجی افسر نے سنہرے بالوں والی کا پیچھا کیا، مصور نے سیاہ بالوں والی کا، محض اس ارادے سے کہ اِس کے مکان کی شان و شوکت دیکھے، کیوں کہ بظاہر وہ بہت امیر معلوم ہوتی تھی، لیکن وہ ایک معمولی طوائف نکلی، مصور کی بھولی معصوم طبیعت، جس پر اس عورت کے حسن کا بہت اثر ہوا تھا، اس صدمے کی تاب نہ لاسکی، اور چند دنوں میں وہ ایک نازک پھول کی طرح کمھلا کر مر گیا - جس عورت کے فراق میں فوجی افسر گیا تھا وہ ایک جرمن موچی کی بیوی تھی، افسرنے بہت کوشش کی کہ اس سے آشنائی ہوجائے، مگر کامیاب نہ ہوا، اور آخر کار جب جرمن موچی نے اسے گھر میں اپنی بیوی کے ساتھہ اکیلا دیکھا تو اپنے دوست کی مدد سے اسے اٹھاکر دروازے کے باہر پھینک دیا - فوجی افسر ایسا بے حیا تھا کہ اس بے عزتی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا - اور دوسرے دن وہ اسے بالکل بھول گیا —

" نفسکئی پراسکت " گوگول کے عام طرز سے جدا ہے، مگر اس میں بھی اس کی باریک بینی اور ظرافت اپنا رنگ دکھاتی ہیں . عدم سے

شام تک جو مختلف قسم کے لوگ نفسکائی پراسپکٹ پر سے گذرتے ہیں ان کے اوصاف نہایت مفصل اور دلچسپ طریقے پر دکھائے گئے ہیں. جرمن موچی، جو اپنی ناک کٹوا ڈالنا چاہتا ہے، کیونکہ ناک کی وجہ سے اس کی ناس لینے کی عادت بڑ گئی ہے، اور ناس خریدنے میں اس کا بہت روپیہ صرف ہوتا ہے، گوگول کے بہترین مضحک کیرکٹروں میں سے ہے.

اس وقت تک گوگول کے تصور نے جو خیالی پیکر بنائے تھے، وہ روسیوں کے سچے نمونے تھے، لیکن وہ کیرکٹر جس کے ہم شکل روسی ناولوں میں ہزاروں کی تعداد میں نظر آتے ہیں اور جسے عام رائے نے روسی تمدن کی مخصوص پیداوار قرار دیا ہے، پہلی بار گوگول کے افسانے "لبادے" میں اپنی صورت دکھاتا ہے، "لبادے" کا ہیرو اکاکی اکاکئے وچ ایک مضحک مگر سیدھا سادا اور مسکین آدمی ہے، جسے دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ کہہ اٹھتے ہیں، : "دیکھو بچارے غریب کو" اکاکی اکاکئے وچ ایک دفتر میں نوکر ہے، جہاں اسے زیادہ تر کاغذات اور خطوط نقل کرنے کے لئے دیے جاتے ہیں - اس کام سے اس کا جی نہیں گھبراتا، بلکہ اسے اس میں خاص لطف آتا ہے، کیونکہ اسے خوش نویسی کا شوق ہے، اور اس کام میں اسے خوش نویسی کا بہت موقع ملتا ہے، خطوط اور کاغذات نقل کرنے کا کام اس کے لئے پر لطف اور رنگا رنگ احساسات کا ایک عالم تھا ایک خاص قسم کے خط اسے بہت ہی پسند تھے. اگر انہیں دوبارہ لکھنا ہوتا تو اسے دلی مسرت ہوتی. " لیکن " شوق " اور " لطف " کے الفاظ اکاکی اکاکئے وچ کے صحیح جذبات ادا نہیں کرسکتے، اسے اپنے کام سے حقیقی عشق ہے، اس کی ساری امیدیں، ارمان اور تمنائیں اسی سے وابستہ ہیں، زندگی کا کوئی مزہ نہیں جو اسے اس کام میں حاصل نہ

ھوتا ھو. لیکن اکا کئی اکا کئے وچ کا جسم ذرا کمزور ھے' جاڑوں میں اسے سردی بہت لگتی ھے' اس لئے اس کا بہت جی چاھتا ھے کہ ایک لبادہ خریدے' اور رفتہ رفتہ خطاط ھونے کے علاوہ ایک نئے لبادے کا مالک بننا بھی اس کی دلی آرزؤں میں شامل ھوجاتا ھے' کئی سال تک تھوڑا تھوڑا روپیہ اکھٹا کر کے وہ آخر کار ایک نیا لبادہ خریدتا ھے' مگر آسمان کا ظلم دیکھئے' اکا کئی اکا کئے وچ کا لبادہ پہلے ھی دن چوری جاتا ھے۔ اس کا دل ایسا سخت صدمہ برداشت نہیں کرسکتا' وہ بے چارہ مرجاتا ھے' اور بھوت بن کر شہر میں مارا مارا پھرنے لگتا ھے ——

عموماً دنیا اکا کئے وچ جیسے بچارے غریبوں پر ھنستی ھے' اور اس کی ھنسی حقارت بھری ھوتی ھے' روسی حقیقت نگار اپنی قوم کے نمونوں کی صورت اور سیرت کے تمام پہلو کمال وضاحت اور باریک بینی سے دکھاتے ھیں' مگر اپنے تعصبات اور رجحانات کو اس طرح سے معطل کردیتے ھیں کہ ان کی صورت گری میں حقیقت کا منظر دکھانے کے سوا اور کوئی خواھش یا ارادہ ظاھر نہیں ھوتا' ھم ان کے کیرکٹروں کو ان کی نظر سے نہیں ' اپنی نظروں سے دیکھتے ھیں ' اور ھمارے دلوں پر وہ اثر نہیں ھوتا جو حقیقت نگار پیدا کرنا چاھتے ھیں ' بلکہ وہ جو خود بخود پیدا ھوتا ' اگر ھم ایسی ھستیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے . اکا کئے وچ جیسے لوگوں سے ھمیں پہلے الجھن ھوتی ھے' پھر ان پر غصہ آتا ھے' اور آخر کار اگر ھم کو انسانی ھمدردی چھو بھی گئی ھے ' تو ھم کو ان پر ترس آتا ھے ' اور دل محبت کے درد سے بھر آتا ھے گو گول کی بحیثیت انسان کے یہی کیفیت تھی ' لیکن بحیثیت آرٹسٹ اور مصور کے اس نے بچارے اکا کئے وچ پر رحم

کہا کر یا اس سے خفا ہو کر کسی قسم کا مبالغہ یا غلط بیانی جائز نہیں رکھی - وہ ایک آنکھ سے اکاکیے وچ پر ہنستا ہے' اس لئے کہ اکاکیے کے مضحک ہونے میں کوئی شک نہیں' اور ایک آنکھ سے روتا ہے' اس لئے کہ اکاکیے وچ بھی انسان ہے اور ہمدردی کا مستحق' جذبات کے گھوڑے کو ایڑ لگا کر پھر اس طرح روکنا خواہ کتنا مشکل اور تکلیف دہ ہو' حقیقت نگاری کا تقاضا تھا اکاکیئے وچ جیسے لوگ ہر گز نظر انداز نہ کئے جائیں - روس میں اکاکیے وچ جیسے 'بچاروں' کے وجود کا سب نے گوگول کا افسانہ پڑھتے ہی اعتراف کیا' بلکہ یہ بھی تسلیم کر لیا کہ روس کے اکثر باشندوں میں اکاکیے وچ کی کوئی نہ کوئی صفت موجود ہے - چنانچہ افسانہ پڑہ کر گوگول کے معاصرین میں سے کسی نے لکھا : ' "ہم سب گوگول کے 'لبادے' سے نکلے ہیں" جس کے معنی یہ تھے کہ ہر روشن خیال روسی 'بچارے' اکاکیے وچ سے مشابہت محسوس کرتا تھا' بے کسی نے اسے بھی اکاکیے وچ کی طرح مضحک اور مسکین اور قابل رحم بنا دیا تھا' اور تقدیر اس کے اور اس کی تمناؤں کے ساتھہ بھی ویسا ہی سلوک کرتی تھی' جیسا اس نے اکاکیے وچ کے ساتھہ کیا —

'گل کاریوں اور کہانیوں' کے بعد گوگول نے دو ڈرامے لکھے' 'انسپکٹر جنرل' اور 'شادی' - ان میں مضحک کیرکٹروں کی کوئی انتہا نہیں' لیکن ان میں بھی وہی لا شخصی انداز نمایاں ہے جو گوگول نے اکاکیئے وچ کی صورت گری میں اختیار کیا تھا' اور ان موقعوں پر بھی جب گوگول ہمیں ہنسی سے بیچین کر دیتا ہے' انسانی ہمدردی آنسوؤں یا آہوں کی شکل میں اپنا خراج وصول کر لیتی ہے - 'انسپکٹر جنرل' کے کیر کٹر مضحک ہونے کے علاوہ مفسد اور بد دیانت بھی ہیں' اور گوگول نے ڈراما محض

ان کا مذاق اُڑانے کے لئے نہیں بلکہ اس غرض سے بھی لکھا تھا کہ قوم سرکاری ملازموں کی رشوت خوری اور بے ایمانیوں سے آگاہ ہو، مگر مصور کے کمال نے مصلح کے خیالات پر بالکل پردہ ڈال دیا اور ریاست کی بد نظمی پر خفا ہونے کے بجائے ہم کو ان لوگوں کی بے چارگی اور بے کسی پر ترس آتا ہے جو فطرتاً ایک خاص طرح کا چال چلن اختیار کرنے پر مجبور ہیں، اور اپنی صفائی کی کوشش بھی کرتے ہیں تو اس طرح کہ بالکل مسخر معلوم ہونے لگتے ہیں۔

انسپکٹر جنرل کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک شہر کے سرکاری عہدہ داروں کو پتہ لگتا ہے کہ دارالسلطنت سے ایک خاص افسر ان کا کام جانچنے کے لئے بھیجا جا رہا ہے، کیونکہ ان لوگوں کی مرکزی حکومت تک بہت سی شکائتیں پہنچی ہیں۔ شہر کے تمام عہدہ دار یہ خبر سن کر گھبرا جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہا ہے، سب بڑے رشوت خور ہیں، اور تمام شہر والے ان کی حرکتوں سے بہت نالاں ہیں، اس لئے سب کو یقین ہے، کہ اگر واقعی انسپکٹر جنرل بھیجا گیا تو ان کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ ان کا خیال ہے کہ انسپکٹر جنرل بھیس بدل کر آئے گا، اور بد حواسی میں وہ ایک آوارہ نو جوان کو جو اتفاق سے شہر کے ایک ادنیٰ ہوٹل میں آ کر ٹھیر گیا ہے، انسپکٹر جنرل سمجھ لیتے ہیں۔ یہ نو جوان جسے روپے کی سخت ضرورت تھی، تقدیر کے اس کھیل سے فائدہ اُٹھاتا ہے، اور خوب دعوتیں کھا کر اور روپیہ وصول کرکے اپنا رستہ لیتا ہے، آخر میں ان سب کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نو جوان انسپکٹر جنرل نہیں تھا، کوئی معمولی لفنگا تھا، اور اسی وقت کوئی سپاہی آ کر اطلاع دیتا ہے کہ انسپکٹر جنرل آیا ہے اور اس نے سب کو طلب کیا ہے۔—

جعلی انسپکٹر جنرل کے آنے کا منظر نہایت دلچسپ ہے صدر کو جیسے

هی خبر هوتی هے که دارالسلطنت سے ایک بڑا افسر آنے والا هے ' وہ تمام بڑے عہدہ داروں کو بلا بهیجتا هے ' اور انهیں یه خبر سنا دیتا هے. سب کے سب بہت پریشان هوتے هیں ' مگر چونکه سب پر یکساں گرفت هوسکتی هے ' اس لئے ایک دوسرے کو تنبیه کرتے هوئے بهی ڈرتے هیں صدر میونسپلٹی هچکچا کر منصف سے کہتا هے :—

" آپ کی کچهری کے برآمدے میں' جہاں لوگ عموماً عرضیاں لےکر آتے هیں ' اردلیوں نے بطخوں کے بچے پال رکهے هیں ' جو اِدهر اُدهر بهاگے پهرتے هیں ' اور پیروں تلے آ جاتے هیں - گهر گرستی کرنا هر شخص کے لئے قابل تعریف بات هے تو اردلیوں کے لئے کیوں نه هو ' مگر بهئی ایسی جگه پر تو زیادہ مناسب معلوم نہیں هوتا... ... ... "

منصف فوراً جواب دیتا هے :—

" میں ان سب کو آج هی باورچی خانے پکڑ بهجواتا هوں ' آپ کا جی چاهے تو آج میرے یہاں کهانا کهائیے "

صدر میونسپلٹی چلد اور بے قاعدگیوں کی طرف توجه دلا کر کہتا هے :—

" ... ... اسی طرح آپ کا اسیسر ... یوں تو وہ آدمی خاصا هوشیار هے ' مگر اس کے منه سے ایسی بو آتی هے ' معلوم هوتا هے ' سیدها کسی شراب کے کارخانے سے آ رها هے - یه بهی کوئی اچهی بات نہیں ...... اگر یه بدبو واقعی کوئی پیدائشی مرض هے ' جیسا که وہ خود کہتا هے ' تو اسے سمجهائیے ' پیاز یا لہسن یا کوئی اور دوا کهائیے ...... "

لیکن اس معاملے میں منصف کا بس نہیں چل سکتا :—

" نہیں ' اب یه بدبو نہیں مٹ سکتی. وہ کہتا هے بچپن میں اس

کی ڈاڑھی کے چوٹ لگ گئی تھی ' اور تب سے اس کے منہ سے کچھہ ووڈکا کی بو آنے لگی ہے ."

اس ناکامی سے صدر میونسپلٹی کی اصلاحی کوششوں کا خاتمہ نہیں ہوجاتا . وہ تمام افسروں کو فلسفیانہ طرز پر ان کی خاص کم زوری سے آگاہ کرتا ہے :—

" ...... عجیب بات ہے' ایسا کوئی آدمی ہی نہیں' جس کے سر کوئی گناہ نہ ہو ' خدا ہی نے دنیا کو ایسا بنایا ہے ... ... "

منصف سمجھتا ہے کہ اس کی رشوت خوری کی طرف اشارہ ہے اور بگڑ کر کہتا ہے کہ گناہ گناہ میں فرق ہے ' "میں سب سے کھلم کھلا کہتا ہوں' میں رشوت لیتا ہوں ' مگر کیسی رشوت ؟ شکاری کتے کے بچے. یہ کچھہ اور ہی چیز ہے ."

پھر صدر میونسپلٹی ان حضرات کی طرف متوجہ ہوتا ہے ' جن کے ماتحت اسکول اور اوقات اور خیرات خانے ہیں.

"... ... آپ کو استادوں کی طرف خاص طور سے توجہ کرنا چاہئیے ' وہ بڑے لائق لوگ ہیں اور مختلف کالجوں میں تعلیم حاصل کرچکے ہیں ' مگر عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں' جو ممکن ہے علم و فضل کے لازمی جزو ہوں مثلاً استادوں میں سے ایک جس کا چہرہ کچھہ پھولا سا ہے ... کبھی اپنی کرسی پر بیٹھہ ہی نہیں سکتا ' بغیر اس طرح (منہ بنا کر) منہ بنائے ہوئے اور پھر حلق کے پاس ہاتھہ لے جاکر اپنی ڈاڑھی کو انگلیوں سے باہر کی طرف پھینکتا ہے ' اگر وہ صرف طالب علموں کا اس طرح منہ چڑھائے تو کوئی بات نہیں ... ... لیکن آپ خود غور کیجئے ' اگر وہ کسی شخص کا جو اسکول کا معائنہ کرنے آیا ہو ' اس طرح منہ چڑھائے - تو

اس کا نتیجہ بہت برا ہوسکتا ہے : ممکن ہے انسپکٹر جنرل یا کوئی اور اس بات کو اپنی رپورٹ میں درج کردے . خدا جانے پھر اس کا کیا انجام ہو ... ... مجھے آپ کو استاد تاریخ کی طرف بھی توجہ دلانا ہے ... ... میں نے ایک مرتبہ ان کا لکچر سنا تھا ... ... جب انھوں نے اسکندر اعظم کا ذکر شروع کیا تو خدا جانے انہیں کیا ہو گیا . انھوں نے اپنی جگہ سے جھپٹ کر ایک کرسی اٹھائی اور پوری طاقت سے اسے زمین پر دے مارا - میں نے مانا اسکندر اعظم بڑا بہادر تھا ' مگر آخر کرسیاں کیوں توڑی جائیں ؟ اس سے تو خزانے کا نقصان ہوتا ہے ... ... "

اس مجمع میں پوسٹ ماسٹر بھی شریک ہوجاتا ہے ' صدر میونسپلٹی الگ لے جاکر اس سے کہتا ہے کہ فی الحال تمام خط کھول کر دیکھ لیا کرے تاکہ ان لوگوں نے خلاف کوئی شکایت ڈاک کے ذریعہ سے دارالسلطنت نہ بھیجی جا سکے . پوسٹ ماسٹر جواب دیتا ہے کہ اسے یہ باتیں سکھانے کی ضرورت نہیں ' اسے خود خط پڑھنے کا بہت شوق ہے ' اور اگر کوئی خط اسے خاص طور سے پسند آتا ہے تو وہ اسے اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور بار بار پڑھا کرتا ہے ... ... یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ دو حضرات جن کا کام شہر بھر میں خبریں سننا اور سنانا ہے دوڑے ہوئے آتے ہیں' اور خبر دیتے ہیں کہ انہیں فلاں ہوٹل میں ایک آدمی نظر آیا ہے ' جو دارالسلطنت سے آیا ہے ' اور انسپکٹر جنرل کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا .

صدر میونسپلٹی فوراً ہوٹل پہنچتا ہے - نوجوان لفنگے کی پہلے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ معاملہ کیا ہے - لیکن جب اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سارے بزرگ کس غلط فہمی میں ہیں تو انہیں اچھی طرح سے

لوٹتا ہے - آخر کار پوسٹ ماسٹر اس کا ایک خط کھول ڈالتا ہے' جو اس نے اپنے کسی دوست کو لکھا ہے اور جس میں شہر کے تمام مشاہیر کو خوب گالیاں دی ہیں اور پھبتیاں کسی ہیں - خط سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ان سب نے دھوکا کھایا ہے' مگر اس وقت تک چڑیا اُڑ جاتی ہے —

گوگول کا دوسرا ڈراما "شادی" بھی اسی طرح مضحک سیرتوں کا عجائب خانہ ہے - اس کا ہیرو پود کولیسن' ایک کھاتا پیتا آدمی ہے' جو شادی کرنا چاہتا ہے' مگر ایسا جھینپو ہے کہ خود کسی لڑکی سے دوستی کرکے اس سے شادی کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا' ایک مشاطہ اس کا ایک لڑکی سے نکاح کرانے کا وعدہ کرتی ہے' اور پود کولیسن کپڑے وغیرہ تیار کرانے لگتا ہے - اس کی کیفیت پہلے منظر میں ظاہر ہو جاتی ہے' جب وہ اپنے نوکر کو بار بار بلا کر اس سے جرح کرتا ہے :—

"درزی کے یہاں گیا تھا ؟"

"گیا تھا -"

"تو کیا ہوا . وہ فراک کوٹ سی رہا ہے ؟"

"سی رہا ہے ."

"بہت سا سی چکا ہے ؟"

"ہاں کافی سی لیا ہے' کاج بنانے شروع کردئیے ہیں . "

"کیا ؟"

میں نے کہا: اس نے کاج بنانے شروع کردئیے ہیں . "

"اور اس نے کہیں یہ تو نہیں پوچھا کہ صاحب کو بھلا فراک کس لئے چاہئیے؟"

"نہیں' نہیں پوچھا ."

"ممکن ہے اس نے کہا ہو : صاحب شادی تو نہیں کرنا چاہتے ؟"

" نہیں کچھہ نہیں کہا۔" ....

" ... ہاں ' مگر کیا اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ صاحب اتنی باریک بانات کا کوٹ کیوں سلوا رہے ہیں ؟ "

" نہیں ۔"

" اس کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا کہ شاید صاحب شادی کرنا چاہتے ہوں ؟ "

" نہیں ' اس کے متعلق کچھہ باتیں نہیں ہوئیں " ....

پود کولیسن کو اس کا خوف ہے کہ ایسا نہ ہو اس کی شادی کی خبر تمام شہر میں مشہور ہو جائے اور لوگ اسے چھیڑیں اور اس کا مذاق اڑانے لگیں - نوکر ایک بار چلا جاتا ہے تو کچھہ سوچنے کے بعد وہ پھر اس کو آواز دیتا ہے ۔

" پولش خرید لایا ؟ "

" خرید لایا " ....

تجھے پالش دیتے وقت دکان والے نے یہ تو نہیں پوچھا تھا کہ بھلا صاحب کو اس پالش کی کیوں ضرورت پڑی ؟ "

" نہیں "

" ممکن ہے اس نے کہا ہو : کہیں صاحب شادی کرنے کی فکر میں تو نہیں ہیں ؟ "

" نہیں ' اس نے کچھہ نہیں کہا تھا ۔ "

یہ گھبراہٹ ' خوف اور اندیشوں کا یہ عالم دیکھتے ہوئے بھلا کب ممکن تھا کہ پود کولیسن دولھا بننے کی ہمت کرسکتا ' اتفاق سے اس کے ایک دوست کوچ کرت نے اس کی شادی کرادینے کا بیڑا اٹھا لیا ' پودکولیسن کے علاوہ اور امید واروں کو جنھیں مشاطہ نے پھانسا تھا کوچ کرت نے بھاکر

اور ڈرا کر بھگا دیا اور پود کولیسن کے لئے میدان صاف کردیا' لیکن عین اس وقت جب دلہن گرجا میں جانے کے لئے تیار ہوگئی' پود کولیسن ہمت ہار گیا' اور چونکہ کوچ کرت نے اس خیال سے کہ کہیں وہ فرار نہ ہوجائے دروازے پر پہرہ کھڑا کردیا تھا' پود کولیسن کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔

"انسپکٹر جنرل" کا اصلاحی مقصد نہیں پورا ہوا۔ زار نکولائی نے خود اسے پڑھا بہت پسند کیا' اسے اسٹیج پر دکھلانے کا حکم دیا' اور پہلے تماشے میں جا کر ہنسنے اور داد دینے میں پیش قدمی کی۔ لیکن سرکاری عہدہ داروں نے اس کی مخالفت میں ایک طوفان برپا کردیا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اسٹیج پر دکھانے کی قطعی ممانعت ہو گئی۔ مگر گوگول کی طبیعت میں اس ڈراما لکھنے کے ساتھہ قومی اصلاح کا ولولہ اٹھا اور اس کا نقطۂ نظر بھی کسی قدر بدل گیا۔ اس کی باریک بینی ویسی ہی رہی' ظرافت اتنی ہی' مگر واقعات کو وہ مصلح کی نگاہوں سے دیکھنے لگا' اور جو درد روسی زندگی کا نظارہ اس کے دل میں پیدا کرتا تھا وہ اس امنگ میں منتقل ہو گیا کہ روسیوں کو حقیقت حال سے آگاہ کیا جائے' اور روسی زندگی کی عبرت انگیز تصویریں دکھا کر لوگوں کے دل بہتر زندگی کی آرزوؤں سے معمور کردئے جائیں۔ "انسپکٹر جنرل" کی تصنیف کے بہت جلد بعد اس نے ایک ناول لکھنا شروع کردیا جس کا عنوان "مردہ روحیں" تھا۔

"مردہ روحوں" میں مصوری بہت بڑے پیمانے پر کی گئی ہے' گوگول کا ارادہ تھا کہ روسی زندگی کی ایک جامع تصویر کھینچے' اور اسی غرض سے اس نے ایک ایسا لوچدار پلاٹ منتخب کیا جو اس پر قصے کے تسلسل کی کوئی ذمہ داری یا پابندی نہیں ڈالتا۔ ناول کا ہیرو چچکوف' ایک نہایت درجہ چالاک' خود غرض اور عیار آدمی ہے جو دو بار سرکاری

ملازمت سے غبن اور رشوت خوری کی بنا پر نکالا جا چکا ہے ۔ وہ روپیہ کمانے کی ایک اور تدبیر سوچ کر مردہ روحیں خریدنے نکلتا ہے ۔ اس زمانے میں تمام روسی کاشتکار زمینداروں کی ملکیت تھے اور دوسری چیزوں کی طرح بیچ اور خریدے جاسکتے تھے - زمینداروں پر لگان ان نفوس "روحوں" کے حساب سے لگایا جاتا تھا جو ان کی ملکیت میں تھیں ' لیکن چونکہ مردم شماری ہر دسویں سال ہوا کرتی تھی ' اس لئے زمینداروں کو ان کاشتکاروں کا لگان بھی دینا ہوتا تھا جو درمیان میں مرجاتے تھے ' چیچکوف کی تدبیر یہ تھی کہ ایسی مردہ "روحیں" زمینداروں سے سستے داموں خریدے فرضی قیمتیں لگاکر ان کا ایک باقاعدہ بیع نامہ لکھوائے - جیسا کہ زندہ روحوں کی خرید فروخت کے وقت لکھوایا جاتا تھا ' اور تب انہیں کسی بڑے بنک میں جاکر ایک معقول رقم کے عوض رہن رکھا جاوے ' روحیں خریدنے کے لئے وہ ایک گاڑی پر بیٹھہ کر سفر کو نکلتا ہے ' اور گوگول بھی ہمیں اس کے ساتھہ ساتھہ سیر کراتا ہے ' اور ان زمینداروں میں جن کے پاس چیچکوف بیوپار کرنے جاتا ہے ' ہمیں روسی سیرت مختلف شکلوں میں دکھلائی جاتی ہے - منی لوف ایک جوان زمیندار ہے ' جس میں کوئی خصوصیت نہیں ' کسی قسم کا شوق نہیں ' جو کبھی سوچتا ہے کہ اپنے گھر سے تالاب تک ایک زمین دوز راستہ بنائے ' کبھی اسے تالاب پر ایک ایسا پل بنانے کی سوجھتی ہے جس کے دونوں طرف مٹھائی کی دوکانیں ہوں ' مگر وہ کرتا کراتا کچھہ نہیں اس کے گول کمرے میں کئی کوچ ہیں جن پر کپڑا چڑھانا باقی رہ گیا ہے ' وہ اپنے تمام مہمانوں سے کہتا ہے کہ ان پر نہ بیٹھیں ' وہ ابھی تیار نہیں ہیں ' لیکن کئی سال گذر گئے اور وہ کوچ اسی حالت میں پڑے ہیں - اس کی جائداد کا انتظام بہت خراب ہے ' اسے

کھانا تک ٹھیک طرح سے نہیں ملتا مگر وہ خوش ہے اور کسی چیز کی فکر نہیں کرتا - اس کے برعکس سویا کئیے وچ ایک نہایت کنجوس ' اکھڑ آدمی ہے ' جو اپنی جائداد کا انتظام بہت اچھا کرتا ہے اور روپیے کے لالچ میں ہر طرح کی بے ایمانی کرنے پر خوشی سے راضی ہوجاتا ہے ' اگر اسے یہ یقین ہوجائے کہ اس میں فائدہ ہوگا - کھانے میں اور دوسروں کو گالیاں دینے میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا - نور ذرلویف اسی قسم کا مگر کسی قدر مختلف آدمی ہے ' بے ایمان ' جھوٹا ' فسادی ' آوارہ ' جو ملنے جلنے میں بڑا بے تکلف ہے - مگر جیسا کہ چچکوف کو ذاتی تجربہ سے معلوم ہوجاتا ہے اپنی جان پہچان کے لوگوں کو پٹوانے اور ذلیل کرنے پر بھی بہت جلد آمادہ ہوجاتا ہے - جب شہرن میں چچکوف اپنا کام ختم کرچکتا ہے ' بیع نامے لکھہ کر کچہری میں داخل کردئے جاتے ہیں ' اور رخصت ہونے سے پہلے وہ دوستوں کے یہاں دعوتیں کھانے میں مصروف ہوتا ہے تو یہی نورذریوف سب سے کہہ دیتا ہے کہ چچکوف نے مردہ روحیں خریدی ہیں ' اور ناول کے ہیرو کا سارا کام بگڑ جاتا ہے ' وہ اس ناکامیابی سے مایوس نہیں ہوجاتا بلکہ ملک کے دوسرے حصے میں جاکر اسی طرح مردہ روحوں کا بیوپار شروع کردیتا ہے ' اسی سلسلے میں وہ جعلی وصیت نامہ بناکر ایک رئیس عورت کی جائداد کا بڑا حصہ ورثے میں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے ' مگر اس کا جعل پکڑا جاتا ہے ' اور وہ بمشکل قید خانے سے اپنی جان بچاتا ہے —

جو ہنسنا چاہے اسے " مردہ روحوں " میں اس کے بہت سے موقع ملیں گے ' گو گول کی نظر انسانی زندگی کا پہلو دیکھنے میں کبھی نہیں چوکتی - شہرن کے سرکاری وکیل کی بائیں آنکھہ اس طرح جھپکتی تھی گویا وہ کہنا چاہتا ہے " بیٹا ذرا دوسرے کمرے میں جو چلو تو تم کو بتے

کی بات سناؤں'' لیکن وہ نہایت سنجیدہ اور خاموش پسند آدمی تھا' چچکوف سے اس کی خاصی دوستی ہوگئی' اور جب اس نے آخر میں افواہ سنی کہ چچکوف کوئی سزا یافتہ مجرم ہے' اور جعلی نوٹ بناتا ہے تو اس کو بہت صدمہ ہوا - اتفاق سے اسی زمانے میں فالج گرنے سے یا قلب کی حرکت بند ہونے سے وہ اچانک مرگیا - 'لوگوں نے ڈاکٹر کو فصد کھولنے کے لئے بلوایا' لیکن وہ دیکھہ رہے تھے کہ سرکاری وکیل کے جسم سے روح نکل چکی ہے تب انہیں ...... احساس ہوا وہ واقعی روح رکھتا تھا' اگرچہ اس کی انکسار نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا'' ... .. ایک زمیندار ہے جو لمبان چوڑان میں یکساں ہے اور کھاتے کھاتے پھول گیا ہے' ایک ہمسایہ شکایت کرتا ہے کہ اسے زندگی میں کوئی لطف نہیں آتا ہے' اور اس کا جی گھبرایا کرتا ہے - '' تمہارا جی کیوں گھبراتا ہے '' ؟ وہ بزرگ حیرت سے پوچھتے ہیں-'' تم کھاتے کافی نہیں ہو' اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں - لیکن ایسے '' چٹکلے '' مردہ روحوں '' کی مایوس کن اور ہمت شکن فضا پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے ' گوگول ہنستا اور ہنسا تا ہے ' مگر یہ بھی ایک مجبوری سی ہے ' '' مردہ روحوں '' میں ایک جنرل ہیں جنھیں چچکوف کا ایک لطیفہ بہت پسند آتا ہے اور جب ان کی لڑکی اعتراض کرتی ہے کہ انھیں ہنسنے کے بجائے افسوس کرنا چاہئے تو وہ کہتے ہیں :- بیٹی میں کروں کیا ...... یہ بات ہی کچھہ ایسی مضحک ہے : '' گوگول کا بھی یہی انداز ہے ' لیکن ظرافت سے وہ کبھی اپنے یا اپنے پڑھنے والوں کے دل پر غم کا بوجھہ ہلکا نہیں کرتا- '' مردہ روحوں '' میں ایک بزرگ فرماتے ہیں : '' مجھے اکثر خیال ہوتا ہے کہ روسی کو بالکل گیا گذرا سمجھنا چاہئے ' اس کے ارادے میں قوت نہیں ' اس میں اتنی ہمت نہیں کہ استقلال سے کام کرے - وہ کچھہ کرنا چاہتا ہے '

مگر کچھ کر نہیں پاتا - وہ ہر دن سوچتا ہے کہ کل سے ایک نئی زندگی شروع کروں گا ، جس قدر محنت کرنی چاہئے وہ کرونگا ، کھانے میں پرہیز کروں گا ، مگر ہوتا ہواتا کچھ نہیں - اسی رات کو وہ ضرورت سے زیادہ کھاجاتا ہے بے وقوفوں کی طرح آنکھیں مٹمٹاتا ہے اور منہ سے ایک حرف بھی نہیں نکال سکتا - ہاں ، واقعی : ہمیشہ یوں ہی ہوا کرتا ہے ، گوگول نے جب " مردہ روحوں " کے پہلے دو چار باب لکھے تو شاعر پشکن زندہ تھا ، اور گوگول نے اسے یہ پڑھ کر سنائے - پشکن گھبرا کر چلا اٹھا ، یا خدا ہمارا روس بھی کیا عجیب ویرانہ ہے " ۱۸۴۲ ع میں " مردہ روحوں " کی پہلی جلد شائع ہوئی اور اس کے پڑھنے سے اور سب پر بھی ایسا ہی اثر ہوا - لیکن گوگول کی حقیقت بینی تسلیم کرتے ہوئے نقادوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ جس معاشرے میں صرف ایسے ہی لوگ ہوں جیسے گوگول نے اپنی ناول میں دکھائے ہیں اس کا صفحہ ہستی پر قائم رہنا ناممکن ہے - گوگول نے بھی یہ محسوس کیا ، اور اپنے نقادوں کو یقین دلایا کہ ناول ابھی ختم نہیں ہوا ہے ، اس کا پہلا حصہ روسی زندگی کا صرف ایک رخ دکھاتا ہے اور آگے چل کر وہ ناول کے پیرائے میں نجات کی بھی کوئی صورت دکھائے گا ، لیکن نجات کی اسے کوئی صورت نظر نہیں آتی - " مردہ روحوں " کا دوسرا حصہ تین بار لکھ کر جلادیا ، اور جس شکل میں اس کی آخر کار چھپنے کی نوبت آئی وہ نہایت نامکمل تھا ، اور اس میں نجات کا راستہ سمجھانے کا وعدہ بھی ذرا بے تکے طریقے سے پورا کیا گیا تھا - مگر " مردہ روحوں " کے دوسرے حصے کو دیکھ کر گوگول پر حرف گیری کرنا انصاف کے خلاف ہے . یہ حصہ گوگول کے مرنے کے بعد شائع ہوا ، اور مرنے سے کئی سال قبل ۱۸۴۷ ع میں گوگول نے " احباب کے نام خطوط " کے عنوان سے

ایک کتاب لکھی تھی ' جس میں اس نے اعلان کیا تھا کہ اس نے ناول نویسی ترک کردی ہے .

قومی نجات کا مسئلہ در اصل نہایت اہم تھا ' اور اگر گوگول نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے طے کرنا ناول نویس کے امکان سے باہر ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی . " احباب کے نام خطوط " ایک قسم کے مذہبی وعظوں کا مجموعہ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گوگول نے اپنی عاجزی اور بے کسی محسوس کرکے مذہب کے آغوش میں پناہ لی تھی . اس کے معاصرین کو اس تصنیف سے کسی قسم کا اطمینان نہیں ہوا ' کیونکہ وہ مذہبی جذبے اور مذہب کی پیروی میں فرق کرتے تھے . گوگول کے وعظوں سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ زار اور روسی کلیسا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی تعلیم دینا چاہتا ہے ' اور یہ بھول گئے کہ وہ کیسے زار اور کیسے کلیسا کے خواب دیکھہ رہا تھا . جہاں تک روسی فطرت کی تعبیر کا تعلق ہے ' گوگول کے وعظ بھی اسی قدر پر حقیقت تھے ' جتنے اس کے ناول اور دستئفکی اور تالستائی کی تصانیف نے اسے ایک حد تک ثابت بھی کردیا . بہر حال یہ صحیح ہو یا نہ ہو کہ روسی فطرت کو صرف مذہبیت کا جذبہ نجات دلا سکتا ہے ' گوگول کا انجام صاف طور سے ظاہر کردیتا ہے کہ روسی ناول نویسوں کے لئے ناول محض قصے کہانی نہیں تھے - ان کی نظروں میں ناول وہی حیثیت رکھتا تھا جو قدیم یونانی معیار کے مطابق فلسفے کی تھی ' اس کا مقصد صرف جی بہلانا یا عبرت دلانا نہیں تھا - اس کا موضوع انسانی زندگی کی ہر شکل اور کیفیت تھی ' وہ ایک آئینہ تھا جس میں صرف موجودہ حالات کا عکس

نہیں تھا ، بلکہ اس زندگی کا ایک دھندلا سا پرتو جسے انسان اپنے تمام قویٰ کی نشو و نما کے بعد اپنی جولانگاہ بنا سکتا ہے ۔ گوگول پہلا ناول نویس تھا جس نے ناول کے کل امکانات سمجھے اور ناول نویسی کے پورے فرائض محسوس کئیے ، اور باوجود اپنے فلسفیانہ مقاصد کی ناکامی کے وہ دنیا کے ناول نویسوں میں بہت بڑا درجہ رکھتا ہے .

خطبات گارساں دتاسی

تیرھواں خطبہ

۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۳ ع

از

(ترجمہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی ۔ لٹ

(پیرس) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن)

حضرات !

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس سال کے خطبے میں بھی میں آپ کے روبرو یہ اعلان بلا تکلف کر سکتا ہوں کہ ہندوستانی ادب دن بدن ترقی پر ہے ۔ میں اپنے اس دعوے کی تائید میں اس سرکاری رپورٹ کو پیش کرتا ہوں جو اس سال ماہ مئی میں شائع ہوئی ہے ۔ اس رپورٹ میں ان زبانوں کے متعلق معلومات ملتی ہیں جن کا سیکھنا سول سروس کے نوجوان ملازموں کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے ۔ خاص کرکے ان کے واسطے جو صوبۂ شمال مغربی ' اودھ یا پنجاب میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں ۔ سول سروس کے امتحان کی ایک کونسل ہے ۔ اس کونسل کے صدر وزیر مالیات سر چارلس تریولین ہیں ۔ اور دوسرے ارکان میں آر ۔ ایم بنرجی اور مولوی عبداللطیف کے نام قابل ذکر ہیں ۔ اس کونسل نے وزیر ہند سرچارلس وڈ

کے مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ سول سروس کے امیدواروں کا ہندوستان کی صرف دو زبانوں یعنی اردو اور ہندی میں امتحان لینا چاہئیے۔ ان دو زبانوں کے جاننے سے سول سروس کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ اب تک یہ قاعدہ تھا کہ صوبہ شمال مغربی' اودھ اور پنجاب میں جانے والے امیدواروں کی ہندی اور فارسی میں جانچ ہوتی تھی اور بنگال جانے والے امیدواروں کا اردو اور بنگالی میں امتحان لیا جاتا تھا —

سر چارلس ٹریولین نے انڈیا آفس میں سرکاری ملازموں کے متعلق جو یہ تجویز کی ہے اس سے علوم مشرقیہ کو بہت نفع پہنچے گا۔ موصوف ان سب لوگوں میں ہر دلعزیز ہیں جو ہندوستان سے محبت رکھتے ہیں۔ موصوف کی تجویز کے موافق سول سروس کے ابتدائی امتحان میں ۱۸ سے لے کر ۲۱ سال کی عمر والے شریک ہو سکتے ہیں۔ کامیابی کے بعد انھیں آکسفورڈ یا کیمبرج بھیجا جاتا ہے تا کہ وہ دو سال اس علاقے کی زبان کی تحصیل کریں جہاں ان کا تقرر کیا جائیگا۔ اس علاقے کی زبان کے ساتھ جہاں ان کا تقرر ہوگا ہندوستانی لازمی طور پر سب کو سیکھنی ہوتی ہے۔ چنانچہ اکسفورڈ اور کیمبرج دونوں یونیورسٹیوں میں ہندوستانی کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ آکسفورڈ میں کیپٹن جے چیمبرس اور کیمبرج میں میجر جے۔ جی سٹیفن ہندوستانی پڑھاتے ہیں —

فوجی خدمت کرنے والوں کے لئیے ایشیائی زبانوں کے سیکھنے کے متعلق قواعد زیادہ سخت نہیں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فوجی خدمت سے کوئی اپنے تئیں سول میں یا سیاسیات میں منتقل کرالے۔ لیکن صیغۂ سیاسیات کی خدمت اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک کہ ہندوستانی کے سخت امتحان میں کامیابی نہ حاصل کر لی جائے۔ باوجود اس کے کہ فوج میں

بھرتی ہونے سے قبل ہندوستانی زبان کا امتحان ہر امیدوار کو دینا ہوتا ہے لیکن اگر وہ فوج سے سیاسیات میں منتقل ہو تو اس وقت پھر اس کا امتحان ہوتا ہے - زبان کے علاوہ امیدوار سے ہندوستان کے قوانین ' تاریخ اور با لخصوص ان عہد ناموں کے متعلق سوالات پوچھے جاتے ہیں جو دیسی رئیسوں کے ساتھہ برطانیہ نے کئے ہیں - وہ افسر جو اس امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں - انہیں سرکاری طور پر ایک سو اسی روپے دئے جاتے ہیں تا کہ وہ کسی منشی سے خاص طور پر بعد میں سبق لے سکیں * —

سر چارلس ٹریویلین نے ہندوستانی زبان کے لئے انعام مقرر کیا ہے - اس سے بھی ہندوستانی کی اهمیت میں اضافہ ہو گا - یہ انعام پانچ سو روپے کا ہے - یہ انعام اس امیدوار کو ملے گا جو اردو زبان میں حسب ذیل موضوع پر بہترین مضمون لکھے —

" یونانی علوم کا بغداد کے عباسی اور قرطبہ کے اموی خلفاء کے زمانہ میں اثر - اس کے ساتھہ وہ اثر بھی بتلایا جائے جو عربوں نے قرون مظلمہ کے بعد یورپ کے نشاۃ ثانیہ پر ڈالا ہے - ان باهمی اثرات سے بطور نتیجہ یہ ثابت کیا جائے کہ اب اس وقت پختہ کار اهل یورپ اور هندوستان کے مسلمانوں کے میل جول سے کیا حالات مترتب ہوں گے —

مضمون یکم اکتوبر سنہ ۱۸۶۴ ع کمیشن کے پتہ پر کلکتہ بھیج دینا چاهئے جو خاص طور پر اس مضمون کی جانچ کے لئے نامزد کیا گیا ہے - اس کمیشن میں " ایڈورڈ بی کاول " کے علاوہ دو هندو عالم بھی شامل ہیں - اس ضمن میں میں " سر چارلس وڈ " کے قول کا نقل کرنا مناسب خیال

* Allen's Indian Mail, Nov. 1863

کرتا ہوں - سرچارلس ٹریولین بھی ان کے ہم خیال ہیں اور میں بھی متعدد مرتبہ انھیں خیالات کا خود اعادہ کر چکا ہوں - لیکن 'سرچارلس وڈ' نے انھیں خیالات کو نہایت خوبی اور واقفکاری کے ساتھہ پیش کیا ہے - وہ کہتے ہیں —

پٹنہ سے لے کر پیشاور تک سارے شمالی ہند کی زبان ہندوستانی ہے - شہروں میں ' قصبات میں ' گاؤں میں ' سول اور فوجی مرکزوں میں ' درباروں میں اور سرکاری دفتروں میں ہر کہیں یہ سمجھی جاتی ہے - ہر تعلیم یافتہ شخص اور ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک سب ہی اسے استعمال کرتے ہیں - جس طرح اطالوی زبان کی اہمیت 'اٹلی' میں ہے یا انگریزی کی انگلستان میں ہے بس وہی حیثیت ہندوستانی کی شمالی ہند کے وسیع علاقوں میں ہے " —

پھر وہ کہتے ہیں —

" ہندی سے در اصل مراد وہ دہقانی بولیاں ہیں جو شمالی ہند میں بولی جاتی ہیں - سول سروس کے نوجوانوں کو جو ہندی سکھائی جاتی ہے وہ برج کی بھاشا ہے - یہ وہ بولی ہے جو 'متھرا' اور 'برندابن' کے آس پاس بولی جاتی ہے - ہندی کا پنجابی سے بس اسی قسم کا تعلق ہے جو Somersetshire کی بولی Northumberland کی بولی سے ہے - ان ہندی بولیوں کا اردو (ہندوستانی) سے وہی تعلق ہے جو اصلی انگریزی زبان کا مذکورہ صدر بولیوں سے ہے - ہر کہیں آپ دیکھیں گے کہ گاؤں والے بلا تکلف ہندوستانی میں بات چیت کرتے ہیں - اگر کسی کو ہندوستانی زبان پر پوری قدرت حاصل ہو تو وہ بہت جلد آسانی کے ساتھہ

ہندوستان کی ہر مقامی بولی کو سیکھہ سکتا ہے * —

مسٹر " منٹگمری مارٹن " نے اپنی کتاب " مشرقی ہند " میں اور بھی واضح طور پر یہ بات ثابت کی ہے کہ صوبہ شمال مغربی کی زبان سوائے ہندوستانی کے اور کوئی نہیں ہوسکتی دہلی ' آگرہ ' الہ آباد ' لاہور اور اودہ کے ملحقہ علاقوں میں یہی زبان استعمال کی جاتی ہے - ہندی بہار اور صوبہ متوسط کی زبان ہے ' لیکن ہندوستانی اردو یا دکھنی ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں سمجھی جاتی ہے —

اس سے آپ حضرات پر یہ روشن ہوگیا ہوگا ' جس کی نسبت میں بار بار آپ کی توجہ مبذول کرا چکا ہوں ' کہ ہندوستانی زبان ہندوستان میں عام طور پر مروج ہے - گزشتہ سال آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں " کلکتہ " کے اس جلسہ کی مثال پیش کی تھی جس میں " سر جان پی گرانٹ " کو الوداع کہتے وقت اظہار خلوص و ہمدردی کے لئے متعدد ہندو مقررین نے ہندوستانی زبان میں تقریریں کیں نہ کہ بنگالی میں جو صوبہ بنگال کی زبان ہے - اسی طرح کلکتہ کے ایک اور جلسہ میں جو اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ انگلستان کے کپڑے کے کارخانوں کے مزدوروں سے اظہار ہمدردی کی جائے - مختلف

---

* سر چارلس فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں فارسی نہ تو دفتری زبان ہی باقی رہی اور نہ لوگ اس میں گفتگو کرتے ہیں اور اب دن بدن اس زبان کے تحصیل کرنے والوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے - موصوف نے یہ بات اس واسطے بیان کی ہے تا کہ وہ اپنے ان ساتھیوں کو قائل کریں جو فارسی زبان کو صوبہ شمالی مغربی کے مدارس میں لازمی قرار دینے کے حق میں ہیں —

مقررین نے هندوستانی میں تقریریں کیں - فرینڈ آف انڈیا (Friend of India) میں اس کا ذکر ہے کہ راجہ نراین سنگھہ نے اس جلسہ میں تجاویز کی تائید اردو زبان میں کی - موصوف نے اپنی تقریر میں انگلستان کی اس فیاضی کا ذکر کیا جو هندوستان میں قحط کے موقعہ پر ظاهر هوچکی هے - موصوف نے فرمایا کہ اب هماری باری هے کہ هم اپنے محسنوں کی اعانت کے لئے اُنہیں جنہوں نے اپنی فیاضی سے مصائب و خطرات سے نجات دلائی - اگر اس وقت هم کچھہ کریں تو یہ کوئی بڑا احسان نہ هوگا بلکہ همارا ایسا کرنا اس قرض کی ادائی هوگی جو هم پر واجب هے - همارے اور انگلستان کے تعلق میں اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا جو هم پر اس قوم نے کیا هے - اس کے علاوہ یہ ایک مسلم بات هے کہ ضرورت مند کی ضرورت رفع کرنا اور اس کی اعانت کرنا هر صاحب مقدور کا فرض هے —

اس جلسہ میں هندو، مسلمان، عیسائی سب نے شرکت کی اور هر شخص جذبۂ خدمت سے متاثر تھا - بقول شاعر پوپ —

" مذهب و نجات کے معاملے میں هر کوئی اختلاف رکھتا هے لیکن صرف همدردی هی ایسی چیز هے جو ساری دنیا کو متحد کر دیتی هے " —

شہزادہ " ویلز " کی شادی کے موقعہ پر هندوستان میں هر جگہ جلسے منعقد هوئے اور ان میں هندوستانی زبان میں تقریریں کی گئیں - ۱۸ مئی کو کلکتہ میں ایک جلسہ هوا جس میں منشی " امیر علی " نے اردو میں نہایت فصیح و بلیغ تقریر کی - مقامی اخباروں میں اس تقریر کا انگریزی ترجمہ شائع هوچکا هے - اس جلسہ میں شہزادہ اور ان کی بیوی کے لئے ایک تحفہ پیش کرنے کی تجویز منظور هوئی —

اس بات کا ایک مزید ثبوت کہ ہندوستانی ہندوستان کی مروجہ زبان ہے - ہمیں اس سے ملتا ہے کہ گورنمنٹ انگریزی نے ہندوستان میں یہ قاعدہ بنا دیا ہے کہ اگر کسی رجمنٹ میں ترجمان (Interpret) کی ضرورت ہو تو اس افسر کو یہ خدمت دی جاسکتی جس نے صرف ہندوستانی زبان میں امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے - لیکن یہ ایسی صورت میں ہوگا جب کہ اور کوئی بہتر شخص نہ ملے جو ہندوستان کی سب زبانیں جانتا ہو - تا ہم اس سے آپ کو ہندوستانی زبان کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے —

ہندوستان کے سکوں پر ان کي قیمت لکھنے کا جب مسئلہ در پیش تھا تو یہ فیصلہ ہوا کہ ہندی اور اردو حروف میں اسے لکھنا چاہئے - یہ سکے ہندوستان کے سب صوبوں میں استعمال کئے جاتے ہیں —

ہندوستاني صرف ہندوستان ہی میں نہیں بولی جاتی ہے - مشرق قریب کے بندرگاہوں اور افریقہ کے ساحل پر لوگ اس زبان کو استعمال کرتے ہیں - مسٹر شیفر نے ' جو شاہ لمانیہ کے خاص انٹرپرٹ (ترجمان) (Interpret) تھے اس زبان کو عدن میں سنا اور مسٹر ژول اپیر نے جو ہمارے انسٹیٹیوٹ کے معزز رکن ہیں اس زبان کو " بصرہ " میں بولتے سنا - میں نے ابھی حال میں تجارتی سامان کی رسید دیکھی جو بندرگاہ " لامو " پر زنجبار کے قریب جہاز پر لادا گیا تھا اور " عدن " بھیجا گیا - یہ رسید ناگری رسم خط میں تھی جو عام طور پر بنئے لوگ اپنی خط و کتابت میں استعمال کرتے ہیں - میں نے حال ہی میں " رنگون ٹائمز " میں ایک انگریزی مشن کا ذکر پڑھا جو " آوا " " کرنیل فیر " کے زیر سر کردگی گیا تھا - یہ مشن تجارتی معاہدے کی غرض سے بھیجا گیا تھا - چنانچہ راجہ کے لڑکے نے

اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار ہندوستانی زبان میں کیا اس واسطے کہ اسے انگریزی نہیں آتی تھی * —

سول سروس کے امتحان کے لئے حسب ذیل ہندوستانی کی کتابیں نصاب میں رکھی گئی ہیں : انتخابات باغ و بہار ؛ اخوان الصفا ؛ سیرالمتاخرین ۔ آخرالذکر کتاب میں عہد مغل کے زوال اور انگریزی حکومت کی ابتدا کا حال ہے ۔ اس کتاب کا مصنف ایک مشہور مسلمان ہے جو ذاتی طور پر کلایو ' وارن ہیسٹنگز اور دوسرے انگریزی اعیان حکومت سے واقف تھا ۔ اس کتاب کی زبان نہایت سلیس ہے —

ہندی کے نصاب میں حسب ذیل کتابیں رکھی گئی ہیں : انتخاب پریم ساگر' سنگھاسن بتیسی' اور شایہ راجنتی اور کالی داس کی راماین رکھی گئی ہے ۔ میں نے یہ معلومات مولوی عبداللطیف سے حاصل کی ہیں ۔

ان کتابوں کے علاوہ خطوط' سرکاری دستاویزیں' عرضداشتیں' احکام اور تعزیرات ہند کے اقتباسات بھی سول سروس کے امیدواروں کو پڑھنے ہوتے ہیں ۔

سنہ ۱۸۶۲ ع میں ہندوستان میں دیسی مطابع نے مختلف قسم کی چھ سو کتابیں طبع کیں اور بارہ نئے رسائل و اخبارات جاری ہوئے † ہندوستانی مطابع کی اہمیت دن بدن بڑھتی جارہی ہے ۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حکومت بنگال نے کلکتہ میں ایک سرکاری رپورٹ کنندہ مقرر کیا ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ ارباب حکومت کو عوام الناس کے خیالات سے ہفتہ وار اطلاع دے تاکہ حکام کو اپنی رعایا کی خواہشات اور ان کی

---

* انڈین میل جون سنہ ۱۸۶۳ ع

† سرکاری رپورٹ کے مطابق سنہ ۱۸۵۸ ع میں صرف صوبۂ شمال مغربی میں اردو ہندی کے ملاکر ۲۲ اخبارات تھے ۔ ان میں زیادہ تر ایسے تھے جو ہفتہ وار شائع ہوتے تھے ۔

ضرورتوں کا علم ہوتا رہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ رپورٹ کنندہ کی حیثیت 'سنسر' کی ہے۔ اس کے ساتھ ایک پنڈت اور ایک مولوی کام کرتا ہے—

کلکتہ سے لے کر پیشاور تک آپ شمالی ہند کے کسی بڑے شہر میں جائیے ہر جگہ لیتھو گرافی پریس دکھائی دیں گے۔ مجھے اس کی اطلاع ملی ہے کہ سنہ ۱۸۵۹ ع میں صرف شہر کلکتہ میں بیس مطبع تھے*—

گذشتہ سال میں نے پنجاب کے دو اخبارات کا ذکر کیا تھا۔ اس وقت میرے پاس ان کے نمونے پہنچ گئے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا یہ دو اخبار "سرکاری اخبار" اور "محب رعایا" ہیں۔ اول الذکر کا جس جگہ نام لکھا جاتا ہے اس کے اوپر برطانیہ عظمیٰ کے آلات حرب کا طغرہ بطور سپاہ موجود ہے۔ یہ اخبار لاہور میں سرکاری لیتھو پریس میں چھپتا ہے۔ یہ رسالے کے طور پر چھوٹی تقطیع میں طبع ہوتا ہے۔ ہر صفحے پر دو کالم ہوتے ہیں۔ پنڈت اجودھیا پرشاد اس کے اڈیٹر ہیں جو متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ یہ مہینہ کی پہلی کو نکلتا ہے۔ اس بات کو بھی خاص طور پر لکھا جاتا ہے کہ اس رسالے کے کاتب کا نام محمد علی خطاط ہے۔ پہلی اکتوبر کے نمبر میں اور دوسری چیزوں کے علاوہ 'راولپنڈی' کے نارمل اسکول کے نتائج امتحان سہ ماہی ۱۸۶۲ ع درج ہیں۔ پہلی نومبر کی اشاعت میں ملتان کے اسکول کے افتتاح کا حال لکھا ہے۔ یہ رسم ۲۴ اکتوبر کو منائی گئی تھی۔ اس کے تتمے کے طور پر ایک اور اخبار شائع ہوتا ہے جس کا نام ہی "تتمہ سرکاری اخبار" ہے۔ اسے صوبۂ

---

* اس کی فہرست "Selections from the Records of Bengal Govt." میں ملے گی۔ نمبر ۲۳ —

پنجاب کا پولیس گزٹ سمجھنا چاہئے —

' محب رعایا ' مہینے میں دوبار نکلتا ہے - مجھے اس اخبار کا ایک نمبر ملاہے جو ۲۸ فروری سنہ حال کا ہے - یہ بھی چھوٹی تقطیع میں دوکالم پر چھپتا ہے - یہ لیتھو میں نہیں نکلتا بلکہ ٹائپ میں - جہاں تک کہ اخبارات کا تعلق ہے ایسی مثال ہندوستان میں اور نہیں ملے گی - ٹائپ میں نسخ رسم خط استعمال ہوتا ہے - ہندوستان میں نسخ کا مطلق رواج نہیں نستعلیق عام طور پر مروج ہے - اس اخبار کے سر ورق پر ایک شعر ہوتا ہے * اس اخبار کے مدیر کا نام جواہر لال ہے - انکا نام شاید آپ پہلے بھی سن چکے ہیں - یہ اخبار مطبع صدرالعام میں بمقام اناوہ طبع ہوتا ہے —

ہندوستانی کے جو جدید اخبار نکلنا شروع ہوئے ہیں ان میں سے میں آپ کی توجہ " خیر خواہ خلق " کی جانب مبذول کراتا ہوں - یہ اس اخبار سے علحدہ ہے جس کا میں ذکر کر چکا ہوں یعنی " خیر خواہ خلائق " اور جو اجمیر سے نکلتا ہے - " خیر خواہ خلق " مہینہ میں دو مرتبہ آگرہ میں سکندرہ کے چھاپے خانہ سے شائع ہوتا ہے یہ چھوٹی تقطیع میں صرف ایک ورق پر دو کالم میں چھپتا ہے - یہ در اصل بلکل مذہبی قسم کا اخبار ہے - اس کا مقصد دین مسیح کی نشر و اشاعت ہے - اس کے سر ورق پر یہ الفاظ لکھے رہتے ہیں —

" خدا کا خوف دانائی کی ابتدا ہے اور مذہبی آدمی کے نزدیک علم اور احتیاط ہم معنی ہیں - " سیاسی خبروں کے علاوہ اس میں مذہبی ' تاریخی ' علمی اور ادبی مضامین ہوتے ہیں اور کبھی کبھی لیتھو میں

---

* یہاں فرانسیسی میں شعر کا مطلب دیا ہے کہ محنت سے آدمی ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ سکتا ہے —

تصاویر بھی ہوتی ہیں - ۱۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۲ ع کے تتمے میں برے دن کے درخت کی ایک تصویر دی ہے اور اس کا مطلب سمجھایا ہے —

ایک اخبار اوک متر ہے - یہ ہندی کا رسالہ ہے اور دیوناگری رسم خط میں شائع ہوتا ہے - اور آگرہ میں سکندرہ کے مطبع میں چھپتا ہے جہاں " خیرخواہ خلق " چھپتا ہے - یہ پہلی جنوری سنہ ۱۸۶۳ ع سے نکلنا شروع ہوا ہے - چھوٹی تقطیع میں دو کالم پر چھپتا ہے - یہ رسالہ ماہانہ ہے - اس رسالہ کا مقصد وہی ہے جو " خیر خواہ خلق " کا - ایک ہندوں میں اور دوسرا مسلمانوں میں مسیحیت کی اشاعت و تبلیغ کی غرض سے شائع کیا گیا ہے - اس کے مدیر کا نام پردۂ خفا میں ہے - لیکن اس کے مضامین کے معیار اور سنسکرت دوہوں اور ہندی چوپائیوں کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً وہ کوئی ہندو و عالم ہوں گے جنھوں نے مسیحی دین قبول کرلیا ہے —

مجھے اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں پہنچی کہ آیا اس سال کلکتہ سے کوئی نیا اخبار یا رسالہ شائع ہوا یا نہیں ؟ - گزشتہ سال تو چار اردو کے اخبار وہاں سے نکلتے تھے —

اب ہم اخبار و رسائل کے علاوہ اور دوسرے ادبی مشاغل کی نسبت کچھ کہنا چاہتے ہیں - ایک مشہور کتاب جو حال میں شائع ہوئی ہے انجیل مقدس کی شرح ہے * - یہ " سید احمد " صدرامین غازی پور کی تصنیف ہے - موصوف اس وقت اردو زبان کے اعلی ترین انشاپردازوں میں ہیں اور میں نے انھیں کی کتاب " آثارالصنادید " کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے - موصوف آج کل مذہبی مباحث میں مصروف ہیں - غالباً چند

* Mohemedan Commentary of the holy Bible غازی پور سنہ ۱۸۶۲ ع —

سال قبل وہ ایسا نہ کرسکتے اس واسطے کہ بادشاہ دھلی نے اپنی رعایا کو ممانعت کردی تھی کہ وہ عیسائی مشنری لوگوں سے کسی قسم کا بحث مباحثہ نہ کریں † - گزشتہ سال میں نے تذکرۃ کہا تھا کہ عنقریب یہ کتاب نکلنے والی ہے - اس کا پہلا حصہ شائع ہوچکا ہے - مصنف نے ازراہ عنایت یہ حصہ مجھے ارسال فرمایا ہے - میں ان کا ممنون ہوں - اس کتاب کا اصلی نام تبئین الکلام فی تفسیرالتوریت والانجیل علی ملۃ الاسلام " ہے —

میں سمجھتا ہوں آپ کے لئے اس کتاب کے سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ میں اس کے چند اقتباسات اس وقت آپ صحباوں کے سامنے پیش کروں ‡ —

اس کتاب کا یہ پہلا حصہ شہر غازی پور میں مصنف کے خاص ذاتی مطبع میں چھپا ہے - اور موصوف نے خود اس کے سارے اخراجات برداشت کئے ہیں - یہ کتاب بڑی تقطیع پر ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے - اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی ترجمہ بھی ہے - یہ حصہ در اصل تمہید کے طور پر ہے - اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس پوری کتاب کی وسعت کیا ہوگی - سید احمد کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی معلومات گہری ہیں اور انہیں صرف قران اور توریت و انجیل ہی پر کافی عبور نہیں ہے بلکہ دوسری مشرقی تصانیف سے بھی وہ پورے طور پر واقف معلوم ہوتے ہیں - اس سے بھی بڑہ کر تعجب اس امر پر ہے کہ موصوف نے یوروپین تصانیف سے بھی استفادہ کیا ہے - چنانچہ وہ ان کے جگہ جگہ پر حوالے دیتے ہیں - یہ کتاب وسیع مطالعہ اور

† Friend of India

‡ اس جگہ اقتباسات کا فرانسیسی ترجمہ ہے —

تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے -- مجھے زیادہ تر خوشی اس بات پر ہے کہ یہ کتاب اس زبان میں ہے جس کی تعلیم یہاں میرے ذمہ ہے - میرا تو خیال یہ ہے کہ اس قسم کے مطالب شاید پہلی مرتبہ کسی مسلمان نے اردو میں فکر و تحقیق کے ساتھہ پیش کئے ہیں - غالباً یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ شاید ہی مشرق کی کسی زبان میں اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے اس نوعیت کے مطالب کو ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہو --

اس پہلی جلد میں دس ابواب ہیں - پہلے باب میں انبیاء کے مشن اور انسانیت کے لئے ان کی ضرورت کو ثابت کیا ہے - دوسرے باب میں وحی اور کلام الہی کی اصلیت بتائی ہے سید احمد اپنی بحث میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انجیل مقدس میں تعلیم وحی حضرت مسیح کی زبان سے ادا کی گئی ہے --

تیسرے باب میں توریت، صحف الانبیاء، زبور اور انجیل کے متعلق اظہار خیال ہے - چوتھے باب میں ان آسمانی کتابوں کی نسبت جو مسلمانوں کے عقاید ہیں انھیں بیان کیا ہے - پانچویں باب میں ان آسمانی کتابوں سے بحث کی ہے جو بائیبل میں شامل ہیں - اس باب میں ان سب مقدس کتابوں کی صحیح فہرست درج ہے جن میں سے بعض کو مسیحی کلیساء تسلیم کرتا ہے اور بعض کو ماننے سے انکار کرتا ہے - اس فہرست میں بعض کتابیں ایسی ہیں جنھیں مسیحی کلیساء "گم شدہ" یا جعلی بتاتا ہے - مصنف نے ان کتابوں میں سے ہر ایک کی نسبت جو رائے ظاہر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان مسائل پر کافی غور و فکر کیا ہے --

چھٹے باب میں سید احمد نے مسلمانوں کے اس طریقۂ تحقیق کا ذکر کیا ہے جو وہ آسمانی کتابوں کی صداقت پرکھنے کے لئے استعمال کرتے

ہیں - وہ طریقہ یہ ہے کہ ہمیں با وثوق لوگوں کے ایک سلسلہ کا علم ہونا چاہئیے جن کا تعلق صاحب کتاب کی ذات تک پہنچتا ہو - چنانچہ سید احمد نے خود اپنی مثال اس موقع پر دی ہے - وہ کہتے ہیں کہ ۲۸ مشہور اور باوثوق اشخاص کے سلسلے کے توسط سے اُن تک قرآن کریم رسول اللہ سے پہنچا ہے —

ساتویں باب میں ان تصرفات کا ذکر ہے جو انجیل و توریت میں ہوئے ہیں - یہ خیال عام طور پر مسلمانوں میں رائج چلا آتا ہے - در اصل مصنف نے نہایت صفائی اور ہوشیاری سے اس نازک مسئلے پر بحث کی ہے - اس باب کو پڑھنے سے ان کے علمی تبحر کا پتہ چلتا ہے - مصنف نے آٹھ قسم کے تصرفات کا ذکر کیا ہے اور ان سبھوں کو مثالوں کے ذریعہ سے واضح کیا ہے - پھر اس کے بعد انجیل مقدس کی مختلف کتابوں کے قدیم قلمی نسخوں پر مورخانہ تبصرہ کیا ہے اور بر محل تفصیل سے اپنے مطالب کی تشریح کی ہے —

آٹھویں باب میں سید احمد نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ آیا انجیل مقدس کی مختلف کتابیں اصلی وحی کی تعلیم کے مطابق ہیں یا یہ کہ ان میں بعد میں تصرفات ہوئے ہیں - چنانچہ مصنف نے اس مسئلے کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے وہ وہی ہے جو عام طور پر مسلمانوں میں رائج ہے -

نویں باب میں یہ بتایا ہے کہ مسلمان لوگ انجیل مقدس کے ترجموں کو کس حد تک صحیح سمجھ سکتے ہیں اور ان پر اعتماد کرسکتے ہیں - میرے خیال میں یہ باب اس کتاب میں سب سے زیادہ دلچسپ ہے - شروع میں مصنف نے کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی دشواریوں پر عام افکار پیش کئے ہیں اور پھر اس کے بعد انجیل مقدس کے ان ترجموں پر پوری

غیر جانبداری کے ساتھہ تبصرہ کیا ہے جو مشرق اور مغرب میں اب تک کئے گئے ہیں ۔ اسی ضمن میں ان ترجموں کا بھی ذکر آگیا ہے جو مختلف انجمن ہاے اشاعت انجیل کی جانب سے شائع ہو چکے ہیں ۔ مثلاً ان ان عبرانی اور عرب ترجموں کا بھی ذکر ہے جو میرے استاد سلو ستردے ساسی (Silvestre De Sacy) نے اور میں نے اصلی قدیم نسخوں سے مقابلے کے بعد شائع کرائے ہیں - اس کے علاوہ مصنف نے ان سب ہندوستانی، فارسی، عربی اور انگریزی ترجموں کا ذکر کیا ہے جو ان تک پہنچ سکے - اس باب کو لکھتے وقت مصنف کے پاس ۱۸ زبانوں کے ترجمے اور دو قلمی نسخے موجود تھے ۔ ان قلمی نسخوں میں ایک عبرانی زبور کا تھا جس کا mazni نے عربی ترجمہ بھی کیا ہے - غالباً یہ نسخہ سولھویں یا سترھویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے - اس میں اور عام 'زبور' میں اختلافات بھی پائے جاتے ہیں - دوسرا قلمی نسخہ چاروں Evangiles کا عربی زبان میں ہے - یہ روم کے سنہ ۱۶۷۱ ع والے ایڈیشن سے ملتا جلتا ہے اور میرے خیال میں غالباً اس کی نقل ہے - اس باب کے آخر میں لسانی خاندان کے اعتبار سے ان زبانوں کا نقشہ دیا ہے جن جن میں انجیل مقدس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے یا عنقریب ہونے والا ہے - یہ نقشہ "Bible of every land" سے نقل کیا ہے - السنہ کی جو تقسیم اس موقع پر دی ہے وہ بجائے خود علمی دلچسپی سے خالی نہیں —

دسویں باب میں، جو اس کتاب کا آخری باب ہے، مصنف نے اُن اسلامی احکام کا ذکر کیا ہے جن سے قدیم آسمانی کتب کے بعض حصے منسوخ ہو گئے ہیں - آخر میں دو ضمیمے ہیں پہلے ضمیمہ میں ان مشہور واقعات کی تاریخیں درج ہیں جن کا انجیل مقدس میں ذکر آیا ہے - یہ تاریخیں

نامور انگریز عالم دینیات یوشر (Usher) کے حوالے سے لی گئی ہیں دوسرے ضمیمے میں تیرہ سو ہجری تک (۱۸۸۲ مطابق سن عیسوی) سن ہجری اور سن عیسوی کی مطابقت قایم کی ہے - ۱۳۰۰ ہجری تک اس واسطے کہ عام طور پر مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اس سال کے بعد جو عہد آئیگا وہ دنیا کا آخری عہد ہو گا ــ

غرض کہ مصنف نے اپنی کتاب کی اس تمہید میں ذاتی اپج اور اجتہاد سے کام لیا ہے - نہ صرف مسلمانوں بلکہ خود عیسائیوں کے لئے اس میں بعض باتیں نئی اور سبق آموز ہیں - یہ کتاب یقیناً انجیل کی ایک نہایت مکمل شرح ہو گی - تمہید کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو ہماری مقدس کتب پر پورا عبور حاصل ہے اور ان کی نظر سب ضروری معلومات پر پوری طرح حاوی ہے - اس کتاب میں وہ معلومات جو ہمیں مختلف جگہ جستہ جستہ ملتی ہیں' ایک جگہ اکھٹا مل جائینگی - ہاں ' ساتھہ ہی ہمیں یہ امر فراموش نہ کرنا چاہئیے کہ مصنف ایک مسلمان ہے - اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسیحی اور اسلامی تعلیم میں میل پیدا کرے - لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ غالباً اس کے ہم مذہب لوگ اس کی روا داری کی باتوں کو بری نظر سے دیکھیں گے - دوسری جانب عیسائی لوگ غالباً کبھی اس بات کی صداقت کو تسلیم نہیں کریں گے کہ قرآن بھی ایک آسمانی کتاب ہے - ہو گا یہ کہ مسلمان کفر کے فتوے دیں گے اور عیسائی مصنف ان کے علمی اور صلح پسندانہ خیالات کے ساتھہ اتفاق کرنے سے انکار کریں گے - خیر ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ دوسرے لوگ اس کتاب کو کس نظر سے دیکھیں گے - ہماری اپنی رائے یہ ہے کہ مصنف نے یہ کتاب لکھہ کر ایک بڑی علمی خدمت کی ہے - اس کتاب

کے پڑھنے سے مصنف کی رواداری نہ ذہنیت کا صاف طور پر اظہار ہوتا ہے - موصوف اپنے مذہب اسلام پر قایم رہنے کے ساتھہ ساتھہ اسلامی عقاید کی جس قدر بھی مسیحی تاویل ممکن ہے کرنے پر آمادہ ہیں - جہاں کہیں وہ حضرت مسیح کا ذکر کرتے ہیں تو بالکل اسی طرح کرتے ہیں جیسے کوئی عیسائی کریگا - اس کتاب میں جگہ جگہ آپ کو " حضرت عیسیٰ " " سیدنا عیسیٰ " کے الفاظ ملیں گے - خود قران میں بھی حضرت مسیح کے لئے " روح اللہ " کا لفظ استعمال ہوا ہے - اس کتاب کے دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں میں ایک طبقہ موجود ہے جو انجیل مقدس کو پڑھتا ہے اور اس کی تعلیمات کو قدر منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے - انجیل کی متعدد کتابوں کے اردو میں ترجمے موجود ہیں - آج کل " ڈاکٹر ماتھر " " مرزا پور " میں ایک مکمل ایڈیشن فارسی رسم خط میں تیار کر رہے ہیں - موصوف نے لاطینی حروف میں سنہ ۱۸۶۰ ع میں اس ترجمے کو شائع کیا ہے - لیکن اب مزید اصلاحات کے بعد وہ یہ دوسرا ایڈیشن تیار کر رہے ہیں جو لندن والے ایڈیشن کی طرح " انجمن اشاعت انجیل برطانیہ و ممالک غیر " کی طرف سے شائع ہوگا - حال میں صوبۂ شمال مغربی کے مشنریوں نے یہ تجویز منظور کی ہے کہ اردو زبان میں انجیل کا ایک ایسا ترجمہ تیار کرنا چاہئے جو تمام ہندوستان میں بے چوں و چرا تسلیم کیا جائے - مجھے اس میں ذرا شبہ ہے کہ آیا یہ تجویز عنقریب عملی جامہ پہن سکے گی —

حال میں جن مصنفین کی نئی مطبوعات شائع ہوئی ہیں ان میں مولوی کریم الدین کا نام سب سے پہلے قابل ذکر ہے - میں سمجھتا ہوں آپ سب ان کے نام سے واقف ہوں گے - موصوف نے اس سال چھہ تصانیف

شائع کی ہیں - لاہور کے " مسٹر رابرٹ کسٹ " کی عنایت کی بدولت یہ سب میرے پاس بھیجی گئی ہیں —

پہلی کتاب " تسہیل القواعد " اردو زبان کی ہے یہ صرف و نحو کی کتاب نئے طریقہ پر لکھی گئی ہے اور پنجاب کے مدارس میں رائج ہے - یہ کتاب اسی نوعیت کی ہے جیسے میری کتاب " ہندوستانی زبان کے مبادیات " ہے - آپ کو معلوم ہوگا کہ میں نے حال ہی میں اس کا ایک نیا ایڈیشن نکالا ہے —

دوسری کتاب " کریم اللغات " ہے - اس میں عربی اور فارسی الفاظ کے اردو میں معنی دئے ہیں - یہ کتاب پنڈت اجودھیا پرشاد کے زیر اہتمام طبع ہوئی ہے —

تیسری کتاب " انشائے اردو " ہے - اس کے چار حصے ہیں - پہلے حصے میں خط نویسی کے نمونے دئے ہیں جو بزرگ اور خرد ' خرد اور بزرگ اور ہم عمر اور ہم مرتبہ لوگوں کے درمیان ہونی چاہئے - دوسرے حصے میں عرائض نویسی کے نمونے ہیں - تیسرے حصے میں دفاتر اور عدالتوں کے خطوط کے نمونے ہیں - چوتھے حصے میں کاروباری خطوط کے نمونے ہیں —

اس کتاب میں سب ضروری معلومات خط و کتابت کے متعلق موجود ہیں - عمر ' رشتے ' اور رتبے کے لحاظ سے جو القاب و آداب ہندوستانی میں استعمال ہوتے ہیں وہ سب اس کتاب میں مصنف نے جمع کردئے ہیں * دوستوں کو لکھنے کے جو آداب ہیں وہ بھی سب بیان کئے ہیں

---

* یہاں القاب و آداب کے فرانسیسی ترجمے دئے ہیں —

اس کے علاوہ شیخ ' سید ' خان ' مغل ' منشی ' پنڈت اور سرکاری ملازموں کے القاب و آداب ہیں —

اسی قسم کی ایک کتاب ہندی میں بھی لاہور سے شائع ہوئی ہے - اس کا نام پتر ملک ہے —

ایک اور کتاب " پند سود مند " لاہور سے منشی محمد عظیم کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے اس میں قدیم اور جدید مصنفوں کے ڈیڑھ سو مقولے نقل کئے گئے ہیں - اس ڈیڑھ سو میں سو وہ نصائح ہیں جو لقمان نے اپنے بیٹے کو کی تھیں . ہندوستانی میں جو مقولے مروج ہیں وہ عام طور پر کہاوتیں ہیں * —

" لاہور " سے ایک اور کتاب نکلی ہے جس کا نام " خط تقدیر " ہے - یہ کتاب اخلاق پر ہے اگرچہ نثر میں ہے لیکن جا بجا اشعار ہیں - اس کتاب کے سرروق پر ایک شعر بطور طغری لکھا ہوا ہے † —

مولوی کریم الدین نے فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے دیوان حافظ کا ایک انتخاب شائع کیا ہے - اس کے علاوہ موصوف نے " سعدی " کا دیوان مع اس کی سوانح کے طبع کرایا ہے - یہ واضح رہے کہ دیوان " سعدی " کے کلکتہ والے ایڈیشن کے نسخے اب کم یاب ہوگئے ہیں اور اس کے اصل قلمی نسخے تو بالکل ہی نایاب ہیں —

---

* یہاں گارساں دتاسی نے چند مقولوں اور کہاوتوں کا فرانسیسی ترجمہ پیش کیا ہے —

† یہاں اس شعر کا فرانسیسی میں مطلب سمجھایا ہے کہ " تقدیر کی مثال موئے پریشان کی سی ہے جسے کنگھی سلجھاتی ہے " مطلب خبط سا ہے —

- ہندوستانی کی اور کتابیں جو مجھے ہندوستان سے بھیجی گئی ہیں ان میں سنہ ۱۸۶۳ ع کی ایک جنتری ہے - پنڈت سورج بھان نے اس کو لاہور سے شائع کیا ہے - پنڈت جی ہندوستانی کے مشہور انشا پردازوں میں ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اس جنتری میں بہت مفید معلومات درج ہیں شروع میں اکیس کالموں میں ہندوستان کے مروج عہدوں کے مطابق ہر ماہ کے دنوں کا حساب ہے - پھر چاند کے دن کا حساب دنوں کا مختلف موسموں میں طول' سورج اور چاند کے مختلف مہینوں میں طلوع ہونے کے اوقات وغیرہ درج ہیں ہر مہینے کو دو صفحوں پر ختم کیا ہے - پہلے صفحے پر مذکورہ تفصیلات ملتی ہیں اور دوسرے پر خاص خاص دنوں کا حال ہے - پھر مسیحی' اسلامی' فصلی' یزد جردی سنین اور نو روز' سمت وغیرہ کے متعلق معلومات جمع کی ہیں - پھر چاند کی گردش' منحوس ایام' مدارات کی تقسیم' اوقات کا تعین' ہوا کے رخوں کی پہچان' اندھیری کے پندرہ دنوں (بدی) اور چاندنی کے پندرہ دنوں (سدی) کے متعلق تفصیل ہے - منطقۃ البروج کی علامات اور ان کے سب " نام " فارسی اور دیو ناگری رسم الخط میں ہیں - ہاتھ دیکھ کر آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کرنے کے طریقے' وبا' اندھے پن اور زہریلے جانوروں کے کاٹنے کے علاج بھی بتائے ہیں —

میں تعزیرات کے ہندوستانی ترجمہ کی نسبت ذکر کرچکا ہوں - یہ کام مولوی عبد اللطیف خاں نے انجام دیا جن کا میں ابھی ذکر کرچکا ہوں - موصوف نے آر - کسٹ کی ایک کتاب " گنج سوالات قانون فوجداری " کے نام سے ترجمہ کیا ہے - یہ کتاب نہایت مفید ہے - اس کے علاوہ " پنجاب کا قانون دیوانی " " رہنمائے مجسٹریٹ " بھی قابل ذکر ہیں - آخرا لذکر " اسکپ وک " (Skip wick) کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے - اس

قسم کی اور بھی چند کتابیں شائع ہوئی ہیں سنہ ۶۲-۱۸۶۱ ع کی پنجاب کے نظم و نسق کی رپورٹ ہے - پنڈت اجودھیا پرشاد نے اس کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے - یہ رپورٹ ان لوگوں کے لئے اهمیت رکھتی ہے جو اس صوبے کے حالات سے ٹھیک ٹھیک واقفیت حاصل کرنا چاهتے ہیں - ' کپتان فلر ' نے اس صوبے کی تعلیمی رپورٹ انگریزی میں پیش کی تھی - اس کا بھی اردو ترجمہ لالہ رام جس نے کیا ہے - اور دوسرے بعض رسالے قابل ذکر ہیں جیسے " دستور العمل مدارس تعلیم المعلمین " " رسالۂ نظام شمسی " وغیرہ - هندی میں " حقایق الموجودات " (جسے چھوٹی سی دائرۃ المعارف سمجھنا چاهئے) اور " جامع الفغائس " کا اردو سے ترجمہ ہو گیا ہے —

نئی کتابوں میں عبدالواسع هنسوی اور دیوی پرشاد کی فارسی کی صرف و نحو قابل ذکر ہے - آخرالذکر ایک مشہور هندو عالم ہیں - بریلی کالج کے قدیم طالب علم ہیں - آج کل ضلع فرخ آباد میں انسپکٹر مدارس ہیں - موصوف نےضلع فرخ آباد کی اردو میں تاریخ لکھی ہے اور ایک کتاب ' مظہر قدرت " لکھی ہے جس میں مذہبی مسائل سے بحث کی ہے - موصوف نے حال ہی میں صرف و نحو کے علاوہ ایک لغت بھی لکھی ہے جس میں مختلف السنہ مثلاً ' اردو ' هندی ' فارسی ' عربی ' بنگالی اور انگریزی کے الفاظ کے معنی ہیں اور ساتھ ہی ان الفاظ کی مشق کے لئے مثالیں بھی دی ہیں —

مجھے حال میں دو هندی کتابوں کا حال معلوم ہوا ہے جن کے متعلق ذکر کرنا شاید آپ صاحبوں کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا - ایک " بھکتی بودک " ہے اور دوسری " سہسرا رتری سنکشیپ " ہے - اول الذکر میں سو مذہبی قصے ہیں - انہیں " جے پارسنز " نے ایک جگہ جمع کیا ہے - دوسری کتاب بنگالی کا ترجمہ ہے - یہ ترجمہ پنڈت بدری لال نے کیا ہے - موصوف هندی کی

متعدد کتابوں کے مصنف ھیں —

اس سال پہلی جنوری کو گورنمنٹ پنجاب کی طرف سے نئی مطبوعات کی جو فہرست شائع ھوئی ھے اس میں بعض کتابیں قابل ذکر ھیں ۔ اس ضمن میں میں آپ صاحبوں کو یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ھوں کہ اگر چہ صوبۂ پنجاب میں پنجابی بولی جاتی ھے لیکن سرکاری دفتروں اور مدارس میں ھندوستانی (اردو اور ھندی) استعمال ھوتی ھے —

اس فہرست کی بعض کتابیں یہ ھیں" جغرافیہ جہاں " " جام جہاں نما " " تاریخ عالم " " تاریخ اودھ " " تاریخ گوشۂ پنجاب "

میں نے جن کتابوں کے ابھی نام لئے ھیں ان میں تقریباً سب انگریزی زبان سے ترجمہ کی گئی ھیں ۔ در اصل یورپین لوگوں کے لئے یہ بات باعث فخر ھونی چاھئے کہ ان کی کتابیں ھندوستان میں وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ھیں اور ان کے ترجمے کئے جاتے ھیں ۔ چنانچہ 'ولسن' نے 'رگ‌وید' پر جو تمہید لکھی تھی اس کا شیوپرشاد نے ھندی میں ترجمہ کردیا ھے ۔ موصوف اس زمانہ کے مشہور انشاپردازوں میں ھیں اور تیس کتابوں کے مصنف ھیں ۔ وہ ھندی اور اردو دونو میں لکھتے ھیں ۔ انھوں نے سکھوں کے عروج و زوال کی تاریخ اور منو کے قوانین پر قلم فرسائی کی ھے ۔ اس کے علاوہ سنسکرت اور انگریزی زبان سے متعدد ترجمے کئے ھیں ۔ اس سال اور جو کتابیں شائع ھوئی ھیں ان کی فہرست یہ ھے ۔ " کورس اردو " " پندنامۂ عیال داران " " مفتاح القواعد " " کلید گنج مال " " زبدۃالحساب " اور ' ھدایت نامۂ جاگیرداران " —

میں نےآپ صاحبوں کے سامنے جن مطبوعات کا ذکر کیا ھے اس سے آپ پر یہ واضح ھوگیا ھوگا کہ ان کی بدولت اھل ھند میں تعلیم کا چرچا بڑھتا جا رھا ھے اور دن بدن

مغربی علوم میں اہل ہند ترقی کر رہے ہیں - یہ بات قابل افسوس ہے کہ اب تک بہت کم ہندوستانی اپنی تعلیمی تکمیل کی غرض سے یورپ آئے ہیں - اس میں مسلمانوں کے لئے تو کوئی دشواری نہیں ہے لیکن ہندوؤں کے لئے ولایت آنا بے دین ہونے کے مرادف سمجھا جاتا ہے - باوجود اس کے بعض ہندو ہمت کرکے سمندر پار آئے ہیں - مثلاً مہی پترم روپ رام * ہیں جنھوں نے ذات باہر ہونے کے خطرے کی مطلق پروا نہیں کی اسی طرح کلکتہ کے پریسیڈنسی کالج کے ایک طالبعلم بابو ستندرا ناتھہ ٹگور بھی انگلستان تعلیم کی غرض سے آئے اور سول سروس امتحان میں کامیاب ہوکر واپس گئے - موصوف آج کل " بمبئی میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ پر مامور ہیں —

ہندوستان بھر میں آج کل تین یونیورسٹیاں ہیں - ایک کلکتہ میں دوسری بمبئی میں اور تیسری مدراس میں - ان یونیورسٹیوں کے انتظامات نہایت عمدہ ہیں اور ان میں طلبہ کی ایک بڑی تعداد تعلیم پا رہی ہے - کلکتہ یونیورسٹی کو قائم ہوئے اب چھہ سال ہوئے ہیں - اس دوران میں ۲۲۵ طلبہ کا یونیورسٹی ڈگری کے لئے داخلہ ہوا ہے - گزشتہ دو سال میں تقریباً دوسو طالبعلم شعبۂ فنون میں کامیاب ہوئے - ان میں ۸۹ انٹرینس کے امتحان میں کامیاب ہوئے - مخصوص شعبوں میں ۲۰ سول میں اور ۲۱ طبابت میں اور ۲۷ وکالت میں کامیاب رہے یہ بات قابل توجہ ہے کہ ان امتحانات میں مسلمان ہندوؤں سے بہت پیچھے نظر آتے ہیں اور عیسائی بھی پیچھے ہیں —

گزشتہ سرکاری امتحانات میں ۱۳۳۴ امیدواروں نے شرکت کی - ان

* خطبہ ۲ دسمبر سنه ۱۸۶۱ ع —

میں سوله سے لے کر بیس سال کی عمر کے امیدواروں میں ۷۱ عیسائی اور ۴۶ مسلمانوں نے شرکت کی ان امتحانات میں صوبه سرحد لاهور اور کولمبو تک کے طلبۂ شرکت کرتے هیں - ان امتحانوں میں انگریزی کے علاوه ایک اور زبان لازمی هوتی هے - امیدوار کو اختیار هے که وه جونسی زبان چاهے منتخب کرے - چنانچه ۱۰۲ طالبعلموں نے هندوستانی کو منتخب کیا ' ۳۰ نے سنکرت کو اور ۶ نے فارسی کو —

ابتدائی تعلیم بهی دن بدن ترقی کررهی هے - صرف صوبه بنگال میں ۸۱۶ ابتدائی مدارس موجود هیں - ان مدارس میں تقریباً ۵۰ هزار طلبه تعلیم پا رهے هیں - صوبۂ بمبئی میں ۶۸۰ ابتدائی مدارس هیں اور ان میں ۳۶ هزار سات سو پچاس طلبه تعلیم پارهے هیں صوبه مدراس میں ۵۷۹ مدارس هیں جن میں ۲۳ هزار نوسو پچپنستهه طلبه هیں - صوبه جات شمال مغربی میں ' جهاں صرف هندوستانی بولی جاتی هے - تعلیم کی ترقی هورهی هے - ابتدائی مدارس کی تعداد ۱۰ هزار اسی هے جن میں طلبه کی تعداد ایک لاکهه ۷۴ هزار چهه سو اُناسی هے * —

آگره میں سنه ۱۸۵۰ ع میں ایک کالج قائم هوا هے جسے سینٹ جان کالج کهتے هیں - اس کالج میں نوجوان هندوؤں کو مغربی ادب اور علوم کی تعلیم دی جاتی هے - مسیحی رواداری کے اصول کے مطابق هر ذات کے هندو کا اس کالج میں داخله هوسکتا هے - اب تک کوئی خاص دشواری اس طرز عمل کی وجه سے نهیں پیش آئی تهی لیکن ابهی حال میں ایک شدر ذات کے لڑکے کو کالج میں داخل کرنے سے دقت پیش آرهی هے - یه لڑکا مهتر کا هے جس نے مسیحی مذهب قبول کر لیا هے - چنانچه بطور احتجاج

* Indian Mail ستمبر سنه ۱۸۶۳ ع

کالج کے ۲۰۰ ہندو طالب علموں نے علحدگی اختیار کرلی ہے - اس قسم کا کوئی واقعہ آگرہ کے دوسرے کالج میں جس کا نام وکٹوریہ کالج ہے' اب تک نہیں پیش آیا - اس کالج میں گذشتہ ستمبر میں ۳۵۱ طالب علم تھے - ان میں ۳۱۴ ہندو' ۲۵ مسلمان اور صرف ۱۲ عیسائی تھے - اس کالج میں مختلف درسوں کی تعداد ۳۵ ہے - ۱۸ کا تعلق شعبۂ انگریزی سے ہے اور ۱۷ کا شعبۂ مشرقی سے موخرالذکر میں ۱۱ ہندوستانی (اردو اور ہندی)' ۴ فارسی ' ایک عربی اور ایک سنسکرت کا درس ہوتا ہے* —

میری معلومات اودھ کی قدیم مملکت کے متعلق بہت محدود ہیں - اس کے بر خلاف پنجاب کے حالات دریافت کرنے کے لئے میرے پاس کافی مسالا موجود ہے - یہ پانچ دریاؤں کا وسیع علاقہ جو پندرہ سال قبل ایک زبردست آزاد مملکت کی حیثیت رکھتا تھا آج سلطنت برطانیہ کا ایک حصہ ہے اور تعلیمی لحاظ سے خوب ترقی کر رہا ہے - کیپٹن " فلر " نے حال هي میں جو تعلیمی رپورٹ پیش کی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۶۲ اور سنہ ۱۸۶۳ ع میں باوجود مالی حالت کی خرابی کے ۵۴ مدرسے اور نئے قایم ہوئے ہیں اور طلبہ کی تعداد میں ۷ ہزار پانچ سو دس کا اور اضافہ ہوا ہے - چنانچہ گزشتہ سال کے پہلی جنوری کے اعداد و شمار کے مطابق اس صوبہ میں ابتدائی مدارس کی تعداد دو ہزار چھتیس تک پہنچ چکی ہے اور طلبہ کی کل تعداد ۶۰ ہزار ہے - ان میں سے ۵ ہزار آٹھ سو چونتیس ہندوستانی کے ذریعہ سے انگریزی زبان سیکھ رہے ہیں - لڑکیوں کے مدارس کی تعداد ۱۰۳ ہے - ان میں

---

* Indian Mail — نومبر سنہ ۱۸۶۳ ع

تعلیم پانے والیوں کی تعداد ۲ هزار دو سو چوبیس هے گزشته سال کے مقابلے میں یه تعداد دگنی هے - ان مدارس کے علاوه معلموں کی تعلیم کے مدا رس هیں - " لاهور " میں معلموں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک کالج قایم هوا هے جس میں تعلیم پانے والوں کی تعداد دو سو هے —

" لاهور " کا میڈیکل کالج بہت اچھی حالت میں هے - گزشته سال اس میں ۵۰ طالب علم تھے جن میں سے ۳۰ نے جولائی میں اپنی تعلیم کی تکمیل کرلی هوگی —

" بمبئی " کا صوبه تعلیمی ترقی میں کسی طرح دوسرے صوبوں سے پیچھے نہیں هے - " بمبئی " یونیورسٹی کے پاس اس وقت (Haileybury) کالج کا پورا کتب خانه آگیا هے - اس کتب خانے سے مشرقی علوم کی تحقیق میں بہت مدد ملے گی - " کاوس جی جہانگیر " نے' جو " بمبئی " کے ایک متمول پارسی هیں اور جنهیں انگریز لوگ ان کی دولت کے باعث " نقده " (Ready Money) کے نام سے موسوم کرتے هیں' اس یونیورسٹی کی عمارتوں کے لئے ایک لاکھه روپیه کی رقم بطور عطیه دی هے - موصوف نے مبلغ ۵ هزار روپے کا انعام اس پارسی بیر سٹر کے لئے مقرر کیا هے جو بمبئی هائی کورٹ میں امتیاز حا صل کرے گا —

" بمبئی " میں هندوستانی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے جو انگریزی مدرسه قایم هوا هے اس کا نام " "Alexandra Native Girls' English Institution" هے - اس کا افتتاح گزشته سال پهلی ستمبر کو هوا - یه مدرسه "مانک جی کرست جی " کے مکان میں واقع هے - همیں توقع هے که چار هزار روپے کے علاوه جو اس متخیر اور فیاض شخص نے دئے هیں اس کے اور دوسرے

احباب بھی مالی امداد کریں گے تا کہ اس مدرسے کی اپنی عمارت علحدہ بن جائے —

ایک اور پارسی ھیں جنھوں نے لڑکیوں کی انگریزی تعلیم کے لئے چار ہزار روپے کی رقم عطا کی ھے اور ایک دوسرے شخص نے چار ہزار کی رقم سنسکرت مدرسہ کے لئے دی ھے - دو پارسیوں نے مل کر ' بمبئی ' یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ۵ ہزار روپے دئے ھیں اس رقم سے سالانہ ایک سونے کا تمغہ اس طالبعلم کو دیا جائیگا جو بہترین مضمون " ھندوستان میں مغربی علوم " پر لکھے گا - " جمشید جی جی جی بھائی " نے ' پونا ' میں ایک کالج قایم کرنے کے لئے ایک لاکھ کا عطیہ دیا ھے - دو اور پارسی ھیں جنھوں نے مل کر ایک لاکھ کا وعدہ کیا ھے - ایک اور پارسی ھیں جنھوں نے گجرات میں تعلیمی ترقی کے لئے ۵۰ ہزار کی رقم کا عطیہ دیا ھے —

آج کل ھندوستان میں فوٹو گرافی کا ہر جگہ رواج ہو رہا ھے - ھندوستانی لوگ اس کے اصول اور طریقے بڑے شوق سے سیکھہ رہے ھیں - ' الہ آباد ' گزٹ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ' رڑکی ' کے تھومسن کالج میں ایک ماہر فوٹو گرافی بھی رکھا جائیگا تا کہ وہ دیسی طلبہ کو اس کے اصول و مبادیات سکھائے - غرض کہ ھندوستان کے گوشے گوشے میں فوٹو گرافی کا چرچا ھے - ' ٹراونکور ' میں ' ڈبلوٹیلر ' کی کتاب ' قدیم ھند کی عمارتیں ' سنگتراشی اور مصوری ' کو باتصویر شائع کیا گیا ھے - ' ڈبلوٹیلر ' کو اس کتاب پر راجہ ' ٹراونکور ' کی طرف سے انعام بھی مل چکا ھے —

ھندوستانیوں میں یوروپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جاتا ھے اُسی قدر وہ ہمارے تہذیب و تمدن اور ہمارے اصول مذہبی سے قریب تر ہوتے جاتے ھیں - ھندوستان میں تبلیغ مسیحیت کو جو کامیابی حاصل ہو رہی

ہے اس سے ہر عیسائی کو خوشی ہونی چاھئے * 'جامی' نے اپنی 'یوسف زلیخا' میں ایک جگہ کہا ہے کہ 'سچائی کو دن دونی ترقی اور فروغ ہوتا ہے'۔ کیتھو لک مجبوراً اپنی عبادت ہندوستانی گرجوں میں بھی لاطینی زبان میں کرتے ہیں لیکن 'پروٹسٹنٹ' اور 'انگلی کن' ہندوستانی اور دوسری مقامی زبانوں میں اپنی عبادت کی دعائیں پڑھتے ہیں۔ انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہندوستانی زبان میں انگریزی دعاؤں کی لے کو منتقل کرلیں لیکن یہ انگریزی لے ہندوستانی لوگوں کو ذرا نہیں بھاتی۔ بعض مشنری یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستانی راگوں کے مطابق اپنی دعاؤں کو ادا کریں اور ایک حد تک انھیں اس میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ ہندوستانی راگوں کو جو قدیم زمانے سے ہندوستان میں چلے آ رہے ہیں' یوروپین علامات میں لکھ لیا گیا ہے۔ ان راگوں کے متعلق دیسی ماہرین موسیقی سے پوری معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے گیتوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ † ہندوستانی موسیقی میں تحریری علامات نہیں استعمال ہوتیں۔ ان راگوں کو یوروپین علامات کے ذریعہ تحریر کیا گیا ہے ان میں سے بعض راگ تو خاص طور پر اسی کے لئے موزوں کئے گئے ہیں لیکن بیشتر ان میں وہ ہیں جو ہندوؤں میں قدیم زمانہ سے چلے آتے ہیں۔ یہ دن' سال اور موسموں کے لحاظ سے ہوتے ہیں اور

---

* دیکھو ۲ جون سنہ ۱۸۶۳ ع کے Indian Mail میں "of Indian Missions" "Statisticallables" از ڈاکٹر " سلنز "

* بنارس - سنہ ۱۸۶۱ ع - "The Hindustani Choral Book" جے پارسن جے کرسچین اور " ایچ کالنس " نے اس کتاب کو تیار کیا ہے - ہندوستانی میں " سور سنگرا " قابل ذکر ہے - مجھے یہ کتابیں ' ناذت ' کے موسیولیون بھورو نے بھیجی ہیں -

ان کے نام الگ الگ ہیں - مسلمانی گیت ہندو گیتوں سے مختلف ہوتے ہیں - ان میں سے بعض شجاعت علی خاں کے توسط سے حاصل ہوئے ہیں - موصوف پہلے مسلمان تھے اور اب مسیحی دین قبول کر لیا ہے - آج کل وہ کلکتہ کے دیسی گرجے میں پادری کی حیثیت سے کام کرتے ہیں - ہندو اور مسلمانوں کے گیتوں میں نہ صرف راگ اور سر کا فرق ہوتا ہے بلکہ ان کا اتار چڑھاؤ بالکل مختلف ہوتا ہے - ہندوؤں کے گیتوں میں اشعار کو اجزائے لفظی کی مقدار سے موزوں کرتے ہیں جیسے یونانی یا لاطینی میں اور مسلمانی گیتوں میں اجزائے لفظی کی تعداد کا لحاظ کیا جاتا ہے - یہ دوسرا طریقہ زیادہ سادہ ہے *

انگریزی مشن جو ہندوستان میں کام کر رہے ہیں انھیں خوب کامیابی ہو رہی ہے اور ہر روز ہندوستان میں مسیحی دین کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے - ۱۸۹۲ ع میں بنگال ، صوبہ شمالی مغربی ، صوبہ بمبئی اور صوبہ مدراس میں عیسائیوں کی کل تعداد ایک لاکھ اٹھارہ ہزار آٹھ سو نوے تھی - مشنریوں کی تعداد جو تبلیغی کام کررہے تھے ۴۱۸ تھی اور کل ہندوستان میں ۸۹۰ کلیسا تھے - گزشتہ سال جولائی کے مہینے میں ایک یورپین سیاح "دھلی" کے دیسی کلیسا میں اتفاق سے پہنچ گیا تھا - اس نے بیان کیا ہے کہ اس نے وہاں عبادت میں شرکت کی - عبادت کی دعائیں اردو میں تھیں - اس کا بیان ہے کہ اس کلیسا کے ذریعہ سے انجیل مقدس کی نشرو اشاعت کا جو کام ہوتا ہے اس میں دیسی لوگ ، مرد ، عورتیں اور بچے شرکت کرتے ہیں اور دعاؤں کو گا گا کر پڑھتے ہیں - چھوٹا ناگپور میں " رانچی " کے کلیسا کے متعلق

* دیکھو میری کتاب "Rhetorique et prosodie de langues de l'orient Musulman "

بھی ایک دوسرے سیاح نے یہی بیان کیا ھے - فرق اتنا ھے کہ " رانچی " میں دعائیں ھندی میں پڑھی جاتی ھیں - * " امرتسر " میں کلیساء کی دیواروں پر حضرت مسیح کے " دس احکام " اور انجیل مقدس کے بعض دوسرے حصے ھندوستانی میں لکھے ھوئے گئے ھیں - صوبہ شمال مغربی کے دوسرے شہروں کا بھی بعینہ یہی حال ھے - ھر کہیں ھندوستانی زبان میں کلیسا کی دعائیں پڑھی جاتی ھیں —

گزشتہ سال ۳ مئی کو لندن میں " انجمن برائے اشاعت علم مسیحی " کی طرف سے جو جلسہ ھوا تھا اس میں ھندوستا ن کے ان مسیحی مدارس کے متعلق بہت دلچسپ تفصیلات بیان کی گئی ھیں جن میں ھندو اور مسلمانوں کے بچے بلا تکلف تعلیم حاصل کرتے ھیں " شملہ " اور " جبل پور " میں حال ھی میں اس قسم کے مسیحی مدارس کھولے گئے ھیں - کلکتہ کے اسقف اور صوبجات متوسط کے ناظم تعلیمات نے " جبل پور " کے طلبہ کا امتحان لیا اور ان دونوں کا خیال ھے کہ ان کے جوابات قابل اطمینان تھے - اس طرح " ناگپور " کا مدرسہ بھی خوب ترقی پر ھے - " لندن " کے اس جلسہ میں کلکتہ کے اسقف کا ایک خط پڑھا گیا جس میں مذکور تھا کہ میں نے آگرہ ' الہ آباد ' " بھاگل پور " " کانپور " اور " بنارس " کے کلیساؤں میں ھندوستانی زبان میں بپتسما کی رسم ادا کی - پھر بنارس کے ایک دیسی مسیحی مبلغ کا ذکر کیا ھے جو چار سال سے کلیسا کے ایک ادنی عہدہ پر کام کر رھا ھے اور چونکہ اس کا کام قابل ستایش رھا ھے اس واسطے اس کو " واعظ " کے عہدہ پر ممتاز کر دیا گیا —

ھندوستان میں ان مسلمانوں کی تعداد بہت کم ھے جنھوں نے مسیحی

---

* دیکھو " Colonial church chronicle " ماہ اگست اور دسمبر سنہ ۱۸۶۳ ع —

دین قبول کیا - بقول مور (Moore) :

جب کسی کٹر آدمی کا اعتقاد باطل عقیدہ پر جم جائے اور وہ اسے محبوب رکھنے لگے تو آخر تک وہ اس پر قائم رہتا ہے " —

بدقسمتی سے خود عیسائیوں میں جو باہم اختلافات ہیں ان کا ایشیائی لوگوں کی ذہینیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے - اگر یہ اختلافات ہندوستان میں رونما نہ ہوئے ہوتے تو آج مسیحی حلقہ زیادہ وسیع نظر آتا - ڈاکٹر " کولنسو " نے حال میں انجیل کی تعلیم پر جو افسوس ناک حملہ کیا ہے اس کا بھی بہت برا اثر پڑا - ڈاکٹر " کولنسو " کلیسا سے باغی ہوگئے ہیں - بدقسمتی سے وہ ہندوستان میں بہت شہرت رکھتے ہیں - انھوں نے علم الحساب کی متعدد کتابیں لکھی ہیں جو بہت مقبول ہوئی ہیں - چنانچہ اس ضمن میں " کلکتہ " کا اخبار " بنگالی " کہتا ہے کہ جب کہ مسیحی تعلیم کے متعلق خود مشہور اہل یورپ کو شبہ ہے تو اس صورت میں ہندوؤں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے دین کو ترک کر کے عیسائی مذہب قبول کرلیں گے نہایت مہمل بات ہے - لیکن اس اخبار کے لکھنے والے کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ ڈاکٹر " کولنسو " ممکن ہے ماہر علم حساب کی حیثیت سے لائق فائق ہوں لیکن علم دینیات میں وہ ماہر نہیں ہوسکتے - انھوں نے انجیل کی تعلیم پر جو اعتراضات کئے ہیں ان میں انھوں نے کوئی نئی بات نہیں کہی - سیکڑوں مرتبہ ان اعتراضات کے جوابات دئے جاچکے ہیں - یہ نہایت تعجب انگیز امر ہے کہ ڈاکٹر " کولنسو " کے اعتراضات کا جواب ہمیں سید احمد کی شرح میں ملتا ہے جس کی نسبت میں ابھی تھوڑی دیر ہوئی ذکر کرچکا ہوں - سید احمد نے بنی اسرائیل کی آبادی بڑھنے اور " مصر " میں juda اور حضرت یوسف

کے زمانہ کے متعلق جو نکات پیدا کئے ھیں ان میں ڈاکٹر " کولنسو " کے اعتراضات کا شافی جواب پایا جاتا ھے —

ھندو اگر چہ اپنے مذھب کے معاملے میں نہایت قدامت پرست واقع ھوئے ھیں لیکن یورپین اور مسیحی تہذیب کا ان پر بہت اثر پڑرھا ھے - اب آھستہ آھستہ وہ اپنے آپ ان رسوم کو ترک کرتے جارھے ھیں جو مسیحی معیار سے معیوب ھیں - چنانچہ بنگال کے بعض معزز ھندوؤں نے گورنر جنرل اور مجلس وضع قوانین کے سامنے ایک عرضداشت پیش کی ھے جس میں یہ استدعا کی ھے کہ تعداد ازدواج کو اسی طرح ھندوؤں میں قانوناً ممنوع قرار دیا جائے جس طرح ستی کی رسم ممنوع کردی گئی ھے - مجلس وضع قوانین کے آئندہ جلسے میں راجہ دیونرائن سنگھہ ایک قرار داد پیش کرنے والے ھیں جس کی روسے اس مشرقی رسم قبیحہ کا کلی انسداد متصور ھے - یقیناً یہ بہت اچھا ھو اگر اس قسم کا قانون منظور ھوجائے لیکن اندیشہ یہ ھے کہ کہیں اس قانون سے لوگوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے - اس قسم کا قانون ایک عام مروجہ رسم کے بالکل خلاف ھوگا - جن مشنریوں کو ھندوؤں کو بپتسما دینا ھوتا ھے انھیں اس میں بڑی سہولت ھو جائیگی - اس لئے کہ مشنری ایسے لوگوں کو بپتسما کردینے میں تامل کرتے ھیں جن کی متعدد بیویاں ھوتی ھیں —

ھندوستان میں جن لوگوں کو بنی نوع انسان کے ساتھہ ھمدردی ھے وہ جس طرح بیواؤں کے جلانے اور تعداد ازدواج کی مخالفت کر رھے ھیں اسی طرح اور بہت ساری رسوم قبیحہ ھیں جنھیں وہ حقوق نسوان کے لئے نقصان رساں سمجھتے ھیں - مثال کے طور پر ایک رسم کو لیجئے جو در اصل ھندوؤں کی رسم ھے لیکن ھندوستان کے مسلمانوں میں بھی وہ

عام طور پر رائج ہوگئی ہے - ہماری مراد ہے عقد بیوگان کی ممانعت سے - چنانچہ شاہجہانپور میں ایک انجمن قایم ہوئی ہے جس کے ارکان میں ہندو اور مسلمان دونو شامل ہیں - اس انجمن کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں جو بری رسمیں پائی جاتی ہیں ان کی اصلاح کی جائے - اس انجمن کے گزشتہ اجلاس میں جو قرار داد منظور ہوئی ہے اس میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے کہ ارکان انجمن اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنائیں اور 'قاضی سر فراز علی' کو اس کے لئے خاص طور پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ ایک دستور العمل لکھیں جس میں پردہ نشین خواتین کو بتلایا جائے کہ کون کون سی نقصان رساں رسموں کی پابندی کے لئے وہ مجبور کی جاتی ہیں —

آپ حضرات مجھے معاف کریں کہ میں نے بعض مسائل کو بہت طول دے دیا - اب میں اپنے خطبے کو ختم کرنے سے پیشتر ان اصحاب کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو اس سال راهی ملک عدم ہوئے ہیں —

سب سے پہلے بادشاہ دهلي بہادر شاہ کا نام آتا ہے - مرحوم نے ۷ نومبر سنہ ۱۸۶۲ ع بمقام 'رنگون' تقریباً ۹۰ سال کي عمر میں داعی' اجل کو لبیک کہا - آپ سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم کے بعد سے برابر اپنی باوفا بیوی زینت محل کے ساتھہ 'رنگون' میں زندگی بسر کر رهے تھے - آپ کے ساتھہ آپ کے صاحبزادے جواں بخت بھی تھے - * محمد بہادر شاہ ثانی غازی سنہ ۱۸۳۷ ع میں سراج الدین کے لقب سے اپنے والد ماجد اکبر شاہ ثانی کے انتقال پر تخت دهلی پر جلوہ افروز ہوئے - بادشاہ ہونے سے قبل آپ مرزا محمد علی ظفر کے نام سے مشہور تھے - 'ظفر کی یاد بہت سے دلوں

---

* میں نے اپنے ۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۵۷ ع کے خطبے میں بادشاہ دهلی کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں —

کو عزیز ھے - وہ تیموری خاندان کے آخری چراغ تھے - قسمت نے ان کے ساتھہ یاوری نہ کی - ادب کے شائقین کو ان کے ساتھہ اور بھی لگاؤ ہونا چاھئے اس واسطے کہ وہ نہایت اعلی پایہ کے شاعر تھے * -

پچھلے اگست کی پہلی کو لندن میں مہارانی "چند کلور" کا انتقال ھوگیا - وہ پنجاب کے مہاراجہ دلیپ سنگھہ کی والدہ تھیں - باوجود اس کے کہ ان کے صاحبزادے دلیپ سنگھہ نے مسیحی دین قبول کرلیا لیکن مہارانی آخری دم تک اپنے آبا و اجداد کے مذھب پر قائم رھیں - ان کے انتقال پر دو سکھہ افسروں نے احتجاج کی کہ ان کی نعش کو جلایا جائے اور راکھہ کو ھندوستان بھیجا جائے تاکہ سکھہ دھرم کے مطابق وہ گنگا میں ڈالی جائے - لیکن یہ نہیں ھوا ان کے بیٹے " مہاراجہ دلیپ " نے اس کا اهتمام کیا کہ اس موقع پر کوئی رسم نہ برتی جائے نہ مسیحی اور نہ ھندو -

پچھلے اگست کی ۲۱ تاریخ کو نواب سورت میر جعفر علی خاں بھی ملک عدم کوسدھار گئے - ان کا انتقال " سورت محل " (Surat palace) میں ھوا - ان کے ساتھہ ان کے دیرینہ رفیق مرزا لطف الله رھا کرتے تھے - موصوف اپنی " خود نوشت " کے باعث یورپ میں اچھی خاصی شہرت حاصل کر چکے ھیں - نواب مرحوم انگریزوں اور ھندوستانیوں دونوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے - وہ ایک نہایت ھی منکسر اور فیاض شخص تھے - آپ پہلی مرتبہ سنہ ۱۸۴۴ ع میں انگلستان تشریف لائے تھے - پھر دوبارہ سنہ ۱۸۵۳ ع میں آئے تھے - اس مرتبہ پیرس بھی آئے تھے - پیرس میں بعض لوگوں نے انھیں دیکھہ کر کہا تھا کہ وہ ٹیپو سلطان سے بہت مشابہ ھیں - مرحوم سے میری متعدد بار ملاقاتیں رھیں آپ نے

* یہاں ظفر کے بعض اشعار کا فرانسیسی ترجمہ ھے -

مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ سورت واپس ہونے پر اپنا سفر نامۂ یورپ شائع کریں گے - میں سمجھتا ہوں غالباً وہ اپنے اس ارادہ کو پورا نہ کر سکے * -

آخر میں میں " جان ویٹلی " کے انتقال پر ملال کا ذکر کرتا ہوں - آپ " مالی معاملات " کے مصنف تھے - اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ ہوچکا ہے اور میں گزشتہ سال اس کا ذکر کرچکا ہوں - آپ " ڈبلن " کے مہا پادری (Archeveque) تھے آپ کا انتقال پچھلے اکتوبر میں ۸ تاریخ کو ہوا - ان کی ایک مشہور کتاب (Lessons on christian evidences) ہے - اس کتاب میں فلسفہ اور دینیات دونوں کے مسائل سے بحث کی ہے - یہ کتاب لارڈ " سمر " کی (Evidencey of christianity) سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے جو خود ایک زمانے میں " ڈبلن " کے مہا پادری رہ چکے تھے - اس آخر الذکر کتاب کا موسیو " مار سلین فرسن " ممبر کونسل نے نہایت شگفتہ فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے † —

ہم لوگوں کو جنھیں ہندوستانی علوم سے دلچسپی ہے خود بخود ہندوستانیوں کے ساتھ بھی ایک طرح کا لگاؤ پیدا ہو گیا ہے - اس بات میں ہم سب سر چارلس وڈ کے نمونے پر عمل کر رہے ہیں - موصوف

---

* ملاحظ ہو نواب صاحب مرحوم کا خط جو جنوری سنہ ۱۸۵۵ ع کے (Revuede l' Orient) میں شائع ہوا ہے —

† یہ خطبہ چھپنے کے لئے دیا جا چکا تھا جب کہ مجھے اطلاع ملی کہ لارڈ ایلجن کا بمقام دھرم سالہ ۲۰ نومبر انتقال ہوگیا اور ان کی جگہہ سرجان لارنس کام کر رہے ہیں —

وزیر ہند ہیں اور ہندستانیوں کے بھی خواہ ہیں - آپ نے اعلان کیا ہے کہ انگریزی حکومت کے پیش نظر ہندوستان میں ہمیشہ یہ اصول رہے گا کہ ۱۸ کڑور مخلوق کے نفع کا خیال رکھا جائے تاکہ تاج برطانیہ کے سایۂ عاطفت میں جو لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں انہیں خوش حالی نصیب ہو - شاہی اعلان بھی اس اصول پر مبنی تھا - انگریزی عملداری میں ہندو، مسلمان، عیسائی سب کے لئے یکساں قوانین ہوں گے اور کسی قسم کے امتیازات کا لحاظ نہیں کیا جائیگا - ہندوستان میں ایک انجمن قایم ہوئی ہے جس کا نام "برطانوی ہندی انجمن" (British Indian Association) ہے - اس انجمن نے ہندوستانی میں اور دوسری مقامی زبانوں میں اس خیال کی نشر واشاعت کو اپنا مقصد ٹھیرایا ہے کہ انگریزی عملداری کے فوائد و برکات سے ہندوستانیوں کو آگاہ کرے - ابھی حال ہی میں کلکتہ میں اس انجمن کا ایک اجلاس ہوا تھا جس میں "راجہ رادھا کنت دیو" بہادر نے صدارت فرمائی تھی - اس جلسہ میں "سر چارلس وڈ" کی رعایا نوازی پر تشکر کا اظہار کیا گیا - راجہ صاحب ایک نہایت فاضل شخص ہیں - اس موقع پر "راجہ کالی کرشن" نے حسب معمول اردو میں تقریر کی اور "سر چارلس" کی تعریف کی کہ انہوں نے ہندوستانیوں کو اس کا موقع دیا کہ وہ مجسٹریٹ کے عہدہ پر پہنچیں اور ملکی نظم و نسق کے اعلیٰ مراتب حاصل کریں - اور دوسرے متعدد لوگوں نے راجہ صاحب کے خیالات کی تائید میں تقریریں کیں اور صاحب وزیر ہند کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کئے جانے کی قرارداد منظور ہوئی —

میں نے آپ صاحبوں کے سامنے ابھی جو واقعات پیش کئے ان سے یقیناً یہ امید بندھتی ہے کہ ہندوستان جو دنیا کے بہترین ملکوں میں سے ہے

مسیحی تہذیب کی بدولت خواب غفلت سے بیدار ہوگا - دن بدن اس کے ادب کو فروغ ہو گا - درا صل ادب کا نشو و نما شروع ہو گیا ہے اور ہمیں پوری توقع ہے کہ جس طرح آج سارا یورپ اس کے قدیم ادبی شہکاروں کی تعریف میں رطب اللسان ہے اسی طرح وہ دن بھی عنقریب آنے والا ہے جب کہ اس کا موجودہ ادب بھی دنیا سے خراج تحسین حاصل کرے گا —

پو چوی

از

(جناب محمد شرف عالم صاحب آرزو جلهلی -

ایم - ایس سی ریسرچ اسکالر راونشا کالج ' کٹک)

' پو چوئی ' ملک چین کا جلیل القدر شاعر شہر ' تائی ' ' یوان ' صوبہ " شانسی " میں پیدا ہوا - ایام طفولیت میں اُس کا قیام زیادہ تر شہر " جنگ یانگ " صوبہ " ہونان " میں رہا - اُس کا باپ درجۂ دوم کا مجسٹریٹ تھا - اُس کا خاندان بہت غریب تھا اور تکلیف و مصیبت سے دست و گریباں رہتا تھا —

" پو " نے سنہ ۸۰۱ ع میں " چانگ آن " میں مستقل بود و باش اختیار کر لی - یہ شہر شمالی مغربی محاذ پر تھا اور ملک کا سیاسی دارالسلطنت تھا - شہر " لویانگ " جو مشرق میں تھا اور جس کی آب و ہوا معتدل تھی - چین کا معاشرتی دارالسلطنت تھا —

سنہ ۸۰۴ ع میں ' پو ' کے باپ کا انتقال ہو گیا اور سنہ ۸۱۱ ع میں اُس کی ماں بھی اس دارفانی سے کوچ کر گئی - سنہ ۸۱۴ ع میں ' پو ' حکام کے غیض و غضب کا شکار ہو گیا - اُس نے دو میمو ریل لکھے تھے جس میں حکومت کی بعض جارحانہ کارروایوں کو جو تا تاریوں کے چھوٹنے سے

گروہ کو زیر کرنے کے لئے کی گئی تھیں - نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا - اُس نے چند نظمیں بھی لکھیں جس میں حکام کے مظالم اور عوم‌الناس کی مصیبتوں کا نقشہ کھینچا تھا - اتفاق سے عین اسی زمانہ میں وزیراعظم " وُوپو اُن هینگ " کو انقلاب پسند جماعت کے لیڈر " وو لوان چی " نے دن دھاڑے قتل کردیا - " پو " نے بادشاہ کے نام عرضی لکھی اور ملک کی بے چینی کو دفع کر نے کی درخواست کی - اس وقت " پو " شاهزادوں کے استاد کا نائب ناظم تھا - اُس کو اس قسم کی عرضی دینے کا حق نہیں حاصل تھا - دشمنوں کو اُس کے خلات یہ موقعہ غنیمت مل گیا - انهوں نے ایک اور جرم " پو " پر عاید کیا - " پو " کی ماں کنویں میں گر کر مری تھی - کسی کنویں کے کنارے وہ پھولوں کو دیکھ کر محظوظ هورهی تھی کہ عالم محویت میں اُس کے پاؤں پھسل گئے تھے - " پو " نے اس کی وفات کے بعد دو نظمیں لکھیں - " پھولوں کی تعریف " میں اور "نیا کنواں "- پو کے دشمنوں نے اُس پر یہ جرم عاید کیا کہ ایسی نظمیں لکھ کر " پو " نے اپنی مُردہ ماں کے ساتھ گستاخی کی - اس کا نتیجہ یہ هوا کہ " پو " کو جلا وطن کر کے " لیو کیانگ " میں کسی معمولی عہدہ پر سر فراز کیا گیا - تین سال کے بعد اُس کو " چُو نگ چُو " کی گورنری ملی جو اس کے وطن سے بہت دور تھا - " چُونگ چُو " دلفریب باغوں اور خوش نماپھولوں کے لئے مشہور تھا - " پو " کو اِس شہر کے دلکش قدرتی مناظر بھا گئے - سنہ ۸۱۹ ع میں وہ دارلسلطنت کو واپس بلالیا گیا اور دوسرے درجہ کا نائب ناظم بحال هوا - سنہ ۸۲۱ م میں شہنشاہ " مو سنگ " تخت نشیں هوا - اُس کی مطلق العنا نی نے مُلک کے شمالی مغربی گوشہ میں بغاوت پھیلا دی - " چوئی " نے بادشاہ سے اپنا طرز عمل بدلنے کی استدعا کی - جس کا نتیجہ یہ هوا کہ وہ پھر

دارالسلطنت سے ھٹا دیا گیا اور اس دفعہ " ھینگ چو " کا گورنر مقرر ھوا - سنہ ۸۲۴ ع میں اُس کی گورنری کا زمانہ ختم ھوگیا اور شہر " لویانگ " کے قریب ایک دیہات " بی تاؤلی " میں اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگا - موسیقی اور رقص سے وہ اپنا دل بہلایا کرتا تھا —

سنہ ۸۲۵ ع میں وہ " سو چو " کا گورنر ھوگیا - اس وقت اس کا سن ترپن سال کا تھا - مگر یہاں اُس کا شباب از سرنو بیدار ھوگیا تھا - وہ ھمیشہ دعوتوں اور مجلسوں میں مشغول رھتا - دو سال کے بعد صحت خراب ھو جانے کی وجہ سے اُس کو یہ جگہ چھوڑ دینی پڑی - اس کے بعد وہ دارالسلطنت میں متفرق عہدوں پر معمور رھا - سنہ ۸۲۹ ع میں وہ " ھونان " کا گورنر ھوگیا —

اس کے بعد تیرہ سال تک وہ معمولی عہدوں پر جابجا معمور رھا - لیکن اب وہ دنیا کے ھنگا موں سے علیحدہ رھنے کی کوشش کررھا تھا - سنہ ۸۳۲ ع میں اُس نے خانقاہ " سیانگ شان " کو مرمت کرایا اور وھیں رھنے لگا - یہ خانقاہ ' مینگ مین " میں تھی جو " لویانگ " سے تھوڑے فاصلہ پر جنوب کی جانب تھا - یہاں دلچسپی کے لئے وہ اپنا روز نامچہ لکھنے لگا - سنہ ۸۳۹ ع کے موسم سرما میں اُس کا بایاں پاؤں فالج کا شکار ھوگیا - چند مہینوں کے بعد وہ اس قابل ھوا کہ لوگوں کے سہارے سے باغ وغیرہ کی سیر کر سکے —

" پو " کی زندگی کا باقی حصہ اپنی مکمل تصانیف کو ترتیب دینے میں صرف ھوا - سنہ ۸۴۶ ع میں اُس نے انتقال کیا اور یہ وصیت کی کہ اُس کا جنازہ شان و شوکت سے نہ نکالا جائے اور اُس کی لاش " سیانگ شان " کی خانقاہ میں دفن کی جائے —

پوچوئی کے دوست

چینی شاعری کا دارو مدار " دوستی " پر ہے - ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی دوست ضرور ہوتا ہے جس کا تذکرہ وہ اپنی نظموں میں کیا کرتا ہے - " پو " کے دوستوں میں سب سے ممتاز " یوان چین " تھا - ان دونوں میں غالباً سنہ ۸۰۲ ع سے دوستی شروع ہوئی - " پو " کا بیان ہے کہ دوستوں کی تلاش میں اُسے بہت دقت ہوتی تھی - کیونکہ وہ شطرنج یا چوسر وغیرہ سے نہیں واقف تھا جن کے ذریعہ لوگوں سے ملنے جلنے کا زیادہ موقع ملتا - زمانۂ دراز کے بعد اُس نے تین اور دوست حاصل کئے جن سے زندگی بھر ربط قائم رہا - ان میں سے ایک " لیویو سوی " عرف " مینگ تی " شاعر تھا - باقی دو حکام تھے - " لی چین " اور " سوئی سواں لہانگ " —

سنہ ۸۰۵ ع میں " یوان چین " کسی درباری افسر سے اظہار خود داری کرنے پر ، جلا وطن کر دیا گیا - " پو " نے اُس کی جدائی سے متاثر ہوکر حسب ذیل نظم لکھی :—

" میں شہر کی سڑکوں پر نظر دوڑاتا ہوں
سرخ سڑکیں اور اُن کے کنارے سبز اشجار -
مجھے صرف گاڑیاں گھوڑے ، اور سوار نظر آتے ہیں -
میں اُنھیں نہیں پاتا جن کے لئے میرا دل بیقرار ہے -
' کنگ تان ' شہر ' لویانگ ' میں انتقال کر گیا -
اور ' یوان چن ' جلا وطن کرکے ' چنگ من ' بھیجدیا گیا -
ان سبھوں میں جو شمالی جنوبی سڑکوں پر چلتے ہیں -
ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جس کی قدر میں دوسروں سے زیادہ کرتا -"

سنہ ۸۲۱ ع میں ' یوان چن ' ' چنگ سن ' سے واپس اگیا اور پھر ' پو ' کی زندگی خوشگوار ہو گئی - ' یوان چن ' سنہ ۸۳۱ ع میں انتقال کر گیا —

پو کی شاعری

' پو ' کا کلام عام فہم اور سلیس ہے - الفاظ اور محاورں کی سلاست اور شستگی کے لئے وہ مشہور ہے - کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی نظمیں کسی بوڑھی کسان پیشہ عورت کو سنایا کرتا تھا ' اور جو الفاظ اُس عورت کی سمجھ میں نہیں آتے انہیں بدل دیتا تھا - اس کے ہمعصروں کی نظموں میں مرصع الفاظ کا استعمال زیادہ ہے —

' کانفیو کیس ' کی طرح ' پو ' کا خیال تھا کہ کسی فن کا حقیقی مقصد صرف تعلیم دینا ہے - اس لئے وہ خود اپنی ہجویہ نظموں کو زیادہ پسند کرتا تھا - پھر بھی اس کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو محض کسی عارضی تاثر کے ماتحت کہی گئی ہوں - اپنی ہجویہ نظموں کے بارے میں " پو " کہتا ہے کہ جب ظالم حکام اور اُن کے مصاحب ان نظموں کو سنتے تھے تو اُن کے چہرے کا رنگ فق ہوجاتا تھا - " پو " کی ہجو گوئی میں مزاح کم اور سنجیدگی زیادہ ہے - اُس کی کسی ہجو میں شاعری کا پلہ نیچا نہیں ہے - اُس کی ہجویہ نظموں کو ہم " منظوم اخلاقی افسانے " کہہ سکتے ہیں —

" پو " نے دوسرے شاعروں کے کلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں ' ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف " حسن بیان " کو نہیں پسند کرتا تھا - بلکہ اس کا خیال تھا کہ ہر نظم میں کوئی کار آمد اور مفید " اخلاقی تلقین " ہونی چاہئے —

" پو " کو اپنی زندگی میں جتنی شہرت نصیب ہوئی، شاید ہی دنیا کے کسی اور شاعر کو نصیب ہوئی ہو - اس کی نظمیں زبان زد خاص و عام تھیں - تعلیمی درسگاہوں، عبادت گاہوں اور جہازوں پر اس کی نظمیں کندہ تھیں - جس کسی کو " پو " کی کوئی نظم بھی یاد ہوتی وہ اس کا فخریہ اعلان کرتا اور لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے - مگر یہ ہر دل عزیزی اس کی رومانی نظموں کو نصیب تھی - "یوان چن" کو، ' پو ' ایک خط میں لکھتا ہے : " دنیا میری ان نظموں کی زیادہ تعریف کرتی ہے جنھیں میں خود نہیں پسند کرتا - معاصرین میں صرف تم میری تخیلی نظموں کو سمجھ سکتے ہو - ممکن ہے کہ پھر صدیوں کے بعد کوئی میری نظموں کا سمجھنے والا پیدا ہو "—

' پو ' کی شہرت جاپان تک اس کی زندگی ہی میں پہنچ چکی تھی - جاپان میں اب تک اس کی بہت قدر ہے - یہاں تک، کہ شنطائی مذہب کے پیرو اسے دیوتا تصور کرتے ہیں - برٹش میوزیم میں اس کی تصانیف کی ایک ہی نقل ہے جو جاپان میں سترھویں صدی عیسوی میں طبع ہوئی تھی —

" پو " کی بعض نظموں کے ترجمے دلچسپی سے خالی نہیں ہونگے - اگرچہ ترجمہ سے زبان کی خوبیاں نہیں واضح ہو سکتیں، پھر بھی ہم اس کے تخیل کا مطالعہ کر سکتے ہیں —

" جنونی گیت "

" ہر شخص میں کوئی نہ کوئی فطری کمزوری ضرور ہے -
اور میری کمزوری یہ ہے کہ مجھے شاعری سے رغبت ہے —
میں نے زندگی کی ہزاروں قیود سے آزادی حاصل کر لی ہے -

مگر ابھی تک شاعری کا خبط نہیں گیا —
جب کبھی کسی خوشنما منظر کو دیکھتا ہوں —
یا کسی دوست سے ملاقات ہو جاتی ہے —
تو میں بلند آواز سےکوئی نظم پڑھتا ہوں —
اور ایسا خوش ہو جاتا ہوں کہ گویا میں نے خدا کا جلوہ دیکھ لیا ۔
جب سے میں جلا وطن کرکے " سون یانگ " بھیجدیا گیا —
میں اپنا آدھے سے زیادہ وقت پہاڑوں میں گذارتا ہوں —
اور اکثر ۔ جب کوئی نئی نظم تیار کرتا ہوں —
تو میں " مشرقی پہاڑ " کی جانب چلا جاتا ہوں ' —
سفید چٹانوں پر لیٹ جاتا ہوں ' —
جنگلی درختوں کی کسی سر سبز شاخ کو اپنی طرف جھکا لیتا ہوں '
اور میرا جنونی گیت پہاڑوں اور وادیوں میں گونج اُٹھتا ہے —
وحشی جانور ' اور چڑیاں قریب آ کر میرے نغمے سنتی ہیں —
دنیا کی طنز آمیز ہنسی سے بچنے کے لئے '
میں ایسی جگہ پسند کرتا ہوں جہاں انسان کا گزر ہی نہیں " —

" لانبا کمبل "

" کتنے غریب لوگ سردی سے ٹھٹھرتے ہونگے ! ہم اُنہیں کیسے بچا سکتے ہیں ؟

صرف ایک آدمی کو سردی سے محفوظ رکھنا کافی نہیں ہے —
کاش میرے پاس ایک بڑا سا کمبل ' ہوتا ۔ دس ہزار فیٹ لانبا جس سے میں بیک وقت سارے شہر کو ملفوف کر لیتا "

"یوان چن" کو خواب میں دیکھ کر"

(یہ نظم "یوان چن" کی وفات کے آٹھ سال کے بعد، "پو" نے کہی تھی)

' میں نے تم کو خواب میں دیکھا ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اِدھر اُدھر سرگرداں رہے'

جب صبح کے وقت میں بیدار ہوا، کوئی اُن آنسوؤں کو روکنے والا نہ تھا جو میرے رومال پر گر رہے تھے'

دریائے 'پینگ' کے کنارے میرا جسم زار تین بار بیمار پڑ چکا ہے *

' سین یانگ † ' میں تمھاری قبر کے سبزوں کے لئے آٹھ بار موسم خزاں آ چکا ہے —

تم زمین کے نیچے دفن ہو اور تمھاری ہڈیاں خاک میں مل گئی ہیں -

میں انسانوں کی بستی میں رہتا ہوں - میرے بال برف کی مانند سفید ہو گئے ہیں —

' آوی ' اور ' ہاں لانگ ' ‡ نے یکے بعد دیگرے تمھاری اقتدا کی —

عالم بالا میں تم نے اُنھیں بھی دیکھا تھا ؟ " —

جدائی

" کل میں نے سنا کہ فلاں ابن فلاں اس دار فانی سے کوچ کر گیا -

آج صبح مجھے معلوم ہوا کہ فلاں شخص اپنے اعزا کو داغ جدائی دے گیا -

* "یوان چن" کی وفات کے بعد

† ' چانگ آن ' کے قریب - اس شہر کا جدید نام ' سی نہگاں فو ' ہے -

‡ ' لی چن ' اور ' سوئی سوان لیانگ ' کے معروف نام جن سے ' پو ' اُنھیں یاد کرتا تھا —

دوستوں اور ملاقاتیوں کا دو تہائی حصہ ،

عالم ارواح میں چلا گیا —

جو گزر چکے ہیں انہیں پھر کبھی دیکھنے کا موقعہ نہیں ملیگا —

افسوس ! اُن کا ، ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا —

جو باقی ہیں - وہ کہاں ہیں ؟

وہ سب منتشر ہیں - ہزاروں میل کے فاصلہ پر

جن سے میں زندگی بھر صحبت کرتا رہا —

ان کو میں اپنی انگلیوں پر گن سکتا ہوں - وہ کتنے ہیں ؟

صرف ' تنگ ' - ' کؤو ' - ' لی ' اور ' فینگ ' صوبوں کے حاکم - صرف چار اشخاص *

ایک دوسرے کی یاد میں ہمارے بال سفید ہوجاتے ہیں —

اِس بزم فانی میں ہم سمندر کی موجوں کی طرح اُفتاں و خیزاں رہتے ہیں —

آہ ! وہ اگلی صحبتیں - وہ محفلیں - وہ بزم آرائیاں،

ہمیں اس پرا گندہ حالت میں چھوڑ کر فنا ہوگئیں !

ہم پھر کب ملینگے ! اور ساتھہ شراب پیئیں گے —

اور مسکراکر ایک دوسرے کو محویت سے دیکھیں گے ؟"

* " پو " کے چار دوست جن کا تذکرہ اس مضمون میں ہے، " یوان چین" - " سوئی سوانی لیانگ " - " لیویو سی " - " لی چن "

(آرزو جلیلی)



اردو کے اَن پڑھ شاعر

از

[جناب مرزا فدا علی صاحب ' خنجر ' لکھنوی]

قدرت علی

ان کا نام میر قدرت علی تھا - عہد شاهی میں ' لکھنؤ ' میں پیدا هوئے - پڑھے لکھے بالکل نہ تھے مگر نہایت با وضع ' احباب پرست ' زندہ دل ' مرنجان مرنج ' خلق مروت میں اگلوں کا صحیح نمونہ ' وضع قطع بھی قدیم شرفاے لکھنؤ کی سی تھی - ہر کا پائجامہ ' کبھی مشرو یا گلبدن کا ' سفید کرتا اُس پر باریک انگرکھا یا اچکن ' جامدانی کی ٹوپی ' جاڑوں میں یہ لباس سرمائی کپڑوں سے بدل جاتا تھا - گھر سے نکلتے تو هاتھ میں جریب ضرور رهتی - چکن کا کارو بار کرتے تھے ' قرب و جوار کے کاری گروں سے مال تیار کراتے اور جب ذخیرہ جمع هو جاتا تو ممالک هند میں دورہ کرکے تجارت کرتے - اکثر بلاد هند کی سیاحی کرچکے تھے - گفتگو میں الفاظ فصیح اور لب و لہجہ شیریں هوتا اور کچھ ایسی دل کشی و دلچسپی هوتی کہ سننے والا گھنٹوں سنا کرتا لیکن سیری نہ هوتی - حافظہ حد سے زیادہ قوی تھا - شعراے ماضی و حال کے هزار ها اشعار از بر تھے - اردو هو یا فارسی اچھا شعر ان کی

بیاض حافظه میں محفوظ رهتا ۔ " محشر صاحب " کا بیان هے که ان دنوں ان کا بارہ تیرہ برس کا سن اور طالب علمی کا زمانه تها، شاعری کی طرف متوجه هونے کی فرصت نه تهی اور میر صاحب اپنے شباب کو شیب سے بدل چکے تهے ۔ جناب " محشر " کے نانا مرحوم سے نهایت درجه خلوص و ارتباط تها ' اکثر صحبتیں رها کرتیں ۔ بچوں سے بهت مانوس تهے، جب کبهی ان میں آ نکلتے تو ایسی باتیں کرتے جو هم سنوں کو زیبا هیں ۔ پهر لطف یه که وہ باتیں ایسی با اثر اور مزے دار هوتیں که ان کا سلسله ٹوٹنا گوارا نه هوتا ۔ ایک مرتبه میر صاحب تشریف لاے ' حضرت " محشر " اور تین چار ان کے هم سبق و هم عمر طالب علم موجود تهے ' کتابیں کهلی هوی آگے رکهی تهیں اور سبق یاد هورهے تهے لیکن میر صاحب کے آتے هی کتب درسیات گردان دئیے گئے اور سب کے سب میر قدرت علی کی پر کیف باتیں سننے میں مصروف هو گئے وہ کبهی ان کے قلوب کو اشتیاق کی چاشنی سے بهر دیتے، کبهی لب و لہجه اور انداز بیان ظریفانه هو جاتا جس پر هنسی ضبط کرنا دشوار تها ۔ اثناے گفتگو میں شعر و سخن کا چرچا چلا تو فرمایا " تم لوگوں کو اپنے حافظے پر بڑا ناز هے' ایک دن مجهه بوڑهے سے بهت بازی هو جائے میں بهی تو دیکهوں تم لوگ کتنے پانی میں هو' لیکن شرط یه هے که دو میدان هوں ایک دن اردو اور ایک دن فارسی کے اشعار پڑهے جائیں ' اردو ' فارسی شعروں کو گهی کهچڑی کرکے پڑهنا مجهے پسند نهیں ۔ یہاں کیا عذر تها ' یه تو عین خواهش تهی فوراً اس ادبی الٹیمیٹم کو قبول کر لیا ۔ دن بدے گئے ۔ میر صاحب حسب وعدہ تشریف لائے ۹ بجے کهانے وغیرہ سے فارغ هوکر شعر خوانی شروع هوئی ۔ چار ذهین طالب علم ایک جانب اور ایک اُمی مگر طباع

شاعر ایک طرف - اسی شغل میں آدھی رات گذر گئی لیکن میر صاحب کی یاد کا خزانہ اُسی طرح پر تھا ! چار نوجوان طالب علم عاجز ہونے لگے - نتیجہ یہ ہوا کہ صبح چار بجے ہزیمت قبول کرنا پڑی —
. . یہ تو اُس زبان کا حال تھا جس کی آغوش میں پرورش پا رہے تھے ' اب فارسی کا مآل کار سنئیے ' وہ میدان بھی میر قدرت علی کے ہاتھ رہا ! —

میر قدرت علی محض حافظ اشعار ہی نہ تھے بلکہ انھیں قدرت نے طبع سلیم و ذہن رسا عطا کیا تھا - فی البدیہہ گوئی میں اتنا زبردست کمال حاصل تھا کہ اساتذہ فن بھی مقابلے میں لائے جائیں تو میر صاحب کا پلہ گراں رہے - طبیعت میں دریا کی سی روانی تھی - کہنے پر آتے تو بر جستہ نظم کے موتی پروتے چلے جاتے - مذاق سخن ستھرا تھا لیکن نام و نمود کی خواہش مطلق نہ تھی - کبھی اپنے آپ کو زمرۂ شعرا میں داخل کرنا پسند نہ کیا نہ کلام جمع کرنے کی فکر ہوئی - اُن کی شاعری محض تفنن طبع اور اقتضائے وقت پر موقوف تھی - جب کہیں اشعار پڑھے جانے لگے ' اُن کی حاضر طبیعت نے درفشانی شروع کردی - ادھر صحبت برخاست ہوئی ' اور اُدھر وہ اشعار بھی نابود ہو گئے - حضرت محشر کا قول ہے کہ میں نے بارہا اصرار کیا کہ آپ اپنے اشعار لکھوالیا کیجئے ' بلکہ اُن کی یہ خدمت خود انجام دینے کا وعدہ کیا لیکن میر صاحب نے قطعی انکار کرتے ہوئے منع کیا کہ میرے شعر نہ لکھنا ' یہ بھی فرمایا " بھلا میں جاہل آدمی ' شاعری کیا کروں گا ' یہ جو کچھ ہے تم لوگوں کو خوش کرنے کا سوانگ ہے ' بھلا ! میرے اشعار بھی اس قابل ہیں جو لکھے جائیں - اب " محشر صاحب "

اُس وقت کو یاد کر کے متاسف ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں " مجھ سے یہ ایسی غلطی ہوئی جس کا قلق ہمیشہ کانٹے کی طرح دل میں کھٹکا کرتا ہے کیوں کہ مجھے ایسے موقع حاصل تھے کہ اگر چاہتا تو میر قدرت علی کا بہت ساکلام لکھ لیتا ، لیکن اُس زمانے میں بالکل خیال نہ آیا اور اب حافظہ اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ لاکھ غور کرتا ہوں لیکن اُن مرحوم کا کوئی شعر یاد نہیں آتا ۔

میر قدرت علی نے کبھی اس منشا سے شعر نہیں کہا کہ وہ اُس کے ذریعے سے شاعر متصور کئے جائیں - یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کسی اُستاد فن کے سامنے زانوئے شاگردی تہ نہیں کیا جو کچھ کہتے تھے اُس سے صرف تفریح منظور ہوتی یا سامعین کی ضیافت طبع مراد ہوتی - اُن کا سارا کلام ضایع ہو چکا اب ایک شعر بھی دستیاب نہیں ہوتا - جس طرح عرصہ ہوا ہوائے اجل نے اُن کا چراغ حیات گُل کر دیا دنیا کے پردے پر اب وہ شریف ہستی موجود نہیں اُسی صورت سے باد مخالف نے اُن کا سرمایۂ زندگی (کلام) بھی ناپید کردیا ـــ

جب سے جناب محشر نے اِن مرحوم کے حالات بیان کئے تھے مجھے اُسی روز سے میر صاحب مرحوم کے کلام کی تلاش و جستجو تھی - چوں کہ اُن کے پس ماندوں سے ناواقف محض تھا - لہذا تذکروں کی ورق گردانی شروع کی - اس کام میں تحصیل حاصل کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا - یہ بھی گوارا نہ تھا کہ ایسے ذہین شخص کے احوال سے تذکرہ خالی رہے - حسن اتفاق سے ایک پرانی بیاض (دیمک خوردہ) ہاتھ لگ گئی جس میں کسی شوقین نے اکثر شعرا کے کلام کا انتخاب لکھا تھا ، اس کی سیر میں ایک شعر نظر پڑا جو دیمک کے زہریلے اثر

سے کسی قدر محفوظ تھا شعر کے اوپر " میر قدرت علی چکن فروش " تحریر تھا ، فوراً میرا خیال میر صاحب کی جانب متوجہ ہوا - نہ معلوم وہ یہی بزرگ ہیں یا کوئی اور مگر قیاس کی بنا پر انھیں میر صاحب کو فرض کرتے ہوئے اِن کے نام سے وہ شعر لکھتا ہوں - اِس سے میری غرض یہ ہے کہ حالات زندگی کے ساتھ ایک شعر بھی ناظرین تذکرہ کو اِن کی یاد دلاتا رہے —

بتلائیے تو دل کو مرے کیا کیا حضور
مٹھی میں ہے کہ آپ کی زلف رسا میں ہے

کبیر

اس مشہور و معروف عالی دماغ و نازک خیال شاعر نے سنہ ۱۳۹۸ ع میں بمقام کاشی پوری (بنارس) مسمی نورعلی یا نیرو کے گھر میں جنم لیا (جو کپڑا بننے کا پیشہ کرتا تھا) اور رفتہ رفتہ قوت شاعری کی استمداد و استعانت سے او تار کا مرتبہ حاصل کر کے ، ترقی کی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا شہرت و نا موری کی اُس حد تک پہنچ گیا جس کا ڈانڈا حیات جا وید کی پگڈنڈی سے جا ملتا ہے

کبیر کی ولادت کے باب میں مختلف روا ئتیں وارد ہوئی ہیں - اہل ہنود مورخین کا بیان ہے کہ یہ ایک بیوہ کا ہو نہار فر زند ہے جو ہر اصل گرو " راما نند جی " کی دعا کا خوش گوار نتیجہ ہے اور جسے بیوہ نے بد نامی کے خوف اور سو سائٹی کی طعنہ زنی کے خیال سے لہری تالاب (لہر تازہ) معروف بہ کبیر تلائی میں ڈال دیا تھا - حسن اتفاق سے اُسی روز نیرو جلا ہا اپنی دلہن کو اُس

کے میکے سے رخصت کراکے اپنے مکان لئے جاتا تھا - راستے میں دلہن کو پیاس معلوم ہوئی اور وہ اپنے خاوند کی اجازت سے تالاب پر پانی پینے گئی - وہاں بچہ کو پڑا پایا اور گود میں لئے ہوئے شوہر کے پاس واپس آگئی - نیرو نے ابتداً ' تو بچہ کو اپنی حمایت و نگرانی میں قبول کرنے سے پس و پیش کیا لیکن بعد میں رضا مند ہو گیا اور گھر لاکر کبیر علی یا کبیر نام رکھا - آگے چل کے یہی خوش نصیب بچہ اہل ہنود کی عقیدت مندی سے کبیر داس کے لقب سے روشناس ہوا —

نیرو کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اُس نے کبیر کو (جو خواہ صلبی فرزند ہو یا بقول اہل ہنود دستیاب شدہ بچہ) مثل اولاد کے پرورش کیا - اُس کے گھر میں پشتہا پشت سے کپڑے بننے کا کام ہوتا آتا تھا لہذا کبیر کو بھی بجائے علمی تعلیم کے آبائی پیشہ سکھا یا اور وہ نیرو کی طرح جلاہے کا کام کرنے لگا - اس کے علاوہ بھی بہت سی روائتیں ہیں جن میں کثرت سے عقائد شامل ہیں اور اُن سے مور خانہ طریقہ پر کوئی نتیجہ اخذ کرنا بہت دشوار ہے —

اس وہبی شاعر نے جس گھر میں جنم لیا تھا وہاں اصولاً علم و فضل کا چرچا مطلق نہ تھا ' شب و روز تانے بانے اور کرگھے کا مشغلہ جاری رہتا اور یہی اُن لوگوں کی معاش تھی - لیکن مبداء فیاض نے کبیر کو فطری ذہانت و ذکاوت عطا کی تھی اُس کی فلسفیانہ طبیعت قدرت کے لا تعداد مناظر کو عمیق نظروں سے دیکھتی اور اُن سے قابل قدر و سبق آموز نتائج پیدا کرتی - یہ سچ ہے کہ خیالات عالیہ کسی کی میراث نہیں ' خزانۂ قدرت جسے یہ دولت عطا کرتا ہے اُسے ملتی ہے - چنانچہ کبیر صغر سنی ہی میں ایسے ایسے نادر تخیلات پیش کرنے لگا

کہ اُس عہد کے علما و فضلا افراط حیرت سے انگشت بدنداں ہوگئے۔ طبیعت میں تصوف حد درجہ موجود تھا، اخلاقی و تمدنی مضامین سیلاب کی طرح اُمڈا کرتے، معمولی معمولی باتوں سے بڑے بڑے نتائج نکال لینا اس کی طبع خدا ساز کا ادنیٰ کرشمہ تھا - یہی سبب ہے کہ منھ سے نکلتے ہی اُس کی بانیاں اور دوہے زبان زد خاص و عام ہوجاتے، گلی کوچوں میں اشعار پڑھے جاتے پھر لطف یہ کہ ہر طبقے میں اُس کا کلام مقبول اور دل نشین تھا۔ اگر عوام کی صحبتیں اس کی بانیوں سے گونجتی سنائی دیتیں تو خواص کی مجلسیں بھی اُس کے دوھوں سے رشک گلزار نظر آتیں۔ ایک طرف عشق طینت طبائع اُس کے کلام سے لطف اندوز ہوتے تو دوسری جانب مرتاض زاہد اور خشک طبیعت پنڈت بھی اُس کے اشعار کو شمع معرفت الٰہی تصور کرتے - مختصر یہ کہ اُس کے کلام کی دھوم تھی اور زمانہ شرق کا دامن پھیلائے اُس کے چمنستان مضامین کی گل چینی میں مصروف تھا —

کبیر مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا اور اہل ہنود کے طبقے میں قابل پرستش ٹھیرا - اس کی بڑی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اُس میں تعصب کا نام تک نہ تھا - جس طرح مسجد کے سامنے سر عبودیت خم کرنا اُس کا اصل ایمان تھا اُسی طرح مندروں اور شوالوں کو پر نام کرنا واجب و لازم جانتا تھا - اُس نے کبھی بھولے بسرے بھی ہندو مسلم قوموں میں تفریق نہیں کی - مخلوق کو ایک خالق کی خلقت تصور کیا اور ہر ایک سے برادرانہ سلوک سے پیش آیا جیسا کہ خود اُس کے مندرجۂ ذیل کلام سے ثابت ہے —

آؤں گا نہ جاؤں گا مروں گا نہ جیوں گا گرو کے ساتھ امیرس پیوں گا
کوئی پھیرے مالا کوئی پھیرے تسبی دیکھو رے لوگو دونوں کسبی

کوئی جاوے مکہ کوئی جاوے کاشی   دونوں کے گلے بیچ پر گئی پھانسی
کوئی پوجے مڑھیاں کوئی پوجے گوراں   دو او کی مڑھیاں ھیر لیئی چوراں

کہتے کبیر سنو نرلوئی
ھم نہ کسی کے نہ ھمارا کوئی

کبیر اُن لوگوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا جو مذھبی تعصبات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ھیں - اُس کی یہی بے تعصبی بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچ گئی کہ وہ اهل هنود کے اعتقاد میں واجب التکریم و قابل پرستش دیوتا اور مسلمانوں میں اهل اللہ کے مرتبے پر فائز ہوا —

کبیر کے مزاج میں اول سے فقیری کا رنگ پیش پیش تھا جس نے بعد میں اُس کا آبائی پیشہ ترک کراکے سجادہ نشین اور عابد و زاھد بنادیا —

کبیر کی شادی بھی ہوئی اور دو اولادیں بھی پیدا ہوئیں لیکن خرق عادات نے اُسے جس درجۂ عالیہ پر پہنچا دیا تھا اُسے دیکھتے ہوئے بہتوں نے اُسے نوع انسانی سے جدا کرکے خلقت ملکوتی تسلیم کیا اور جو رسوم خاکی نژاد انسانوں میں رائج ھیں اُن سے کلیتہً مستثنا خیال کیا - اسی وجہ سے ایک بڑا گروہ کبیر کے عیال دار ہونے کا منکر ھے - جس طرح بیسیوں روایتیں اُس کی ولادت کے بارے میں پیش کرتا ھے اُسی طرح مناکحت کے معاملے میں بھی بہت کچھ اختلاف سے کام لیتا ھے اور اُس کے کلام کا وہ حصہ ثبوت میں پیش کرتا ھے جو عورتوں کی طرف سے نفرت و حقارت پیدا کرنے کو تصنیف ہوا ھے اور اسی دلیل سے اُس کے دامن کو علائق کی آلودگی سے بری ثابت کرنے کی سعی سے کام لیتا ھے - اس جگہہ کچھہ کلام نقل کیا جاتا ھے —

ناری کی جھائیں پڑت، اندھا ہوت بھجنگ
کبیر تن کی کون گت (جو) نت ناری کے سنگ

کامنی، سندر سر پنی، جو چھیڑے تاہی کھائے
جو گرو چرنن راچیا، تن کے نکٹ نہ جائے

ایک ناری ایک ناگنی، اپنا جایا کھائے
کبھوں سر پر ہینکسی، اوچے ناگ بلائے

نینن کا جرپائی کے، گاڑھے باندھے کیس
ہاتھوں مہندی لائے کے باگھنی کھایا دیس

پر ناری پونی چھری مت کوئی لاوے انگ
راون کے دس سر گئے، پر ناری کے سنگ

اسی طرح اکثر اشعار سے وہ نفرت ظاہر ہوتی ہے جو کبیر کے دل میں جنس اُناث کی طرف سے موجود تھی —

کبیر کی شاعری میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ الفاظ کے عام معنی سے قطع نظر کرکے دوسرے معنی پیدا کر دیتا ہے - جو کلام تحت میں دیا جاتا ہے اُس سے کبیر کا طبیعی رنگ معلوم ہو کا ادنی باتوں سے اعلی نتائج نکالنا ہی وہ وصف ہے جس نے اس کے کلام کو حسن قبول عطا کر دیا —

ٹھگنی کا نینا جھمکاوے تیرے ہاتھ کبیر نہ آوے

کبھو کات سرد لگ بنایا، نبھو کات سجیرا
پانتیر تریا منگل گاوے، ناچے بالم کھیرا

بھینس پدمنی جوھا عاشک، مینڈک تال بجاوے
چولا پہر گدھیا ناچے، اونٹ بسن پد گاوے

روپا پہرے روپ دکھاوے، سونا پہن رجھاوے
گلے ڈال تلسی کا مالا، تین لوک بھر ماوے

آم چڑھے مچھلی پھل توڑے کچھوا چن چن لاوے
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو برلا ارتھہ لگاوے

اس میں شک نہیں کہ کبیر کے صوفیانہ مذاق نے اُسے مجرد زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی ہوگی مگر اُس کے عقیدت مند گروہ سے رو گردانی کرکے دیکھا جائے تو کبیر کی شادی ہونا امر مسلمہ ہے —

' کبیر ' کی بیوی کا نام ' لوئی ' تھا جس کے معنے ' کمبل ' کے ہیں اور لوئی ایک قسم کے پھول کو بھی کہتے ہیں - اس کے متعلق بھی مختلف باتیں مشہور ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ ایک روز ایک سادھو نے اُسے دریا سے نکالا تھا جو کمبل میں لپٹی ہوئی کہیں سے بہتی چلی آتی تھی - اسی سادھونے اس لڑکی کو اولاد کی طرح پال پوس کر بڑا کیا - جب ' لوئی ' سن تمیز کو پہنچی اور سادھو کا آخیر وقت آ پہنچا تو اُس نے بطور وصیت لوئی کو چند ہدایتیں کیں اور کہا کہ وہ اُس وقت تک اس جگہ سے کبھی نہ جاے جب تک اس کا جائز لے جانے والا نہ آئے - جو شخص اسے لینے آئے گا وہی اس کا شوہر ہوگا اور اس کی شناخت یہ بتائی کہ وہ اس کے تمام سوالوں کا جواب صرف ایک کلمے سے دے گا - چنانچہ سادھو کی وفات کے بعد بھی لوئی وہیں مقیم رہی - اس کا دستور تھا - کہ جو

مسافر یا فقیر راستہ سے گزرتا اُسے اپنی جھونپڑی میں مہمان کرتی، خاطر و مدارات سے پیش آتی اور رخصت کردیتی - ایک دن تین چار سادھو مہمان تھے اور کبیر بھی پہنچ گئے تھے - لوئی نے ہر سادھو کے سامنے علحدہ علحدہ دودھ کا ایک ایک پیالا پیش کیا اور سب نے تو اپنا اپنا ظرف خالی کرکے رکھہ دیا لیکن کبیر نے اپنے حصے کے دودھ کو ہاتھہ بھی نہیں لگایا - جب لوئی نے دعوت قبول کرنے کا اصرار کیا تو جواب دیا - " دریا پار سے ایک سادھو آرہا ہے یہ اس کے واسطے بچا رکھا ہے "- جملہ تمام ہوتے ہی ایک سادھو وارد ہوا اور وہ دودھ اُسے دیا گیا - لوئی کبیر کی اس غیب دانی سے نہایت متاثر ہوی اور دریافت کیا " آپ کا نام " جواب ملا کبیر، پتہ ٹھکانا اور کئی سوالوں کا جواب صرف لفظ کبیر سے دیا گیا - جس سے لوئی کو اس سادھو کی وصیت یاد آ گئی اس نے اسی وقت جھک کر کبیر کے چرن چھوئے اور کل حال بیان کیا اور کبیر کے ساتھہ چلی آئی —

کبیر سے لوئی کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے ایک بیٹی اور ایک بیٹا - بیٹے کا نام کمال اور بیٹی کا نام کمالی تھا - اس میں کلام نہیں کہ کبیر عیال دار تھا - اگرچہ عورتوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی نہ تھا نہ ان سے محبت کرنا پسند کرتا تھا جیسا کہ خود کہتا ہے —

ناری تو ہم بھی کری، جانا نہیں بچار
جب جانا تب پیر ہری، ناری بڑی بکار

جہاں جوانی سنہ ری - تو جلی جائے کبیر
اُوڑی کہ بھسم جو لاگ سی، سونا ہوئے سریر

چھوٹی موتی کا منی ، سب ھی بس کی بیل
بٹیری مارے داؤں دے ، یہ مارے هنس کھیل

———

کبیر نے بعض ممالک کی سیر بھی کی ھے اور سیاحت میں جو تجربات حاصل ھوئے اُنھیں فلسفیانہ رنگ سے دل چسپ پیرائے میں بیان کیا ھے - کبیر نے ایک سو بیس برس کی عمر پائی اور شاعری کو شعار بنایا - سن کے ساتھ خیالات عالیہ بڑھتے گئے اور زمین سخن میں ایسی ایسی نادر میناکاری کی جو اپنا مثل و نظیر نہیں رکھتی - کلام میں ھر طرح کا رنگ موجود ھے - تصوف تو خاص چیز ھے جو ھر نظم میں جھلک دکھاتا ھے - اس کے ماسوا اخلاق ، تمدن ، معاشرت ، پند و نصائح کی بھی کچھ کمی نہیں - اس ذھین و طبع اور وھبی شاعر نے ضلع بستی کے ایک گاؤں مگھر میں ایک سو بیس سال کی عمر پا کر سنہ ۱۵۱۸ ع میں وفات پائی اور اپنی یادگار میں اپنا زندۂ جاوید کلام چھوڑ گیا - چوں کہ بھاشا زبان کا شاعر تھا جو اُردو سے ملتی جلتی ھے اس لئے نمونتاً تھوڑا کلام نقل ھوتا ھے - حسن تخیل و ندرت مضامین قابل لحاظ ھے —

رنگی کو نارنگی کہیں ، بنے دودھ کو کھویا
چلتی کو گاڑی کہیں ، دیکھ کبیرا رویا

———

من کو ھارے ھار ھے ، من کو جیتے جیت
کہہ کبیرا پیو پائے من ھی کی پرتیت

———

من پانچھوں کے بس پڑا من کے بس نہیں پانچ
جت دیکھوں تت دؤں لگی چت بھاگوں تت آنچ

من مرید سنسار ہے ' گرو مرید کوی سادھ
جو مانے گرو بچن کو ' تا کا متا آگادھ

من چلے سو مانبا ' بے حد چلے سو سادھ
حد بے حد دونوں تجے ' تا کا متا آگادھ

چلتی چاکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دو پاٹن کے بیچ ماں ثابت رہا نہ کوئے

چلوں چلوں سب کوی کہے ' پہنچے برلا کوئے
ایک کنک ارد کامنی ' درگم گھاٹی دوئے

پر ناری کے راچنے ' سیدھا نرکئے جائے
تنکو جم چھوڑے نہیں ' کوتن کرے اُپائے

آپو آپ چیتے نہیں ' کہو تو رسوا ہوئے
کہیں کبیر جو آپو نہ جاگے نا ست آست نا ہوئے

پر گت کہوں تو ماریا ' پردے لکھے نہ کوئے
سنہا چُھپا پوار تر ' کو کہہ بیرائی ہوئے

کلی کھوتا جگ انہ ھیرا شبد نہ مانے کوئے
جا ھی کہوں ھت اپنا ' سو اُتّھ بیری ہوئے

من کے متّے نہ چالئے ' من کے متّے انیک
جو من پر اسوار ھے ' سو سادھو کوئی ایک

گلشن

گلشن بیگم نام گلشن تخلص - لکھنؤ کی باشندہ ' شریف خاندان ' عفت پرست و عصمت مآب - نکبت و افلاس نے امارت کے خواب فراموش کردئیے - عسرت و تنگ دستی میں بسر ہوتی - جوانی میں غم بیوگی نصیب ہوا - مدت تک کس مپرسی کے عالم میں پر الم زندگی تیر کی - سنا جاتا ھے سینے پرونے کے کاموں میں کافی دستگاہ تھی - چکن خوب کاڑھتیں ' کتاؤ کے فن میں کامل ملکہ رکھتیں ' ایام ضعیفی اُجرتی کپڑے سی سی کر بسر کئے - اولادیں اُن کے سامنے ھی دنیا سے چل بسیں جس سے دل درد مند اور کلیجہ چھلنی ھو گیا - کچھہ مدت ہوئی دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا ——

شاعری کا شوق بہت کم تھا لیکن حسن اعتقاد کبھی کبھی نوحہ و سلام کہوا دیتا - مدت العمر میں چند مرتبہ غزل کہنے کا بھی اتفاق ہوا شاید

یہی ابتدا اور یہی انتہائے غزل گوئی ہے - دو شعر دستیاب ہوئے جو لکھے جاتے ہیں —

نقدیر کی جفائیں ' ستم آسماں کے ہیں
کب تک لڑیں گے ان سے ہم ایسے کہاں کے ہیں

چپ چاپ کر بلا کی طرف بس چلی چلو
' گلشن ' یہ کیوں کہو کہ ارادے کہاں کے ہیں



ادبیات

(از ٹیگور)

۲

ادبیات کا مسالا

(جس کا ترجمه اصل بنگالی سے پنڈت ونهی
دهر صاحب ودیا لنکار ' لکچرار اورنگ آباد کالج نے دیا)

صرف اپنی مسرت کی خاطر لکھنے کا نام ادبیات نہیں ہے بعض لوگ نظم لکھ کر کہتے ھیں که جس طرح ایک پرندہ اپنی مسرت کی ترنگ میں چہچہاتا ہے اسی طرح شاعر کے کلام کا وجود اسی کے اپنے واسطے ہوتا ہے گویا پڑھنے والے اُسے چھپ کر سنا کرتے ھیں —

یه بات وثوق سے نہیں کہه سکتے که کسی پرندے کا خیال گاتے وقت اپنی هم جنس جماعت کی طرف نہیں هوتا اگر ایسا نہیں ہے تو نه سہی - اس بات پر بحث کرنا فضول ہے لیکن مصنف کے کلام کا مطمح نظر پڑھنے والوں کی جماعت هوتا ہے —

اِسی وجه سے یه نہیں کہا جا سکتا که مصنف کا کلام بناوٹی هو جاتا ہے اور نه یه کہنے میں همیں کوئی اعتراض هو سکتا ہے که ماں کا دودھ اپنی اولاد کے لئے ہے اور اسی وجه سے وہ جوش مار کر خود بخود نکلتا ہے -

بعض لوگ خاموش شعر گوئی اور اندرونی جذبات کے تلاطم هی کو شاعری خیال کرتے ھیں جو لکڑی جلتی نہیں ہے اگر اسے آگ کہیں تو جو انسان آسمان کو دیکھه کر اسی کی طرح خاموش هوجاتا ہے اسے شاعر کہنا بھی ویسا هی ہے - اشاعت هی

ادبیات ہے - دل کی اندرونی تہ میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے اس پر غور کرنے سے دوسرے انسانوں کو کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچتا - بھنڈار میں کیا جمع ہے اس کا اندازہ لگانے میں دوسرے لوگوں کو کوئی نفع یا نقصان حاصل نہیں ہوتا - ان کو تو مٹھائی دست بدست ملنی چاہئے —

ادبیات میں دلی جذبات کے اندرونی جوش کی بھی یہی حالت ہے - ہمیں یہی تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ تسلیم کرکے ہی غور کرنا پڑے گا کہ کلام خود مصنف کے لئے نہیں ہوتا —

ہمارے دلی جذبات کا یہ ایک قدرتی رجحان ہے کہ وہ بہت سے دلوں تک پہنچنا چاہتے ہیں - ہم قدرت میں دیکھتے ہیں کہ حیوانات کے اندر بڑھنے اور ہمیشہ قائم رہنے کی مسلسل کوشش جاری ہے جو حیوان اپنی اولاد کے ذریعہ خود کو جتنا بڑھا کر جتنی زیادہ جگہ گھیر سکتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کی زندگی کا حق بڑھ جاتا ہے گویا وہ اپنی ہستی کو اتنا ہی زیادہ حقیقی بنالیتا ہے —

انسان کے دلی جذبات میں بھی ایسی ہی ایک تحریک ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ حیوانات کا حق ملک اور وقت پر ہوتا ہے اور دلی جذبات کا حق دل اور وقت پر - دلی جذبات کا کام بہت سے دلوں کو ایک عرصہ تک اپنے زیر اثر رکھنا ہے —

صرف اسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے کتنے ہی قدیم زمانے سے' کتنے ہی اشاروں میں' کتنی ہی زبانوں میں' کتنے ہی قسم کے خطوں میں کتنے ہی پتھروں کی کھدائیوں میں' کتنی ہی دھاتوں کی ڈھلائیوں میں' کتنے ہی چمڑوں کی بندھائیوں میں' کتنے ہیں پیڑوں کی چھالوں میں' پتوں میں' کاغذوں میں' کتنی ہی رنگ کار برشوں میں' کتنی ہی چھینیوں سے' قلموں سے' کتنی مصوری اور کیا کچھہ کوشش نہیں کی گئی ہے - بائیں طرف سے دائیں طرف اور دائیں طرف سے

بائیں طرف' اوپر سے نیچے کو ایک سطر سے دوسری سطر میں دیا کیا نہیں کیا گیا؟ میں نے جو کچھہ سوچا ھے' میں نے جو کچھہ محسوس کیا ہے وہ انمٹ رہے گا ' وہ ایک دل سے دوسرے دل میں' ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں منقش ھوتا ھوا محسوس ھوتا ھوا اور بہتا ھوا چلے گا - ھمارا گھر' ھمارا سامان وغیرہ' ھمارا جسم' ھمارے سکھہ دکھہ کے اسباب سب کچھہ مٹ جائیں گے' صرف میں نے جو کچھہ غور کیا ھے' جو کچھہ محسوس کیا ہے وہ ابدالاباد تک انسان کے جذبات اور انسان کی عقل کا سہارا لے کر ذی روح دنیا میں زندہ رہے گا —

وسط ایشیا کے ریگستان گوبی کے ریتیلے ڈھیر میں سے جب معدوم انسانی جماعت کے متعلق بھولے ھوے قدیم زمانے کی ایک پھٹی پرانی کتاب باھر نکل پڑتی ھے تب اس کی غیر معروف زبان کے غیر معروف حروف کے بیچ میں سے کونسا درد ظاھر ھوتا ھے کس وقت کی کس زندہ دل کی تحریک آج ھمارے دل کے اندر داخل ھونے کے لئے بے تاب ھے ؟ جس نے لکھا تھا وہ نہیں ھے' جس بستی میں لکھا گیا تھا وہ بھی نہیں رھی لیکن انسان کے دل کا جذبہ انسان کے راحت و الم کے اندر پرورش پانے کے لئے ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں آکر خود کو روشناس نہیں کرسکتا' اپنے دونوں بازوں کو پھیلا کر منہ کی طرف دیکھہ رھا ھے —

دنیا کا سب سے نیک شہنشاہ اشوک اپنی جو باتیں مسلسل آنے والی دنیا کو ھمیشہ سنانا چاھتا تھا ان کو اس نے پہاڑ کے جسم میں کھودیا تھا - وہ سوچتا تھا کہ پہاڑ کسی وقت مرے گا نہیں' ھٹے گا نہیں' ابد کے راستے کے کنارے ھمیشہ کھڑا رہ کر نئے نئے زمانے کے مسافروں کو ایک بات ابد تک دھرا دھرا کر سناتا رھے گا - اس نے پہاڑ کو اپنی بات کے کہنے کی ذمہ داری سونپ دی تھی —

پہاڑ وقت اور بے وقت کا کچھہ بھی خیال نہ کرکے اس کی زبان کا حامل بنتا چلا آیا ھے - کہاں اشوک؟ کہاں پاٹلی پتر؟ کہاں فرض کا احساس رکھنے والے ھندوستان

کا وہ شاندار زمانہ؟ لیکن پہاڑ اس زمانہ کی ان کتنی ہی باتوں کو غیر معروف رسم‌الخط میں، غیر مروج زبان میں آج بھی بول رہا ہے - کتنے دنوں تک وہ جنگل کو اپنی داستان سناتا رہا ہے ۔ اشوک کی وہ عظیم‌الشان زبان بھی کتنی صدیوں تک انسانی دلوں کو گونگے کی طرح اشاروں سے بلاتی رہی ہے - راستے سے راجپوت گئے، پٹھان گئے، مغل گئے، برگی * کی تلواریں بجلی کی طرح نہایت تیزی سے ایک سمت سے دوسری سمت میں ہلم کے چابک لگاتی ہوئی گزر گئیں لیکن کسی نے پلٹ کر ان اشاروں کا جواب نہیں دیا - سمندر پار کے جس معمولی سے جزیرے کا اشوک نے کبھی خیال بھی نہیں کیا تھا - اس کے کاریگر جب پتھروں کی بڑی بڑی چٹانوں میں اس کے احکام کو کھود رہے تھے اُس وقت اُس جزیرے کے جنگل میں پھرنے والے " ڈروئڈ " لوگ اپنی پرستش کے جذبے کو بے زبان پتھروں کی لاٹوں میں تعمیر کیا کرتے تھے —— کئی ہزار سال کے بعد اسی جزیرے سے ایک پردیسی نے آکر قدیم زمانے کے اس گونگے اشاروں کے جال میں سے اس کی زبان کو آزاد کرکے زندہ کردیا - اس طرح شہنشاہ اشوک کی خواہش اتنی صدیوں کے بعد ایک پردیسی کی مدد سے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے قابل بنی وہ خواہش اور کچھہ نہیں ہے - اشوک خواہ کتنا ہی بڑا شہنشاہ کیوں نہ ہو، وہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں، اسے کونسی چیز پسند ہے اور کونسی ناپسند؟ یہ باتیں اسے ایک راستہ کے مسافر کو بھی بتانی پڑیں گی - اس کے دل کا جذبہ اتنے زمانوں سے تمام انسانوں کے دلوں کا آسرا دیکھتا ہوا راستے کے ایک طرف کھڑا ہوا ہے - شہنشاہ کی اس خواہش کے مرکز کی طرف کچھہ مسافر دیکھتے ہیں اور کچھہ مسافر بغیر

* مرہٹوں کی حملہ کرنے والی مشہور سوار فوج —

دیکھے چلے جاتے ہیں —

یہ کہہ کر میں اشوک کے احکام کو " ادبیات " کہتا ہوں ایسی بات نہیں ہے - اس سے اتنا پتہ لگتا ہے کہ انسان کے دل کی بہت بڑی خواہش کونسی ہے ؟ ہم جس مورت کو گھڑ رہے ہیں، جس تصویر کو بنا رہے ہیں، جس نظم کو لکھہ رہے ہیں، پتھر کے جس مندر کی تعمیر کر رہے ہیں اور اس طرح ہر ملک میں ہمیشہ سے جو ایک انتھک کوشش جاری ہے وہ اور کچھہ نہیں ہے، انسان کا دل دوسرے انسان کے دل سے زندۂ جاوید ہونے کی خواہش کر رہا ہے —

جو ہمیشہ رہنے والی چیز انسان کے دل میں زندۂ جاوید بننے کی کوشش کرتی ہے عام طور پر وہ ہماری وقتی ضروریات اور حرکات سے مختلف طور پر امتیازی حیثیت اختیار کرلیتی ہے - ہم اپنی ضروریات کے لئے ہی چاول، جو، گیہوں وغیرہ بوتے ہیں - لیکن اگر ہم جنگل قائم کرنا چاہیں تو ہمیں جنگلی نباتات کے بیجوں کو اکھٹا کرنا پڑتا ہے —

ادبیات میں یہی ہمیشہ قائم رہنے کی کوشش ہی انسان کی دلپذیر کوشش ہے - اس لئے ملک کے خیر خواہ نقاد یہ کہہ کر کتنا ہی جوش کیوں نہ دلائیں کہ ملک میں مفید ادبیات کی کمی ہے صرف ڈراموں، ناولوں اور دیوانوں سے سارا ملک بھرتا چلا جارہا ہے، پھر بھی لکھنے والے ہوش میں نہیں آتے کیونکہ مفید ادبیات سے وقتی ضروریات پوری ہوجاتی ہیں لیکن غیر مفید مطلب ادبیات میں یعنے ایسی ادبیات میں جو وقتی ضرورت کو پورا نہیں کرتی قائم رہنے کا زیادہ امکان ہے —

جو باتیں علمی ہیں شائع ہو جانے پر ان کا مقصد پورا ہوجاتا اور وہیں ختم بھی ہوجاتا ہے - انسانوں کے علم میں نئی نئی ایجادوں کے

ذریعے سے پرانی ایجادیں روپوش ہوتی چلی جا رہی ہیں - کل جو چیزیں پنڈتوں کے لئے نا قابل فہم تھیں وہ آج کے بچوں کے لئے بھی نئی نہیں ہیں - جو حقیقت نئی شکل میں انقلاب انگیز ہوتی ہے وہ پرانی شکل میں حیرت بھی نہیں پیدا کرتی - آج جو حقیقت ایک معمولی سے شخص کو بھی اچھی طرح معلوم ہے کسی زمانے میں بڑے بڑے عالم اس کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے - اس پر لوگوں کو حیرت ہوتی ہے —

لیکن دلی جذبات کی حقیقت اشاعت کے ذریعے سے پرانی نہیں ہوتی - کسی علمی حقیقت کو ایک دفعہ جان لینے کے بعد دو بارہ جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی - آگ گرم ہے ' سورج گول ہے ' پانی مائع ہے یہ سب باتیں ایک مرتبہ جان لینے کے بعد ختم ہو جاتی ہیں - دوسری دفعہ اگر کوئی شخص انہیں باتوں کو بطور نئی تعلیم کے ہمارے سامنے پیش کرے تو ہمیں اپنی قوت برداشت کو قابو' میں رکھنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن جذبات کی حقیقت کو بار بار محسوس کرنے پر بھی تکان معلوم نہیں ہوتی - سورج مشرق سے نکلتا ہے اس بات میں ہمارے دلوں کے لئے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی لیکن سورج کے نکلنے میں جو حسن اور مسرت ہے اس میں ازل سے لے کر آج تک بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی احساس جس قدر قدیم زمانے سے اور جتنی مختلف نسلوں میں سے گزرتا ہوا آتا ہے اتنا ہی وہ ہمیں آسانی سے متاثر کر سکتا ہے —

اس لئے اگر انسان اپنی کسی چیز کو ہمیشہ کے لئے انسانوں کے دلوں میں روشن اور نئے جذبات میں زندۂ جاوید کرکے رکھنا چاہتا ہے تو اُسے جذبات کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے - اسی وجہ سے ادبیات کا خاص انحصار علمی مضامین پر نہیں ہے بلکہ جذبات پر ہے - اس کے علاوہ علمی مباحث

کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے سے کام چل جاتا ہے - اصل تصنیف کو دوسری زبان میں بدل دینے سے بعض اوقات اُس کی خوبی اور بھی بڑھ جاتی ہے - اُس کے مضامین کو لے کر مختلف قسم کے لوگوں میں مختلف زبانوں کے ذریعے طرح طرح سے شائع کیا جا سکتا ہے، اسی طرح اس کا مقصد حقیقی طور پر پورا ہوتا رہتا ہے —

لیکن جذبات کے بارے میں یہ بات نہیں ہو سکتی - وہ جس شکل میں ڈھلے ہوئے ہیں پھر اُس سے الگ نہیں ہو سکتے —

علمی باتوں کو ثابت کرنا پڑتا ہے اور جذباتی کیفیات کو متحرک کرنا ضروری ہوتا ہے - اس کے لئے مختلف قسم کے اشارے کنائے اور طرح طرح کی شوخیوں اور انداز کی ضرورت ہوتی ہے - اسے صرف سمجھا کر کہہ دینے سے کام نہیں چل سکتا اسے خود پیدا کرنا پڑتا ہے —

یہ صنائع کی خوبیوں سے بھری ہوی تصنیف جذبات کا جسم ہوتی ہے - اس جسم میں جذبات کے قائم کرنے سے مصنف کی حقیقت معلوم ہوتی ہے - اسی جسم کی فطرت اور ساخت کے مطابق ہی اس میں قائم کئے ہوئے جذبات انسانوں کے پاس عزت پاتے ہیں —— اس جسم کی قوت کے مطابق ہی یہ جذبات انسانی دلوں اور زمانوں میں پھیل سکتے ہیں —

روح کا انحصار صرف جسم پر ہے - پانی کی طرح اُسے ایک برتن سے دوسرے برتن میں ڈھالا نہیں جا سکتا - جسم اور روح آپس میں ایک دوسرے کو بڑھا چڑھا کر اک جان ہو کر رہتے ہیں —

جذبات، اور حقائق تمام انسانوں میں یکساں ہوتے ہیں اگر انھیں ایک انسان ظاہر نہیں کرتا تو وقت آنے پر دوسرا انسان کرے گا - لیکن تصنیف مصنف کی بالکلیہ اپنی ہوتی ہے - وہ جس طرح ایک انسان کی ہو گی بالکل

اُسی طرح دوسرے کی نہیں ہوگی - اس لئے مصنف حقیقی طور پر اپنے کلام ہی میں زندہ رہتا ہے - جذبات اور مضمون میں نہیں —/

" تصنیف " کے لحاظ سے " جذبات اور جذبات کو نمایاں کرنے کا طریقہ " ان دونوں باتوں کا ایک ساتھہ علم ہوجاتا ہے لیکن لکھنے کا طریقہ خاص طور پر لکھنے والے کا ہوتا ہے —

تالاب کھلے سے پانی اور کھودا ہوا قطعہ زمین ان دونوں باتوں کا ہمیں ساتھہ ساتھہ علم ہوتا ہے لیکن ان دونوں میں فضیلت کس کو ہے ؟ پانی انسان کی بنائی ہوی چیز نہیں ہے وہ ایک دوامی شے ہے - اسی پانی کو خاص طور پر زمانۂ دراز تک لوگوں کے استعمال کے لئے حفاظت کرکے قائم رکھنے کا جو طریقہ ہے وہ انسان کا اپنا ہے اور اسی وجہ سے لوگ بنانے والے کے گن گاتے ہیں - اسی طرح جذبہ بھی تمام انسانوں میں مشترک ہے لیکن اسے ایک مخصوص شکل میں تمام انسانوں کے لئے خاص لطف کا سرمایہ بنانے کا طریقہ ہی مصنف کی تعریف ہے —

اس لئے جذبہ کو اپنا بنا کر سب کا بنا دینا ہی " ادبیات " ہے اور یہی فن لطیف ہے - حرارت پانی میں ' خشکی میں ' ہوا میں ' مختلف چیزوں میں عام طور پر سب میں یکساں ہے لیکن درخت اور بیلیں وغیرہ اس کو مخفی طاقت کے زور سے پہلے پھل خاص شکل میں اپنا بنا لیتی ہیں اور اسی طریقہ سے زمانہ دراز تک وہ سب کے کام آنے والی چیز بن جاتی ہے - اس کا استعمال صرف کھانے پکانے اور گرمائی کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعے سے خوبصورتی ' حفاظت اور صحت بھی حاصل ہوتی ہے —

اس وجہ سے دیکھا جاتا ہے کہ عام لوگوں کی چیز کو خاص طور پر اپنا بنا کر اُسی طریقہ سے پھر اُس کو عام لوگوں کا بنا دینا

ادبیات کا کام ہے —

ایسا ہونے پر علاوہ چیز ادبیات میں سے خود بخود نکل جاتی ہے کیونکہ انگریزی میں جسے " Truth " کہتے ہیں اُسی کو ہم اپنی زبان میں " سچ " کہتے ہیں - یعنی جو چیز ہمارے فہم میں آسکتی ہے اس کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اُس کو ذاتیات کے اپناپے سے الگ کرکے لکھا جائے - سچائی ہر حال میں شخصیت سے بالا تر ' بے داغ اور بے لاگ ہوتی ہے - قانون کشش ثقل جیسا ہمارے لئے ہے ویسا ہی دوسرے کے لئے ہے یہاں اس کا کوئی موقع ہی نہیں کہ انسان خواہ وہ کیسے ہی مختلف اور عجیب دلوں کے ہوں ' اسے اپنے رنگ میں رنگ سکیں سایہ پڑنا آسان نہیں ہے —

جو چیزیں دوسروں کے دلوں میں حرکت اور جوش پیدا کرنے کے لئے ایسے دلوں سے جو فطرتاً ذہین ہوتے ہیں ' سروں ' رنگوں ' اور اشاروں سے مالا مال ہونے کی التجا کرتی ہیں —— جو ہمارے دلوں کے ذریعے سے جب تک خلق نہیں ہوجاتیں تب تک دوسروں کے دلوں میں نہیں بیٹھ سکتیں —— وہی چیزیں ادبیات کا مسالا ہیں - وہ شکل میں ' طریقے میں ' جذبے میں ' زبان میں ' سروں میں ' بحروں میں اسی صورت میں جی سکتی ہیں —— وہ انسان کی بالکلیہ اپنی ہیں وہ ایجاد نہیں ہیں وہ نقل نہیں ہیں وہ انسان کی خلق کردہ ہیں - اس لئے اُن کے ایک دفعہ نمایاں ہوجانے پر انہیں دوسری شکل یا حالت میں بدلنا ممکن ہی نہیں - اُن کے ہر جز پر اُن کے کل کا پورا انحصار ہے - جہاں اس کے برخلاف دیکھا جاتا ہے وہاں وہ جز ادبیات میں سے خارج کردینے کے قابل ہے —



ترکی ادبیات کا احیاء

(۲)

(نوشتہ ڈاکٹر جولی یس جرمانوس استاد اسلامیات بڈا پسٹ یونیورسٹی)

مترجمہ

مولوی سید وہاج الدین صاحب لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد

سنہ ۱۸۲۶ ع کا ایک نہایت ابر آلود اور تاریک دن تھا - قصر توپ قاپو میں ' جو قسطنطنیہ میں نہایت پر فضا جگہ پر واقع ہے ' سلطان محمود ثانی نے اپنی سلطنت کے مدبرین ' علماء اور فوجی افسروں کو جمع کیا اور ترکی کے افسوس ناک حالات کے متعلق ان سے گفتگو کی - ملک سرکش ہو چلا تھا ' اور فوج ہزیمت خوردہ ' نظم و نسق ابتر تھا ' اور رعایا مفلوک الحال - سرکش جانثاری افواج سلطنت کی بربادی کے درپے تھیں ' اور کسی میں اتنی جرات نہ تھی کہ ان کی سرکوبی کرے - اس عالم یاس و ناامیدی میں ایک شخص عبدالرحمن آفندی اپنی جگہ سے اٹھا ' اور ایک مختصر لیکن دل ہلا دینی والی تقریر کی - دوران تقریر میں وفور جوش سے اس کی تسبیح اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر گر پڑی اور اس کے دانے بکھر گئے - اس نے کہا :-

" اگر خدا کی مرضی یہی ہے کہ ہمارا مذہب "

" اور ہماری سلطنت قائم رہے ' تو ہم ان بد کرداروں "
" کا قلع قمع کردیں گے ' نہیں تو اپنی سلطنت "
" اور اپنے مذہب کے نام پر خود قربان ہو جائیں گے "

اس کی یہ تقریر اپنا اثر دکھا گئی - تامل اور پس و پیش کی جو حالت پہلے تھی وہ جاتی رہی اور چند ہی روز میں ' ات میدان ' پر چن چن کر ایک ایک جانثاری قتل کردیا گیا —

اسی واقعہ سے ترکی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے - پہلے یہ جانثاری عثمانی شوکت و عظمت کی بنیاد اور اس کے ستون تھے ' لیکن بعد کو یہی سلطنت کے حق میں سب سے زیادہ پر خطر بن گئے تھے ' اور جب ترکی جمہور نیند سے چونکي اور اس میں خودی کا احساس پیدا ہوا تو اس نے مستقبل کی بنیادیں رکھنے کے لئے ماضی کو مسمار کرنے میں ذرا تامل نہیں کیا - ترکی قوم نے جس طرح اپنے دل کو سخت اور ارادہ کو مضبوط بنا کر جانثاریوں کو قتل کیا ہے ' وہ ان کی آئندہ کی تاریخ کے لئے بطور ایک مثال کے ہے ' اور اس کے بعد سے ہم ہمیشہ یہی دیکھتے ہیں کہ ترکوں نے اپنی مٹی ہوئی عظمت اور شوکت کے کھنڈروں ہي پر ایک تازہ روح اور ایک نئی زندگی کی بنیادیں رکھی ہیں - اگر کسی قوم کی تاریخ محض درباری سازشوں ' سیاسی ناکامیوں ' اور میدان جنگ میں شکست کھانے کی کہتونی نہیں ' بلکہ جمہور کی روحانی زندگی اور تخلیقی قوت ارادي کی داستان ہوتی ہے ' تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ترکی تاریخ بھی زوال کی رام کہانی نہیں ' بلکہ ایک مقررہ منزل مقصود کی طرف برابر ترقی کرتے رہنے کی روئداد ہے - اس میں شک نہیں کہ پچھلی صدی میں یکے بعد دیگرے متعدد صوبے ترکی کے ہاتھ سے نکل گئے '

لیکن اس کے سپوتوں نے لڑائی کے میدانوں میں ایسی جیوت دکھائی کہ ان کے جانی دشمن بھی ان کا لوہا مان گئے' اگر ایک طرف ترکوں نے ظالم یورپ کے سیاسی حوصلوں کا مقابلہ تلوار سے کیا' تو دوسری طرف ان کی ذہانت اور فراست نے ماضی کے نقوش کو ذہنوں سے محو کرکے' یورپ کے مایۂ ناز مفکرین' شعراء اور نغز گویوں کی روح کو اپنے اندر جذب کرلیا - ترکوں کی یہ جنگ مذہب کے واسطے نہیں' بلکہ آزادی اور حریت کے لئے تھی' جس میں کمال ہمت اور استقلال سے کام لے کر عہد رفتہ کے بہتر سے بہتر سرمایہ کو مستقبل کے فائدہ کے لئے بے دریغ قربان کردیا گیا —

ترکوں کی نشاۃ ثانیہ اور ترکی ادبیات کا تجدد مشرق کی تاریخ کا ایک عجیب و غریب واقعہ ہے - ترکوں کے پاس پہلے ہی سے ادبی سرمایہ موجود تھا' جو ان کی تاریخ اور ان کے نظم معاشرت سے بہت قریبی مناسبت رکھتا تھا' لیکن بعد کو جب سلطنت کے اختلال کے بعد پرانی معاشرت کا چولا بدلا' تو لوگوں میں ایک دوسرا ہی ذوق اور ایک جدید روح پیدا ہوگئی' جس نے انہیں تہذیب و شائستگی کے میدان میں آئندہ نئی نئی جولانیوں کے لئے تیار کردیا - سلطنت عثمانی کو بے شک زوال ہوا' لیکن جمہور کی روح مردہ نہیں ہوئی —

قدیم ترکی ادبیات کی جڑیں اس زمانے کی معاشرت کی گہرائیوں تک پہنچی ہوی تھیں - اس ادب کا مرکز اور محور خاص خاص شخصیتیں ہوا کرتی تھیں - قصر شاہی' سلطان اور اس کے ندماء - یہی شعراء و مصنفین کے سرپرست اور ان کا ماویٰ اور ملجاء تھے' اس لئے ادبیات میں بھی انہی کی تحریک کام کرتی تھی - چونکہ رعایا کی حیثیت محض طبقہ اعلیٰ کے ایک اقتصادی

آله کار کی سی تھی ' اور لفظ " قوم " کا اطلاق ان پر نه هوسکتا تھا ' اس لئے ادبیات کا روے سخن بھی ان کی طرف نه تھا ' اور ان کے مذاق اور ان کی ضروریات کا اس میں کوئی لحاظ نه رکھا جاتا تھا —

قدیم ترکی ادبیات کا محور مذهبی الهامات هوا کرتے تھے - شعراء کے دواوین اگر ایک طرف بنی نوع انسان کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور شریفانه جذبات کے راگ گاتے تھے ' تو دوسری طرف هوس‌ناکی کی پستیاں بھی ان میں اکثر نظر آتی تھیں - تصوف کو اعلیٰ سے اعلیٰ یا بدتر سے بدتر معنے پنهانا محض مصنفین یا قارئین کے ذوق پر منحصر تھا - نامق کمال نے ایک مرتبه کہا تھا که دواوین سے جو شیطانی خیالات پیدا هوگئے هیں ' ان کی بنا پر یه قیاس کرنا کچھه زیادہ نا مناسب نہیں هے که لفظ دیوان فارسی " دیو " سے نکلا هے —

پرانا ترکی ادب محض مصنوعی اور تقلیدی تھا - اس میں معنی آفرینی کے بجاے سارا زور فکر صنایع لفظی پر صرف کیا جاتا تھا - ایسے دور از کار استعارے جو صرف انهیں لوگوں کی سمجھه میں آسکتے یا پسند هوتے تھے جو زبان کی باریکیوں سے واقف هوں ' اس ادب کا مایهٔ ناز تھے - ظاهر هے که ایسا طرز نبھنے والا نہیں هوتا - اس میں ترقی کی صلاحیت نہیں هوتی ' نتیجه یه هوا که بند پانی کی طرح یه ادبیات بھی صرف چند مخصوص طبقوں میں محصور هوکر رہ گئی - نثر کا ادب تو اس خصوصیت میں نظم سے بھی بدتر تھا ' اس لئے که بحر و قوافی کی پابندیاں پھر بھی مہمل الفاظ کی بھرتی اشعار میں زیادہ نہیں هونے دیتیں - شعر کا موضوع البته تنگ اور محدود تھا - نبی نے ذیل کے اشعار میں اسی کی شکایت کی هے :-

باقسه اءِ اکثر سخن شاہرخام سنبل و زلف و مے و بلبل و جام
چیقا سان دائرہ دلبردن خط و خال و لب و چشم تردن
(الخ)

(اگر غور کرو تو اکثر شعراء کے سخن کو خام پاو گے —
اس میں صرف سنبل و زلف و مےء و بلبل و جام ہوتا ہے -
ان کے نقوش دلبر کے دائرہ سے باہر نہیں آنے پاتے -
بس اس کے خط و خال ہیں ' یا لب یا نشیلی نگاہیں - ایک سبزہ زار پر کلیلیں کرتا ہے - دوسرا بہار کے مزے لوٹتا ہے - کوی نئے راستوں میں قدم نہیں رکھتا —
بلکہ پرانے جانے پہچانے رستوں پر پڑے ہوے چلے جارہے ہیں) -

مذکورہ بالا چند اشعار پڑھ کر ہم قدیم ترکی ادبیات کی اچھی خاصی تصویر اپنے ذہنوں میں قائم کرسکتے ہیں - یہ قدیم مذہب ادبیات کلاسک ' لکیر کا فقیر ' اور لفاظی سے بھرا ہوا ہے ' لیکن یہ بات چنداں تعجب خیز نہیں ہے ' اس لئے کہ اس زمانے کی معاشرت اور زندگی بھی ایسی ہی تھی ' انسانوں کی اُمنگیں پست اور اغراض محدود تھے ' چنانچہ ادبیات کے بھی جو تھوڑے بہت اصناف تھے ' وہ بھی انہیں کی ہمنوائی کرتے تھے - پرانا مذہب ادبیات تمثیلی تھا - حقیقت نگاری اس میں نہ تھی ' اس میں نری تخیل آفرینی تھی اور وہ بھی چند بندھی تکی اصناف میں - جزئیات اپنی اپنی جگہ پر بہت پرشکوہ ہوتی تھیں ' لیکن مجموعی حیثیت سے ساخت ناقص ہوتی تھی - اس زمانہ کی ادبیات میں تم کو جذبات کا تلاطم نظر نہ آئے گا ' بلکہ ہلکے اور دھیمے تاثرات' اور ایسے پیش پا افتادہ استعارات ملیں گے' جن کا حقیقی زندگی سے کوئی لگاؤ ہی نہیں - مختصر

یہ ہے کہ یہ ادبیات ایک مصنوعی اور خود ساختہ طبقہ کے مذاق کی آئینہ دار تھی' اور اس لئے خود بھی مصنوعی تھی - شعراء جمہور کے درمیان رہتے سہتے تھے' لیکن جمہور کو شعراء کے دیوانوں میں کوئی جگہ نہ ملتی تھی - ان کے پر شکوہ قصیدوں اور عاشقانہ غزلوں میں تمھیں عام انسانوں' کھیتوں میں کام کرنے والوں' کسی دور دراز میدان جنگ میں خون میں نہاکر مرنے والوں کے جذبات' ان کی امنگیں' ان کے صدمات' ان کی خوشیاں' ان کے غم و الم' ان کے حوصلے —— ان میں سے کسی ایک کی بھی صداے بازگشت سنائی نہ دے گی - اس ادبیات میں کسی قسم کی انفرادیت یا شخصیت تمھیں نظر نہ آے گی' اس لئے کہ اس نے اپنے سانچے روز مرہ کی معمولی زندگی سے نہیں لئے تھے' بلکہ ایک سانچہ پسند کرلیا تھا' اور اسی کو ہر موقع پر استعمال کیا جاتا تھا - تمام قدیم ترکی شاعروں کے معشوق ہو بہو ایک سے ہیں' اور تمام شعرا کی مثنویوں میں جو جذبات رنج و الم بیان کئے گئے ہیں وہ سب کے سب ایک ہی فرضی اور خیالی شکستہ دل سے نکلے ہیں —

انقلاب فرانس نے حریت کے انفرادی جذبات پیدا کرکے مشرق قریب کو بھی خواب سے بیدار کردیا - نپولین جب مصر میں پہنچا' تو نئی نئی حربی چالوں کے ساتھ نیا عربی چھاپہ خانہ بھی اس کے ساتھ وہاں داخل ہوا - انقلابی خیالات اور یورپی باشندوں کی بیداری نے ترکوں کے تخیلات اور احساسات میں بھی حرکت پیدا کی - فرانسیسیوں سے تو وہ پہلے ہی سے واقف تھے' اور جب انھوں نے دیکھا کہ فرانسیسی فوجوں نے یورپ کے صدیوں کے جمے ہوے تخت الٹ کر رکھدئے ہیں' تو مشرق کی کہنہ اور خواب آلود فضا میں بھی انفرادیت' تشکیک اور نئی تحقیق و تلاش کا شوق

۷۸۳۶

تیزی کے ساتھ سرایت کر گیا - سر زمین فرانس ترکوں کی نظروں میں ایک نیا جہان اور نیا عالم بن گئی' اور جس طرح وہ صدیوں سے مشرقی خیالات پر ثابت قدم تھے' اسی طرح اب صرف فرانس کے مطیع و معتقد اور ثناخواں بن گئے - فرانسیسی تخیلات' فرانسیسی افکار کے نمونے' فرانسیسی مذاق ادبی' فرانسیسی معاشرت - ان کی کشش نے ترکی کے بہترین دل و دماغ کو اپنی طرف مائل کرلیا' اور انھوں نے اس کی کوشش کی جس طرح ہوسکے' فرانس کے خیالات کو مشرق کی فضا کے موافق اور مطابق بنالیا جائے - سلطان محمود کو جن مشکلات و حوادث کا سامنا کرنا پڑا تھا' ان کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ یورپی طور طریقے اختیار کرلئے جائیں' چنانچہ سلطان عبدالمجید خان نے فرمان گل خانہ صادر کرکے ایک نئے دور کی داغ بیل ڈالی - اس فرمان میں مساوات کو قانون' نظم و نسق مملکت' اور عدل' سب سے پہلے جگہ دی گئی تھی - اگرچہ یہ کار روائی اتنی ہی اندیشہ ناک اور پر خطر تھی جتنا کہ جانثاریوں کا قلع قمع' لیکن بتدریج اس کے بعد دوسری کار روائیاں بھی کی گئیں' جن سے پرانی بنیادیں اکھڑ گئیں' اور نئی تعمیر کے لئے جگہ پیدا ہوگئی - اسی فرمان گل خانہ کی بدولت ' شناسی' کو اپنا اخبار" تصویر افکار" نکالنے کا موقع ملا ' اور نامق کمال اپنا ڈراما " وطن " لکھہ سکا - لیکن بدقسمتی سے ترکی جمہور اور حکمران طبقہ دونوں دنیا کے حالات سے ہنوز با خبر نہ تھے ' اور بہت جلد سازشوں کا بازار ایسا گرم ہوگیا کہ اصلاح کی ساری تجویزیں بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں - "رشید پاشا " نے ' جسے یورپی اصلاح کا بانی مبانی کہا جا سکتا ہے ' عوام کی تعلیم کا کام شروع کیا' لیکن اس کے صلہ میں اسے قتل کی دھمکی دی گئی ' وجہ یہ تھی کہ جو لوگ پرانی وضع پر اڑے ہوے تھے ' انھیں رشید پاشا کے مدارس کی جدید تعلیم کی

طرف سے خوف اور بدظنی تھی - اسی نے اخبارات جاری کر وائے ' جن کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ ترکی زبان جو پہلے بعید از فہم تھی ' عام فہم بن گئی - اسی نے اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کے لئے ' انجمن دانش ' قائم کی - لیکن ان اصلاحات کا رد عمل نہایت عجیب و غریب ہوا - اس پر ہر طرف سے لعن طعن ہونے لگی کہ بچوں سے جغرافیہ کے نقشے کھنچوا کر وہ انھیں تصویر کشی سکھاتا ہے ' اور اس کے رسوخ کے مٹتے ہی یہ تمام نقشے تلف کر دیے گئے - اسی طرح سے جب اس نے یہ تجویز پیش کی کہ نوجوان ترک سپاہی اعلیٰ فنون حربی کی تعلیم کے لئے یورپ روانہ کئے جائیں ' تو جو بد ترین بد معاش اور بد اخلاق آدمی مل سکتے تھے ' ان کا انتخاب کیا گیا ' اس میں مصلحت یہ تھی کہ ترکی کے ہونہار فرزند یورپ کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھنے نہ پائیں گے ' اور باقی رہے خود یہ لوگ ' تو یہ پہلے ہی سے اتنے خراب ہیں کہ یورپ جا کر ان کے اور زیادہ بگڑنے کا اندیشہ نہیں!

اس طرز عمل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ترکی میں آپس کی شکر رنجیوں کو دور کرنا اور جہالت کی تاریکی کو مٹانا کتنا مشکل کام تھا - اراکین نظم و نسق مملکت بھی ان جدتوں اور بدعتوں سے خائف تھے ' اور اسے اپنی ہوس پرستیوں کے حق میں پیام مرگ تصور کرتے تھے —

اس زمانہ میں ادبیات کے اوا بردار ' ' عاقف پاشا ' اور ' پرتو پاشا ' تھے - عاقف یورپی زبانوں سے واقف نہ تھے ' اور انھوں نے بالقصد و ارادہ ادبیات میں کوئی جدت نہیں پیدا کی - دفتری مراسلات میں تو ان کا طرز تحریر اپنے پیش رووں کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے بھی ترقی یافتہ نہیں کہا جا سکتا ' البتہ ان کے خانگی خطوط اور ان کے بعض بعض اشعار میں ایک خیال ایسا نظر آ جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نئی روشنی کی کرن

پڑنے والی ہے :—

" وہ اپنی تحریروں میں اپنے دل کی ترجمانی اوراپنی "

" اصلی روح کا نقشہ اتارنا چاہتے ہیں "

' پرتو پاشا ' نے ' روسو ' (Rousseau) اور ' وکٹر ہیو گو ' (Victor Hugo) کی کتابوں کے ترجمے شروع کئے ' اسی طرح ' اپنی نظموں میں انھوں نے یورپی طرز کی مخلوط بحریں استعمال کیں اور ترکی کے عامیانہ گیتوں کے بول (ہنگل) کننا شروع کئے - لیکن ان جدتوں میں سے کوئی بھی بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوی - وہ زمانہ ان اصلاحات کے لئے ساز گار نہ تھا ' ابھی تک ایسی کوئی ہستی پیدا نہیں ہوئی تھی ' جو جمہور کو بیدار کرے اور ان میں قومی احساس پیدا کرے - ایک صدی قبل ترکی میں جو کچھہ اصلاحات ہوئیں ' وہ خود سلاطین نے اپنے تخت و تاج کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی تھیں ' مثلاً سرکاری ملازمتوں اور عہدوں میں کچھہ رد و بدل ' اور یہ پہلے بھی کئی مرتبہ کیا جا چکا تھا - لیکن وہ نئی روح جو رفتہ رفتہ رعایا کے اندر سرایت کر گئی سلاطین اور پاشاؤں کی پیدا کی ہوئی نہیں تھی ' بلکہ خود جمہور میں سے ایک شخص کی تھی ' جسے ترکی قومی ادبیات کا سب سے پہلا نمائندہ کہا جا سکتا ہے ' یعنی ' شناسی آفندی ' - ادبیات کے متعلق شروع سے ایک خاص مقصد ' شناسی ' کے پیش نظر تھا - اس کی تحریریں محض تفنن طبع کے لئے نہ ہوتی تھیں - وہ قدیم سے جدید کی طرف زینہ بہ زینہ اور درجہ بہ درجہ ترقی پسند نہیں کرتا تھا بلکہ خیال کی ایک دوسری ہی فضا پیدا کرنا اس کا مقصد تھا ' وہ انقلاب پسند تھا ' اور وہی ترکی کا سب سے پہلا معاشرتی اور تمدنی انقلابی تھا - پانچ سو برس پہلے کے قدیم ایشیائی مذہب خیالات کی جگہ وہ ایک نیا مذہب

خیالات پیدا کرنا چاهتا تها ' اور اسے اور اس کے احباب کو جس آسانی سے اس کام میں کامیابی هوئی ' اس سے معلوم هوتا هے که قدیم مسلک کتنا فرسودہ اور بے جان هوکر رہ گیا تها —

شناسی سنه ۱۸۲۶ ع میں پیدا هوا - اس زمانه میں یه دستور تها که جو لوگ سرکاری ملازمتیں چاهتے تهے وہ دفتر کلم (Kalem) کے مدرسه میں بهیج دئے جاتے اور جو لوگ کسی علمی خدمت پر جانا چاهتے وہ " مدرسه " میں شریک هوتے - لیکن رعایا کی بهت بڑی تعداد ناخواندہ اور جاهل رهتی - شناسی نے سرکاری ملازمت کو پسند کیا ' اور اپنے فرائض کے ساتهه ساتهه فرانسیسی زبان بهی سیکهی - عنفوان شباب هی میں وہ پیرس بهیج دیا گیا ' اوو یهیں سے اس نے وہ یاد گار خط اپنی والدہ کے نام لکها جس کے آخری الفاظ یه هیں :—

" میں همیشه شریفانه کاموں میں مشغول رهوں گا "

" اور مذهب اور ملک'وطن'اورملت پراپنی جان فدا کردوں گا"

شناسی هی وہ پهلا ترک هے ' جس نے سب سے پهلے ' اور وہ بهی صرف سترہ سال کی عمر میں " وطن " اور " ملت " کے الفاظ کو ان معنوں میں استعمال کیا - چونکه اسے ادبیات سے خاص شغف تها ' اس لئے اسے فرانسیسی مصنفین کی صحبت مل گئی ' اور لامارتی نے (Lamartine) ارنست رینان (Ernest Renan) اور ساسی (Sacy) کے علمی حلقه تک اس کی رسائی هو گئی - چند سال کی تعلیم کے بعد وہ ترکی واپس آیا ' اور یهاں پهنچ کر مصلح اعظم رشیدپاشا نے اسے " انجمن دانش " کا رکن بنادیا ' لیکن جیسے هی رشیدپاشا کا رسوخ مٹا ' شناسي کو محض اس وجه سے که وہ " ڈاڑهی منڈا " تها وهاں سے نکال باهر کیا گیا ! اس واقعه کے تهوڑے هی عرصه بعد وہ پهر

پیرس واپس چلا گیا ' اور اگرچہ اسے کئی خدمتیں پیش کی گئیں ' لیکن اس نے ان کے قبول کرنے سے انکار کردیا اور سنہ ۱۸۷۰ ع میں ایک ترکی اخبار نکالا ' جس میں یوروپی طرز اختیار کرنے پر زور دیا جاتا تھا - قدامت پرستوں نے اس کی مخالفت شروع کی ' لیکن جوان همت شناسی ' اپنے گنتی کے چند دوستوں کی رفاقت میں ' آخر تک ان کے مقابلہ میں پامردی سے جما رہا - اس کا انتقال قبل از وقت یعنی ۴۶ سال کی عمر میں ہوا ' لیکن جو بیج اس نے بویا تھا ' وہ اس کی زندگی هی میں ایک چھتنار درخت بن چکا تھا - سیاسی حیثیت سے ' وہ مشروطہ خواہ تھا - ادبیات میں اس کا مسلک یہ تھا کہ متقدمین کی فرسودہ رسمیت کو توڑ دیا جاے ' اس نے اپنے ملک کی بہت بڑی خدمت کی ہے اس کی دلیری ' پا مردی ' اور اخبار نویسی کی قابلیت نے تجدد میں جتنا حصہ لیا اور اس تحریک کو جتنا آگے بڑھایا ' وہ کسی اور سے نہ ہوسکا - لیکن اس کے اغراض و مقاصد اس قدر بلند اور شریفانہ تھے کہ اس کی ادبی قابلیت ان کا ساتھ نہ دے سکی - اسے خود بھی اس کا احساس تھا کہ میرا طرز کسی قدر سطحی اور خشک ہے اور میرے معتقدات کی ترجمانی پوری طرح نہیں کرسکتا :-

اینجہ در کرچہ بو فکرم قابا دوشدی تعبیر
ایلدم صانکہ سو کب ایلہ حوری تصویر

(افسوس میرے خیالات سطحی ہیں اور ان کی زبان ناقص -
گویا میں نے قلم دوات سے حور کی تصویر اتاری ہے) -

لیکن ان کوتاهیوں کے باوجود ' محض شناسی کے خلوص اور صداقت کی کی وجہ سے ' ایک ایسی تحریک شروع ہوگئی ' جو اس کے تہذیبی اور سیاسی رجحانات کے عین مطابق تھی ' یعنی ترکی زبان کی پاکی اور صفائی -

اسلام کی ہمہ گیری، اور عجمی اور عربی تہذیب کی مقبولیت کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ترکی زبان ایک کار آمد مخلوط زبان بن کر رہ گئی تھی، جو، اگر سنجیدگی اور اعتدال کے ساتھہ استعمال کی جاتی، تو یقیناً شان و شوکت کے اعتبار سے، دنیا کی تمام زبانوں کی، خواہ زندہ ہوں یا مردہ، ہمسری کرسکتی تھی، لیکن اگر بے احتیاطی سے استعمال کی جاتی — اور بدقسمتی سے اکثر یہی ہوتا تھا — تو اس کی حیثیت محض ایک بے معنی طومار لفظی کی سی ہوجاتی تھی - شناسی نے اپنے اخبار میں جس ٹھیٹ طرز تحریر کی ابتدا کی تھی، اس کے متبعین اس کو نہ پہنچ سکے - شایستہ اور شستہ زبان لکھنے کے لئے عربی اور فارسی الفاظ کے بغیر کام نہ چل سکتا تھا، اور شناسی کی تحریر سے بلند پایہ تحریروں میں ان کا استعمال ناگزیر تھا - اس کے شاگرد اور متبعین مثلاً نامق کمال، اکرم اور عبدالحق حامد جن میں صحافت نگاری کی بجائے، شاعری کا رجحان غالب تھا، زبان کے بارے میں اتنا ٹھیٹ مذاق نہ رکھتے تھے، جتنا شناسی —

شناسی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایک ترکی اخبار " ترجمان احوال " نکالا - چونکہ ٹھیٹ ترکی کے استعمال کا اسے خاص طور پر شوق تھا، اس لئے اس نے ایک صرف و نحو کی کتاب اور ایک ترکی لغت بھی مرتب کی - چونکہ طبیعت ایجاد پسند تھی، اس لئے اس نے ایک طنزیہ ناٹک " شاعر کی شادی " بھی تصنیف کیا، جس میں ترکی کی شادی کی رسموں کا خاکہ اڑایا گیا تھا —

ترکوں میں جو سیاسی بے چینی اور ہیجان پیدا ہوگیا تھا، اس کا رنگ ان کی ادبیات پر بھی بہت گہرا چڑھا ہے - ان کی تصنیفات میں وطنی اور ادبی دونوں رنگوں کی ایک عجیب و غریب ملی ہوی جھلک نظر آتی

ہے - وہ ترکی ادب، جو متقدمین کے زمانہ میں روز مرہ کی جیتی جاگتی چیزوں سے بالکل بے تعلق اور بے نیاز رہتا تھا، وہی اب جمہور کے جذبات کا ترجمان بن گیا - ضیا پاشا، جو اسی زمانے کا شاعر ہے، اور جس کے اشعار سب سے زیادہ نقل کئے جاتے ہیں، نوجوان ترکوں کی اس خفیہ جماعت کا رکن تھا، جو طرز حکومت کا انقلاب چاہتی تھی، اور جس نے آخر میں چل کر عبدالعزیز کو معزول کردیا تھا - پہلے وہ کئی سرکاری ملازمتوں پر، مثلاً والی صوبہ، منشی السلطان وغیرہ رہ چکا تھا - اس کے بعد وہ بھاگ کر یورپ چلا گیا، اور جب واپس آیا، تو مورد عتاب سلطانی بنا اور کسی صوبہ کے شہر میں نہایت کس مپرسی کی حالت میں اس کا انتقال ہوا - اس پر اس قدر مظالم کئے گئے تھے کہ جب وہ مرا ہے تو کسی شاعر کی اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ تاریخ وفات لکھ کر اس کی قبر پر کندہ کراتا - اس کے ادبی مشاغل بکثرت تھے - اس نے فرانسیسی زبان سے کتابیں ترجمہ کیں اور دوسروں کے ترجموں کی عبارت کو مثلاً " تاریخ اندلس " پر شکوہ بنایا، لیکن اس کا اصلی کمال اس کے مقالات سے ظاہر ہوتا ہے، جو اس کی دور اندیشی اور فراست کے ثبوت ہیں - ان مقالات میں اس نے بہت جرأت کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ فارسی عروض ترکی زبان کے لئے موزوں نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے عروض کی بجائے بول (پنگل) گننا زیادہ مناسب ہے - ترکوں کی حقیقی روح نے اپنے آپ کو جن مصنوعی اور خود ساختہ زنجیروں میں مقید کرلیا تھا، ان کے خلاف وہ علم بغاوت بلند کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کا "ترکیب بند،" جو روحی بغدادی کے تصوفانہ ترکیب بند کے جواب میں لکھا گیا، اور وہ ہجو جو اس نے اپنے سیاسی دشمن علی پاشا پر لکھی یہ دونوں فارسی بحروں ہی میں ہیں، اور کہیں کہیں تو اتنی ہی بعید از فہم ہیں، جتنی اس کے پیش روؤں

کی نظمیں - اس کے اشعار آج تک ترکوں کی زبان پر ہیں' اور ان میں سے اکثر تو ضرب المثل بن گئے ہیں —

جس طرح افق مشرق پر ایک کرۂ آتشیں نمودار ہوتا اور اپنی جگمگاہٹ سے دنیا میں اجالا کردیتا ہے' اسی طرح اب ایک نیا شاعر اور مصنف عرصۂ شہود پر جلوہ افگن ہوا' یعنی نامق کمال - اصل میں ترکی ادبیات کا دور جدید اسی سے شروع ہوتا ہے - اگرچہ وہ شناسی کا شاگرد تھا' لیکن ادبی اصلاح کے خیالات کو اس نے انتہائی حد تک پہنچادیا - اس کی ادبی زندگی کا تعلق' بہ نسبت کسی دوسرے شعبہ کے' سیاسیات سے بہت زیادہ تھا - اس کی بے چین اور سیمابی طبیعت نے جمہور کے دل اور تخیل کو مسخر کرلیا' اور اس نے اپنی فصاحت اور شیوہ بیانی سے عظمت رفتہ کو ایک اس سے بھی زیادہ با عظمت و پر شوکت مستقبل کا پیش خیمہ بنا کر پیش کیا - کمال ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا تھا' جس کے اکثر افراد ترکی کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں - عنفوان شباب میں اس نے ایک سرے سے لے کردوسرے سرےتک ترکی سلطنت کی سیاحت کی تھی' غربت اور فلاکت ' نا انصافیوں اور بے عنوانیوں کے جو مناظر اس کے سامنے آئے تھے ' انہوں نے اس کے دل پر بہت گہرا اثر کیا تھا اور ملت کے لئے لڑنے کے عزم کو راسخ کر دیا تھا - وہ کم سنی ہی سے شعر کہنے لگا تھا ' اور قدیمی مرصع طرز کی غزلیں ' قصائد وغیرہ لکھتا تھا ' لیکن ان ابتدائی زمانہ کے اشعار میں بھی کہیں کہیں وطن پرستی کے رنگ کی جھلک نظر آ جاتی ہے - اس نے فرانسیسی کا مطالعہ شروع کیا اور اپنے دیوان کے آخری صفحہ پر بہت ہاتھ روک روک کر اور سنبھل سنبھل کر ' اس نے بعض فرانسیسی مصنفین کے نام لکھے - یورپ نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور اس نے

غزلیں لکھنا چھوڑ دیا ' وہ نوجوان ترکوں کی جماعت میں شریک ہو گیا -
سلطان عبدالعزیز کی حکومت نے اسے گورنر کا سکریٹری مقرر کر دیا ' لیکن
وہ یورپ بھاگ گیا - لندن پہنچ کر ' اس نے ضیا پاشاء کی شرکت میں اخبار
" حریت " نکالا ' اور چار برس تک وہاں رہا - جب ترکی میں عام معافی کا
اعلان ہو گیا ' تو وہ واپس آیا ' اور قیام یورپ کی بدولت جو اضافہ معلومات
اسے ہوا تھا ' اس سے کام لے کر پہلے سے بھی زیادہ جوش کے ساتھ وطنی
خدمت میں مشغول ہو گیا - لیکن اس عرصہ میں ترکی کا سیاسی مطلع
مکدر ہو چکا تھا ' اور ترقی خواہ نوجوان ترکوں نے ' جو مشروطہ کے لئے
جدو جہد کر رہے تھے ' بہت جلد تاڑ لیا کہ سیاسی مطلع کی یہ گھنگور
گھٹا اب برسنے ہی والی ہے - جذبہ آزادی نے جو ایک شریفانہ اور
ہمدردانہ جذبہ ہونے کی حیثیت سے ہر شخص کو مرغوب ہوتا ہے ' ترکی
میں بسنے والی تمام قومیتوں ' مثلاً رومانوی ' سربی ' بلغاری وغیرہ ' غرض
سب کے دلوں میں ایک سی امنگیں پیدا کر دی تھیں - سلطنت ترکی
کی بد نظمی کا اثر ان سب پر یکساں پڑا تھا ' لیکن جو رعایا مختلف المذهب
اور مختلف النسل تھی ' اس نے (مسلمان ترکوں کے مقابلہ میں)
مظالم کو کچھ زیادہ محسوس کیا - علاوہ بریں ان غیر ملکی عناصر کو
یورپ کی مسیحی دول پر بھی بھروسہ تھا ' جن کی حکمت عملی ' اگرچہ
وہ نہایت کوتہ اندیشانہ تھی ' یہی تھی کہ ترکی کے حصے بخرے کر دئے
جائیں - سنہ ۱۸۷۶ ع میں سربیوں نے اعلان جنگ کر دیا ' اور بلغاریوں
نے بھی علم بغاوت بلند کر دیا - الگزینڈر بات چیف (Alexander Bothcheff)
نے ' جو ایک بلغاری وطن پرست اور شاعر تھا بمقام سلسترا (Sillistra)
شاہ دانہ کی لکڑی سے بنی ہوئی بندوق سے پہلی گولی ترکی فوجوں پر چلائی -

اصل میں بلغاریہ اور ترکی دونوں جگھوں کے شاعروں کے دلوں میں ایک ھی سا احساس تھا، یعنی آزادی اور قومی احساس کی بے روک ٹوک ترقی، لیکن سیاسی مدبرین اب تک اسی خواب خرگوش میں تھے کہ گرفتاریوں کے خوف اور آھستہ آھستہ اور جرعہ جرعہ اصلاحات دینے سے قومیت کی یہ رو تھم جاے گی —

کمال نے ایک ناٹک 'سلسترا یا خود وطن' (سلسترا، یعنی وطن) کے عنوان سے لکھا، اور جب یہ قسطنطنیہ میں دکھایا گیا؛ تو غیر معمولی طور پر مقبول ھوا - حاضرین پر اس کے طرز بیان اور سوز و گداز کا اس قدر اثر ھوا کہ وہ بے اختیار ھو کر 'زندہ باد وطن' "زندہ باد ملت" کے نعرے لگانے لگے - کمال کو دوسرے دن ھی گرفتار کرکے 'قبرس' (Cyprus) پہنچا دیا گیا، اور اس بطل جمہور، اور پہلے ترکی ڈراما کے مصنف کی یہ قدر کی گئی کہ اسے ایک تیرہ و تار اور مرطوب کوٹھری میں ڈال دیا گیا، جہاں سے اس کی رھائی اس وقت ھوئی جب عبدالعزیز معزول کیا گیا - جدید سلطان، یعنی سلطان مراد اور اس کے بعد سلطان عبدالحمید یہ دونوں ترقی خواہ جماعت پر نظر عنایت رکھتے تھے، لیکن بہت جلد جنگ روس کی بد بلا ترکی پر مسلط ھونے والی تھی، عبدالحمید نے جو پارلیمنٹ بنائی وہ ترکوں کی آرزوؤں اور خواھشوں کے عین مطابق تھی - اب مستقبل کا راستہ صاف تھا اور ملک میں آزادی کا دور دورہ ھونے والا تھا، لیکن جوشیلے شعراء اور مصنفین نے حقیقت کو نہیں دیکھا، وہ دوسری ھی سلطنت کے خواب دیکھہ رھے تھے - ترقی خواہ ترکوں کا بہادر قائد، یعنی نامق کمال خود آج کل کے معنوں میں قوم خواہ نہ تھا، بلکہ ایک عثمانی وطن پرست تھا - وطن کے متعلق اس کا تصور یہ تھا کہ مسلمان ترکوں کی سلطنت قائم ھو،

پچھلے زمانہ میں جس طرح راہ اسلام میں جانبازی کی بدولت اسلام کو عروج نصیب ہوا تھا ' وہ انھیں مستقبل کے متعلق بھی ھمت دلا تا تھا - بالفاظ دیگر ترکی قوم پرستی کا منشاء و مدعا یہ تھا کہ انیسویں صدی کے یورپ کے اسلحہ اور طریقوں سے کام لے کر اسلام کا احیاء کیا جاے - نامق کمال کا طرز تحریر ٹھیٹ نہیں بلکہ کسی قدر مغلق تھا اس کی نثر کی کتابیں مثلاً جزمی ' ناولیں اور قصے مثلاً بارکۂ ظفر' قانچی' اس کے ڈرامے مثلاً " وطن " زاولی چوجق (غریب بچہ) ان سب میں کسی قدر لفا ظی نظر آتی ھے - سخن آرائی اب تک معنی آفرینی پر غا لب ھے ' اس کے قصو ں کے افراد اسی کی سی رنگین اور مرصع زبان بولتے ھیں اور ان کی سیرتوں میں جو رقت پسندی نظر آتی ھے وہ بھی کچھہ ایسی زیادہ مرغوب اور پسندیدہ نہیں - لیکن چاھے ھم یہ نہ ما نیں کہ کما ل فن کا بادشاہ تھا ' تاھم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ میدان عمل کا دھنی تھا ' اور اس کی ذات ھر تر کی محب وطن اور پر جوش انقلابی کے لئے نمونہ بن سکتی ھے - اس کی ادبی کوتاھیوں کے باوجود ' ترکوں کے دلوں میں کما ل کی جگہ بحیثیت ایک بلند پایہ اور بہترین مصنف کے ھمیشہ باقی رھے گی ' اس لئے کہ جس روح نے تر کی کو گرما دیا ' وہ کمال ھی کی پیدا کی ھوئی تھی —

کمال کے شاگردوں اور ثناخوانوں کا حلقہ بہت وسیع تھا - انھی میں سے ' اس کا مخلص دوست اور شاگرد رجائی زادہ اکرم بھی تھا ' جو ادبیات کا پروفیسر اور باب حکو مت کا ر کن تھا - اگر چہ وہ ھمیشہ سلطنت کا وفادار رھا ' لیکن پو لیس کی بدظنی سے وہ بھی نہ محفوظ رہ سکا ' اور اسے اپنے تمام ادبی لکچروں کو محکمہ سیاسیات کو دکھانا پڑ تا تھا - اکرم ایک پرگو شاعر بھی تھا ' اس کی شاعری کا رنگ عاشقانہ تھا اور چونکہ

اس میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا تھا' اس لئے اس کے اشعار زیادہ تر زندگی کے تاریک پہلوؤں کے متعلق ہوتے تھے - اس کے ہم عصر اسے موجد اور اعلی درجہ کا ذہین شخص سمجھتے ہیں' اور اس حیثیت سے وہ بے شک موجد کہے جانے کا مستحق ہے کہ فرانسیسی ادبیات کے اثر سے' اس نے متقدمین کے راستہ سے ہٹ کر شاعری کے لئے نئے نئے موضوعوں کا انتخاب کیا اور قدیم لفاظی اور صنعت بازی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کی' لیکن اس میں وہ اکثر نا کام بھی رہا - باقی رہی اس کی ذہانت اور ذکاوت' تو اس کے ماننے میں ایک خارجی نقاد کو کسی قدر کلام ہوگا' اس لئے کہ دوسرے شعر گویوں کے مقابلہ میں اس میں کوئی خاص ابداع یا اختراع' تخلیقی قوت' یا خیالات کی کوئی غیر معمولی خوبصورتی نظر نہیں آتی - اس کی زبان بھی ہمیشہ بے عیب اور اعتراض سے خالی نہیں ہے اور اس کے حریف معلم ناجی نے اس پر جو سخت تنقیدیں کی ہیں' وہ اکثر و بیشتر حق بجانب ہیں —

نوجوان ترکوں میں جو جذبہ وطن پرستی پیدا ہو گیا تھا' اس کا ایک اور باکمال ترجمان عبدالحق حامد ہے' وہ نامق کمال کا دوست اور شاگرد تھا' لیکن بہت جلد اپنے استاد پر چھا گیا' اور مشرق کے مشہور ترین مصنفین میں اس کا شمار ہونے لگا - وہ سنہ ۱۸۵۱ ع میں ایک شریف اور علمی مذاق رکھنے والے خاندان میں پیدا ہوا' اور اسے دنیا دیکھنے اور مشرق اور مغرب دونوں کی زبانوں اور ادبیات کی گہری واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا - اس نے بمبئی' میڈرڈ' لندن غرض کہ یورپ اور ایشیا کے مختلف شہروں میں ترکی سفارت خانوں میں ملازمت کی' علوم مشرقیہ کے متعلق تو اس کی نظر پہلے ہی سے بہت گہری تھی' اب اس کے ساتھ

ساتھہ ' اس نے فرانس کے رومانی (Romantic) اور انگلستان کے شیکسپیری مذاھب ادبیات کا اثر بھی قبول کیا - وھی سب سے پہلا ترکی مصنف ھے ' جس نے بحیثیت شاعر ' نثار اور تمثیل نگار کے ' نو مشقوں کی سطح سے بلند ھوکر ' ترکی زبان کو ادبی خیالات کے اظہار کا ایک اعلی درجہ کا وسیلہ بنادیا - عبدالحق حامد کی زبان میں بڑی خوبی یہ ھے کہ اس میں آورد اور تصنع کا کہیں نام نہیں ' اور لغت بازی اور تلاش لفظی کا اس میں شائبہ بھی نہیں پایا جاتا - اس کے الفاظ میں اس کے خیالات کی سی روانی پائی جاتی ھے اور ایسا کبھی نہیں ھوتا کہ محض زبان لکھنے کے شوق میں لفظ لکھے گئے ھوں —

عبدالحق حامد کا ادبی رنگ یہ ھے کہ وہ اپنے موضوعوں کے انتخاب میں رومانیت اور ان کے بیان کرنے میں حقیقت نگاری سے کام لیتا ھے' اس نے اپنے موضوعوں کو یا تو تاریخ مشرق سے لیا ھے تاکہ وہ انسانی قوتیں جو تاریخ کی تہ کے نیچے کام کرتی ھیں جیتی جاگتی بن کر قارئین کی نظروں کے سامنے آجائیں ' یا پھر حقیقی زندگی کے واقعات کو موضوع بنا یا ھے ' تاکہ خاص خاص قسم کی عورتوں اور مردوں کی زندگیاں ' اور ان کے جذبات اور آلام کے نقشے پڑھنے والوں کی آنکھوں کے آگے آجائیں - بحیثیت تمثیل نگار (ترامانست) کے وہ اپنے ھم ملکوں میں پیش پیش ھے ' اور اگرچہ اس کے ترامے ھمیشہ کتابی شکل ھی میں رھیں گے ' کیونکہ اپنی پیچیدہ فنی حیثیت کی وجہ سے وہ اسٹیج پر دکھائے جانے کے لئے موزوں نہیں ھیں ' لیکن ان میں جو گہرے انسانی جذبات اور بلند پایہ اسلوب تحریر پایا جاتا ھے ' اس کی وجہ سے وہ ھمیشہ ترکی ادبیات میں زندۂ جاوید رھیں گے - اس کی ذھانت کا اس سے بڑہ کر اور کیا ثبوت ھو سکتا ھے کہ باوجود اس کے کہ پہلے سے ترکی اسٹیج پر کوئی

نمونہ اس کے سامنے نہ تھا، تاہم محض غیر ملکی اثرات کے ماتحت اس نے ایسے ایسے ڈرامے لکھے، اور اپنے قصوں کے افراد کے ایسے ایسے نفسیاتی چربے اتارے جو بہترین یورپی نمونوں سے ٹکر کھاتے ہیں - اس کی تصنیفات تیس کے قریب ہیں - اس کے بعض ڈرامے نثر اور نظم دونوں میں ہیں، بعض محض نثر میں ہیں، اور بعض شروع سے آخر تک منظوم - لیکن ان منظوم ڈراموں میں اس نے فارسی عروض استعمال نہیں کی ہے بلکہ قدیم ترکی طریقہ یعنی پنگل (بول) گننے کا استعمال کیا ہے، اور اسی کے تقاضہ سے اس کی زبان زیادہ ٹھیٹ اور اس کا طرز تحریر سلیس تر ہو گیا ہے —

عبدالحق حامد کے بعض ڈراموں کے قصے ہندوستان سے لئے گئے ہیں - عنفوان شباب ہی میں، جب وہ ہندوستان آیا بھی نہ تھا، اس نے ایک ڈراما " دختر ہندو " لکھا تھا، جس میں ایک انگریز افسر اور ایک ہندوستانی لڑکی کے عشق کا قصہ بیان کیا گیا ہے - انگریز افسر ہندوستان میں جس بے فکری اور عیش کی زندگی گزارتے ہیں، یہ قصہ اس کی ہو بہو نفسیاتی تصویر ہے - ہندوستانیوں اور انگریزوں کی معاشرت میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں اس کے متعلق بھی ہمیں اس قصہ کو پڑھ کر بصیرت حاصل ہوتی ہے، اور آج سے پچاس سال پیشتر ہی، ہمیں (اس ڈرامے میں) جمہور ہندوستان کو آزاد کرنے کے متعلق ایک موثر اپیل نظر آتی ہے —

بمبئی کے قنصل خانہ کے قیام کی وجہ سے اسے ہندوستان کی معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا - وہ اسے " سبز و شاداب ملک " کہتا ہے " جس کے پرندے انسانی زبان میں باتیں کرتے ہیں " - اس گہری واقفیت ہی کی بنا پر اس نے سنہ ۱۸۸۹ ع میں، جب وہ لندن میں تھا، اپنا مقبول عام

ڈراما " فن تن " (Fin ten) لکھا - اور سب ڈراموں سے زیادہ اس کے اسی ڈرامے میں ہمیں جزئی سے جزئی باتوں میں خاص اہتمام نظر آتا ہے ' اور اس کے فنی نقوش اور نفس قصہ دونوں میں شیکسپیر کا اثر خاص طور پر نمایاں ہے - اس موقع پر اگر ہم اس ڈرامے کی تلخیص ناظرین کے سامنے پیش کریں تو شاید کچھ ایسا بے محل نہ ہوگا :-

مسز کراس (Mrs. Cross) ' جو " فن تن " کی ہیروئن ہے ' ایک حسین عورت ہے ' جس کی شادی آسٹریلیا کے ایک متمول شخص سے ہوئی ہے ' جو سونے کی کانوں کا مالک ہے - یہ عورت لندن میں مقیم ہے ' اور نظر بازیوں اور عشوہ طرازیوں میں اپنا وقت گزار رہی ہے - یہاں ایک لارڈ اس کے دام عشق کا اسیر ہوجاتا ہے ' مسز کراس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے ؛ جسے اپنا لڑکا سمجھ کر یہ لارڈ مسز کراس سے شادی کرنا چاہتا ہے - لیکن اس میں کئی دقتیں ہیں ' جنہیں دور کرنے کے لئے حوصلہ مند مسز کراس (فن تن) ایک نہایت جسارت آمیز ترکیب سوچتی ہے - پہلے اسے ایک مدقوقہ لڑکی کی تلاش ہے ' جس کی شادی لارڈ سے کردی جائے ' اور اپنے ناجائز اور کاودی لڑکے کو اس لڑکی کی جائز اولاد بتا دیا جائے - اس کے بعد وہ یہ چاہتی ہے کہ اپنے وفادار نوکر کے ہاتھوں اپنے شوہر کو مروا ڈالے - اپنے طبیب خاص کی مدد سے اسے مدقوقہ لڑکی تو ایک اسپتال سے مل جاتی ہے ' لیکن اس کا وفادار نوکر دولاجی راو ' جو ہندوستانی ہے ' راضی نہیں ہوتا ہے ' وہ اپنی مالکہ کا ہر حکم بجالانے کے لئے تیار ہے ' وہ اس کے لئے تیار ہے کہ جنگل میں جاکر شیرنی کے پنجے سے اس کے دودھ پیتے بچے اٹھالائے ' لیکن اپنے بوڑھے مالک ' مسٹر کراس ' کو مارنے کے لئے وہ آمادہ نہیں ہوتا - بہت کچھ

بحث مباحثہ کے بعد ' جس میں 'فن تن' 'دولاجی راو' کی محبت کا دم بھرتی ھے ' اور جس سے برسبیل تذکرہ یہ راز بھی آشکار ھوتا ھے کہ وہ نا جائز لڑکا دراصل اس نوکر کے عشق ھی کا نتیجہ ھے ' بالآخر نوکر نمک حرامی پر راضی ھوتا اور آسٹریلیا کی طرف روانہ ھوجاتا ھے -

لیکن یہاں سے پیچیدگیاں پڑنا شروع ھوتی ھیں - مدقوقہ لڑکی ' (جسے اسٹیج پر لاتے وقت شاعر نے گریز کرکے بیماروں، ان کے آلام اور ان کی موت کے متعلق لمبے چوڑے اشعار لکھے ھیں) لارڈ سے محبت کرنے لگتی ھے ' اور اپنی مہلک بیماری سے اچھی ھو کر اس کے ساتھ ' بیروت ' بھاگ جاتی ھے ' 'فن تن' آتش رقابت سے جل کر ان کا پیچھا کرتی ھے - لیکن اب وہ لارڈ دل و جان سے اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ھے جو پہلے مدقوقہ تھی ' اور وہ 'فن تن' کو منہ بھی نہیں لگاتا - اس کے بعد سمندر پر ایک طوفان خیز رات کا منظر پیش کیا گیا ھے ' 'فن تن' ایک چھوٹی سی کشتی میں سوار ھو کر لارڈ کے تعاقب میں جاتی ھے اور قریب ھے کہ طوفان میں ھلاک ھوجائے ' لیکن دولاجی راؤ جو آسٹریلیا سے اپنے مالک کو قتل کرکے واپس آرھا ھے ' اس کی چیخیں سنتا ھے ' اور اسے بچا کر اپنے جہاز پر لے آتا ھے ' جس پر خود اس کی معشوقہ جو ایک کسان کی لڑکی ھے ' اس کے ساتھ سفر کررھی ھے - یہاں پھر کسان کی لڑکی اور فن تن کے درمیان رقابت کا منظر پیش آتا ھے اور دولاجی راؤ اس لڑکی کو قتل کرڈالتا ھے ' اور فن تن کو گود میں لیکر جہاز سے کود پڑتا ھے اور تیر کر صحیح و سلامت کنارے پر پہونچ جاتا ھے - اب یہ دونوں لندن میں زندگی بسر کرتے ھیں - فن تن لارڈ کو بھول جاتی ھے ' لیکن اپنے لڑکے کو واپس پانے کی غرض سے ' اسے مطلع کرتی ھے کہ اس

کا اصلی باپ دولاجی راؤ ہے - یہ دونوں شادی شدہ زندگی بسر کرتے ہیں ' لیکن دونوں میں سے کسی کو بھی اطمینان نصیب نہیں ہے - دولاجی راؤ قید ہو جاتا ہے ' اس کو وہاں سے چھڑانے کے لئے فن تن کئی روز گھر سے باہر رہتی ہے ' اور بالآخر اسے رہا کرا لاتی ہے ' لیکن دولاجی راؤ' فن تن کی طرف سے بدظن ہو جاتا ہے اور غصہ میں آکر اپنے لڑکے کو مار ڈالتا ہے' فن تن محبت مادری سے بے تاب ہو کر دولاجی راؤ کو گولی سے ہلاک کر دیتی ہے —

سیاہ فام دولاجی راؤ کی رقابت ہمیں آتھیلو کی رقابت یاد دلاتی ہے' لیکن ڈرامے میں کچھ ایسے فنی نقائص پائے جاتے ہیں کہ ہم ان دونوں (آتھیلو اور دولاجی راؤ) کا محض سطحی طور پر ہی مقابلہ اور موازنہ کرسکتے ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ اس ڈرامے کو مصنف نے بہت کچھ محنت اور کاوش سے لکھا ہے' لیکن اس کے بعض بعض اشعار میں غضب کی روانی پائی جاتی ہے - ایک اور ڈراما ' جس کا قصہ تاریخ ہندوستان سے لیا گیا ہے ' ' اشہر ' ہے - اس کے لکھتے وقت ترکی مصنف کے سامنے کارنیلی کا ' جو رومانی طرز کا جید فرانسیسی استاد تھا ' قصہ ہوریس (Horace) بطور نمونہ کے تھا - اشہر کشمیر کا بادشاہ ہے - فاتح عالم سکندر رومی اس کی حسین بہن پر عاشق ہو جاتا ہے - یہ لڑکی جس کا نام ' سرو ' ہے اس خیال سے کہ اس کے بھائی اور سکندر میں جدال و قتال کی نوبت نہ آنے پائے ' معاملہ کو رفع دفع کرنے اور سمجھوتا کرانے کی کوشش کرتی ہے ' لیکن مغرور بادشاہ اس پر راضی نہیں ہوتا اور اپنی بہن کے قتل کا حکم دے دیتا ہے - اس اثنا میں سکندر ملک پنجاب کی طرف پیش قدمی کرتا ہے رکزن (Rokzan) دارا کی بیٹی ' جو خود سکندر پر عاشق ہے

اس کی کوشش کرتی ہے کہ وہ اپنی معشوقہ سمرو سے نہ ملنے پائے ' لیکن سکندر اسے ہاتھی کے قدموں کے نیچے روندواکر مار ڈالتا ہے ' اور بہادر اشبر کو شکست دیتا ہے ' جو شرم کے مارے خود تلوار مار کر مر جاتا ہے۔ اس کشت و خون کے دوران میں ارسطو بھی اسٹیج پر آتا ہے اور اس طنزیہ جملہ سے ڈرامے کو ختم کرتا ہے " اسی کا نام فتح ہے ! " —

اگر چہ اس ڈرامے کی فضا مصنوعی ہے ' جسے تاریخی ڈراما لکھنے والے فرانسیسی رومان نویسوں کا ورثہ سمجھنا چاہئے ' تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں تمثیلی توازن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے —

عبدالحق حامد کا ایک اور ڈراما بھی ہے ' جو کارنیلی (Corneille) کے " لی سد " (Le Cid) کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں مصنف نے پہلی مرتبہ ہنگل کی بحروں کو استعمال کیا ہے ' لیکن چونکہ اسے اسٹیج کی زبان کا لحاظ بھی رکھنا پڑا ہے ' اس لئے اس کی موسیقیت جا بجا کسی قدر اکھڑی اکھڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس ڈرامے کا نام " نسترن " ہے۔ قصہ کا منظر کابل میں ہے اور اس میں تخت و تاج کے ایک جھوٹے مدعی کی ' اپنے باپ کے خلاف سازشوں کو دکھایا گیا ہے۔ قصہ میں جان ڈالنے کے لئے رومانی عشق و محبت کی چاشنی دی گئی ہے —

ایک اور رومانی ڈراما ' " زینب " ہے ' جس میں مافوق البشری قوتوں کی تاثیرات اور الہامات سے بحث کی گئی ہے۔ اس کا ماحول بھی مشرقی ' یعنی ہندوستانی اور افغانی ہے۔ اس کا کچھ حصہ منظوم ہے ، اور کچھ نثر میں ' نثر کا حصہ نسبتاً زیادہ بر جستہ اور جاندار معلوم ہوتا ہے —

اب ہم اس پرنویس مصنف کے بقیہ ڈراموں کے صرف عنوانات ہی

بتانے پر اکتفا کرتے ہیں - اس کی پرنویسی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب اس کی غیر معمولی طبیعت حاضر ہوتی اور آمد شروع ہوتی تو وہ ایک ایک دن میں ڈیڑھ سو شعر کہہ دیا کرتا تھا :—

' سر ڈنپل " آشوری زمانے کا ایک تاریخی ناٹک ہے طارق ' ابن موسیٰ ' طزر اور عبداللہ الصیغر ' ان سب کے قصے عربی اندلس سے لئیے گئے ہیں ' لبرتی ' یہ ایک مثالیہ قصہ ہے ' جس میں عبدالحمید کی استبدادی حکومت پر چوٹیں کی گئی ہیں : الغان اور ترخان ان میں مصنف نے تورانی ترکوں کی سابقہ عظمت کے گیت گائے ہیں ۔ ان دونوں ڈراموں کو گویا اس تحریک " توران خواہی " کی منادی سمجھنا چاہئیے ' جو بعد میں چل کر ظاہر ہوئی —

عبدالحق حامد صرف ایک پر زور تمثیل نگار ہی نہ تھا ' بلکہ بیانیہ شاعری پر بھی اسے اعلیٰ درجہ کی قدرت حاصل تھی ۔ اپنی نظم صحرا و بلدہ میں اس نے اس عشق کا اظہار کیا ہے جو اسے سبزہ زاروں ' مرغزاروں ' دھیمی ہوا میں ہلنے والے درختوں اور ان کی ترنم ریزیوں کے ساتھ تھا - ان چیزوں کو وہ خالص الہامات سمجھتا ہے اور ان کے مقابلے میں شہروں کے تصنعات اور زر پرستیوں کو نام دھرتا ہے - حامد سے پہلے کسی ترکی شاعر نے نہ تو دیہات کی فضا کا اتنا گہرا اثر اپنے قلب پر لیا تھا ' اور نہ اس زور اور قدرت کلام کے ساتھ اسے بیان کیا تھا - ادبیات کی یہ صنف خالص مغربی الاصل ہے ' اور اسی کی خاطر حامد نے مشرقی عروض کو چھوڑ کر ' فرانسیسی طرز کے مخلوط قوافی استعمال کئیے ہیں ۔ حامد کا اس طرح لوچ کے ساتھ دیہاتی فضاؤں کی تصویریں اُتارنا خاص کر اس وجہ سے اور زیادہ قابل توجہ ہے کہ وہ شہروں کی زندگی ،

ان کے شور شغب اور ان کی دلچسپیوں کا بہت شوقین تھا چنانچہ اپنی نظموں کے ایک مجموعہ " دیوانهلی کلمیرم " (میرا جنون شباب) میں اس نے انھی چیزوں کو بیان کیا ہے —

اس نے ایک منظوم قصہ " غرام ": (جذبہ عشق) بھی لکھا ہے ' جس میں مذہب ' تصوف ' فنا وغیرہ کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں —

اپنی پہلی بیوی کی وفات کا ' جو بیروت میں واقع ہوئی تھی ' حامد پر اتنا اثر ہوا ' کہ وہ خود کشی کرنا چاہتا تھا ' اور اس کے اعزا و اقربا کو کامل چالیس دن تک اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنی پڑی - اس زمانہ میں اس نے مقبرہ کے عنوان سے اپنی بیوی کا ایک نہایت پر اثر اور دل ہلا دینے والا مرثیہ لکھا ' جو اس وجہ سے کہ اس میں رقت اور سوز و گداز کا عنصر بہت افراط سے تھا ' اُس زمانہ میں تو مقبول نہ ہو سکا ' لیکن اب اس نے ترکی ادبیات میں اپنی ایک مخصوص اور معزز جگہ پیدا کر لی ہے —

ترکی ادبیات کی تاریخ میں ایک اور نمایاں ہستی جو خاص کر ترکی ناول نویسی کے سلسلہ میں قابل ذکر ہے " سزائی بے " کی ہے - انھوں نے اپنی کتابوں ' ' کوچک شے لر ' (چھوٹی چھوٹی چیزیں) اور ' سرگزشت ' میں سب سے پہلی مرتبہ ایسے قصے لکھے جو بڑی بڑی حرم سراؤں اور ان کی کنیزوں کے حالات پر مبنی تھے - اگرچہ مصنف نے مشرقی زندگی کے اس رنگین رخ پر سخت سخت تنقیدیں کی ہیں ' تاہم ان کی قوت بیان بہت زبردست ہے ' اور ان افسانوں کے مختلف اجزا کے درمیان کمال کا تسلسل پایا جاتا ہے - یہ ایک عیب اس میں بے شک ہے کہ لمبے چوڑے جملے لکھ کر عبارت کو خراب کر دیا گیا ہے - یہ ناول تمثیلی نہیں ہے -

اور اس اعتبار سے پرانی شاعرانہ سے الگ ہے بر خلاف اس کے یہ حقیقت پر مبنی ہے ' اور اس میں مصنف نے مشرقی زندگی کے متعلق ایک نیا تصور قائم کرکے جدت کا ثبوت دیا ہے

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادبیات کی یہ نئی روح پرانی روح کو ایک دفعہ ہی مٹا نہیں سکی - جس طرح اب تک ہم نے مشرق کو مغرب سے ملانے والی ادبی کڑیوں کو (خصوصاً صنف نظم میں) دیکھا ہے ' اسی طرح ہم کو ' ینی شہرلی اونی ' ' ہر سک لی عارف حکمت ' اور ' لس کات‌چلی غالب بے ' کے ناموں کو بھی نہ بھولنا چاہئیے ' ان لوگوں نے اپنا ایک مخصوص ادبی حلقہ قائم کرلیا تھا اور ترکی شاعری کی پرانی روایات پر ثابت قدم تھے - رجعت پسند طبقہ کا نمایندہ معلم ناجی تھا جس نے اپنے ادبی مشاغل کے ابتدائی دور میں نئے مذہب شاعری کے بے تکے پن ' خصوصاً اکرم اور عبدالحق حامد پر سختی سے تنقیدیں کیں - لیکن دوسرے دور میں ' جب وہ فرانسیسی زبان سیکھہ چکا ' تو ان ادبی بدعتوں کے متعلق اس کا رویہ کسی قدر نرم ہو گیا ' اور خود اس نے کئی اعلی درجہ کی نثر کی تحریریں ' ٹھیٹ ترکی زبان میں اور اعلی درجہ کی فصاحت کے ساتھہ لکھیں . ترکی زبان کی صفائی ' اور صرف ٹھیٹ زبان لکھنے کے متعلق اس کی راے اس کے اس جملے سے معلوم ہوتی ہے :—

' اگرچہ ترکی زبان میں عربی وفارسی کے بے شمار '
' الفاظ ہیں ' لیکن ان کو صرف ایسے اجزا '
' سمجھنا چاہئیے جنھیں ترکی اپنے مخصوص '
' معنوں اور اپنے مخصوص تلفظ کے ساتھہ استعمال '

" کرسکتی ھے " - *

اسی زمانے میں " ترجمان حقیقت " اخبار جاری ھوا تھا ' اور اس کے ادبی نقاد کی حیثیت سے انھیں اپنے ھم وطنوں کو الفاظ کا صحیح استعمال سکھانے کا بہت کچھ موقع حاصل تھا - اپنی قوم میں وہ بجائے مصنف کے ' استاد زبان کی حیثیت سے زیادہ معروف تھے اور اسی وجہ سے انھیں " معلم " کا لقب دیا گیا - ان کا خاص کار نامہ یہ ھے کہ اپنے تنقیدی مضامین لکھ لکھ کر انھوں نے ' جوشیلے جدت پسندوں کی روک تھام کی ' جو اکثر اپنے جوش اختراع میں ادبی ذوق کی حد سے بھی متجاوز ھوجاتے تھے - ان کی خاص خاص تصنیفات یہ ھیں :-

آتش پارہ (چنگاری) - اس کتاب کے ذریعہ سے انھوں نے بقول خود —

" ویرھم آتش دللرہ سوز دل آوارہ دن
ایلدم ایجاد بہ یک یا تعین بر آتش پارہ دن "

(ایک دل سوزاں و آوارہ سے میں نے کئی دلوں میں آگ لگائی ایک چنگاری سے هزاروں دیا سلائیوں کو جلا دیا)

حمیت کے عنوان سے انھوں نے ارطغرل غازی کی ایک مقفی تاریخ بھی لکھی ھے - ان کے منظوم کلام کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ھے کہ وہ کوئی بہت زیادہ بلند مرتبہ شاعر نہیں ھیں - ان کی نثر کی تصانیف مثلاً سنبلہ ' جو چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ ھے اور بیچ بیچ میں کچھ نظمیں بھی ھیں —— اپنی سلاست کے اعتبار سے خاص طور پر

---

* انشاللہ خاں نے " دریاے لطافت " میں اردو زبان کے مختلف الاصل الفاظ کے متعلق بھی بعینہ یہی رائے ظاھر کی ھے —

قابل ذکر ہے —

اس ادبی زندگی اور جدوجہد کے ساتھہ ساتھہ' انیسویں صدی میں ترکوں کے علوم بھی خواب غفلت سے بیدار ہوے - علم کے میدان میں سب سے اعلیٰ اور افضل ذات ' احمد جودت ' کی تھی ' جو ماہر سیاسیات بھی تھا اور استاد اور مورخ بھی - اور اپنی زبان کی سب سے بڑی خدمت انھوں نے تاریخ ہی کے شعبہ میں انجام دی ہے' یعنی ان کی تاریخ ترکی جو بارہ جلدوں میں ہے اور سنہ ۱۷۷۴ ع سے سنہ ۱۸۲۵ ع تک کے زمانہ پر حاوی ہے - ترکی میں اس سے زیادہ مستند اور کوئی تاریخ نہیں اور اس کی زبان از اول تا آخر سیدھی سادھی اور تصنع سے بری ہے —

مغرب کی سمت سے جو ہوائیں آ رہی تھیں' انھوں نے ترکوں میں ایک خاص ادبی فضا پیدا کردی' اور انیسویں صدی کی رومانیت (Romanticism) سے مسحور ہو کر انھوں نے کمال شوق کے ساتھہ مختلف علوم کا مطالعہ شروع کردیا' اور ان میں ایک باکمال ذات ایسی پیدا ہوگئی جس نے اپنی قوم کی تلاش علم اور تفریح کی خواہش دونوں چیزوں کو پورا کردیا - یہ ذات ' احمد مدحت ' کی تھی - واضح رہے کہ ' احمد مدحت ' سیاست داں اور مدبر دوسرا شخص تھا یہ ' احمد مدحت ' اپنے زمانہ کا قاموس نویس تھا - اسے ہر چیز کے متعلق تھوڑی بہت معلومات تھی' اور وہ اسے اپنے ہم وطنوں کو بھی فراہم کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا - جریدہ عسکریہ' 'جریدہ حوداث' اور ترجمان حقیقت کے مدیر کی حیثیت سے اس نے ہزاروں ہی مضامین لکھے' وہ نہایت پر نویس اور جامع الحیثیات تھا اور ہر موضوع پر' جس ضخامت کا مضمون اس سے کہا جاے لکھہ سکتا تھا - بحیثیت فلسفی کے' اس نے اپنی تمام تر توجہ روحِ مادئیں پر مبذول رکھی' اور فلاسفہ مغرب کی

تردید سے تو اس کا قلم کبھی تھکتا ہی نہ تھا' اور اس موضوع پر اس کی تحریریں کئی جلدوں میں سما سکتی ہیں - اگرچہ بعض اوقات اس کا استدلال نہایت غیر فلسفیانہ ہوا کرتا تھا' لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اپنے زمانے میں (یعنی سنه ۱۸۸۰ اور اس کے قریب) اسی کی دلچسپ کتابوں نے ترکوں کے ذہنی جمود کو توڑا' اور انہیں تعمق اور تفکر پر اُبھارا - اس نے یہ ثابت کر دکھایا کہ اسلام کی اعلیٰ اور شریفانہ روح سائنس اور فلسفہ کی ترقی کے منافی نہیں ہے —

اگرچہ اسے ایک اعلیٰ درجہ کا ناول نویس نہیں کہا جا سکتا' تاہم اس حیثیت سے بھی اس کی خدمات کچھ کم قابل لحاظ نہیں ہیں - اس کی کتابیں' نہ صرف ترکی میں' بلکہ تمام ایشیا کی ترکی بولنے والی اقوام میں پڑھی جاتی تھیں - اگر ہم صرف اس کی ناولوں کے عنوانات ہی لکھیں' جن میں سے کچھ ترجمے ہیں اور کچھ اپنی خاص چیز' تو اسی میں کئی صفحات خرچ ہو جائیں - کم از کم ان کی تعداد ایک سو سے تو ضرور اوپر ہے - اگر وہ کسی ناول کا ترجمہ کرتا' تو اس میں اپنی طبیعت سے بھی کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کردیتا تھا - اس نے ترکوں کو پڑھنا سکھایا اور ان کے دلوں میں ناول خوانی کا شوق پیدا کیا - شروع شروع میں وہ خیالی اور جالب توجہ قصے لکھا کرتا تھا' لیکن جب اس نے دیکھ لیا کہ قارئین انہیں انتہائی شوق سے پڑھتے ہیں تو رفتہ رفتہ اس نے ناولوں میں حقیقت آمیزی اور تحلیل نفسی شروع کردی' تاکہ لوگوں کی اخلاقی تعلیم بھی ہوتی رہے' اور ان میں کمال پیدا ہوجائے - اس کے قصوں میں جتنے مجرم اور گنہ گار نظر آتے ہیں' وہ سب کے سب اپنے کیفر کردار کو ضرور پہنچ جاتے ہیں —

چونکہ وہ نہایت ہی وسیع المعلومات تھا، اس لئے اپنی ناولوں کے ذریعہ سے وہ اپنی قوم کا معلم اور استاد بن گیا - وہ مقابلہ میں فرانسیسی مصنف جولس ورن سے کسی طرح کم نہیں ہے ' بلکہ کہیں کہیں تو تخیل آفرینی میں وہ اس سے بھی آگے نکل گیا ہے - اس کی اکثر ناولوں کے واقعات دور دراز ممالک کے ہیں ' مثلاً امریکہ ' برےزیل ' ہندوستان وغیرہ ' اور ان ملکوں کے باشندوں کے عادات ' رسم و رواج وغیرہ کے جو حالات اس نے لکھے ہیں وہ ترکی قارئین کے لئے مدرسوں کی جغرافیہ کی تعلیم سے کہیں زیادہ سود مند ہیں - اس کی تیز نویسی کا ایک قابل افسوس نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس کا طرز تحریر عامیانہ ہے اور قدیم ادبی معیاروں تک نہیں پہنچتا ' لیکن غالباً اپنے طرز کی اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ اتنا مقبول بھی ہوا ' اور پڑھنے والوں پر اتنا زیادہ اثر ڈال سکا —

لسانیات کے شعبہ میں جس شخص نے شہرت پیدا کی ' وہ ' احمد وفیق پاشا ' تھا ' وہ مدبر تھا ' لیکن تحریر کا ایک خاص مذاق رکھتا تھا ' اور اپنی فرصت کے اوقات میں اس نے ایسی ایسی لسانیاتی کتابیں تصنیف کیں ' جو ترکوں کے لئے نہایت اہم اور ضروری تھیں - وہی سب سے پہلا ترکی ماہر لسانیات تھا ' جس نے یوروپی ماہرین السنہ مثلاً ردھاوس (Redhouse) کے اصول تحقیق پر کاربند ہوکر ایک ترکی لغت " لہجہ عثمانیہ " مرتب کی ' اور " جگتائے لغاتی " یعنی وسط ایشیا کی ترکی زبانوں کی ایک شرح لکھی - اپنی ان تصنیفات کے ذریعہ سے ' اس نے عثمانی ترکوں میں نسل پرستی کا احساس پیدا کیا ' اور ان کے دلوں میں جذبہ توران خواہی کی بیداری میں حصہ لیا - اس نے " ابوالغازی بہادر خاں " کی ' شجرات ترک ' کا بھی ترجمہ

کیا - لیکن مذکورہ بالا ادبی خدمات سے بھی کہیں زیادہ قابل قدر اس کے وہ اعلیٰ درجہ کے تراجم ہیں، جو اس نے فرانسیسی کتابوں کے کئے - اگرچہ اس سے پہلے بھی یوسف کیامل پاشاہ نے ' فے‌نی لان (Fenelon) کی مشہور کتاب تے لی ماک (Telemaque) کا ترجمہ کیا تھا ' لیکن اس میں مغلق اور متروک الفاظ و عبارات کی کثرت تھی ' اس کے مقابلہ میں احمد وفیق پاشا کے تراجم آج تک ترکی زبان کے کلاسک بنے ہوئے ہیں - اس نے مولی‌یر (Moliere) کے ناٹکوں کو اس طرح پر "اپنایا" کہ ان کے ہیروؤں کو بطور نمونہ لے کے انہیں ترکی بساط پر بٹھا دیا - اب ترکی میں یہی فیشن ہوگیا ہے کہ غیر ملکوں کے ناٹکوں کو اپنا لیا جاے ' یعنی خاص خاص افراد قصہ کی سیرتیں وہی رہیں - جو اصل میں تھیں ' اور قصہ کا عام رنگ بھی وہی ہو ' لیکن افراد قصہ کو ترکی نمونوں میں اور غیر ملکی ماحول کو ترکی ماحول سے بدل ڈالا جاے * - البتہ یہ بات کسی قدر افسوس ناک ہے کہ یہ تراجم اسٹیج پر نہ دکھائے جاسکے - عبدالحق حامد کو بھی ہر نئی چیز کی طرف سے کچھہ ایسا خوف (جدت ترسی !) تھا کہ ترکی میں اسٹیج کے قابل کھیلوں کی ترقی نہ ہوسکی ' بلکہ زیادہ تر ناٹک صرف

---

* اردو کے افسانہ نویس بھی اگر اسی اصول پر کاربند ہوں تو بہتر ہے - خاکسار نے بھی مولی‌یر کے ڈرامے (Forced Marriage) کو " نکاح بالجبر " کے عنوان سے ' علی‌ہذا گوگول کے ڈراموں " Marriage " اور " Inspector - General " کو نیز چخوف کے چند افسانوں کو اپناکر اس کا تجربہ کیا ہے ' اور اکثر احباب اور نقادان فن نے انہیں پسند کیا ہے - یہ ڈرامے اسٹیج پر بھی دکھاے جاچکے ہیں —

۱۲ — مترجم

کتابی صورت ھی میں رھے —

اس دور کے مورخین میں 'مراد بے' سب سے بڑا ھے - چونکه اصل کے اعتبار سے وہ روسی ترک تھا' اس لئے تاریخ کے غیر ملکی مآخذ تک بھی اس کی دست رس تھی - اس کی ضخیم کتاب تاریخ عالم جو چھ جلدوں میں ھے' فاحش اغلاط سے پر ھے' علی ھذا اس کی تاریخ آل عثمان میں جس کا عنوان " تاریخ ابوالفاروق " ھے قیاسی کلیات اور تعمیمات سے بہت زیادہ کام لیا گیا ھے - ایک عرصه تک' یعنی اس وقت تک جب که نئی انجمن تاریخ نے ترکی تاریخ کے مآخذ کی طباعت شروع کرکے تقابلی مطالعه تاریخ کے علمی اصول قائم نہیں کئے تھے —— 'مراد بے' کی تاریخ ھی مستند ترین سمجھی جاتی تھی —

اسی سلسله میں ' ابوالضیا توفیق ' کا ذکر کرنا بھی ضروری ھے' اس لئے که وہ چاھے بلند پایه مصنف کی حیثیت سے معروف نه ھو' تا ھم ایک پر جوش وطن خواہ اور واقف فن ناشر کتب کی حیثیت سے ضرور ممتاز ھے - تمام بڑے بڑے ترکی مصنفین کے ساتھ اس کے دوستانه تعلقات تھے' اور اس نے ان کی تصنیفات کو جس اھتمام اور خوش ذوقی کے ساتھ شایع کیا ھے' اس کا جواب ترکی طباعت میں آج تک پیدا نہیں ھوا ھے - اس کی کتاب " نمونۂ ادبیات" تاریخ ادبیات ترکی کا سب سے پہلا نمونه ھے - شمس‌الدین سامی' یعنی قاموس سامی کے مشہور مدون نے بھی اپنی کتاب میں عربی اور فارسی محاورات کے علاوہ عوام کی بول چال اور محاورات کے نمونے جمع کئے ھیں اور اس حیثیت سے اس کی قاموس زبان کے متعلق ایک اعلی درجه کی حواله کي کتاب اور سند کا حکم رکھتی ھے —

ترکی جمہور کی بیداری اگر چه آھسته آھسته اور بتدریج ھوئی' لیکن

اس کے ساتھہ ساتھہ قطعی اور واقعی بھی تھی - حوادث کے تازیانہ نے اس کے روحانی جمود کو توڑا، مثلاً عیسائی رعایا میں قومی احساس کا پیدا ہو جانا اور حقوق کے مطالبات، سیاسی مظالم کی کثرت، جن کی بدولت عبدالحمید کے زمانے میں مصنفین جلا وطن کئے گئے اور اس طرح ان میں یورپی تخیلات و افکار کا غیر معمولی شوق پیدا ہوگیا - قوم کے بہترین دماغوں نے بھی اس نئی روشنی کی صرف ہلکی سی جھلک دیکھی تھی، اور اسی لئے جن خیالات کا انھوں نے اپنی تصانیف میں اظہار کیا، ان میں بھی ماضی کی یادداشتیں بکثرت نظر آتی ہیں - جس دور کو اصلاحی دور کہا جاتا ہے، اس میں قوم پرستی کو خلافت کا سرادف سمجھا جاتا تھا - خود عبدالحق حامد نے اپنے ڈراموں میں اندلس کے حالات لکھے ہیں، اور اسے محض اس وجہ سے ایک قومی موضوع بحث قرار دیا ہے کہ یہ ایک اسلامی چیز تھی - اسلام اور تحریک عثمانیت یہ دونوں مل کر ایک تصور ہوگئے ہیں اور ترکی کے روشن خیال مصنفین کا تخیل قومی آزادی کے متعلق ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اسلام کی عظمت رفتہ کو زندہ کرکے اور خلفاے عثمانی کی سرکردگی میں، یورپی علوم اور یورپی مذاق کے ذریعہ قوم کو آزاد کیا جاے - ان لوگوں کی معلومات مشرق کے متعلق غالباً اتنی ہی غیر مکمل اور ناقص تھی، جتنی کہ مغرب کے متعلق - لیکن اس کے ساتھہ ہی ان کی نیت نیک تھی، اور انھوں نے خلوص اور صدق دل کے ساتھہ اس کی کوشش کی کہ زندہ رہیں، اور دریاے ڈینوب (Danube) سے لیکر خلیج فارس تک ملت اسلامیۂ عثمانی پر جو روحانی بے حسی طاری ہوچکی تھی، اسے دور کریں - فلسفہ تاریخ کی رو سے یہ بات محال نظر آتی ہے کہ ایک ایسا زبردست انقلاب، جیسا کہ سلطنت عثمانی کی روحانی اور سیاسی زندگی میں ہونے والا تھا، دفعتاً ہوجاے- یہ

نہیں ہوا، بلکہ ایک درمیانی زمانہ ایسا گزرا ہے جس میں قدیم اور جدید کا سنگم ہوا، پرانے اور نئے دونوں زمانوں کی کوتا ہیاں ایک دوسرے سے مل گئیں، اور یہ درمیانی دور گویا اس بات کی قطعی ضمانت تھی کہ ہنوز ترکوں کی روحانی تاریخ کا خاتمہ نہیں ہوا ہے - اس دور میں اخبارات جاری ہوے، ترکی بحروں میں نئی شاعری شروع ہوئی، ناول اور ڈرامے تصنیف ہوے، ان میں سے ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جو فرانسیسی اصل سے (جس کے یہ سب نمونے تھے) بڑھی چڑھی ہو۔ ترکی زبان بہت زیادہ اکھڑ تھی، اور اس پر صدیوں سے پرانا رنگ چڑھا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ ان نئے اور غیر مانوس خیالات اور احساسات کے اظہار کا اچھا ذریعہ نہ بن سکی - تاہم ترکوں نے کوشش میں کمی نہیں کی اور ضیا پاشا کے زمانے سے لیکر عبدالحق حامد کے دور تک جس قدر ترقی ہوئی، وہ واقعی تعجب خیز ہے - نو جوان مصنفین کے دل جوش اور فتح مندی کے احساس سے لبریز تھے، اور جب سلطان عبدالحمید کو معزول کیا گیا، تو تاریخ کے اسٹیج پر ایک نئی ترکی قوم نے قدم رکھا - اس نئی قوم کو سخت سے سخت ناکامیوں اور شدید سے شدید مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا - جنگوں کے لامتناہی سلسلے اور اقتصادی مشکلات کی وجہ سے اس کی صفیں کی صفیں تہ و بالا ہوگئیں، لیکن مصائب کے باوجود ترکی روح فنا نہیں ہوئی، ترک بدستور اپنی شاندار شاہراہ ترقی پر گام زن رہے، اور انھوں نے اگلے زمانہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ شاندار کام کر دکھاے - انھوں نے ان ذہنی بندھنوں کو جو متقدمین سے انھیں ورثہ میں ملے تھے، توڑنا شروع کیا، اور تہذیب و شائستگی کے ایک نئے شاندار اور تاریخی دور میں داخل ہوگئے - بالآخر قومی احساس بیدار ہوکر رہا !

◁ †⊙† ▷

تبصرے

تبصرے

ادب

گوئٹے کا فاؤست

(مترجمۂ جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم - اے ' پی ایچ - ڈی -
صفحات ۳۵۰ ' قیمت مجلد چار روپے غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے -
انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن)

گوئٹے کا فاؤست اُن کتابوں میں سے ہے جن کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی اور دنیا کے حوادث اور تغیرات اُن کی فضیلت اور شوکت کو کبھی مدھم نہیں کر سکیں گے - اس کتاب میں جرمنی کے سب سے بڑے شاعر اور نقاد نے ڈرامے کے پیرائے میں نظام ہستی کے اُن مسائل اور اسرار پر روشنی ڈالی ہے جس کی توہ میں بنی نوع انسان کے برگزیدہ لوگ ہمیشہ رہے ہیں اور آیندہ بھی رہیں گے - شاعر نے اس میں انسان کی روحانی زندگی کی کشمکش کی داستان بیان کی ہے - ایک طرف انسان ہے اور دوسری طرف شیطان - وہ کائنات کی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ اُسے مادی لذتوں کی طرف مائل کرنا چاہتا ہے —

یہ کتاب یورپ کے ادب میں بہت بڑا پایہ رکھتی ہے اور اس کا ترجمہ یورپ کی ہر زبان میں ہو چکا ہے - انگریزی میں اس کے متعدد ترجمے موجود ہیں - ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے اصل جرمن زبان سے اس کا ترجمہ انجمن ترقی اردو کے لئے کیا ہے اور انگریزی ترجمے بھی پیش نظر رہے ہیں - ڈاکٹر صاحب کے ترجمے کی تعریف میں کچھ کہنا لاحاصل ہے - اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اردو میں نہ تو ایسی اعلیٰ پایہ کی

کتابیں ترجمہ ہوی ہیں اور نہ ایسا اعلیٰ درجے کا ترجمہ ہوا ہے - فاضل مترجم نے شروع میں ۱۱۷ صفحے کا مقدمہ لکھا ہے جس میں گوئٹے سے قبل کے جرمن ادب ، گوئٹے کی زندگی کے حالات اور اس کی تصانیف ' فاؤسٹ کے ماخذ ' فاؤسٹ کی تدریجی نشو و نما ' قصے کے خلاصے اور کتاب کی تنقید پر نہایت خوبی اور تحقیق کے ساتھہ بحث کی ہے - اس ڈرامے نیز جرمن ادب کے سمجھنے کے لئے اس مقدمے کا مطالعہ بہت ضروری ہے —

تاریخ ادبیات ایران

(مصنفہ پروفیسر براؤن مرحوم و مترجمہ سید سجاد حسین صاحب ایم - اے مددگار پروفیسر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن - قیمت مجلد چار روپے آٹھہ آنے - غیر مجلد چار روپے - انجمن ترقیء اردو سے مل سکتی ہے)

یہ کتاب کسی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں ہماری زبانوں میں تو کیا یورپ کی بھی کسی زبان میں فارسی ادب کی تاریخ پر اس پایہ کی کتاب نہیں لکھی گئی - یہ حصہ جو اس وقت شایع کیا گیا ہے خاص طور پر نہایت قابل قدر ہے کیونکہ لسانی تحقیق سے ابھی تک ہماری زبان محروم ہے - اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ زبان کی تاریخ کا کیونکر کھوج لگایا جاتا ہے اور کہاں کہاں سے اور کیونکر اس کا مسالا جمع کیا جاتا ہے - جسے ہم اب فارسی زبان کہتے ہیں وہ کیا تھی ' کیونکر بنی ' کیا کیا تغیرات ہوے اور کن کن قوتوں اور اسباب نے اس کے بنانے اور بدلنے میں مدد کی - غرض یہ تمام مسائل غور اور مطالعہ کرنے کے قابل ہیں - ترجمہ قابل مترجم نے بہت صاف اور شستہ زبان میں کیا ہے —

شاعر کی رات

(از حضرت جوش ملیح آبادی - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتہ - اعجازالحق قدوسی صاحب فام پلی جدید (۱۷۶) حیدر آباد دکن

یہ حضرت جوش ملیح آبادی کی اُن نظموں کا مجموعہ ہے جن میں مست رات

سنہری رات ' برسات کی رات ' صبح کی رات ' اندھیری رات ' وغیرہ وغیرہ عنوانوں کے تحت میں عجیب عجیب کیفیتیں بیان کی گئی ھیں - اب تک حضرت جوش صبح کے شاعر سمجھے جاتے تھے لیکن اب معلوم ہوا کہ رات کی کیفیتیں وہ صبح کی کیفیتوں سے کہیں زیادہ لطف اور دلکشی سے بیان کرسکتے ھیں - رات پردہ پوش ہوتی ھے اور انسان کی آزادی اور تخیل کی جولانی میں زیادہ وسعت پیدا ہوجاتی ھے - جوش جیسے آزاد منش شاعر کو رات دن سے زیادہ عزیز ھے اور یہی وجہ ھے کہ ان نظموں میں ان کا خاص انداز زیادہ اجاگر نظر آتا ھے اور ان میں ایک والہانہ اور مستانہ کیفیت پائی جاتی ھے یہ نظمیں بہت دلکش اور پر لطف ھیں اور پڑھنے کے قابل ھیں —

رفیق تنہائی اور دیگر فسانے

(مصنفۂ سید علی عباس حسینی صاحب ایم ۰ اے ' ایل - ٹی ' جوبلی
کالج لکھنؤ - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتہ سید نثار مہدی صاحب
گنڈری پٹنہ سٹی - سید اعظم حسین صاحب مدیر ادب لکھنؤ

اس مجموعے میں نو فسانے ھیں جن میں سے بعض مختلف رسالوں میں شایع ہوچکے ھیں - ان فسانوں کو پڑھ کر خوشی ہوئی - قابل مصنف نے ہر فسانے میں تناسب کا بڑا خیال رکھا ھے ' کہیں اعتدال سے آگے قدم نہیں بڑھایا - بعض بعض موقعوں پر نفسیاتی نکات بڑی خوبی سے بیان کر گئے ھیں - زبان بہت شستہ اور اچھی ھے اور موقع محل کے لحاظ سے بہت موزوں ھے اگرچہ آج کل مختصر فسانوں کے لکھنے کا عام رواج ہوگیا ھے لیکن بہت کم اس میں کامیاب ہوئے ھیں اور ہماری رائے میں خوش نصیب کامیاب مصنفوں میں سید علی عباس حسینی صاحب کا بھی شمار ھے —

دختر فرعون

(حصہ دوم مترجمہ لطافت حسین خاں صاحب صفحات ۲۳۴ قیمت
دو روپے - انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ھے)

ایک جرمن ناول کا ترجمہ ھے اس کے پہلے حصے پر اس سے قبل تبصرہ

ہو چکا ہے یہ اسی کا دوسرا حصہ ہے - مصنف (جارج مارٹز ایبرس) مصریات کا بڑا ماہر ہے - اس نے مصر و ایران کے قدیم تمدن کو ناول کے پیرایے میں نہایت خوبی سے دکھایا ہے - جو معلومات اس ایک ناول کے پڑھنے سے حاصل ہوتی ہیں وہ بڑی بڑی کتابوں کے مطالعہ سے بھی ممکن نہیں - یہ ایک خاص قسم کا ناول ہے اور اپنے طرز کا بے نظیر ہے - ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مطالعہ نہایت دلچسپ اور مفید ہوگا - یہ شروع سے آخر تک عجیب و غریب معلومات اور واقعات سے لبریز ہے اور اس کے ساتھہ ناول کی دلچسپی میں کہیں فرق نہیں آتا —

ارمغاں محبوب

اس رسالے کے شروع میں راجہ نرسنگھہ راج بہادر عالی نے اپنی کچھہ رباعیات جو حمد میں ہیں درج کی ہیں - اس کے بعد اپنے عزیز بھائی راے محبوب راج محبوب کا مرثیہ اور نوحے ہیں - آخر میں مرحوم کے دوست اور عزیز و اقربا نے اُن کی وفات کی جو تاریخیں کہی ہیں وہ درج ہیں - ان تاریخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کس قدر مقبول اور ہر دلعزیز تھے —

گلزار عثمانی

یہ مولانا محمد عبدالقوی فانی، ایم - اے، معلم شعبۂ فارسی و اردو جامعۂ لکھنؤ کے نو فارسی قصائد کا مجموعہ ہے - ان میں سے آتھہ قصیدے اعلیٰ حضرت بندگان عالی حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی مدح میں ہیں اور آخری قصیدہ شہزادوں کی کدخدائی کی تہنیت میں ہے - بعض قصائد قاآنی کی تتبع میں لکھے ہیں اور خوب لکھے ہیں - اِن کے کلام میں زور اور بلندی پائی جاتی ہے اور فارسی زبان پر پوری قدرت حاصل ہے —

فرانسیسی افسانے

مرتبہ عزیز احمد صاحب طالب علم کلیہ جامعہ عثمانیہ
حیدر آباد دکن - چھوٹی تقطیع صفحات ۸۴ - لکھائی
چھپائی اور کاغذ معمولی - قیمت ۱۲ آنے ' ملنے کا پتہ :-
مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن

دنیا کے شاہکار افسانوں کے سلسلے کے تین حصوں پر اس سے قبل تبصرہ ہوچکا ہے - یہ اس سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے - اس کے مرتب عزیز احمد صاحب ہیں ' اس میں کل نو افسانے ہیں ' جو مختلف فرانسیسی مصنفوں کے لکھے ہوے ہیں - افسانے مشہور ہیں - ان کے ترجمے یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی ہوچکے ہیں - ان میں سے اکثر مرتب کے مترجمہ ہیں اور بعض دوسروں کے ' جو کہیں سے نقل کرلئے گئے ہیں ' اور حصوں کے مقابلے میں ان افسانوں کے ترجمے اچھے ہیں ' حالانکہ انگریزی سے ترجمہ ہوئے ہیں تاہم ترجمہ در ترجمہ میں اصل سے قریب معلوم ہوتے ہیں - زبان اور بیان دونوں افسانوں کے لحاظ سے نامناسب نہیں —

(چ)

اِنقلاب دھلی

مرتبہ جناب مولانا نظامی بدایونی ایڈیٹر ذوالقرنین - چھوٹی
تقطیع صفحات ۱۲۰ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ - قیمت
ڈیڑھ روپیہ - مرتب کے پتے (بدایوں یوپی) سے مل سکتی ہے -

مغل اعظم عالمگیر کی وفات ہی سے مغلیہ سلطنت کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگی تھیں ' باہمی نفاق امرا کی سازشوں اور ارکان حکومت کی خود غرضیوں اور کوتاہ اندیشیوں نے رفتہ رفتہ اس عظیم الشان سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا یہاں تک کہ قلمرو ے مغلیہ کا نام صرف قلعہ معلیٰ کی چار دیواری تھی - پونے دو سو سال قبل ہی بقول ' سودا ' ہند کی وسیع و عریض سلطنت کے بائیس صوبوں کا شہنشاہ کول (علی گڈہ) کی فوجداری کے اختیار سے

محروم تھا :—

کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند جو ایک شخص تھا بانوس صوبہ کا خاوند
رہی نہ اُس کے تصرف میں فوجداری کول

اس عرصے میں پیہم کشت و خون اور قتل و غارت کے ہنگامے برپا ہوتے رہے ' دہلی جو پایۂ تخت تھی اور تمام ہندوستان کی جان ' ہر وقت ان حوادث کا نشانہ بنی رہی ' اس کی رونق و آبادی اور چہل پہل ہر آن گھٹتی گئی یہاں تک کہ سنہ ۵۷ کی شورش ہوئی ' اور وہ تخت و تاج جس کو بابر و ہمایوں نے بڑی اولوالعزمی اور جانبازی سے حاصل کیا تھا نہایت بزدلی اور کمزوری سے چھن گیا - اس کے ساتھ ہی دہلی جو علوم و فنون کا مرکز ' تہذیب و تمدن کا گہوارہ ' مال و دولت کا گھر تھا ' بے رونق ' مفلس سنسان اور ڈراونا جنگل بن گیا —

آغاز انحطاط سے لے کر اس شورش تک اکثر شاعروں نے دہلی کی تباہی و بربادی کا رونا رویا ہے ' یہ شاعر دہلی کے خراب و برباد اور تباہ و تاراج ہونے کا دکھڑا نہیں سناتے ہیں بلکہ اس عظیم الشان سلطنت کے ملیا میٹ اور تباہ و غارت ہونے پر خون کے آنسو روتے ہیں جس کا پایۂ تخت دہلی تھی - یہ نظمیں در اصل دکھ بھری آواز ہے جو عبرت اور غیرت دلاتی ہے اور آئینہ ہے جس میں ایک اولوالعزم قوم کے ادبار و انحطاط اور زوال و نحوست کی تصویر نظر آتی ہے -

حضرت نظامی بدایونی نے یہ بہت مفید کام کیا کہ ایسی نظمیں جس قدر مل سکیں جمع کرلیں اور ان کو خاص اہتمام سے طبع کرکے شائع کیا ہے - اس میں (۴۷) شاعروں کی (۹۷) نظمیں ہیں - یہ بجائے خود ہماری شاعری کا عمدہ نمونہ ہے - اس میں بعض نظمیں بہت بلند پایہ رکھتی ہیں - ' سودا ' کی نظمیں پونے دو سو سال قبل لکھی گئی ہیں لیکن جو حال اس زمانے کا تھا اس کو ہو بہو بیان کیا ہے ' یہ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں بعض نظموں میں تغزل کا رنگ غالب ہے - لیکن بہت کم درد اور اثر سے خالی ہیں مولانا حالی کی نظم بہت دلدوز ہے —

حضرت نظامی بدایونی نے سنہ ۵۷ کی شورش کے بعد کے شاعروں کی نظمیں جمع کی ہیں اور قدیم شعرا میں سودا کو لیا ہے - جب قدیم شاعروں کو

انھوں نے اس بزم میں جگہ دی تو کیا مناسب نہ تھا کہ بعض مشہور شاعروں کے کلام سے مسلسل نظمیں نہ ملتیں نہ سہی مختلف اشعار ہی جمع کرلئے جاتے - مثال کے لئے ' میر کے ضخیم کلیات میں متعدد شعر ایسے ہیں جو اس موضوع سے تعلق رکھتے ہیں - ان میں ایک ایک شعر کئی کئی نظموں سے زیادہ پر تاثیر ہے - کہا کہا ہے —

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آی تصویر نظر آی

اس قسم کے اشعار کے علاوہ میر کے کلیات میں دو مخمس ایسے ہیں جو کم و بیش اسی موضوع سے تعلق رکھتے ہیں میر کے علاوہ ان کے مشہور معاصرین کے کلام میں اور بعد کے شعرا کے کلام میں بھی ایسے اشعار اور نظمیں موجود ہیں - اگر تلاش سے ان کو جمع کر لیا جاتا تو بہت اچھا مجموعہ تیار ہو جاتا —

موجودہ کتاب میں بھی کافی نظمیں ہیں اور عمدگی سے مرتب اور طبع ہوئی ہیں - لایق مرتب نے ہر شاعر کے مختصر سے حالات بھی لکھے ہیں ٹائٹل بہت خوبصورت ہے ' اس پر ' سودا ' غالب ' ظفر ' حالی ' مجروح اور داغ کی تصویریں ہیں —

کتاب میں ایک جگہ رکت (بمعنی خون) کو رکت لکھا ہے - اور کلیات کو بجاے مذکر کے مونث ' صفحہ ۴۹ " ان کی ایک کلیات .. .. بدایوں میں طبع ہوئی ہے " —

(چ)

تصوف

صبغۃ اللہ

(یعنی مرقعۂ تصوف کا پہلا مقدمہ مصنفۂ شیخ غلام محمد احمد ایم - اے ' ایم - او - ایل ' مجسٹریٹ جموں صفحات ۱۸۴ قیمت قسم اول ایک روپیہ د س آنے' قسم دوم ایک روپیہ چھ آنے ملنے کا پتہ نیاز بک ایجنسی محلہ جو لاھکہ جموں توئی)

فاضل مصنف نے تصوف اسلام پر جو کتاب لکھنی شروع کی ہے یہ اس کا پہلا مقدمہ ہے - باقی مقدمے اور حصے کچھ تو لکھے جا چکے ہیں اور کچھ زیر تالیف ہیں - ان کا ارادہ ان سب حصوں کو انگریزی فارسی اور عربی ترجمہ کرنے کا ہے - انہوں نے ایک بہت بڑا کام اپنے ذمے لیا ہے اور بڑے خلوص اور مستعدی سے انجام دے رہے ہیں - وہ مستشرقین کے اس خیال سے سخت خفا اور بیزار ہیں کہ اسلامی تصوف کے اکثر اصول اس کے اپنے نہیں یعنی اسلامی نہیں بلکہ اوروں کے نظام فلسفہ سے لئے گئے ہیں - اس مقدمے میں انہوں نے اس خیال کی تردید کی ہے - فاضل مصنف رموز تصوف کو حقایق اسلام سمجھتے ہیں اور کسی حال میں بھی اُسے اسلام سے جدا خیال نہیں کرتے - اور اس دعوے کو غلط کہتے ہیں کہ شرائع اسلام میں ابتداً حقائق و دقائق تصوف کا وجود نہ تھا —

اس مقدمے میں تصوف کے بہت سے ابتدائی اور ضروری مسائل پر بحث آگئی ہے - جو لوگ تصوف سے ذوق رکھتے ہیں یا اسلامی تصوف کو سمجھنا چاہتے ہیں اُنہیں یہ کتاب ضرور مطالعہ کرنی چاہئے - قابل مصنف کے طرز بیان میں جوش اور خلوص پایا جاتا ہے - انہوں نے مستشرقین اور انگریزی داں طلبہ پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کی ہے اور ان کے خیالات سے بیحد سوء ظنی کا اظہار کیا ہے - ہماری راے میں اس قسم کے مباحث میں اس قدر سوء ظنی اور تشدد مناسب نہیں - اور یہ کہنا کہ اسلامی تصوف پر بیرونی اثر مطلق نہیں پڑا زیادتی ہے - جب کہ مذاہب ایک دوسرے کے اثر سے نہیں بچے تو دوسرے عقائد اور تعلیمات کا کیا ذکر ہے —

انتخاب دیوان شمس تبریز

(از ڈاکٹر نکلسن مرتبہ جناب عبدالمالک آروی صاحب

دفتر ایوان اشاعت گورکھپور - قیمت دو روپے آٹھ آنے)

جناب عبدالمالک صاحب آروی نے پروفیسر نکلسن کے انتخاب دیوان شمس تبریز پر نہایت محققانہ مقالہ لکھا ہے اور اس ضمن میں تصوف، صوفی شاعری اور شعرا اور دوسرے اہم مسائل پر جن کا تعلق تصوف سے ہے بڑی قابلیت سے بحث کی ہے - ان کے ماخذ زیادہ تر انگریزی اور فارسی تذکرے اور کتابیں ہیں - اس کتاب کے مطالعہ سے فاضل مرتب کی وسیع نظری اور تنقیدی قوت کا اظہار ہوتا ہے - آخر میں مولانا روم کے دیوان کا (جو دیوان شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے) انتخاب دیا ہے - انتخاب تو صرف پچیس چھبیس صفحے پر ہے لیکن باقی تمام کتاب یعنے تقریباً ۲۰۹ صفحات پر دوسری متعلقہ بحثیں ہیں جو محققانہ معلومات سے لبریز ہیں - لیکن تعجب ہے کہ فاضل مصنف نے سند میں حضرت خواجہ معین‌الدین چشتی اور غوث‌الاعظم عبدالقادر جیلانی (رح) کے اشعار جا بجا پیش کئے ہیں حالانکہ دیوان جس میں سے یہ اشعار نقل کئے گئے ہیں اُن سے خواہ مخواہ منسوب کردئے گئے ہیں - ہمارے ہاں بارہا ایسا ہوا ہے کہ بڑے بڑے بزرگوں اور اولیا کے نام سے کتابیں لکھ کر شائع کردی گئیں اور غلطی سے انہیں کی سمجھی گئیں - محققانہ بحثوں میں ان سے سند لینے میں احتیاط کی ضرورت ہے —

آئینۂ معرفت

(مصنفۂ سید اعجاز حسین صاحب ایم - اے، لکچرر شعبہ اردو - الہ آباد یونیورسٹی - مجلد قیمت دو روپے لالہ نراین لعل بک سیلر، کٹرہ روڈ، الہ آباد) —

دراصل مصنف کا یہ وہ مقالہ ہے جو انہوں نے سنہ ۱۹۲۹ ع میں الہ آباد یونیورسٹی کے ری سرچ اسکالر کی حیثیت سے تحریر فرمایا تھا اور اب کتاب کی صورت میں شائع ہوا ہے - پہلے باب میں تصوف کی ابتدا اور ترقی

اور فرقۂ فلانہ کا ذکر ہے - دوسرے میں شریعت ' طریقت ' معرفت ' حقیقت اور صوفیوں کے فرقوں کا بیان ہے - تیسرے میں فارسی صوفیانہ شاعری اور شعرا اور چوتھے میں پرانی اردو شاعری اور پانچویں میں ولی سے ایکر اب تک کی صوفیانہ شاعری اور شعرا سے بحث ہے - تمہیدی بحثوں اور فارسی صوفیانہ شاعری پر ۱۷۶ صفحے لکھے ہیں ' اردو شاعری پر جو اصل موضوع ہے ' ۱۱۰ صفحے ہیں —

اگرچہ ابتدای تین باب میں جو اصل موضوع کا مقدمہ ہیں تمام بحثیں سر سری ہیں لیکن اصل موضوع یعنے اردو صوفیانہ شاعری پر جو بحث ہے وہ بھی کافی نہیں —

صوفیوں کی تین قسمیں ہوسکتی ہیں ایک تو عملی ' دوسرے علمی اور تیسرے رسمی - عملی تو وہ ہیں جنھوں نے ریاضت اور محنت سے اپنے نفس کا تزکیہ کیا ہے اور اعلیٰ مقامات پر پہنچے ہیں اور یہی اصل صوفی ہیں علمی وہ ہیں جنہیں تصوف کے علم و اصطلاحات پر عبور ہے مگر عملی طور پر کبھی اسے حاصل نہیں کیا - رسمی وہ ہیں جن میں عمل ہے نہ علم چند سنی سنائی باتیں یا اصطلاحیں جانتے ہیں اور بس —

اردو زبان کے دکنی یا گجراتی صوفیوں میں بیشک بہت سے حقیقی صوفی تھے لیکن شاعر کہلانے کے مستحق صرف چند ہی تھے - وہ شعر اس لئے کہتے تھے کہ یہ تعلیم کی اشاعت کا مقبول طریقہ تھا اور نثر کا نہ زیادہ رواج تھا اور نہ یہ مقبول تھی - اس میں مصنف نے سلطان قطب شاہ کو بھی شریک کرلیا ہے - اگر قطب شاہ صوفی شاعر تھے تو پھر اردو کا کوئی شاعر بھی غیر صوفی نہیں ہوسکتا —

دوسرے اور بعد کے دور میں انہوں نے میر درد ' میرتقی ' آتش ' غالب اور زندہ شعرا میں آسی ' عزیز اور اقبال کو لیا ہے - اصل یہ ہے کہ ان میں سوائے میر درد کے کوئی بھی صوفی یا صوفی شاعر نہیں - میر درد پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردوے معلیٰ کی اردو شاعری میں تصوف کا رنگ پیدا کیا وہ اعلیٰ درجے کے درویش اور صوفی تھے اور اُن کا کلام صحیح صوفیانہ شاعری کا نمونہ ہے - اور انہیں کا اثر تھا کہ بعد کے شعرا مثلاً میر تقی وغیرہ نے اس روش کو کسی قدر اختیار کیا - زندہ شاعروں میں

عزیز ' اقبال اور آسی کو صوفی شاعر کہنا ظلم ہے - ان سے تو کہیں زیادہ بے نظیر شاہ اس کے مستحق ہیں - اور جب آتش صوفی شاعر ہے تو کیوں نہ نظیر کو صوفی شاعر کہا جاے —

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ قدیم اردو کے صوفی شعرا میں مصنف نے قطب شاہ کو بھی داخل کیا ہے لیکن جو کلام نقل کیا گیا ہے وہ قطب شاہ کا نہیں ہے بلکہ اس کے چچا سلطان قلی قطب شاہ کا ہے - اس باب کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان قدیم شعرا کا کلام نہیں پڑھا ' اس لئے لازم تھا کہ وہ صحیح طور پر حوالے دیتے کہ یہ چیزیں انہیں کہاں سے دستیاب ہوئیں ہیں ہر مصنف اور مولف کے لئے مگر خاص کر ایک ری سرچ اسکالر (ادبی محقق) کے لئے یہ بیحد ضروری ہے کہ وہ ہر خیال اور کلام کے لئے جو اس نے کسی دوسری جگہ سے حاصل کیا ہے ٹھیک ٹھیک حوالہ درج کرے - اس سے (جیسا کہ اکثر کم علم اور محدود نظر کے مولف خیال کرتے ہیں) اُن کی کم علمی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ان کی وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے —

خاتمے پر مصنف نے لکھا ہے کہ " اردو شاعری میں عشق و حسن کے چرچے کا ایک بڑی حد تک ذمہ دار تصوف ہے " - ممکن ہے ایسا ہو لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اردو شاعری میں یہی چرچے نہیں بلکہ دوسرے مضامین بھی بھی جنھیں وہ تصوف کا اثر سمجھتے ہیں فارسی شاعری سے آے ہیں اور ہمارے شاعروں نے اکثر و بیشتر فارسی شعرا کی تقلید کی ہے —

حکمت و معاشرت

ریاست

(از افلاطون مترجمۂ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب

ایم - اے ' پی ایچ - ڈی پرنسپل جامعۂ اسلامیہ دہلی - صفحات
۶۶۸ ' قیمت فی جلد مجلد پانچ روپے ساڑھے چار روپے غیر مجلد
انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہے)

بقول فاضل مترجم کے یہ " دنیا کے سب سے بڑے مصنف کی سب سے اہم کتاب اور " فلاطون کے شجر علم کا پختہ ثمر " ہے - اس سے بڑھ کر اس کتاب کی کوئی تعریف نہیں ہوسکتی اور یہ سچی تعریف ہے - اس کتاب کا موضوع کیا ہے - وہ بھی ہم قابل مترجم کے مقدمے ہی سے نقل کرتے ہیں کیونکہ اس سے بہتر طور پر یہ حقیقت ادا نہیں ہوسکتی --

" اِن ناموں سے (ریاست اور تحقیق عدل) یہ سمجھ لینا کہ یہ سیاست یا قانون پر ایک تصنیف ہے غلط ہوگا - سچ یہ ہے کہ اس میں انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے ' البتہ زیادہ توجہ انسانی زندگی کے عملی پہلو پر ہے ' اس لئے کتاب کا زیادہ حصہ اخلاقی اور سیاسی مسائل سے پر معلوم ہوتا ہے - لیکن یہ نہیں ہے کہ فکر و خیال کی دنیا کو یک قلم نظر انداز کر دیا گیا ہو - فلسفہ کی بلندیاں دیکھنی ہوں تو عین خیر میں سب چیزوں کے اتحاد کا جلوہ بھی اس کتاب میں دکھائی دیتا ہے ' اخلاق کا سبق لینا ہو تو اس میں روح انسانی کے محاسن کی گہری اور لطیف تحقیق موجود ہے : تعلیم کے مسائل پر روشنی درکار ہو تو بقول روسو فن تعلیم پر آج تک جتنی کتابیں لکھی گئیں اُن میں یہ سب سے بہتر ہے ' - سیاسی زندگی میں رہنمائی کے لئے یہ ایک جدید ہئیت اجتماعی اور اس کے اداروں کی جیتی جاگتی تصویر لا کھڑی کر دیتی ہے اور انسانی جماعتوں کے تغیر ' عروج و زوال کے اسرار سر بستہ کی کنجی کی تلاش ہو تو فلسفۂ تاریخ کے یہ مشکل مسائل بھی اس میں پانی کر دئے گئے ہیں " --

اس کے بعد بھی اگر کوئی پڑھا لکھا شخص (خصوصاً جب کہ اس کا ترجمہ اردو میں ہوگیا ہے) اس کتاب کو نہ پڑھے تو اس کے حق میں سوائے اس کے کہ دعائے خیر کی جائے اور کچھ نہیں کہہ سکتے --

اس قسم کی حکیمانہ قدیم کتابوں کا ترجمہ نہایت دشوار ہوتا ہے لیکن یہ ترجمہ ایسی صاف ' شستہ اور پختہ زبان میں کیا گیا ہے کہ فاضل مترجم

کی محنت کی داد دینے کو بے اختیار جی چاہتا ہے —

نفسیات عنفوان شباب

(تصنیف پروفیسر اشپرانگر ، استاد فلسفۂ تعلیم و فلسفۂ تمدن برلن یونیورسٹی - مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم - اے ، پی ایچ ، ڈی - صفحات (بڑی تقطیع) ۴۰۸ - مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

شباب کی منزل زندگی میں سب سے زیادہ کٹھن ہے اور اس کا جاننا اور سمجھنا اس سے بھی زیادہ کٹھن ہے - پروفیسر اشپرانگر ہی سا عالم متبحر اس دشوار کام کو انجام دے سکتا تھا - کیونکہ وہ علاوہ فاضل اجل ہونے کے فلسفۂ تعلیم اور فلسفۂ تمدن کے نامور پروفیسر بھی ہیں - ان کو پندرہ سولہ سال سے ہزارہا نوجوانوں سے سابقہ رہا ہے - نیز انھیں جرمنی کی " تحریک شباب " سے جس میں یونیورسٹی کے طالب علموں کے علاوہ اسکولوں کے لاکھوں لڑکے شامل ہیں ، بہت گہرا تعلق ہے - انھوں نے بڑے غور سے ان نوجوانوں کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے اور سالہا سال کی محنت اور فکر کا نتیجہ یہ کتاب ہے - اس کتاب کے موضوع کے متعلق کچھ کہنا بیجا طول ہوگا - یوں سمجھئے کہ یہ شیخ سعدی کے اس جملہ کی تشریح ہے " در ایام جوانی چنانکہ افتد تو دانی " مگر یہ محض حسن و عشق تک محدود نہیں بلکہ نوجوانوں کی زندگی کے ہر شعبے اور ہر پہلو کو حکیمانہ انداز میں بڑی صفائی اور سلاست سے بیان کیا ہے —

مترجم اس کے ڈاکٹر عابد حسین صاحب ہیں - یہ فاضل پروفیسر کے شاگرد ہیں اور ان میں استاد کی بعض خوبیوں کی صاف جھلک نظر آتی ہے - یہ ادیب بھی ہیں اور حکیم بھی اور اس کے علاوہ مترجم بھی بے نظیر ہیں - ترجمے کو لوگ معمولی چیز سمجھتے ہیں لیکن اعلیٰ پائے کی تصانیف کا ترجمہ معمولی تالیف و تصنیف سے کہیں زیادہ مشکل اور صبر طلب اور

کہیں زیادہ مفید اور بیش بہا ہوتا ہے —

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ اصل جرمن زبان سے کیا ہے اور ابھی یورپ کی دوسری زبانوں میں ترجمہ نہونے پایا کہ اردو میں ترجمہ ہوگیا اس پر ہم جامعۂ ملیہ اور قابل مترجم کو مبارک باد دیتے ہیں - جب مصنف ایسا اور مترجم ایسا ہو ' ایک اُستاد اور دوسرا شاگرد اور دونوں ادیب ' حکیم اور معلم تو اس کے بعد کتاب یا ترجمہ کی تعریف میں کچھ کہنا لا حاصل ہے —

جرمنی میں اس کتاب کی اتنی قدر ہوئی کہ پہلا اڈیشن چند مہینے میں چھپ کر فروخت ہوگیا - دیکھیں یہاں اس کی کیا قدر ہوتی ہے —

سہاگ رات یا

بھورانی کو سیکھ

(مصنفہ پنڈت کرشنا کانت مالوی صاحب ' مترجمہ جگمت موہن لعل صاحب " رواں " ایم - اے ایل بی چھوٹی تقطیع ' صفحات ۴۶۵ درمیانی ٹائپ ' طباعت اور کاغذ عمدہ - قیمت درج نہیں - پنڈت جی کے پتہ (الہ آباد) سے مل سکتی ہے —)

اصلاح معاشرت کے باب میں ہندوستان کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے خصوصاً صنف نازک کے خیالات اور اعتقادات کی اصلاح نہایت ضروری ہے سہاگ رات اسی قسم کی کوشش کا نتیجہ ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ کس طرح ایک نوجوان لڑکی مکمل عورت اور کامل انسان بن سکتی ہے ' اور ازدواجی زندگی کو خوش گوار و سود مند بناکر زندگی کی مہم کامیابی کے ساتھ سر کرسکتی ہے - اس مقصد کو مد نظر رکھتے ہوے لایق مصنف نے خط

و کتابت کے پیرائے میں اس کو تحریر فرمایا ہے ' بڑی بہن اپنی چھوٹی چچا زاد بہن کو جس کی حال میں شادی ہوئی ہے خطوں کے ذریعہ ازدواجی زندگی کے رموز سے آگاہ کرتی ہے - اس میں کل ۲۶ خط ہیں جو ۴۵۶ صفحوں پر مشتمل ہیں ' شادی سے لے کر صاحب اولاد ہونے تک اور اس کے بعد کے زمانے سے متعلق تمام ضروری اور لازمی باتیں درج ہیں - ان میں معاشرتی ' اخلاقی ' مذہبی ' طبی غرض زندگی سے متعلق ہر قسم کے معاملات سے بحث کی ہے - یہ تمام باتیں کوئی نئی اور اجنبی نہیں ' تا ہم ان کو جس دلچسپ اور موثر پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ بہت ہی موثر اور سبق آموز ہے - ہر شعبہ زندگی اور مبحث و موضوع کے لحاظ سے جگہ جگہ رشیوں ' مقدس کتابوں اور مغربی مشاہیر خواص تنقید کے حوالے دئے ہیں جن سے کتاب کا پایۂ اعتبار بلند تر ہوگیا ہے اکثر مقامات اس کتاب میں ایسے تھے جہاں اندیشہ تھا کہ مصنف کا قلم عریانی اختیار کرے ' لیکن لایق مصنف نے پردہ ہی پردہ میں نہایت موثر طریقہ سے ان مقامات کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہیں متانت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا —

کتاب ختم کرتے ہی آخر میں مولانا " حالی " کی مشہور نظم " چپ کی داد " پر نظر پڑتی ہے جس میں عورتوں کی عظمت و سر بلندی کو نہایت موثر انداز میں جتایا گیا ہے اور ان کو اس پردے میں نہایت دل نشین سبق دئے ہیں - یہ نظم بہت ہی مناسب محل درج کی گئی ہے —

کتاب در اصل ہندی میں لکھی گئی تھی - ہندی داں طبقے میں اس کی کافی شہرت ہوئی ضرورت تھی کہ اردو میں بھی منتقل ہو جاتی ' مقام مسرت ہے کہ خود پنڈت جی نے اپنے ایک دوست جناب " رواں " صاحب سے اس کا ترجمہ کرایا ہے - زبان کی چند غیر اہم فرو گذاشتوں کے قطع نظر ترجمہ بہت صاف ستھرا اور رواں ہے - ترجمہ میں اصل کتاب کے تیور نظر آتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کا طرز تحریر مربوط و مدلل ہے —

امید ہے کہ یہ کتاب نوجوانوں کے لئے مفید اور سبق آموز ثابت ہوگی —

(چ)

مذہب

دربار رسالت

مولفہ جناب فضل اللہ خاں صاحب شاہ جہاں پوری
ناظم مدرسہ ہاشمیہ بمبئی نمبر ۳ چھوٹی تقطیع '
صفحات ۱۳۶ ' لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجے کے
قیمت ۸ آنے ' مولف کے پتہ سے مل سکتی ہے —

اس مختصر کتاب میں آنحضرت صلعم کی حیات و سیرت اور تعلیمات کا ذکر ہے - کل سترہ باب ہیں ' پہلے باب میں ظہور نبوی سے قبل کے عرب کی حالت کا نقشہ دکھایا گیا ہے - اس کے بعد ۱۵ ابواب میں رسول اکرم کی حیات ' اسلام کی تعلیم اور اس کی اشاعت کے واقعات ہیں ' آخری باب میں غیر مسلم مشاہیر کی آرا درج کی گئی ہیں جو آنحضرت اور اُن کی تعلیم کے باب میں ظاہر کی گئی ہیں —

کتاب گو مختصر ہے لیکن اس میں تمام ضروری اور قابل ذکر واقعات درج ہیں ' کتاب کی تہذیب و ترتیب بھی اچھی ہے - ہر باب کے آخر میں چند سوالات طالب علموں کے آموختے اور یاد تازہ کرنے کے لئے دئے ہیں - کہیں کہیں یوروپین مصنفین کے اقتباسات دئے ہیں ' جن کی ضرورت اس کتاب میں نہ تھی ' ان سے بہتر ' وقیع مستند اور اصل ماخذ موجود ہوتے ہوئے بجوں

کی اس مختصر کتاب میں ان کا داخل کرنا کچھہ مناسب نہیں —

اگر زبان و بیان میں کسی قدر سلاست و سہولت کا خیال رکھا جاتا تو چھوٹی جماعت کے بچوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوتی ' بحالت موجودہ مڈل کلاس کے طالب علموں کے لئے مفید ہے —

(چ)

اعمال محمود

(مصنفۂ مولوی حافظ علی خاں صاحب عزیز ' اسدی سابق ناظم دینیات مسلم اسکول جے پور - قیمت مجلد بارہ آنے ' غیر مجلد آٹھہ آنے - هیڈ ماسٹر صاحب مڈل اسکول جے پور سے مل سکتی ہے) —

قابل مصنف نے قصے کے پیرائے میں جو سراسر حقیقت پر مبنی ہے بڑی خوبی سے اسلام کی خوبیوں کو بیان کیا ہے - محمود کوئی فرضی نام نہیں اس پردے میں آنحضرت صلعم کی زندگی کے حالات اور اُن کے زبردست کیریکٹر کو بیان کرکے اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا ہے - زبان بہت اچھی اور شستہ اور پیرایۂ بیان بہت خوب ہے —

اردو کے جدید رسالے

طبیہ کالج میگزین

یہ سہ ماہی رسالہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے طبیہ کالج سے شایع

ہونا شروع ہوا ہے - اگرچہ اڈیٹر اس کے طالب علم ہیں لیکن نگران کالج کے قابل پرنسپل ڈاکٹر عطا اللہ بھٹ ایم - ڈی (برلن) ہیں اور اڈیٹوریل بورڈ میں کالج کے فاضل طبیب اور ڈاکٹر شریک ہیں —

رسالہ حسن صورت اور حسن سیرت دونوں اعتبار سے قابل تعریف ہے اور ہم رسالے کے کارکنوں کو اُن کے سلیقے ' محنت اور خوبی مضامین پر دل سے مبارک باد دیتے ہیں —

تمام مضامین تحقیق اور غور کے بعد لکھے گئے ہیں - حکیم عبدالطیف (فلسفی) صاحب کا مضمون تجدید طب کے تحت عناصر پر بہت محققانہ ہے اور قدیم و جدید معلومات پر نہایت عالمانہ اور منصفانہ بحث کی ہے اسی طرح دوسرے مضامین مثلاً محمد زکریا رازی ' احتباس لطمث ' تحذیر ' صحت و مختلف امراض میں کیفیت الدم وغیرہ خاص حیثیت رکھتے ہیں علاوہ ان کے عام فائدے اور معلومات کے متعلق قبض ' حیاتین ' تمباکو ' مکھی وغیرہ کے مضامین بہت مفید ہیں - زبان اور طرز بیان حتی الامکان ایسا ہے کہ صاحب فن اور عام لوگ دونوں مستفید ہوسکتے ہیں —

یوں تو طبی رسالے ہمارے ملک میں متعدد شایع ہوتے ہیں لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اس سے بہتر رسالہ اب تک شایع نہیں ہوا - اگر اس کا معیار یہی رہا تو اس میں شک نہیں کہ یہ طب کی بہت بڑی خدمت کرے گا اور اهل ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچائے گا - ہمارے ملک میں صحت و امراض سے متعلق ضروری اور معمولی باتوں سے عام نا واقفیت ہے اگر اس قسم کی معلومات کی جیسی کہ اس رسالے میں درج ہیں عام اشاعت کی جاے تو اس سے نہ صرف ہمارے علم میں اضافہ ہوگا بلکہ ہم اپنی صحت کو بہت بہتر بناسکیں گے اور بہت سی تکلیفوں سے نجات پا جائیں گے —

رسالہ کا حجم بڑی تقطیع پر ۱۷۰ صفحے ہے - لکھائی چھپائی کاغذ اعلی درجے کا - چندہ سالانہ چار روپے ' جو رسالے کی خوبیوں کے مقابلے میں

کچھہ بھی نہیں —

جہانگیر

یہ نیا ادبی ماہانہ رسالہ لاہور سے شایع ہوا ہے - اڈیٹر محمد احمد خاں صاحب درانی اور سید شبیر حسین صاحب قیس حیدرآبادی ہیں زیادہ تر نظمیں اور فسانے ہیں - شعرا میں حضرت جوش ملیح آبادی ' حضرت اصغر گونڈوی ' ایم - حسن لطیفی صاحب ' حضرت جاہل کی نظمیں پڑھنے کے قابل ہیں - لطف ذوق کے لئے بعض غیر زبانوں کی نظموں کے ترجمے کئے گئے ہیں - حجم بڑی تقطیع پر ۱۲۰ صفحہ ہے - قیمت سالانہ صرف تین روپے —

مورخ

یہ چھوٹی سی تقطیع کا چھوٹا سا ماہانہ رسالہ فیض آباد سے مولوی سید علی اظہر (عابدی) کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے - تاریخ میں تحقیق کی بہت گنجائش ہے اور اگر محنت اور قابلیت سے کام کیا جاے تو بہت مفید اور بڑا کام ہوسکتا ہے - اس رسالے میں طویل مضامین کی گنجائش نہیں - اور اگرچہ اس میں محققانہ مضامین درج نہیں ہیں تاہم جو مضامین اس کے لیے لکھے گئے ہیں وہ دلچسپ اور مفید ضرور ہیں - تاریخی مضامین میں صحت واقعات کا خاص لحاظ رکھنا چاہئے اور جو واقعہ بھی لکھا جاے اس کے لیے سند حوالہ درج کرنا لازمی ہے - سالانہ چندہ دو روپے چار آنے ہے —

الضیا

یہ عربی زبان کا ماہانہ رسالہ لکھنؤ سے مولوی مسعود عالم صاحب ندوی کی زیر ادارت ماہ محرم سے شایع ہونا شروع ہوا ہے - لکھنؤ سے پہلے بھی ایک

رسالہ اسی قسم کا شایع ہوا تھا لیکن وہ کچھ بہت دنوں تک نہ چلا - لیکن اِس رسالے نے اپنے معاونین ایسے پیدا کئے ہیں جس سے یہ توقع ہوتی ہے کہ یہ رسالہ کامیابی سے چلے گا - شاید یہ وقت، بھی اس کے لئے مناسب ہے - یہ ادبی اور علمی رسالہ ہے جیسا کہ اس کے مضامین سے ظاہر ہے - جو لوگ عربی زبان کے دلدادہ ہیں انہیں اس سے بہتر رسالہ ہندوستان میں نہیں مل سکتا - افسوس ہے کہ رسالہ لیتھو میں چھپتا ہے حالانکہ عربی کے ٹائپ بہت اچھے موجود ہیں اگر ٹائپ میں چھپتا تو اس کا حسن ظاہری بھی بڑھ جاتا --

سالانہ چندہ تین روپے آٹھ آنے ہے —

مطالعہ

یہ ہفتہ وار جریدہ لدھیانہ سے ایم - حسن لطیفی صاحب بی - اے (ڈپلوما یافتہ لندن اسکول آف جر نلزم) کی زیر ادارت اسی سال جاری ہوا ہے پورا جریدہ خود حضرت اڈیٹر لکھتے ہیں - تنہا نگاری کی یہ پہلی مثال ہے - یہ ہر شخص کا کام نہیں - ہم لطیفی صاحب کے عزم و ہمت کی داد دیتے ہیں - انہوں نے خوب سمجھ کر اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے - وہ اپنے ہم وطنوں کو اپنے خیالات سے فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں - اُن کا مقصد نیک ہے اور اپنی کامیابی پر وثوق رکھتے ہیں - یہ ہفتہ وار ہے اور اس سے یہ دھوکا نہ ہونا چاہئے کہ معمولی اخبار ہے - یہ ایک ادبی اور علمی جریدہ ہے اور فاضل اڈیٹر اپنی جدید اور اعلیٰ معلومات سے خیالات میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں - ان کی تحریر میں شان و شکوہ ہے - وہ معمولی الفاظ اپنے جریدہ کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اکثر ان کی بجاے شاندار الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں اور جب نہیں ملتے تو خود وضع کر لیتے ہیں - البتہ یہ بات دل میں کھٹکتی ہے کہ یہ پر شکوہ طرز بیاں ایک جریدہ کے لئے کہاں تک مناسب ہے ؟

ہمیں تعجب ہوا ہے کہ ایک ایسا صاحب عزم ادیب بعض اخباروں کی تنقید سے اس قدر برہم ہو کہ آپے سے باہر ہو جاے اور جواب میں ایسے الفاظ اور فقرے لکھ جاے جو متین اہل قلم کے لئے زیبا نہیں - مثلاً وہ تحریر فرماتے ہیں " اعتراض

کیا جاتا ہے کہ مطالعہ کی ضخامت بہت کم ہے ' سمجھہ میں نہیں آتا کہ جب پہلے پوسٹر میں اس امر کی وضاحت کردی گئی تھی کہ صرف آٹھہ صفحے ہونگے تو اُس وقت وہ حضرات کیوں خاموش رہے ؟ اور اگر وہ کہیں کہ سائز تو ہمیں معلوم نہ تھا ' وہ خود ہی بتلائیں کہ ایک معقول ہفت روزہ جریدہ کا سائز اور کیا ہو —

ضخامت ! ضخامت ! ضخامت !!! چہ خوب ! چہ خوش ! یہ شور بدتمیزی " سگ بانگ می زند " سے کم نہیں —

عشوہ فروشان " متانت " کو میرا جواب یہ ہے کہ انھیں کوئی مجبور نہیں آتا کہ وہ " مطالعہ " کا پرچہ خرید فرمائیں ' انھیں بار بار " صفحے تھوڑے ہیں " " صفحے تھوڑے ہیں " کہہ کہہ کر اپنی زبان مبارک کو جنبش تکلم دینے کی ضرورت نہیں ...... وہ " گرگان بارہ دید " جو بظاہر معصوم نظر آتے ہیں اُن " بھیگی بلیوں " پر گرم نوازش کیوں ہیں جن کی کونجی آنکھوں میں " مطالعہ " کی ایک ایک زیر اور ایک ایک زیر نوک خار کی طرح کھٹک رہی ہے ؟ ...... ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ " مطالعہ " کے بعض متین اور سنجیدہ قارئین بھی ضخامت کے کم ہونے کے شاکی ہیں ' تو اگر وہ اپنا چندہ بھجوا چکے ہوں تو خط بھیج کر واپس منگوالیں اور اگر یہ بھی اُن کے مزاج مقدس پر گراں ہو اور وہ فوقا آرائی کو ترجیح دیں تو اس کا بلیغ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اور خریداروں کو جو آٹھہ صفحے ارسال کئے جائیں ' اُن کو صرف چار - ! "

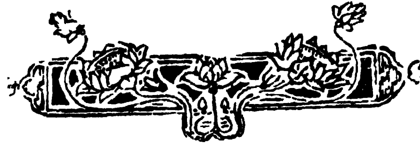
کیا بلیغ جواب ہے - ہمیں اس جواب کو پڑھ کر افسوس اور صدمہ ہی نہیں ہوا بلکہ بہت شرم معلوم ہوئی اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ " مطالعہ " کے سمجھنے کے لئے صحیح دماغ کی ضرورت ہے " - اللہ اکبر ! یہ دماغ !

اگر کسی نے یہ کہا کہ آٹھہ صفحے کم ہیں تو اس میں برا ماننے اور اس قدر طیش میں آنے اور ایسے سخت اور نا ملائم الفاظ کہنے کے کیا معنی - ہمارا بھی یہی خیال ہے کی آٹھہ صفحے کم ہیں اور یہی نہیں بلکہ اُن کا استعمال بری طرح کیا جاتا ہے - مثلاً اس کی کیا ضرورت ہے کہ پہلا صفحہ پورا غیر معمولی جلی قلم میں مطالعہ اور اڈیٹر کا نام لکھنے میں صرف کردیا - اس کے لئے آدھا صفحہ کافی ہے اور باقی آدھا آپ اپنے خیالات لطیفہ کے لئے رکھئے - دوسرا صفحہ پورا ایک نظم کی نذر ہو جاتا ہے - اگر نظم جلی قلم میں نہ ہو تو اس میں

بھی کفایت ہوسکتی ہے - اور ایک بار تو سارا اخبار جلی قلم سے لکھی ہوئی نظم کی نذر ہوگیا - آخری پورا صفحہ قدر دانوں کے خطوں کے لئے محفوظ ہے - اکثر تین چار سطر کے خط کے لئے پورے صفحے کا خون کردیا جاتا ہے - ان خطوں میں کوئی بھی تو کام کی بات نہیں ہوتی - ان خطوں کا (جو خود اڈیٹر کی تعریف میں ہیں) ویسے بھی درج کرنا نامناسب ہے - ان خطوں سے تو نکتہ چینوں کے اعتراض ہزار درجہ بہتر ہیں —

فاضل اڈیٹر کو خود سمجھنا چاہئے کہ اُن کے اخبار میں بہت کم گنجائش ہے اور جس قدر فضول چیزیں اس میں سے خارج ہوسکیں خارج کردی جائیں اور ایک ایک انچ جگہ کام کی باتوں کے لئے محفوظ رکھی جائے - مثلاً انہوں نے ایک پرچے میں دو صفحوں پر اپنے دو انگریزی کے خانگی (پرائیوٹ) خط شایع کئے ہیں - ان میں سے ایک عشقیہ خط ہے - ہماری سمجھہ میں مطلق نہیں آیا کہ اس سے آپ کی کیا غرض تھی اس خط میں زبان یا خیالات کی کوئی بھی تو ایسی خوبی نہیں کہ اُسے اردو کے جریدے میں خاص طور پر شایع کیا جاتا —

بہر حال ہمارا مشورہ یہی ہے (اور اس میں ہرگز کسی بدنیتی کو دخل نہیں) کہ وہ ان تمام فضول اور بیکار چیزوں کو فوراً خارج کردیں اور ممکن ہو تو اس بارے میں کفایت کو کام میں لائیں - چھپائی بہت خراب ہوتی ہے اس کی اصلاح فرمائیں - زبان کو جو بعض اوقات انگریزی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے ، کسی قدر سلیس اور عام فہم بنانے کی کوشش کریں - صبر اور تحمل سے کام لیں ، ذرا ذرا سے نکتہ چینی پر اس طرح بگڑنا ان کی شان کے خلاف ہے - اور بے ادبی معاف ! تھوڑا سا انکسار بھی ہو تو کچھہ بیجا نہوگا —



اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ - جنوری ' اپریل ' جولائی
اور اکتوبر کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور
پہلوؤں پر بحث ہوگی - حجم کم از کم ایک سو اور زیادہ سے زیادہ
ڈیڑھ سو صفحے ہوگا —

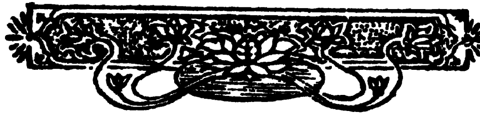
۳ - بلنظر احتیاط رسالہ ذریعۂ رجسٹری بھیجا جا تا ہے —

۴ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملاکر سات روپے کلدار (مع محصول
ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) —

۵ - تمام خط و کتابت :- مولوی عبدالحق صاحب بی - اے آنریری سکریٹری
انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئیے —



(باهتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن ترقی اردو پریس ' اُردو باغ
اورنگ آباد دکن - میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)



اُردو

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اردو

حصہ ۴۶ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء جلد ۱۲

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

اردو لسانیات

از جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی
یہ توسیعی لکچر حضرت کیفی نے کلیۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں ۸ نومبر سنہ ۱۹۳۱ ع کو دیا تھا - سامعین نے اسے بہت پسند کیا تھا - اس میں فاضل لکچرار نے بڑی خوبی اور دلاویزی کے ساتھ اردو زبان کے بعض ایسے مسائل پر بحث کی ہے جو نہایت اہم اور بنیادی ہیں اور جن پر زبان کی ترقی کا بہت کچھ دارمدار ہے - ہمیں امید ہے کہ یہ محققانہ اور پر از معلومات لکچر غور اور شوق سے پڑھا جاے گا —

(اڈیٹر)

زبان ، اصل میں انسان کے تعینات یا اداروں میں سے ہے - وہ اون کی معمول ہے جن کی کار براری اوس سے ہوتی ہے - وہی اوس کے محافظ اور مختار ہیں اونہیں نے عوارض اور ضروریات کے مطابق اوس کو اپنے ڈھب کا بنایا ہے - ہمیشہ ہر کہیں ایسا ہی ہوتا ہے - زبان کا ہر جز و ترکیبی مسلسل تغیرات کا ماحصل ہے جو اہالیان زبان کے ارادے اور رغبت سے عمل پزیر ہوا - یہ لوگ تاریخی عوارض ' انسانی فطرت اور داعیے کے تہہم سے متاثر تھے جن کے نشانات ہماری نظر میں صاف نمایاں ہیں - اور یہی زبان کو سائنٹیفک تحقیق و تفحص کا شایاں موضوع قرار دیتے ہیں ۔

انھیں امتیازی اعتبارات سے مطالعۂ زبان کی نوعیت کا مثل تاریخ و اخلاقیات کے تعیّن ہوتا ہے —

زبان انسانی تہذیب اور نوع انسان کی تاریخ کا ایک شعبہ ہے ۔ زبان متعدد علوم سے استعانت کرتی ہے ۔ لیکن باوجود اس کے انسان کا ذھن افکار کے اظہار کی تلاش اور چھان بین میں زبان کی ترقی و حل معضلات اور روابط و نتایج کے درمیان ایک قسم کی حد وسطی ہے ۔ تاریخ کی مانند زبان کی بھی تحلیل علمیہ مثل کیمیا اور طبیعات کے ایک معمل میں ممکن ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معمل میں اوسی شے کا دخل ممکن ہے جو امر واقعہ ہو اور قانون قدرت کے کُلیہ کے تحت جگہ پاسکے ۔ زبان امر واقعہ تو ہے مگر بہ تقاضائے نوعیت ہمیشہ معرض تغیر میں ہے اور یہی مابہ الامتیاز لسانیات کو دوسرے علوم سے حاصل ہے —

لسانیات کے باب میں تحلیل و تجزئے کے وہ اصول عہدہ برآ نہیں ہوسکتے جو طبیعات و مادیات پر حاوی ہیں ۔ زبان سالمات یا سالبات کے قدغن سے مبرا ہے ۔ ہاں علما کوشش میں ہیں کہ زبان کو سائنس کھئے علم نفسیات وصوتیات کے تحت لائیں ۔ اس ضمن میں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ اول الذکر جیسا کہ اس وقت ہے ضرور یہ شان رکھتا ہے کہ لسانیاتی مسائل پر اس کے خاص نظریوں کی روشنی میں فکر کی جائے ۔ یہ امر متقدمین اردو کے ذہن نشین تھا ۔ اہالیان اردو نے زبان کی طرف سے علمی تخیّل کو کبھی طلاق نہیں دی ۔ افعال کے صیغوں کی تنظیم ۔ سائنٹیفک اصول پر صفت و موصوف اور مضاف و مضاف الیہ کی تقدیم وتاخیر کا آئین — حروف جار کی معنوی حیثیت کی تعین — اسلوب اور زبان کی داخلی استعداد کے مطابق مرکبات کی توضیح ۔ تارید کے موقعوں پر تصرف کا مستحسن استعمال

محاورے کی سلاست اور منطقی تدوین -- ضرب الامثال کی عمومیت اور کلیت اور قوت تالیف -- اور تعقید و اضمار قبل الذکر کی معائب انشا میں شمولیت وغیرہ وغیرہ -- وہ امور ہیں جو عہد قدیم و متوسط میں اہالیان اردو کے حسن شعور اور سلیقہ تنظیم کی ہزار زبان سے داد دیتے ہیں -- ان میں سے بعض امور جستہ جستہ آپ کی توجہ کے لئے پیش کئے جائینگے —

خدا معلوم وہ دن اردو زبان کے حق میں کتنا اہم اور نتیجہ خیز تھا جب حضرت شاہ سعداللہ گلشن نے شمس الدین " ولی " کو یہ ہدایت کی :—

" ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ بہ کار ببر -- از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت " ترجمہ

یہ اتنے سارے فارسی کے مضمون جو بیکار پڑے ہوئے ہیں ان کو اپنے ریختے میں استعمال کر - کون تجھ سے جایزہ لیگا —

استاد کی ہدایت کی تعمیل میں وہ مضمون تو شاگرد رشید نے اٹھا لئے جن کی بدولت اس کے کلام کو شہرت دوام کا تمغا نصیب ہوا مگر زبان اس شاہ جہان آباد کی اردو معلیٰ ہی رکھی -- شاہ صاحب کا منشیہ یہ تھا کہ ولی دکنیت کو ترک کرکے اردو زبان کو ایران کی نغز گفتاری - تشبیہ و استعارہ وغیرہ محاسن کلام یا اصناف شعری سے متمول کرے انہیں کیا خبر تھی کہ تین صدی بعد ایسا زمانہ آئیگا کہ اوس مفید مشورے کے الٹے معنی لئے جائینگے -- اور چند حروف جار اور اسماء افعال وغیرہ کے سوا اردو کلمے کلام سے خارج کردئے جائینگے —

اردو نے قدیم اور متوسط زمانوں میں کیا لسانی ترقی کی اور اس اعتبار

سے اب اوس کی کیا حالت ہے -- اس کا مجمل تذکرہ آج کیا جائیگا -- تحقیق اس امر کی منظور ہے کہ عہد حاضر میں اردو لسانیاتی اعتبار سے کس درجہ کو پہونچی ہے اور یہ کہ وہ حالت اطمینان کے قابل ہے یا نہیں؟ یہ تحقیق نہ صرف اس یا اوس جماعت بلکہ ہر شخص کا فرض ہے جو اردو کو اپنی زبان کہنے کا دعوی کرتا ہے —

زبان کے ترکیبی فعلوں میں سے یہاں صرف دو کا ذکر کیا جائیگا -- یعنی اختراعی یا ابداعی استعداد اور اخذ کی قابلیت -- یہی دو علامتیں ایک زبان کے موجیون ہونے کی ہیں -- یہ قابلیت اور استعداد جب کسی زبان میں زایل ہو جاتی ہے تو اوس کی ترقی کا راستہ مسدود ہو جاتا ہے -- اور اسباب بھی ہیں جو زبانوں کی ترقی بلکہ زندگی کے مزاحم ہوتے ہیں - جیسے رواج و پسند عام کو قطعاً نظر انداز کردینا اور زبان سے متعلق ہر امر کو سائینٹفک تنقیم قرار دیکر قاعدے کے قیود و تعینات میں جکڑ بند کردینا جیسا کہ سنسکرت کے ساتھہ ویّاکرنیوں نے کیا -- میں مانتا ہوں کہ قاعدے اور آئین کی ضرورت مسلم ہے لیکن اوس کا استبداد اور بارن تولے پاورتی جیسے یقینیات عامہ کا حکم ناطق زبان کی شبابیات اور اپج کا دشمن ہے - یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ اختراع بغیر حسن شعور اور ذوق سلیم کے اور اخذ بغیر تصرف حسنہ کے ممکن نہیں - اردو کی موجودہ حالت دیکھکر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ بیچاری اوس مقام کے قریب تو نہیں پہنچ رہی ہے جس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا - اگر ہم انانیت اور برخود غلط ہونے سے دور ہٹ کر نظر غایر سے کام لیں تو خوف ہے کہ شبہ یقین کے قریب پہنچ جائیگا —

لسانیات اور ادبیات یا کہئے کہ زبان اور لٹریچر میں جو امتیاز ہے

اوس کی تصریح کی ضرورت نہیں - مختصر یہ کہ یہ امر تمام اردو دنیا کا دل بڑھانے اور امید دلانے والا ہے کہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے دارالترجمہ کا محض تتمہ نہیں یعنی کسی خطّ تو اماں کا ورق ثانی نہیں بلکہ زبان کی ترقی واصلاح بھی اس کے مقاصد میں سے ہیں - آج کا موضوع محض اس غرض سے انتخاب کیا گیا کہ جامعہ کے معزّز آر اکین و اصحاب حلّ وعقد اور دوسرے ادیب اور نکتہ رس اصحاب جو اس صحبت میں تشریف رکھتے ہیں - اون کی توجّہ اس طرف منعطف کی جائے - یعنی اردو کی لسانیاتی حالت کی جانب تاکہ وہ بزرگ اس کی کیفیت و کمیت کا موازنہ کریں - اس لحاظ سے شاید ہندی بھی اوسی ضغطے میں ہے جس میں اردو ہے - لیکن میرا روئے سخن اردو کی طرف ہے —

عرض کیا گیا ہے کہ جب کوئی زبان اختراع و اخذ کے بارے میں قوّت فعل سے عاری ہوجاتی ہے تو ارتقا کی شاہراہ سے بھٹک جاتی ہے - اگر ابھی سے روک تھام نہ کی گئی تو خوف ہے کہ اب سے دور یہ موذی مرض کہیں لاعلاج نہ بن جائے —

پہلے اس کا جایزہ لیا جائیگا کہ اردو کی لسانی ترقی سے متعلّق متقدمین اور متوسطین نے کیا کچھہ کہا - اور پھر بتایا جائیگا کہ اون کے متعا قبین اور عہد حاضر کے کارنامے کیا ہیں - لیکن یہ سب امور ایک واحد لکچر میں احاطہ نہیں ہو سکتے - جو کچھہ کہا جائیگا بالاجمال ہوگا —

متقدمین کرام کو جس وقت یہ چیتک لگی کہ اردو یا ریختہ کو منظم کریں تو اون کے سامنے کوئی مکمل دیسی ہندوستانی نمونہ موجود نہ تھا - اوس وقت کی ہندی یا برج بھاشا - سورسینی یا پراکرت کو آج کل کے لسانیاتی معیار اور اصول کے متبع مکمل نہیں کہا جاسکتا - کیونکہ اگر

کسی میں اعلیٰ نظم موجود تھی تو نثر مفقود - اور کسی میں نثر تھی تو نظم مہتم‌بالشان ندارد تھی - اس لئے تحقیق اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ " ہندیرانی " مسالے سے جوبت تیار ہوا تھا اوس کی پوشاک تو ہندوستانی رہی لیکن اوس کے لئے زیور کچھہ ہندوستان اور زیادہ تر ایران کا استعمال کیا گیا - یہ آپ جانتے ہیں زیور کس قدر پیارا اور سہانا ہوتا ہے —

اردو زبان کی تدوین و تزئین کے بہت سے اصول اور طریقے بتائے گئے ہیں - لیکن جو گُر سیدانشا مرحوم نے دریافت کیا فلسفۂ زبان کا سرتاج ہے اور رہیگا جب تک اردو زندہ ہے - آپ فرماتے ہیں :—

" مخفی نہ ماند کہ ہر لفظے کہ در اردو مشہور شد عربی باشد یافارسی یا ترکی - یا سریانی - یا پنجابی یاپوربی - ازروئے اصل غلط باشد یا صحیح - آں لفظ لفظ اردوست - اگر موافق اصل مستعمل است هم صحیح و اگر خلاف اصل است هم صحیح - صحت و غلطی آں موقوف بر استعمال پزیرفتن در اردو است - زیرا کہ ہرچہ خلاف اردوست غلط است گودر اصل صحیح باشد - و ہرچہ موافق اردوست صحیح باشد گودر اصل صحت نہ داشتہ باشد " * —

ترجمہ

یادرکھنا چاہئےکہ‌ہرلفظ‌جواردو میں مشہور ہو گیااُردوہوگیا - خواہ وہ عربی ہو یا فاسی - ترکی ہو یا سریانی - پنجابی ہو یا پُوربی - ازروئے اصل غلط ہو یا صحیح - وہ لفظ اردو کا لفظ ہے - اگر اصل کے مطابق ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر اصل کے خلاف مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے - اوس کی صحت اور غلطی اردو میں اس کے استعمال میں آنے پر منحصر ہے - کیونکہ جو اردو کے خلاف ہے غلط ہے - خواہ وہ اصل زبان میں صحیح ہو - اور جو اردو کے موافق ہے صحیح ہے خواہ وہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو — "

* دریائے لطافت ـ صفحہ ۲۴۱ —

سید مبرور نے ان چند فقروں میں تہذیب لسان کے ضابطے کا لب و لباب پیش کر دیا ہے۔ اسی اصول پر اُردو بنی اور پروان چڑھی۔ اسلاف کا دستور العمل یہی تھا۔ یہ تصرفات اُردو جن کو میں ایک لفظ 'تاریہ' سے تعبیر کروں گا تفریس و تعریب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور رکھیں گے جب تک اُردو زندہ اور چالو زبان ہے۔ کیوں کہ اول تو وہ عربی یا سنسکرت کی طرح صرفی زبان نہیں اور دوسرے یہ کہ اُس کی بنیاد ہی کاٹ چھانٹ اور تصرف ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ آیا زبان کی ساخت کا یہ گر اردو والوں نے ہندی سے سیکھا جس کا بہت امور میں سنسکرت سے انحراف بدیہی ہے۔ بہرحال کامل تحقیق اب اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ دسویں صدی عیسوی کے قریب سورسینی آپ بھرنش سے مغربی ہندی نکلی جس کے میل سے دوآبہ گنجم * میں ایک نئی زبان پیدا ہوئی۔ اسے مستشرق اور لسان ہندوستانی کہتے ہیں۔ پھر اس کی دو شاخیں ہوگئیں۔ جس کی وجہ اول اول زیادہ تر رسم الخط تھی۔ یہ دو شاخیں آپ کی ہندی اور اردو ہیں۔ زبان کی تاریخی روداد کے اس مجمل حوالے سے میرا مطلب یہ ظاہر کر دینا ہے کہ جو دعوی ہم اردو کے بارے میں کرتے ہیں بہت ممکن بلکہ اغلب ہے کہ اوس میں ہندی والوں کا بھی حصہ شریک ہے۔ کیوں کہ یہ امر ثبوت اور استدلال کا محتاج نہیں کہ جب تک ہندوستانی دو شاخوں میں منقسم ہوکر جداگانہ ضبط تحریر میں نہ آئی سب برابر کام کرتے رہے اور اُسے بناتے رہے —

---

* میں نے اُس حصۂ ملک کو جو دریاے گنگا اور جمنا کے بیچ میں واقع ہے دو آبہ گنجم نام دیا ہے —

اس سلسلے میں پہلے اسموں کو لیا جائےگا۔ اردو والوں نے نہ صرف یہ کیا کہ الخالق کو الخالق (پوشاک کی ایک چیز جیسے اچکن) جامؔ کو جاجَم اور موسِم کو موسم بنا لیا بلکہ بہت سے عربی الفاظ کی جنسیت بھی بدل دی۔ فارسی خوش نصیب تھی کہ اُس نے یہ بکھیڑا پالا ہی نہیں۔ مثلاً شمس جو عربی میں مونث تھا اردو میں مذکر ٹھہرا۔ آپ کہیںگے یہ مداخلت بیجا کیوں؟ یہ تو سخت لسانی بدعت ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اس لغت کے لئے اُن کے پاس صرف دو متبادل طریق عمل تھے۔ یا تو وہ اس لفظ کو لیتے ہی نہیں اور لیتے تو اُس کے مترادف لغت ہندی کی جنسیت کا اتباع لابد تھا۔ جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا یعنی سورج۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ غیر زبانوں کے اسموں کی تذکیر و تانیث سے متعلق اُن کا نظریہ یہ تھا کہ اُن کو دیسی اسموں کی جنس کا متبع کرتے تھے۔ مدتوں اہل اُردو اسی دستور پر چلتے رہے اور جو محتاط ہیں اور ذوق سلیم رکھتے ہیں اب بھی اسی پر عامل ہیں۔ اُنھوں نے 'مندیل' کو 'مَندیل'۔ 'جادہ' (بر وزن 'مادہ') کو جادہ۔ 'توشک' (بجز فوقانی سب حرف ساکن) کو 'توشک' اور نغمہ (غین مضموم) کو نغمہ کر دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں جلدی سے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان اور بیسیوں دوسرے الفاظ میں تصرف کی معقولیت اور وجاہت کے حق میں زبردست دلائل پیش ہو سکتے ہیں۔ جس کا یہ موقع نہیں۔ تصرف کا عمل الفاظ فارسی و عربی کی صوتی حیثیت یعنی تلفظ اور جنسیت تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اصل معنوں میں بھی تصرف کئے گئے۔ 'تحفہ' سوغات کے معنی رکھتا تھا لیکن وہ اچھے۔ سجل اور تازے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا —

وہ زمانہ بیسویں صدی عیسوی کا زمانہ نہ تھا کہ بات بات میں

ملی- پچھ نکالی جاتی - اُن لوگوں کے نزدیک ھندو مسلمان اور اُن کے مذھب یا مذھبی روایتیں اور اصطلاحیں یکساں تھیں - اُنھوں نے اپنی زبان کو بنانے اور سنوارنے کا عزم کیا تھا - شدھی یا تبلیغ کا نہیں - اُن کا قول و فعل تھا "عیسیٰ بدین خود و موسیٰ بدین خود" خود - قرآن کا جامہ پہننا اور گنگا اُٹھانا تو رھا ایک طرف انھوں نے صلواۃ جیسے لغت کے معنی میں بھی جو جناب رسالت مآب کی مقدس ذات سے مخصوص ھو چکا تھا تصرف کیا - اگرچہ اتنا پاس ادب ضرور رھا کہ اُسے محض صیغہ جمع تک محدود رکھا - میر تقی 'میر' مغفور فرماتے ھیں :—

پڑھتا تھا میں تو سبحہ لئے ھاتھہ میں درود
صلواتیں مجھہ کو آ گے وہ نا حق سنا گیا

اُنھوں نے گنگا کو اُلٹا کر پھر شوجی کی جٹاؤں میں پہنچا دیا - منشی اسیر کا شعر ھے :—

ھم تو پیاسے رھے سے غیر کو دی پیر مغاں!
اُلٹی اس شہر میں بہتی ھوئی گنگا دیکھی

اصل میں تھا :— "لا اِلی الذین و لا الی الذّین" یعنی نہ اُن میں سے نہ اُن میں سے - اس سے بنا لیا اِلّذی نہ اُلّذی - بمعنی مذبذب - ڈانواں ڈول - چنانچہ سید رضی نے کہا :—

نہ تو عاشقوں ھی میں جا ملی نہ وہ فاسقوں سے بنی رھی
ڈری وہ مثل ھے اب اے رضی کہ اللّذی نہ اللّذی

کلمہ مقدس 'لن ترانی' کی شان ورود تشریح کی محتاج نہیں - اس کے معنی قرار پائے خود ستائی - انانیت - شیخی وغیرہ - شیخ ناسخ نے فرمایا :—

لنترانی سنتے ہیں دیدار سے محروم ہیں
یعنی اس حیرت کدہ میں کور ہیں ہم کر نہیں

ٹھاکروں کی پوجا میں سب سے پہلے گنیش جی کی پوجا کی جاتی ہے - مگر وہ بھی تصرف و اختراع کی زد سے نہ بچ سکے۔ "گوبر گنیش" کا مرکب آپ کے روز مرہ اور لغات میں موجود ہے —

سامعین کرام - ذرا بگلا بھگت' اور 'ولی کھنگر' کی طرف التفات فرمائیےگا۔ کیا برابر کی جوڑ ہے - شوق قدوائی مرحوم نے فرمایا —

کھویا انہیں شوق کیمیا نے اے شوق
لوٹا انہیں جھوٹے فقرا نے اے شوق
کامل نہیں ایک اور ولی کھنگر لاکھ
بس دور کے ڈھول ہیں سہانے اے شوق

' رام کہانی' ہندؤں کے ہاں رامچندر جی کی کتھا کو کہتے تھے - اردو والوں نے اس کے معنی میں تصرف کرکے اس طرح استعمال کیا - جرات مرحوم کا ارشاد ملاحظہ ہو :—

درد دل اوس بت بیدرد سے کہئے تو کہے
جا کے یہ رام کہانی تو سنا اور کہیں

کھٹ سنسکرت میں چھہ کا نام ہے - کھٹراگ کے لغوی و اصطلاحی معنی ہیں چھہ راگ - یہ مرکب اون چھہ مول راگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جن سے اور بہت سی راگنیاں نکلی ہیں مگر اردو میں اس کے معنی کے کے اور سُر کیا ٹھاٹھہ ہی بدل دیا - صبا کا شعر ہے :—

پڑے ہیں عشق کے کھٹراگ میں ہم اے مطرب
کسے خیال ہے دھرپد - ترانے تروٹ کا

مرکب اسموں کے سلسلے میں ایک اور لفظ کا ذکر کیا جائے گا وہ ہے "کُٹ بڈیا" - اس کے معنی آپ جانتے ہیں مار پیٹ زدوکوب یہ وہ بدیا ہے جو بے سکھائے پڑھائے آتی ہے —

مبادا آپ سنتے سنتے اکتا جائیں اس لئے اب اس سلسلے کو ختم کرتا ہوں - میں نے کئی سو لفظوں کا ایک نقشہ مرتب کیا ہے جن میں اسم بھی ہیں اور افعال و ضمایر وغیرہم بھي - اس کے چھہ خانے رکھے ہیں (۱) اردو (۲) ہندی (۳) پنجابی (۴) اپ بھرنش (۵) پراکرت اور (۶) سنسکرت۔ اس موقع پر سارا نقشہ پیش کرنا تو طول امل ہے نمونے کے طور پر پانچ چھہ لفظ عرض کئے جائیں گے جو اردو والوں نے اخذ و تصرف کے سلیقے کا بین ثبوت پیش کرتے ہیں —

اردو	هندی	پنجابی	اپ بھرنش	پراکرت	سنسکرت
چھانو	چھئیاں	چھاں	چھاؤ	چھاآ	چھایا
بیکا	بانکا	ویلکا	وَنکڑُو	وکٹُو	وکَرَک
ڈھیٹ	ڈِھیٹھ	ڈھیٹھ	ڈھٹّھوُ	ڈِھٹّھوّ	دِھرِشٹ
سچ	سانچ	سَچّ	سَچُّ	سچّم	ستیم
کونَل	کوپل	کول	کوئِل	کوئلِا	کوکِلا
ڈِیٹھا	ڈِیکھا	ڈِٹھا	ڈِٹھّوُ	ڈِٹّھ	درِشٹ

حفظ مراتب کی نظر اور ادبی روا داری ملاحظہ فرمائیے گا - ایک لفظ کو مفرد حالت میں اتو اپنے ڈھب کا بنالیا مگر مرکب حالت میں اوس کی اصلی ہئیت کو ہاتھہ نہ لگایا - مثلاً سانچ کو بدل کر سچ کرلیا . لیکن " سانچ کو آنچ - نہوں" اس میں سانچ ہی رہنے دیا . اسی طرح ہست سے بہ تدریج " ہتھہ " بنا - جب ہمارے ہتے چڑھا تو ہم نے اس کو ہاتھہ بنا لیا لیکن

مرکبات میں اس کی وهی سورسینی شکل قائم رکھی - جیسے " هتهه چُهٹ "
" هتهه پھیری " " هتهه پھول " - " هتهه کھنڈا " - پُهلّم سے پھول بنا مگر
مرکب پھلجھڑی اور پھلکاری میں اصل شکل قائم رکھی - اسی طرح سورسینی
" نک " میں الف ایزاد کرکے " ناک " تو بنالیا لیکن " نکتوڑا " نکٹا میں اس کی
هئیت کذائی قائم رکھی —

قدما اور متوسطین کی نکته رسی اور معنی آفرینی کی کہاں تک
داد دی جائے - ایک معمولی لفظ ' خوف ' کو لیجئیے - اس کے کتنے مترادف
الفاظ وضع یا اختراع کئے - یا تصرف سے کام میں لائے اور اون کو وہ وہ
معنی پہنائے که نفسیات کا ماهر دنگ رہ جاتا هے - ملاحظہ هو : -
ڈرنا - جھجک - بھچک - سانسا - کھٹکا - تھڑکا - سهم - سنّاٹا - دھچکا - در -

یہ سب کلمے خوف کے مختلف درجوں کو وا ضع کرتے هیں اور پکار کر کہہ
رهے هیں که هماری زبان کا دامن کتنا فراخ هے —

مرکبات کو دیکھئیے -- " مرتکا " سے ادل بدل هوتے هوتے ماٹی بنا - اس بهاشا
کی ماٹی کو انهوں نے مٹی بنا لیا اور پھر اوس سے نہایت اهم مرکب تو صیفی
تیار کیا یعنی مٹیالا - میرے خیال میں یه مرکب سنسکرت کی سندھی
کے قاعدے پر بنا هے - بے محل نه هو گا اگر گریمر کی اس اصطلاح سندھی
کی نسبت یہاں دو لفظ کہدئے جائیں - جب ایک لفظ ایسے حرف پر ختم هو که
اوس کی آواز متعاقب لفظ کے اول حرف کی آواز کے ساتھه آسانی سے پیدا نه
کی جا سکے تو اون حروف میں سے ایک حرف کو کبھی کسی کبھی کسی حرف سے
بدل دیتے هیں - یا کہئیے ایک حرف کو حذف کر کے اوس کی جگه ایک نیا
حرف ایزاد کر دیتے هیں - سنسکرت کا اصل فقرہ تھا " دَدِهی آنے " چونکه
' اِی ' اور ' آ ' دونوں کی آواز یکے بعد دیگرے ادا نہیں هو سکتی تھی اس

واسطے اس کا " دھنیانے " بن گیا - اسی طرح " روی آتی تھکشنو بَھوتی "
میں آتی کے الف کو " ر " سے بدلا اور ' روی رتی ' - بنا دیا آپ نے دیکھا
اب جس کو ہمارے ہاں تنا فر حروف کہتے ہیں رفع ہو گیا - سنسکرت میں
یہ قاعدہ یعنی سندھی کا قاعدہ مہتم بالشان حیثیت رکھتا ہے - میری تحقیقات
میں اکثر ' انڈو یوروپین ' یعنی آریائی زبانیں اس پر کم و بیش عمل پیرا
ہیں فارسی کو لیجئے ' بندہ ' اور ' مژہ کی ' جمع ' الف ' ' نون ' سے بنا نی
تھی - دیکھا کہ ہائے مختفی کے ساتھ الف کا میل نہیں - چنانچہ ' بندہ ' اس
کے بدلے بندگا ں ' اور ' مژہ اں ' کے بدلے ' مژگاں ' بنادیا - یعنی ہائے
مختفی کو ' گ ' سے بدل دیا - یہ دقت اور سندھی کے اصول کی پابندی
کی ضرورت وہیں آ کر پڑتی ہے جہاں دونوں طرف حرف علت ہوں - یا
ایک طرف ہائے مختفی اور دوسری طرف حرف علت —

ایک خاص فقرے کے تلفظ پر آرنلڈ بنٹ کا غصہ سرا سر بے محل
تھا جب اوس نے ' وسٹ انڈ ' کے ایکٹروں کی زباں سے سنا : —

" سوڈا رینڈ ملک "

وہ سمجھا کہ " سوڈا اینڈ ملک " کی مٹی خراب کی ہے جاہل
ایکٹروں نے * مگر مغربی لنڈن کے جاہل ایکٹر نادانستہ پا ننی کا اتباع
کر رہے تھے - جس نے " روی آتی " کو " روی رتی ' بنا دیا - وضع کر نے
والے نے کیوں نہ سوچا کہ دو الف پیہم آواز نہیں دے سکینگے - لوگوں
کو اس ترکیب کی غیر فطری ادا کا احساس ہوا اور اب وہ اور تو کچھ
نہ کر سکے " ملک اینڈ سوڈا " اور " وھسکی اینڈ سوڈا ' بولنے لگے —

---

* تفصیل کے لئے دیکھو (Modern English in thi Making مصنفۂ جارج
میکنا ئمن - صفحہ ۵۶۹

اس ضمن میں ایک مثال انگریزی زبان سے اور پیش کی جائیگی - یہاں اوسی سندھی کے اصول کو قاعدے کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے - انگریزی گریمر کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جو لفظ حرف علت سے شروع ہو اوس کے پہلے اے (A) بمعنی ایک نہیں لاتے بلکہ ' اَین ' An لاتے ہیں ' اے بک ' تو ٹھیک لیکن اے ایکٹ غلط - کیوں کہ دو الف کی آواز ایک سا تھہ نکا لنا آلات نطق کے بس کا روگ نہ تھا اس لئے (N) یا نون بڑھا کر (A) کا اَین بنانا پڑا —

عجمی جب عربی زبان کے قاعدے باندھنے بیٹھے تو ان کا ذہن سندھی کے اُس اصول سے متاثر تھا - اسی وجہ سے اُنھوں نے فصاحت سے متعلق تنافر حروف پر بہت زور دیا - لیکن چونکہ عربی ان کی مادری زبان نہ تھی اور سامی حروف کی صحیح آواز پیدا کرنے سے ان کے آلات نطق عاری تھے نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں تنافر حروف نہ تھا وہاں بھی انگلی رکھہ گئے - سب جانتے ہیں کہ ہائے ہوز اور حائے حطي کی آوازیں جدا جدا ہیں لیکن غیر اہل زبان اپنے منہ سے اُس امتیاز کو ظاہر نہیں کرسکتا - اسی طرح بعض شاعروں نے جن کے آلات نطق الف اور عین کی صحیح سامی آواز پیدا کرنے میں قاصر تھے الف کی طرح عین کو بھی گرا دیا ہے —

مرکب افعال ایسے ایسے مرتب اور وضع کئے کہ اس بارے میں شاید کوئی زبان اردو کا مقابلہ کرسکتی ہو - مثال کے لئے ایک معمولی مصدر ' لکھنا ' کو لیجئے - ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے :—

(۱) خط لکّھو

(۲) خط لکھدو

(۳) خط لکھڈالو

(۴) خط لکھہ چکو

آپ ان چار جملوں کے معنی جانتے ھیں - ترکیب نے جو زور اور معنوی امتیاز فعل کو بخشا ھے اُس کو بھی محسوس کرتے ھیں - اردو کی لسانیاتی وقعت جو اوسے اسلاف نے عطا کی ایک اور واقعہ سے ثابت ھے علما کے اس مجمع کے سامنے اس توجیہہ کی ضرورت نہیں کہ ھمارا مجموعہ تعزیرات ھند شاید حسنی نین کے ضابطۂ قانون کے سوا سیاسی قوانین میں مکمل بلکہ اکمل تسلیم کیا جاتا ھے - یورپ کے کئی ملکوں میں اس مجموعہ کو آگے رکھہ کر ضابطے مدون کئے گئے - باوجود اس کے یہ مجموعہ بھی اُردو کا مرھون منت ھوئے بغیر نہ رہ سکا - اور لارڈ مکالے جیسا وحید عصر اور بے بدل منشی اُردو کے سامنے ھاتھہ پھیلانے پر مجبور ھوگیا - یہ اشارہ ھے دفعہ ۵۰۸ کی تشریح الف کی جانب جس میں لفظ ' دھرنا ' قدرے الطف تصرف کے ساتھہ استعمال ھوا ھے - 'دھرنا دینا' کے معنی آپ کو معلوم ھیں جو ھیں —

اونھوں نے ماخذ کی پروا نہ کر کے ماخوذ سے واسطہ رکھا اور اوسے اپنے مطلب کا بنالیا - چنانچہ عربی یا فارسی لفظوں کی جب اپنے قاعدے کے بموجب جمع بنانے لگے تو حرف ثانی کی حرکت کو حذف کردیا - 'محل' کی جمع بنی 'محلوں' - حائے حطی کی حرکت غائب - اسی طرح ' نظر ' کی جمع بنائی ' نظروں ' نہ کہ ' نظَروں ' —

اگر اونھوں نے فارسی اور عربی یا سنسکرت کے لغات کی اندھی تقلید کی ھوتی تو اُردو کو یہ لغاتی تمول ھرگز نصیب نہ ھوتا - اب جو کوئی " ازالۃ الاغلاط " یا " تصحیح اللغات " وغیرہ کا نام لے تو سمجھہ لو کہ وہ اُردو کا اھل نہیں —

' صفات ' میں بھی ایسے مرکب وضع کئے کہ انسان حیران رہ جاتا ھے

کہ کن الفاظ میں ان کے ذہن رسا اور جدت آفرینی کی توصیف کرے ' سیتلا مُنہ داغ ' اور سیتاستی ' کو ملاحظہ فرمائیے - اس مرکّب توصیفی وسیتاستی ' کے معنوں میں لکّھا گیا ہے " ہندی - مسلمان عورت " یعنی یہ مرکب مسلمان عورتوں کے استعمال سے خصوصیت رکھتا ہے - اس کے معنی ہیں :- " عفیفہ - بیوی زن - جس کے دامن پر نماز جایز ہو"۔ یہ معنی وہ ہیں جو مسلمان مولف اس لغت کے سامنے لکھتا ہے —

صفت نسبتی میں انھوں نے نہایت دلچسپ تصرت سے کام لیا۔ " تاریخ فیروز شاہی " آپ نے دیکھی ہے - یہ بھی جانتے ہیں کہ اوس کا مصنف " ضیاء برنی " ہے -- جغرافیہ کے بڑے سے بڑے ماہر سے پوچھئے کہ برن کہاں واقع ہے -- وہ سوئیزرلینڈ کے نقشے میں تو ایک برن آپ کو بتا دیگا لیکن ہندوستان کے نقشے میں یہ مقام معدوم رہیگا -- آپ جانتے ہیں کہ بلند شہر کا قدیم نام " برن " ہے -- اونھوں نے قصبہ کا نام تو بدل دیا مگر صفت نسبتی کو ' برنی ' رکھا -- بلند شہری نہ بنایا -- اس کا دوسرا رخ بھی دلچسپ ہے - آگرہ کا نام اکبرآباد نہ پڑسکا اکبر کے عہد کے قبل سے آج تک سب آگرہ ہی کہتے ہیں - لیکن شاہ نظیر اکبرآبادی کہلاتے ہیں -- دہلی شاہجہان آباد تو بنگئی لیکن اوس کے شاعر دہلوی ' ہی رہے -- بات یہ ہے کہ اون کا تصرّت مصلحت اور حسّ مشترک پر مبنی تھا -- ضد اور استبداد پر نہیں اور اون کے نظر یے معقولیت پر مدون تھے —

ذرا غور فرمائیے کہ اون بزرگوں کی ذہنیت کتنی دقیقہ رس اور نکتہ پرور ہوگی - اور اُن کی تصرت لسانی کی قوت عمل کتنی زبردست ہوگی جو بخشنا - خریدنا -- آزمانا -- بدلنا -- فرمانا ' وغیرہ مصدر ترکہ میں

چھوڑ گئے -- مختصر یہ کہ اردو کے متقدمین نے اوس کی تدوین و تنظیم میں جو سنبھالا اون کے سامنے تھا اوس سے بہترین کام لیا -- جس کی بدولت زبان کو مستقل اور قایم بالذات حیثیت حاصل ہوگئی -- تصرف لسانی کے معنی صرف ' اپنانا ' نہیں بلکہ اپنا سا بنالینا ہیں -- آپ نے دیکھا عربی لفظ " بدل " کو لے کر بدلنا مصدر بنایا -- اب اس کی فعل کے ہر زمانے اور صیغے میں گردان ہوسکتی ہے -- یہیں تک نہیں حاصل مصدر بنا " بدلی " تابع مہمل بھی اس کے ساتھ ملایا گیا جیسے ادل بدل ' -- مختصر یہ کہ اوس کی وہی حیثیت ہوگئی جو آنا -- جانا -- کھانا پینا کی تھی -- انگریزی میں یہ عمل اب تک جاری ہے اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ وہ زبان برابر ترقی کررہی ہے -- 'لوٹ' انھوں نے ہمارے ہاں سے لیا اور ایسا اپنامنا بنا لیا کہ فعل کی گردان میں ' ٹوآؤ ' اور ' ٹولوٹ ' بالکل یکساں ہیں -- چارلس ڈکنس جیسے مستند مصنف نے یہ لفظ استعمال کیا ہے -- اور پھر ہمارے ' لٹیرا ' کی جگہ 'لوٹر ' بنایا -- حال ہی میں ایک لفظ انگریزی میں داخل ہوا ہے -- ہڑتال ' یہ اونھوں نے ہڑتالسٹ ' بنایا اور جمع کے لئے ' س ' اوس پر ایزاد کیا -- جیسا کہ انگریزی گریمر کا قاعدہ * ہے -- میرا مطلب تصرّف سے یہ ہے --

پچاس برس کا مشاہدہ اور تجربہ جو منظر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے - حسرت ناک اور مایوس کرنے والا ہے -- یہ دیکھکر جی ڈوبتا ہے کہ اس نصف صدی کی مدت میں ہم نے اردو کی لغات میں کوئی ایزادی نہیں کی - یعنی اس بارے میں اردو کا ترکیبی فعل گویا معطّل ہوگیا -- چند اصطلاحیں جیسے " برقانا وغیرہ ضرور وضع کی گئیں -- اور ' بوروت ' جیسے چند

* دیکھو ٹائمس آف انڈیا ہفتہ وار -- بمبئی -- مطبوعہ ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۳۱ ع صفحہ ۱۹ --

دیسی لفظ اردو میں ضرور لے لئے گئے ھیں - لیکن یہ سب علم و فن کی اصطلاحیں ھیں -- اور پھر یہ بھی دیکھنا ھے کہ ان کے وضع یا اختیار کرنے والوں کو کیا کہا گیا —

غیر زبانوں سے جو لفظ بلا ضرورت بجنس اردو میں آئے اون میں سے اکثر نا خواندہ مہمان کی طرح اردو کی سبھا میں اوپرے معلوم ھورھے ھیں -- اس ضمن میں آگے چل کر کچھہ عرض کیا جائیگا —

سیاسیات کی مانند لسانیات میں بھی سخت جان ھوا کرتے ھیں - یہ سخت جان اون سخت جانوں سے مختلف ھیں جن کی سوانح عمریاں غزل کے اشعار میں بکھانی جاتی ھیں - ان کا استبداد اور سخت گیری زبان کی ترقی اور توسیع کے مزاحم اور جانی دشمن ثابت ھوئے ھیں - ھر زبان ان حضرات سے تنگ ھے - کہاں اللہ بخشے وہ بزرگ جن کا قول تھا کہ برقع چونکہ ھماری زبان میں الف سے نکلتا ھے اس لئے بجائے عین کے الف سے لکھنا چاھئیے اور کہاں یہ حضرت جو تصرف لسانی کے نام سے بھویں تانتے ھیں -- کہا جاتا ھے کہ اردو میں ' خود رفتہ نہیں بلکہ ' از خود رفتہ ' استعمال کرنا لازم ھے -- جواب دیا گیا کہ ' سر گذشت ' کی سرگذشت تو ذرا بیان فرمائیے -- یہ اوسی قسم کی موشگافی اور ماخذ پرستی ھے جیسی انگریزی میں لفظ " Reliabli " کے متعلق انگلستان کے ادبی سخت جانوں کی طرف سے ظہور میں آئی تھی - ذرا سنئیگا بڑے لطف کی بحث ھے —

اس لفظ کے معنی ھیں اعتبار کے قابل -- اعتراض ھوا کہ ایک لفظ ٹرسٹ وردی (Trust Worthy) پہلے سے موجود ھے تو پھر زبان کے نازک اندام پر اور بوجھہ کیوں لادا جاتا ھے -- اس کا شافی جواب ملا یعنی ثابت کردیا

کہ پرانا لفظ نئے لفظ کے نفس معنی کا حامل نہیں -- تو ارشاد ہوا :-
چونکہ یہ نیا مرکب لفظ ' Rely ' سے بنا ہے اور اس فعل کے بعد التزاما
حرف جار آن ' On ' آیا کرتا ہے - اس واسطے اس مرکب کو رلائنبیل
' Relionable ' کہو - سب جانتے ہیں جو حشر اس غلط استدلال کا ہوا -
لفظ ' رلائیبل ' اس وقت انگریزی کے معتبر کلمات سے ہے —

ارشاد ہوتا ہے کہ لفظ رہائش غلط ہے -- اردو مصدر رہنا سے
فارسی طریق پر حاصل مصدر بنا لیا معترض کی ناواقفیت پر ہنسی
آتی ہے کہ اوس نے اِس لفظ کی تاریخ تحقیق کرنے کی زحمت نہ اُٹھا کر اس کے
احترام کی تہمت ایک صوبے کے سر تھوپ دی جو اس بارے میں قطعاً
معصوم ہے -- جاننا چاہئیے کہ سید انشا نے بالکل معمولی طور پر ناچ
اکثر وغیرہ کے ساتھ اس لفظ کو لکھا ہے -- اس بے نظیر ادیب اور اہل
نظر نقاد کے قلم سے پورب ' پچھم ' اتر ' دکھن کوئی نہ بچا اور
مغل پورہ کی زبان اور لہجے پر تو بے پناہ حملے ہوئے ہیں - اگر یہ
لفظ مغل پورہ کی جدت آفرینی یا بد مذاقی کا مولود ہوتا تو سید انشا
اس کو ایک سادھا رن لفظ کی طرح ہرگز نہ لکھہ جاتے — *

زبان کی قوت اشتقاق و اختراع اور سلیقہ ترکیب کا ذکر
آگے آ چکا ہے - یہاں چند مرکبات پیش کئے جاتے ہیں جو اردو
کی قوت حیات اور فعل ترکیبی کی صلاحیت کا بین ثبوت ہیں -
ملاحظہ ہو :—

مُنہ پھٹ - ہتھہ چھٹ - ہری چُگ - نہن سوتلی چھکّو - کھاؤ - لُٹاؤ -

---

* رسالہ صبح امید :- لکھنؤ بابت دسمبر سنہ ۱۹۱۹ ع صفحہ ۳۰ و ۳۱ -
اور دریائے لطافت صفحہ ۱۳۱ —

بڑ بڑیا - کچ پیندیا - نکھٹو - تلوریا - گلچلا - کھاؤ کھپ - لنگوٹیا یار -
هنس مکھ - گلچھرّے - کٹھ پتلی - چھچھیڑ - تل چاولی - گنگا جمنی -
روتی شکل - ماما نچتیاں - ٹھڑ دلا - گرہ کٹ - جیب کترا - گلے باز -
شوربے چٹ - منہ زور - جوشیلا - دل لگی - کموز کس - آگن بوٹ -
قبول صورت - ڈھلمل یقین - ایماندار - درشنی جوان - بیکل - ٹکڑ گدا -
کھنچکڑ وغیرہ وغیرہ —

آپ نے دیکھا کہ تصرف و اختراع کے هاتھہ سے عربی - فارسی اور نیز سنسکرت کوئی زباں نہ بچی - ان الفاظ میں جو مرکبات هیں ان میں اسم اور فعل - اسم اور صفت - اسم اور اسم هر قسم کے کلموں کو آپ شیر و شکر پائیں گے - ایسا اس وقت هوتا هے جب زبان کا بلوغ درجۂ کمال پر هو - بقول خواجہ آتش مغفور :—

یہ باتیں هیں جب کی کہ آتش جواں تھا

میں کہتا هوں کہ اردو کو آریہ زبان هونے کے باوجود نہ سنسکرت کا حلقہ بگوش بنانا چاهئیے نہ فارسی یا عربی کا دست نگر - علمی اصطلاحوں کا معاملہ دوسرا هے جس کو مبحث بنانے کا یہ موقع نہیں —

اس سے کس کو انکار هوسکتا هے کہ شعر کی زبان نثر کی زبان سے اور بول چال کی زبان علمی تصنیف کی زبان سے ممیز هوا کرتی هے - یہ کون کہتا هے کہ فلسفہ ما بعد الطبیعات یا اسلوب تحلیلی کے نظریے پر باغ و بہار یا فسانۂ آزاد کی زبان میں کتابیں تصنیف هونی چاهئیں - علمی زبان روز مرہ سے اسی طرح مابہ الامتیاز رکھتی هے جس طرح ڈریس سوٹ - رائیڈنگ سوٹ سے کوئی صحیح حواس رکھنے والا شخص کھانے کی پوشاک پہن کر سواری کو

نہیں نکلتا - لیکن وہ سواری کی پوشاک پہن کر شام کی پوشاک کی ہولی بھی نہیں مناتا - یہ تمثیل میں آگے نہیں لے جاؤں گا —

عہد حاضر کے ایک جید لسان یعنی عالم لسانیات کا قول * ہے کہ تحریری (علمی) زبان کی ہستی کو یخ کی اُس پپڑی سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو دریا کی سطح پر بن گئی ہو - یخ نے اپنے اجزاے ترکیبی دریا سے لئے حقیقت میں وہ کچھ نہیں سواے اس کے کہ دریا ہی کا پانی ہے - پھر بھی اُسے دریا نہیں کہہ سکتے - ایک بچہ اِسے دیکھہ کر سمجھتا ہے کہ دریا نیست و نابود ہوگیا لیکن یہ صرف دھوکا ہے - یخ کی پپڑی کے تلے پانی برابر بہہ رہا ہے —

یہ تمثیل جو فاضل وینڈریاس نے دی فرانسیسی زبان پر صادق آتی ہوگی - اُردو پر عائد نہیں ہو سکتی - یہاں کی علمی یا تحریری زبان کو اس دریا سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی جس کی سطح جم کر یخ کی پپڑی بن گئی ہو - یخ کے کڑاڑے یا برفانی چٹان کو دریا نہیں کہہ سکتے - حالانکہ تینوں کے وجود کی بنا پانی ہی پانی ہے —

ممکن ہے کسی ذہن میں یہ سوال آتے کہ اگلے زمانے میں علمی یا تحریری زبان کیا تھی یا تھی ہی نہیں ؟ میں عرض کروں گا کہ تھی نمونہ حاضر ہے —

تار برقی کا سلسلہ صوبہ شمال مغربی یا زیادہ صحت کے ساتھہ کہیے صوبۂ آگرہ میں نیا نیا تھا - آج کل آپ تلغراف کو ترجیح دیں گے اُس زمانے

* Language - A Lingiustic Introduction to History - By J. Venryes, Paris University. p. 275.

میں اُسے ڈاک بجلی کا عام نام دیا گیا تھا۔ علمی زبان میں 'تار مخبر کھربائی' کہتے تھے۔ فروری سنہ ۱۸۵۶ ع میں آگرہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں ایک ہزار سے زیادہ رئیس اور شرفا جمع ہوے۔ قاضی صفدر علی نے 'تار مخبر کھربائی' کا تجربہ دکھاتے ہوے ایک تقریر کی جس کو اُردو میں سائنٹفک موضوع پر شاید اولین تقریر کہنا درست ہوگا۔ اس کا جستہ جستہ خلاصہ جسے آج کل کی زبان میں 'ملخص' کہنا چاہئے پیش کیا جاتا ہے۔ غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا :—

"صاحبو۔ علم دو قسم کے ہیں۔ اول وہ جس کو انسان بدون مشاہدہ اور استعمال اجسام کے حاصل کرسکتا ہے۔ اس کو ریاضی کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جس کا جاننا بغیر تجربہ کے نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ فرض کرو ایک شخص پیدا ہوا اور اُس نے کچھ بھی گرم و سرد زمانے کا نہیں دیکھا۔ ایک اندھیرے کمرے میں رہتا ہے۔ تو وہ عقل سے ریاضی کے اصول دریافت کرسکتا ہے کہ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ اُس نے اجساموں کے تجربے نہیں کئے اس واسطے وہ نہیں جان سکتا کہ اگر پتھر کو پانی میں ڈالیں تو وہ گھلے گا یا نہیں۔ وہ علم جو تجربہ پر منحصر ہیں اُن کی قسموں میں سے ایک قسم علم طبیعی ہے ......

"یہ علم بہت سے علموں کے واسطے حاوی ہے۔ چنانچہ منجملہ علوم طبیعی کے ایک علم کھربائی بھی ہے —

"کھربا ایک سیال لطیف ہے جو جہان کے تمام اجساموں میں بہ مقادیر مختلفہ پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے چند اوصاف مخصوصہ ہیں جن سے حوادث عجیبہ اور فوائد غریبہ سرزد ہوتے ہیں ... ...

"یہ علم بذاتہ دو قسموں پر منقسم ہے — اول وہ کھربا جو رگڑنے

سے پیدا ہوتی ہے - دویم وہ کہربائی جو چھونے سے پیدا ہوتی ہے " *

آپ نے تین چوتھائی صدی پہلے کی علمی زبان ملا خط فرمائی - یہ تو ہوئی بہتےدریا کی سطح پر برف کی پپڑی - آج کل کی زبان جیسی کچھ ہے آپ جانتے ہیں - اوس کو کہنا چاہئے انجماد خالص - صاحب زبان خواہ کسی نوع کے موضوع پر لکھے وہ زبان کو یخ کے کڑاڑے اور برف کی چٹان کے نیچے دفن نہیں کریگا —

ترجموں کی زبان بھی اسی بھول بھلیاں میں چکر کھاتی ہے - ایک بات اسی ضمن میں عرض کرونگا - ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے تعزیرات ہند کا ترجمہ کیا اور اوسی شان کا کیا جس شان کی اصل کتاب تھی اس ترجمہ میں جہاں آپ کو 'استحصال بالجبر' اور 'تخویف مجرمانہ' جیسے اصطلاحی فقرے ملیں گے جو مرحوم کی دقت نظر اور اختراعی کمال کا ثبوت ہیں - ٹھیٹھ اردو کی مثالیں بھی ملیں گی - جن کی اصطلاحی اہمیت قانون میں کسی لاطینی اصطلاح سے کم وقیع نہیں مثلاً " لے بھاگنا " اور " بھگا لے جانا " وغیرہ - یہ وہی مرکب مصادر یا افعال کی طلسم کاری ہے جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے - وہ اردو کیا کہ جب تک قاموس اور برہان اسر کوش اور شبد کلپدرم داہنے بائیں تشریف فرما نہ ہوں ایک تحریر کا معنی مدعا سمجھ ہی میں نہ آسکے - یہ تو ہوئی ایک بات اور میں اون مہربانوں کی خاطر سے کچھ دونگا اس کا مضایقہ ہی کیا ہے - لیکن زبان کی بہبودی اون کی یا کسی کی خوشنودی پر فوقیت چاہتی ہے - میں اس موقع پر لسانیات کا نہایت وقیع اور مہتمم بالشان اصول

---

* تفصیل کے لئے دیکھو رسالہ خورشید پنجاب - لاہور بابت مارچ سنہ ۱۸۵۶ ع مرتبہ منشی ہرسکھ رائے - مالک اخبار و مطبع کوہ نور -

موضوعہ آپ کی توجہ کے لئے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے :- کہ جب کسی زبان کو دوسری زبانوں سے الفاظ یا مرکبات اپنے کا لپکا پڑ جاتا ہے اور وہ اونہیں بلا چوں و چرا یعنی اپنی طور پر تصرت کے بغیر استعمال کی عادی ہو جاتی ہے تو اوس کی تصریفی قوت - اختراعی قابلیت - اور اشتقاقی اہلیت زایل ہو جاتی ہے —

متاخرین اور اون سے بڑھکر ہمارے معاصرین نے یہ نہ سوچا کہ وہ جو اور زبانوں کی لغات الدھا دھند لئے جاتے ہیں اس کا نتیجہ اون کی زبان کے حق میں کیا ہوگا - میں پھر کہتا ہوں کہ پچھلے پچاس برس میں اردو میں ایک لفظ - ایک مرکب - ایک محاورہ وضع یا اختراع نہیں ہوا بزرگوں کی کمائی کہاں تک ساتھہ دیگی - زبان کا تصریفی اور اشتقاقی عمل معطل ہو رہا ہے - یہی حالت رہی تو یاد رہے کہ یہ تعطل سقوط کی صورت پکڑ جائیگا اور اب سے دور ہماری زبان آئے دن بھیک کا کاسہ ہاتھہ میں لئے اور زبانوں کے دروازوں پر الکھہ جگاتی پھرا کریگی - مانگے تانگے کی خوشباشی اور قرض پر دھوم دھام کو تمول نہیں کہتے —

اگلے موقعہ پر آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا تھا کہ متکلم یا منشی کے اور سامع یا مخاطب کے باہم ذہنی قربت ہی روح فصاحت ہے - آج میں یہ گزارش کرونگا کہ یہ ذہنی قربت لسانی تربیت کی محتاج ہے - محض ابتدائی مدارس کو رہنے دیجئے اور مدارس ثانوی کے نصاب تعلیمی پر نظر ڈالئے تو آپ پر ظاہر ہوگا کہ ان مدارس کے لئے جو اردو نصاب مدون ہوتے ہیں سائنٹیفک نقطۂ نظر پر راجع نہیں ہوتے میں فوراً یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہاں میرا روئے سخن دکن کے مدارس ثانوی کے اردو نصاب سے ہرگز نہیں - میرا تجربہ ہندوستان کے دوسرے حصوں

تک محدود ہے -- لیکن یہ چونکہ اُصولی امر ہے اس لئے اس کا تذکرہ ضروری سمجھا گیا -- میں امید کرتا ہوں آپ میرے ہم خیال ہونگے اس بارے میں کہ جو بچّے مدارس ثانوی میں داخل ہوتے ہیں اون کو فصیح وسلیس اردو میں تربیت کرنے کی ضرورت ہے -- اس میں بھی آپ کا اتفاق ہوگا کہ فصیح اور نکھار اردو میں اثر اور ترنّم بھرا ہوا ہے -- اصطلاح میں جسے روز مرّہ کہتے ہیں اُس پر زور دینا مفید نہ ہوگا کیونکہ اس کے ساتھہ صوبیت اور مقامیت تشریف لے آتے ہیں -- بچّے کے ذہن میں شروع سے ہی اختلات اور تناقض کے جراثیم ڈالدینا اوس کی آئندہ ادبی زندگی کے لئے سمّ قاتل کا حکم رکھتا ہے -- اون کو ایسی زبان میں تربیت کرنا چاھئے کہ وہ اپنے پڑوسیوں اپنے شہر یا قصبے والوں کو اور اون لوگوں کو جو اردو سمجھتے اور جانتے ہیں اپنا مطلب سمجھا سکیں -- ابتدائی تعلیم میں نوخیز طلبا کی ذہنی تربیت کا خیال رکھنا نہایت اہم ہے -- یہ بھی یاد رہے کہ ابتدائی عمر میں ابداع و اختراع کی اُپج اون میں کمال ہوتی ہے -- جنھوں نے بچوں کے کھیل کود اور ورزش کے مقاموں میں چند لمحے توجہ سے گذارے ہیں وہ تسلیم کرینگے کہ بچے آپس کی پھبتیوں -- جوش و خروش کے مکالموں اور فی البدیہ تک بندیوں میں ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں اور ایسی ایسی ترکیبیں گھڑ لیتے ہیں کہ آپ حیران رہجاتے ہیں اور نہایت محظوظ ہوتے ہیں - اختراع کی یہ قوت اپنے وقت پر ھنسی کھیل سے منتقل ہوکر علم و فضل اور تحقیق تفحص کے میدان میں مستعمل ہونی چاھئے نہ یہ کہ وھاں کی وہیں رہ جائے اس لئے لازم ہے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم ایسی اردو میں ہوکہ طلبا کے تخیّل اور قوت اختراع کی مزاحم نہ ٹھیرے -- یہ تربیت جبھی ہوسکتی ہے کہ اردو الفاظ کے ٹھیٹھہ معنی اور و ضعی صورت کو اون کے ذہن نشین کردیا

جائے -- اور جملہ کی ترکیب و انشا کا اصول اون کے لوح دل پر نقش ہوجائے -- اسے کہنا چاہئے زبان متداولہ کی تعلیم -- اس لسانی استعداد کے حاصل ہونے کے بعد ادب یعنی لٹریچر کی تعلیم کی نوبت آتی ہے —

زبان سے متعلق بہت سے امور ایسے ہیں جنھیں متوسطین نے متنازعہ فیہ یا تصفیہ طلب چھوڑا وہ ابھی تک لٹک رہے ہیں -- ایک تذکیر و تانیث ہی کو لیجئے -- میرا مطلب اس بارے میں اُس اختلاف سے نہیں جو ایک مقام یا زمرےکو دوسرے مقام یا زمرے سے ہے -- اس جگہغیرذی‌روح اسموں کی تذکیر و تانیث کا سوال نہیں اٹھایا جائیگا -- میں یہ کہنے کو ہوں کہ ہماری بے بسی اور بے بضاعتی کتنی شرم کے قابل ہے کہ ہم ابھی تک یہ فیصلہ نہ کرسکے کہ جنسیت کے بارے میں کلمہ ربط کس کا متبع -- مبتدا کایا خبر کا ؟ " ذوق " اور " غالب نے " اس تنقیم کو جہاں چھوڑا تھا وہیں موجود ہے -- وہ دونوں استاد جب اس کے تصفیہ میں قاصر رہے تو ہم میر فیصلی کہاں کے ؟ ہمارا یہ انداز معلوم ہوتا ہے -- ذوق مرحوم کا قول ہے :—

دریائے غم سے میرے گذرنے کے واسطے
تیغ خمیدہ یار کی لو ہے کا پل ہوا

اس شعر میں کلمہ ربط جنسیت میں خبر کا متبع ہے -- مرزا غالب کا ارشاد ہے :—

باغ میں مجھہ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشم خوں فشاں ہو جائیگا

یہاں کلمہ ربط مبتدا کے تابع رکھا گیا -- اس ایک ادنیٰ مثال سے آپ قیاس کرسکتے ہیں کہ زبان کی یہ گڑبڑ کتنی منحوس ہے اور یہ آج تک ہامت اصحاب کی طرح ہمارے پیچھے پڑی ہوئی ہے - اس کے نتائج و عواقب کی شدت ثبوت

کی محتاج نہیں - آپ دیکھتے ہیں یہ وہ بات نہیں جو فرض کیجئے دھلی اور لکھنؤ یا پنجاب اور پٹنہ کے درمیان ایک امر تنقیح کا حکم رکھتی ہو - بلکہ یہ وہ امر ہے جو زبان کی یگانگت اور ہم آہنگی کا مدعی ہے - جب تک ایسے نقص ہم میں موجود ہیں اور جب تک یہ نامراد تشخص ذاتی سادھاوں اور کار آمد . انفرا دیت کا رنگ پکڑ کر اپنے تئیں اجتماعیت میں جذب اور محو نہیں کر دیتا ہماری زباں کا بس اللہ والی ہے —

انگلستان تو اب انگریزی زبان کے بارے میں ' امریکنزم ' اور " یانکی ازم " یعنی ' امریکیت ' کو بھول گیا جس طرح پہلے ' سکاٹیزم ' یعنی ' سکاٹیت ' کو بھول گیا تھا - لیکن ہم اب تک وھی بے وقت کی راگنی الاپے جاتے ہیں —

ہم کو یاد رکھنا چاھئیے کہ ہم اردو کے واحد مالک نہیں بلکہ امیں ہیں وہ ایک ودیعت ایک امانت ہے جو حفاظت اور ترقی کے لئے ہمیں سونپی گئی - وہ ایک جدی جائداد ہے جس کی ملکیت ہمیں پر ختم ہونے والی نہیں - ہمارا فرض ہے کہ ہم ماضی سے سبق لیکر اُوس کی موجودہ حالت کا صحیح موازنہ کریں اور اوسے ایسا بنا جائیں کہ ہمارے بعد آنیوالے ہم کو دعائے مغفرت سے یاد کریں - یاد رہے کہ ہم ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک کڑی ہیں - اس سے زیادہ نہیں - اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ذاتی پسند اور چاؤ چونچ کو اجتماعی مفاد پر قربان کردیں - ہمارا مطمح نظر مستقبل اور آئندہ ضروریات ہوں نہ کہ ذاتی تشخص اور حوصلہ پسندی —

§ * §

خطبات گارساں دتاسی

بارھواں خطبہ ـ یکم دسمبر سنہ ۱۸۶۲ ع

(مترجمہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی ـ لٹ ـ (پیرس) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد)

حضرات !

گذشتہ ایک سال میں ہندوستانی جنٹلمین کی زبان میں کافی ترقی ہوئی ہے ۔۔ اس باب میں مستشرقین اور خود ہندوستان کے علماء و فضلاء نے بڑی جانفشانی کا ثبوت دیا ۔۔ انھوں نے اردو کے مطالعہ کے لئے بعض سہولتیں بہم پہنچانے کے ساتھہ ساتھہ اس کے ادب میں بیش بہا نئے اضافے بھی کئے ۔۔ بقول 'بُلدر' " ادب ھی وہ سب سے بڑی آسمانی نعمت ہے جس کا شمار مذہب کے بعد ہونا چاھئیے ــ "

راجندرلال متر نے ہندوستان سے اردو کے نئے اخبارات و رسائل کے متعلق میرے لئے بعض معلومات بہم پہنچائی ہیں ـ میں پہلے اسی کی نسبت کچھہ عرض کرونگا ۔۔ در اصل مجھے میجر 'جیمس' کا مرہون منت ہونا چاھئیے کہ ان کے ذریعہ سے راجندرلال متر کے ساتھہ میرا غائبانہ تعارف ہوا ۔۔ میں ذیل کی سطروں میں ان اخبارات و رسائل کے نام گناتا ہوں جن کے متعلق پچھلے خطبات میں میں نے ذکر نہیں کیا ــ

(۱) جام جہاں نما - یہ ایک اردو کا اخبار ہے جو کلکتہ سے نکلنا شروع ہوا ہے - اس میں سوائے سرکاری یا انفرادی اعلانوں کے اور کچھ نہیں ہوتا - اسی نام کا ایک اخبار میرتھہ سے نکلا کرتا تھا جس کی نسبت میں اپنے ۲۹ نومبر سنہ ۱۸۵۳ ع کے خطبہ میں ذکر کر چکا ہوں - میرتھہ والے اخبار میں ادبی رنگ غالب تھا - کلکتہ کا جام جہاں نما ٹائپ میں چھپتا ہے اور میرتھہ کا جام جہاں نما ہاتھہ سے لکھہ کر چھاپا جاتا تھا —

(۲) ایک اخبار بریلی سے نکلنا شروع ہوا ہے جس میں خصوصیت کے ساتھہ صرف رہیلکھنڈ کی خبریں ہوتی ہیں - اس کا نام رہیلکھنڈ اخبار ہے -- یہ مہینہ میں دو بار شائع ہوتا ہے اور چھوٹی تقطیع کے ۱۶ صفحوں پر مشتمل ہے —

(۳) بمبئی سے کشف الاخبار سنہ ۱۸۶۱ ع سے نکلنا شروع ہوا ہے -- یہ ہفتہ وار ہے اور ہر بدھ کے روز شائع ہوتا ہے -- یہ چھوٹی تقطیع کے ۸ صفحوں پر مشتمل ہے -- لکھنئو کے منشی امان علی اس کے مدیر ہیں -- ہر نمبر کے شروع میں ایک چھوٹی سی نظم ہوتی ہے جس میں اس نمبر کا پورا پروگرام لکھا ہوتا ہے —

(۴ - ۵) پنجاب گورنمنٹ کی ابتدائی تعلیم کی رپورٹ میں ایک اخبار کا ذکر کیا گیا ہے جس کا نام "سرکاری اخبار" ہے -- میں اس رپورٹ کی نسبت آگے چل کر پھر ذکر کروںگا -- اس میں بتایا گیا ہے کہ پنجاب کے علاقے میں یہ اخبار بہت مقبول ہے -- پنجاب کے وسیع صوبے کے دور دراز اضلاع میں اس کے ذریعہ سے سرکاری اعلانات وغیرہ پہنچتے رہتے ہیں -- ایک اور ماہوار اخبار ہے جو آگرہ سے نکلتا ہے - اس کا نام

منصب رضایا ہے - مسٹر اے ہیوم کی سربراہی اور دیسی لوگوں کی ادارت میں یہ اخبار نکلتا ہے —

(۹) ان اخبارات کی فہرست کے ساتھ میں ایک مجموعہ مضامین کا بھی ذکر کئے دیتا ہوں جو حال ہی میں گورنمنٹ کی طرف سے شائع ہونا شروع ہوا ہے -- اس کا نام معلم العملہ ہے -- اس کا مقصد یہ ہے کہ سرکاری عملہ کے لئے ضروری معلومات بہم پہنچائی جائیں -- سداسکھ اس کے مولف ہیں - اس کا دوسرا نمبر مجھے ملا ہے - اس میں پان کی کاشت، سر شتۂ تعلیم کے مسائل، مالیات، ہندوستان کے جغرافیہ، رام چندر کی کہانی اور کتبخانے قایم کرنے کے طریقوں پر معلومات درج کی گئی ہیں —

میرے گزشتہ سال کے خطبے کے بعد اس سال کے دوران میں اردو زبان کی متعدد نئی کتابیں شائع ہوئی ہیں - ان سب کے متعلق ذکر کرنے میں طول ہوگا - ان میں جو اہم ہیں ان کا یہاں میں ذکر کرونگا ادبی لحاظ سے ان میں سب سے زیادہ اہم سودا کا انتخاب ہے - ناصر خاں نے یہ انتخاب شائع کرکے اردو داں پبلک پر بڑا احسان کیا ہے - سودا جدید اردو کا مشہور شاعر ہوا ہے لیکن باوجود اپنی شہرت کے اس کا کلام کس مپرسی میں پڑ گیا تھا - ایک اور دوسری کتاب کے متعلق میں پچھلے خطبے میں ذکر کر چکا ہوں - ایچ اسٹورٹ ریڈ نے مجھے اس کا ایک نسخہ بھیجا ہے - * اس کتاب کا نام "منتخبات اردو" ہے - یہ انتخاب کریم الدین نے کیا ہے - موصوف وہی ہیں جنھوں نے میری کتاب "تاریخ ادب اردو" کا ترجمہ کیا ہے -

* مطبوعہ لکھنؤ - سنہ ۱۸۹۱ ع - پہلی جلد میں ۱۹۲ صفحے ہیں اور ہر صفحہ پر ۱۵ سطریں ہیں - دوسرا حصہ مجھے اب تک نہیں ملا —

منتخبات اردو کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب کے لئے لکھی گئی ہے - اس میں الف لیلہ میں سے سند باد جہازی کا دلچسپ قصہ بھی آیا گیا ہے اگرچہ الف لیلہ کے سب نسخوں میں یہ قصہ موجود نہیں ہے * تحفتہ اخوان الصفا کے بعض حصے ہیں - یہ کتاب تمثیلا نہ رنگ میں لکھی گئی ہے - اس کا ترجمہ میں نے فرانسیسی میں کیا ہے جو آج کل " مجلۂ شرقی " (Revued , Orient) میں شائع ہو رہا ہے - فردوسی کے شاہ نامے کا اسی بحر میں اردو ترجمہ کیا گیا ہے اور اس ترجمے کے ۶۰ صفحے ہیں - درد کی غزلوں کے اقتباسات ہیں - درد اردو زبان کے بہترین شاعروں میں سے ہوا ہے گلستان اور اخلاق جلالی کے بھی اقتباسات ہیں ان کے علاوہ † Pazruyiah کی خود نوشت سوانح کے بعض حصے شائع ہوئے ہیں - اس رسالے میں اخلاقی و فلسفہ کی تعلیم سے بحث کی گئی ہے اور اس میں یونانی خطابت کی جھلک پائی جاتی ہے - اس کا خلاصہ یہ ہے : اس قصہ کے ہیرو نے طبابت کو اپنا پیشہ اختیار کرلیا تاکہ اس کی وساطت سے خلق اللہ کی خدمت کر سکے - وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے جس میں بعض اخلاقی باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے - چنانچہ وہ کہتا ہے - " جو شخص خود اپنی روحانی زندگی کی پروا نہیں کرتا اور اپنی اولاد کی خاطر دولت جمع کرتا ہے اس کی مثال اس عود کی سی ہے جو خود جاکر دوسروں کو جو قریب بیٹھے ہوں خوشبو پہنچاتا ہے یا اس شمع کی سی ہے جو اس لئے جلتی ہے کہ ضیافت کے سب شرکاء تک اس کی روشنی پہنچ سکے - " بیٹے نے باپ کی نصیحت

* نسخوں سے مری مراد صرف مطبوعہ نسخے نہیں ہے بلکہ قلمی نسخے بھی -
† یہ لفظ سمجھ میں نہیں آیا (مترجمہ)

پر عمل کیا - بلکہ اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا - اس نے اپنے نفس کو فلسفیانہ غور و فکر کا خوگر کرلیا - اسے یہ معلوم ہوگیا کہ واقعی دنیاوی جاہ و دولت بجلی کی چمک کی طرح بہت جلد غائب ہو جانے والی چیز ہے - اس کی مثال ایسی ہے جیسے ابر کا سایہ یا جیسے ایک خواب - چنانچہ ساری عمر اس نے مذہبی فلسفی کی زندگی بسر کی اور ہمیشہ اس کو اس ابدی مسرت پر اعتقاد رہا جو نیکی کا نتیجہ ہوتی ہے —

ان نئی مطبوعات میں فارسی زبان کے ترجمے بھی شامل ہیں - ہندی میں بھی فارسی سے ایک ترجمہ ہوا ہے - بہاری لال نے گلستان کے آٹھویں باب کو ہندی کا جامہ پہنایا ہے - بعض ترجمے فارسی اور اردو میں ہیں اور بعض ہندی اور سنسکرت میں - آخرالذکر کی مثال " بوج پربندسار"- ہندی میں سنسکرت متن کی شرح دی گئی ہے - اسی طرح " بدھی ودیادیت " کو پیش کیا جا سکتا ہے - شری لال نے سنسکرت اشلوکوں کی ہندی شرح لکھی ہے - ان کے علاوہ " منو دھرم سار " ہے - یہ بھی ہندی اور سنسکرت دونوں میں ہے - اس میں منو کے قوانین کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے - اسی سال کے دوران میں " خلاصہ تواریخ " کا ایڈیشن شائع ہوا ہے - یہ تاریخ غلام علی کی لکھی ہوئی ہے - اس میں ان اسلامی بادشاہوں کا ذکر ہے جو انگریزی حکومت کی ابتدا اور اس کے نشو و نما کے دوران میں ہندوستان میں ہوئے ہیں - اسی مصنف نے سلطان ٹیپو کے عہد کی تاریخ قلمبند کی ہے - وہ خود ٹیپو کے ہاں ملازمت کرچکا تھا - موسیو پال دے گواردی کے پاس اس تاریخ کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے اور انھوں نے اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے - موصوف پانڈی چری میں جج کے عہدے پر ممتاز رہ چکے ہیں - آج کل ان کا قیام شہر بایون میں ہے صرف و نحو

پر بھی اردو میں متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کی نسبت معلومات حاصل کرنا مستشرقین یورپ کے لئے از بس ضروری ہے - مثال کے طور پر "اردو سرتند" کو لیجئے - پنڈت بنسی دھر نے اسے ہندی زبان میں تالیف کیا ہے - پنڈت جی اس عہد کے ان مصنفین میں سے ہیں جو ہر قسم کے موضوع پر قلم فرسائی کرسکتے ہیں - انہوں نے 'علم الہیئت' پر ایک کتاب لکھی ہے - ایک جغرافیہ پر لکھی ہے جس کا نام "بھوگول سار" رکھا ہے - ہندی میں جغرافیہ کو بھرت "بھرت کھنڈ" کہتے ہیں - بابو 'شیو پرشاد' نے ہندوستان کا عام جغرافیہ لکھا ہے اور اسے ہندی اور اردو دونوں میں شائع کیا ہے - اس جغرافیہ کا خلاصہ "چھوٹی جام جہاں نما" * رکھا ہے - 'متھرا پرشاد' نے Maun کی کتاب معلومات عامہ (Lessons in General Knowledge) کا ہندی ترجمہ شائع کیا ہے —

'تھامسن کالج' رڑکی کے مطبع کی ہندوستان میں وہی حیثیت سمجھنی چاہئے جو انگلستان میں 'ایٹن' کے مطبع کو حاصل ہے - اس مطبع سے ہندوستانیوں کے واسطے نہایت کارآمد مطبوعات شائع ہوتی رہتی ہیں - یہ سچ ہے کہ یہ مطبوعات ادبی نہیں ہیں - یہاں سے متعدد خطوط کے مجموعے شائع ہوچکے ہیں جیسے 'دستور الارقام' (؟) - اسے منشی 'میاں جان' نے ترتیب دیا ہے منشی 'میاں جان' کے اشعار کا ذکر تذکروں میں موجود ہے - ان کا تخلص 'انیس' ہے - میں نے ابھی جس بیاض کا ذکر کیا وہ دوسری انشا کی بیاضوں کی طرح نہیں جن میں تشبیہوں اور استعاروں کی بھرمار سے عجب انداز تحریر اختیار کیا جاتا ہے اہل مشرق کو یہ انداز تحریر بہت پسند ہے بلکہ اس کے بالکل برخلاف اس بیاض

---

* اصل میں غالباً چھوٹی کی بجاے چھوٹا ہوگا

میں ایسے خطوط کے نمونے درج کئے گئے ہیں جو کاروباری خطوط اور عرضداشتوں میں مستعمل ہوتے ہیں - یہ مسٹر اسٹورٹ کی فارسی بول چال سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے —

اسی سلسلہ میں ہم اس جغرافیہ کا بھی ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے جس میں ساگو کے زرخیز ضلع کے نقشے اردو اور دیوناگری دونوں رسوم خط میں درج کئے گئے ہیں - ان نقشوں کی ترتیب بھولی رام نے کی ہے - اس کے علاوہ ایک رسالہ زمینوں کے خسرے تیار کرنے کے متعلق ہے - اس رسالے کو پنڈت رام پرشاد نے ترتیب دیا ہے اور اس میں کرنل بوالو کی بڑی حد تک تقلید کی ہے - ایک رسالہ سڑکیں تعمیر کرنے کے متعلق اور ایک رسالہ ڈاک بجلی کے نام سے تار برقی کے متعلق شائع ہوا ہے —

ان میں سے بعض کتابیں ایسی ہیں جن کا مطالعہ یورپین لوگوں کے لئے مفید ہوگا - مثلاً ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام آئینۂ اہل ہند ہے - اس میں هندوستان کے باشندوں کی صنعتوں اور ان کی رسوم سے بحث کی گئی ہے - اس کتاب کے مصنف کا نام کوشن راؤ ہے - اس میں مصنف کی تصویر بھی ہے اور بعض مقامات پر عبارت کو واضح کرنے کے لئے بھی مثال کے طور پر تصاویر مندرج ہیں - یہ تصویریں حسن ذوق پر دال ہیں - میں اس وقت آپ کے سامنے اور دوسرے رسالوں کا ذکر نہیں کروں گا جو علم ریاضی، تعمیرات اور میکانک کے متعلق شائع ہوئے ہیں -

چند هفتے ہوئے مجھے اردو اور هندی کتابوں کا ایک پارسل هندوستان سے ملا ہے - یہ کتابیں میرے کرمفرما مسٹر آر - کسٹ نے بھیجی ہیں جو لاہور میں جوڈیشل کمشنر ہیں - میں نے ابھی جس شہر کا نام لیا یعنی لاہور

وہ ایک تاریخی شہر ہے - اور مسٹر ایچ تھارنٹن نے اس شہر کی تاریخ پر ایک نہایت دلچسپ مضمون لکھا ہے - مسٹر تھارنٹن سول سروس کے آدمی ہیں - ان کتابوں میں ایک بیتال پچیسی ہے - اسے بکرم ولاس بھی کہتے ہیں - یہ لاہور میں طبع ہوئی ہے اور اس میں نہایت خوبصورت تصاویر بھی ہیں - ایک کتاب جو " سبھاولاس " (لطف معاشرت) ہے - اس قسم کے نام دراصل ہندی میں بہت عام ہیں - مگر یہ کتاب جو مجھے بھیجی گئی ہے ہندی اشعار کے انتخاب پر مشتمل ہے - ایک کتاب " تصریح ظہوری " ہے - اس میں در اصل ملا ظہوری کی " سہ نثر " کو اردو میں پیش کیا ہے - ایک کتاب نورس کے تینوں حصوں پر مشتمل ہے نورس بیجاپور کے سلطان ابراہیم شاہ کی مشہور نظم ہے - ایک تعزیرات ہند کا نسخہ ہے - یہ لاہور کا چھپا ہوا ہے - انگریزی سے یہ ترجمہ نہایت سلیقہ کے ساتھ کیا گیا ہے - اس کا انداز تحریر قریب الفہم اور موضوع کے عین مناسب ہے - مسٹر ایچ ایس ریڈ نے اس ترجمہ میں بڑے اہتمام سے کام لیا ہے - موصوف ہندوستان کی مروج و مقبول زبان اردو کے بڑے پرجوش حامیوں میں ہیں - ایک نسخہ ضابطۂ فوجداری کا اردو ترجمہ ہے - یہ ترجمہ الہ آباد سے سنہ ۱۸۶۴ ع میں شائع کیا گیا - اس میں چھوٹی تقطیع کے ۱۱۴ صفحے ہیں —

ان کتابوں میں جو مجھے بھیجی گئی ہیں بعض فلسفیانہ مباحث سے متعلق ہیں - مثلاً " سدھانتا سنگرھا " جو قدیم نیایا فلسفہ کے اصول پر لکھی گئی ہے؛ ایدیش پشپوت اردو کی کتاب گلدستہ اخلاق کا ہندی ترجمہ ہے —

ان کتابوں میں ہندی کی ایک کتاب شددرش درپن کو خاص اہمیت حاصل ہے - اس کتاب میں ہندوؤں کے فلسفہ کے چھ ضابطوں کو بیان کیا گیا ہے اس کے مطالب

نہیمیا نیلا کنتھہ شاستری گور ہیں - آپ ' بنارس ' کے ایک مشہور پنڈت ہیں اور اب آپ نے مسیحی مذہب قبول کر لیا ہے - جیسا کہ ان کے نام کے پہلے جزو سے ظاہر ہوتا ہے - یہ کتاب دو جلدوں میں ہے - ایڈورڈ فٹز ہال جو ہندی علوم کے بڑے ماہر ہیں ' اس کتاب کی بہت تعریف کرتے ہیں - موصوف کے نام سے سنسکرت کی متعدد تصنیفات شائع ہوچکی ہیں - آج کل آپ ' لندن ' کے کنگز ' کالج ' میں اُردو کے پروفیسر ہیں - مسٹر ' ڈنکن فوربس ' کی علحدگی کے بعد آپ نے اس حدمت کو منظور فرمایا ہے - آپ نے اس کتاب کو انگریزی کا جامہ پہنایا ہے اور بعض بعض مقامات پر رد و بدل بھی کیا ہے اور حواشی درج کئے ہیں - یہ ترجمہ ایک جلد میں ہے - اسی سال کلکتہ میں طبع ہوا ہے اور اس کا نام A Rational Refutation of the Hindu Philosphical Systems (یعنے هندو نظام فلسفہ کی عقلی تردید) ہے —

انگریزی سے ترجموں کی تعداد آے دن بڑھتی جاتی ہے - اس جگہہ میں صرف چند کی نسبت ذکر کروں گا - ' ٹاڈ ' کی کتاب "Hints of Self-improvement" کا اردو میں ترجمہ ہوا ہے اور اس کا نام " تعلیم النفس " رکھا گیا ہے - ہندی میں بھی اس کتاب کا اصل سے ترجمہ ہوا ہے اور اس ہندی ترجمہ کا نام " سکشا منجری " ہے - ' شیو پرشاد ' نے ' من بہلاؤ ' کے نام سے ایک کتاب ہندی میں شائع کی ہے - اس میں انگریزی نثر اور نظم دونوں کے ترجمے ہیں —

' روبنسن کروسو ' کے دلچسپ قصے کا اردو ترجمہ پہلے ہی ہوچکا ہے - یہ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ دنیا کی تقریباً ساری زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوچکا ہے - پنڈت ' بدری لال ' نے اس کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے اور حال ہی میں بنارس میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے - یہ کتاب

نہایت ضخیم ہے اور اس میں جا بجا تصاویر بھی ہیں —

"دستور المعاش" کا اس سال دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ دہلی کے مہا پادری (arch-bishop) ڈاکٹر 'وہائیلے' جو ہمارے 'انسٹیٹیوٹ' کے ارکان میں سے ہیں ان کی کتاب "معاشی حالات" (money matters) میں تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد جے۔ پی 'ایڈلی' نے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ پنڈت 'بنسی دھر' نے اسی کتاب کو ہندی کا جامہ پہنایا ہے۔ موصوف ان لوگوں میں ہیں جو کام کے آگے تھکنے کا نام نہیں جانتے —

میرے نزدیک ان سب نئی کتابوں میں "سرا پاے سخن" ایک نہایت اہم کتاب ہے۔ مسٹر فنز 'ایڈورڈ ہال' کی عنایت سے مجھے اس کا ایک نسخہ مل گیا ہے۔ یہ ایک تذکرہ ہے۔ اور یہ نہایت وسیع زمانے پر حاوی ہے۔ غالباً اودھ کے آخری تاجدار کے تذکرہ کے بعد اس کا نمبر دوسرا ہے۔ اس میں بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ پانچ ہزار نثر و نظم لکھنے والوں کے حالات قلمبند کئے گئے تھے مگر سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش کے دوران میں معلوم ہوتا ہے اس کے سب نسخے ضائع ہوگئے تھے اور اب وہ ایک نایاب چیزوں میں سے ہے۔ "سرا پاے سخن" میں جو حالات جمع کئے گئے ہیں وہ سنہ ۱۸۵۴ ع تک آکر ختم ہوجاتے ہیں۔ یہ تذکرہ گزشتہ سال پہلی مرتبہ لکھنؤ میں طبع ہوا اور آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور سات سو سے زائد مصنفوں کے حالات اس میں موجود ہیں۔ جن میں سے اکثر ہم عصر ہیں۔ آپ یہ دیکھیں گے کہ اکثر تذکروں میں ان میں سے بہت سے شعرا کا کوئی حال نہیں ملتا ہے۔ اس تذکرے میں خاص کرکے 'لکھنؤ' اور صوبۂ اودھ کے شعرا کا حال بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ اس واسطے کہ اس کے مصنف کا وطن 'لکھنؤ' ہے اور یہاں کے متعلق اسے کافی واقفیت حاصل ہے۔ اودھ

میں مصنفوں اور بالخصوص شعرا کی بڑی کثرت ہے - اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے دربار سے چار سو شعرا کو تنخواہیں ملتی تھیں اور واجد علی شاہ خود بھی شاعر تھے —

اس تذکرے کے مصنف کا نام 'محسن' ہے - یہ حقیقت کے بیٹے اور وزیر* کے پوتے ہیں - 'محسن' کے باپ اور دادا دونوں اردو کے مشہور شاعروں میں سے ہوئے ہیں - محسن کے خاندان کے دو بزرگوں 'رشک' اور 'عشقی' نے ان کی پرورش کی تھی - 'رشک' بھی شعر کہتے تھے اور 'عشقی' نے شعرائے اردو کا ایک تذکرہ لکھا ہے - 'محسن' نے اپنا تذکرہ دراصل عشقی ہی کے کہنے پر لکھنا شروع کیا تھا - اس تذکرہ کو لکھتے وقت اس کے پیش نظر پندرہ دوسرے تذکرے تھے اور جیسا کہ اس نے اپنے تذکرے کے دیباچہ میں لکھا ہے، اس نے سیکڑوں دیوانوں اور بیاضوں کی مدد سے اپنے کام کی تکمیل کی - چنانچہ انہیں دیوانوں اور بیاضوں میں سے اس نے تقریباً ۹ ہزار اشعار اپنے تذکرہ میں نقل کئے ہیں - دوسروں کے اشعار کے ساتھ ساتھ خود اپنے اشعار بھی نقل کئے ہیں اس واسطے کہ محسن خود اعلیٰ درجہ کے شاعروں میں ہیں - اپنے تذکرہ کے دیباچہ میں 'محسن' نے انگریزی حکومت کی بہت کچھ مدح سرای کی ہے جس کے سایۂ عاطفت میں

---

* مصنف کو غلط فہمی ہوی ہے - محسن وزیر کے پوتے نہیں تھے بلکہ ان سے کسی قسم کا رشتہ نہ تھا - البتہ وہ وزیر کے شاگرد تھے اور اس کا ذکر خود انھوں نے اپنے تذکرے میں کیا ہے - ان کے دادا کا نام عرب شاہ تھا - رشک اور عشقی ان کے خاندان کے بزرگ نہ تھے - عشقی ان کے دوست تھے اور رشک سے ان کو تلمذ تھا - ان کو رشک اور وزیر دونوں کی شاگردی کا فخر تھا - مولف خطبات کو ان صاحبوں کے تعلقات کے سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے - (ایڈیٹر اردو)

پھر سے ہندوستان میں علم و فن اپنی پوری بہار پر ہیں اور ساری مخلوق امن و عافیت کے ساتھہ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف کار ہے —

'محسن' کا تذکرہ اور دوسرے تذکروں کی طرح بے مزہ نہیں ہے۔ اور دوسرے تذکروں کی طرح اس کا ہر باب منتخب کلام کا بے ترتیب انبار نہیں جن میں اگر کوئی ترتیب ہوتی ہے تو وہ محض ردیف کی بلکہ اس میں مختلف مضامین کے اعتبار سے اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اور جس شاعر کے وہ اشعار ہیں اس کی زندگی کے مختصر حالات درج کئے ہیں۔ اس تذکرے میں یہ خوبی ہے کہ مضمون کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف شعرا کا کلام جمع کیا گیا ہے۔ چنانچہ سر' بال' چہرہ' پیشانی' آنکھیں' ناک' رخسار' منہ' ہونٹ' دانت' زبان' ٹھتی' کان' گردن' شانے' ہاتھہ' انگلیاں' ناخن' پاؤں' دل' اور روح وغیرہ پر الگ الگ اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ اگر کسی باب میں سر کا ذکر ہے تو اس باب کا خاتمہ لفظ "سر" پر ہوگا اور اگر کسی باب میں بالوں کا ذکر ہے تو اس کا خاتمہ لفظ "مُو" پر ہوگا۔ اسی طرح ہر باب میں التزام کیا ہے۔ یہ سب اشعار غزلوں کے ہیں۔ غزل میں عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں ملے جلے ہوتے ہیں۔ مشرقی شعراء کے ہاں عورت کی شخصیت خدا کا پرتو ہوتی ہے اور کبھی کبھی وہ ان دونوں کو اپنے بے تکے تخیل سے ایک دوسرے میں ضم کردیتے ہیں۔ ٹینیسن نے جو آج کل انگلستان کا سب سے بڑا شاعر ہے کس خوبی سے اس مضمون کو باندھا ہے۔ وہ کہتا ہے :

تجھے مشکل ہی سے خاکی کہا جا سکتا ہے اور نہ تو پورے طور پر ملکوتی ہی ہے۔ تیرے حسن کو الفاظ کے توسط سے نہیں ظاہر کیا جا سکتا'

تیرے عنبریں لہلہاتے ہوئے بال *

اس کنول کے پھول کے مثل ہیں جن میں سے ہوکر سورج غروب ہوتے وقت جھانکتا ہے —

ان سیکڑوں مصنفوں میں جن کا اس تذکرہ میں ذکر ہے سب کے سب شاعر ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ غالباً ان میں بہت تھوڑے ایسے ہیں جنہیں صحیح معنوں میں شاعر کہا جا سکتا ہے۔ ان میں بیشتر تک بندیاں کرتے ہیں۔ ان کی شاعری ہمارے لئے زیادہ دلچسپی کا باعث نہیں۔ قدیم یونانی شاعر کالی 'ماک' کا قول ہے کہ "خدائے شعر کا دیدار ہر کس و ناکس کو میسر نہیں آ سکتا" —

سراپائے سخن سے مجھے بعض ایسی تصانیف کا علم ہوا ہے جن کے متعلق شاید مجھے کہیں اور معلومات نہ ملتیں۔ مثلاً بعض ایسے دیوان اور تذکرے ہیں جن کا ذکر اس میں موجود ہے اور مجھے پہلی مرتبہ اس کتاب کے ذریعہ سے ان کا علم ہوا۔ جب میں نے اپنی کتاب "تاریخ ادب ہندی و اردو" سنہ ۱۸۲۹ ع میں شائع کی تھی تو اس وقت ان دیوانوں اور تذکروں سے میں قطعاً لاعلم تھا۔ اس وقت صرف سات تذکروں کی مدد سے میں نے اپنی کتاب کی تکمیل کی۔ آج میرے علم میں ۵۴ تذکرے ہیں اور یقیناً ان کے علاوہ بھی اور ہوں گے جن تک میری دسترس نہیں ہوئی۔ چنانچہ آج میرے پاس بہت کافی مواد موجود ہے جسے میں اپنی کتاب کی تکمیل کے لئے استعمال کرسکتا ہوں —

---

* میں نے لفظ (flaxen کے بجائے Amber) کردیا ہے اس واسطے کہ اہل مشرق عورت کے بالوں کو عنبر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اس میں رنگ اور خوشبو دونوں کی مناسبت کا خیال پیش نظر ہوتا ہے —

سراپائے سخن کے علاوہ جس میں ادب اردو کی تاریخ کے لئے بہت مواد موجود ھے میرے پرانے شاگرد مسٹر جے - ان - کارتر نے ایک اور کتاب بھیجی ھے جو مرھٹی زبان میں ھے -- مگر اس میں ھندی کے چوٹی کے شاعروں کا حال مفصل موجود ھے -- یه کتاب سنکسرت اور دوسرے ماخذوں کی خوشه چینی کے بعد لکھی گئی ھے * -- میں افسوس کے ساتھ آج آپ صاحبوں کو یه خبر سناتا ھوں که مسٹر جے - ان - کارتر کا حال ھی میں انتقال ھوگیا -- موصوف بمبئی تک کی ایشیاٹک سوسائٹی کے سکریٹری تھے - موصوف نے ازراہ عنایت جو مرھٹی کی کتاب بھیجی ھے اس میں ۴۵ شعرا کا حال موجود ھے -- ان میں سے ۳۰ شاعر ایسے ھیں جن کی نسبت میرے پاس پہلے کوئی معلومات موجود نہیں تھیں —

یورپین جماعتوں کی طرف سے اردو زبان کی مطبوعات میں " Calcutta Religious Tract Society " کی متعدد شائع کردہ کتابیں قابل ذکر ھیں -- ان مین بعض کي نسبت میں یہاں ذکر کرتا ھوں - (۱) مسیحیت اور اسلام کا موازنه (۲) بعض اشخاص کے مسیحیت قبول کرنے کا بیان (۳) پھلمنی اور کرن کا قصه ' و غیرہ —

پادری اون صاحب (Rev, Owen) نے شورش عظیم سے پہلے انجیل مقدس کی تفسیر اردو زبان میں مکمل کرلی تھی - شورش کے دوران میں ان کی اور دوسری کتابوں کے ساتھ یه بھی ضائع ھوگئي - چنانچه موصوف نے اسے پھر از سر نو لکھنا شروع کیا - اب عنقریب وہ شائع ھونے والی ھے۔ھمیں یه سنکرتعجب ھوا که ایک مسلمان عالم سید ' احمد ' غازی پوری انجیل مقدس کی تفسیر اسلامی نقطۂ نظر سے لکھ رھے ھیں - انھوں نے اپنے ذاتی مطبع میں اسکی چھپائی کا انتظام بھی کرلیا ھے -- یه کتاب

---

* ' کوتی چرتر ' مصنفۂ جنارھن رامچندر جی - مطبوعه بمبئی سنه ۱۸۶۰ ع

قسط وار چھپے گی - اور رسالے کی صورت میں صفحہ کے ایک طرف انگریزی ہوگی اور دوسری طرف اردو ترجمہ اور تفسیر -- ہر رسالہ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہوگا - ہندوستانیوں کی اس قسم کی کوششیں ہمیں یورپی تاریخ کے اس زمانہ کی یاد دلاتی ہیں جبکہ مسیحیت کے سیلاب کے سامنے یونانی اور رومی مذہبی رسوم پاش پاش ہورہی تھیں اور مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتی تھیں —

مسٹر ڈنکن فوربس نے اپنی اردو لغت کا دوسرا ایڈیشن شائع کردیا ہے اتیشن میں اردو کے الفاظ کو دیوناگری خط میں بھی لکھ دیا ہے۔ انھوں نے یہ کام کمال احتیاط اور دیدہ ریزی کے ساتھ کیا ہے جب ہندی الفاظ فارسی رسم خط میں لکھے جاتے ہیں تو ان کی ہیئت ایسی بدل جاتی ہے کہ انھیں بعض اوقات پہچاننا دشوار ہوجاتا ہے - نیز موصوف نے " باغ و بہار " کا چوتھا ایڈیشن فارسی رسم خط میں نکالا ہے - نسولیس کے مشورے کے مطابق اس کتاب کے بعض ایسے فقروں کو خارج کردیا ہے جو ذوق سلیم کی نظر میں کھٹکتے تھے * —

" باغ و بہار " کے دو ایڈیشن جو لاطینی رسم خط میں شائع ہوئے ہیں ہاتھوں ہاتھ بک رہے ہیں - سنہ ۱۸۳۶ ع میں ایک پرتگالی پی- ایس- ڈی روزاریو نے اس کا ایک

---

* بہت اچھا ہو اگر موصوف اپنے معاون کار ' چارلس ریو ' کی مدد سے " اخوان الصفا " کا بھی اسی طرح ایک ایڈیشن شائع کریں اور اس میں سے بعض حصوں کو خارج کردیں -- میری رائے میں صفحہ ۱۸ پر جہاں غیر فطری عشق و محبت کا ذکر ہے اسے ضرور خارج کردینا چاہئے -- بدقسمتی سے یہ خیال اہل مشرق کے ہاں بہت عام ہے —

ایڈیشن ہندوستان کے دارالسلطنت کلکتہ میں طبع کرایا تھا ۔۔ موصوف نے ایک لغت بھی لکھی ہے جس میں انگریزی الفاظ کے معنی اردو اور بنگالی میں درج کئے ہیں ۔ افسوس ہے کہ موصوف کا حال ہی میں کلکتہ میں انتقال ہوگیا ۔ مونیر ولیمس نے سر چارلس ٹریولین کی فرمائش پر " باغ و بہار " کے اسی ایڈیشن کو تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھہ دوبارہ طبع کرایا ہے ۔ مجھے بھی ہندوستانیوں کی طرح بڑی مسرت ہے کہ سر چارلس ٹریولین پھر دوبارہ ہندوستان تشریف لے گئے ہیں ۔ ڈنکن فوربس نے بھی لاطینی رسم خط میں اردو کے پہلو بہ پہلو اس کا ایک ایڈیشن نکالا ہے ۔ اس سے پہلے ایڈیشن کی طرح اس میں بھی متن کے مشکل الفاظ کی تشریح کی ہے ۔

" باغ و بہار " کی نسبت میں اپنے سنہ ۱۸۵۳ ع کے خطبے میں ذکر کرچکا ہوں ۔ اس جگہ پھر ایک امر کی جانب اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو پہلے بھی عرض کر چکا ہوں ۔ وہ یہ ہے کہ اسلامی قصوں میں آپ ہمیشہ دیکھیں گے کہ تبلیغ اسلام کی جانب کسی نہ کسی پیرایہ میں ضرور اشارہ کیا جاتا ہے ۔ اور غنائی شاعری ' تصوف ' عشق مجازی اور ہمہ اوست کے مسائل سے آگے نہیں بڑھتی ۔ قصوں میں اسلامی عقاید اثباتی نوعیت کیساتھہ پیش کئے جاتے ہیں اور اسلام کی جانب غیر مسلموں کو نہایت موثر انداز میں رجوع کیا جاتا ہے ۔۔ مثلاً باغ و بہار میں جہاں بخارا کے تاجر کا ذکر ہے ' کہ اسے کیوں کر دختر وزیر کی وساطت سے مصائب سے نجات ملتی ہے ' تو وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تاجر دوگانہ شکرانے کا رو بقبلہ ہو کر پڑھنے لگا ۔ وزیر کی لڑکی یہ

حرکات و سکنات دیکھکر متعجب ہوتی ہے اور اس تاجر سے دریافت کرتی ہے کہ وہ یہ کیا کررہا ہے؟ تاجر جواب دیتا ہے: "جس خالق نے ساری خلقت کو پیدا کیا اور تجھہ سی محبوبہ سے میری خدمت کروائی اور تیرے دل کو مجھہ پر مہربان کیا اور ویسے زندان سے خلاص کروایا ' اس کی ذات لا شریک ہے ' اس کی میں نے عبادت کی اور بندگی بجا لایا اور اداۓ شکر کیا -- یہ بات سنکر کہنے لگی ' تم مسلمان ہو؟ - میں نے کہا شکر الحمد للہ - بولی میرا دل تمہاری باتوں سے خوش ہوا میرے تئیں بھی سکھاؤ اور کلمہ پڑھاؤ -- میں نے دل میں کہا الحمد للہ کہ یہ ہمارے دین کی شریک ہوئی - غرض میں نے لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھا ' اور اس سے پڑھوایا ---"

ایک اور جگہ بصرے کے تاجر کا اسی طرح ذکر ہے جسے اس کے بھائیوں نے قتل کرنے کی نیت کی تھی -- وہ جب بیہوشی سے ہشیار ہوا تو سراندیپ کی شہزادی اور اس کی خواصیں اس کے چاروں طرف جمع تھیں -- شہزادی مہربانی سے بولی: " اے عجمی! خاطر جمع رکھہ ' کڑہ مت ' اگرچہ کسو ظالم نے تیرا یہ احوال کیا لیکن بڑے بت نے مجھہ کو تجھہ پر مہربان کیا ہے -- " اس پر تاجر نے پکے مسلمان کی حیثیت سے کہا :- " قسم اسی خدا کی جو واحد اور لا شریک ہے " - کچھہ دنوں بعد ایسا اتفاق ہوا کہ شہزادی نے تاجر کو نماز پڑھتے دیکھا اور اس سے پوچھنے لگی :---"

اے جاہل! ہمارے بڑے بت میں کیا برائی دیکھی جو غائب خدا کی پرستش کرنے لگا؟ میں نے کہا انصاف شرط ہے ' ٹک غور فرمائیے کہ بندگی کے لائق وہ خدا ہے کہ جس نے ایک قطرے پانی سے تم سار کا

محبوب پیدا کیا ' اور یہ حسن و جمال دیا کہ ایک آن میں ہزاروں انسان کے دل کو دیوانہ کر ڈالو بت کیا چیز ہے کہ کوئی اس کی پوجا کرے ؟ ایک پتھر کو سنگ تراشوں نے گھڑ کر صورت بنائی اور دام احمقوں کے واسطے بچھایا - جن کو شیطان نے ورغلایا ہے وے مصنوع کو صانع جانتے ہیں - جسے اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں اُس کے آگے سر جھکاتے ہیں - اور ہم مسلمان ہیں ' جس نے ہمیں بنایا ہے ہم اسے مانتے ہیں ' اُن کے واسطے دوزخ ' ہمارے لئے بہشت بنایا ہے -- اگر بادشاہزادی ایمان خدا پر لاوے ' تب اس کا مزا پاوے ' اور حق و باطل میں فرق کرے اور اپنے اعتقاد کو غلط سمجھے " --

اس ضمن میں میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلامی کتب عقاید و تفاسیر کے متعلق مسیحی دینیات کے علماء کو پوری واقفیت رکھنی ضرور ہے -- ہمیں چاہئے کہ ان بیانات کو جو انجیل اور مسیحیت کے متعلق اسلامی عقاید میں ملتے ہیں بیکار سمجھ کر ٹھکرا نہ دیں - در اصل ان میں ہمیں بہت ساری یہودی اور نصرانی روایات ملیں گی - میں اس باب میں مسٹر اوڈول کا ہم خیال ہوں جنھوں نے حال ہی میں قرآن کا انگریزی ترجمہ کیا ہے ' کہ قرآن اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بدولت جو تغیرات پیدا ہوئے انھیں فی الحقیقت دنیا کی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے -- لوگوں کو اس بات کا علم نہیں کہ قرآن کا بیشتر حصہ ان روایات پر مشتمل ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے اور ان کے ملک میں مشہور تھیں -- توریت کی تلمودی اور یہودی روایات اور وہ قصے جو عرب و شام کے یہودیوں اور عیسائیوں میں مشہور تھے قرآن میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ موجود ہے - اس کے علاوہ جعلی (Evangiles) کے بیانات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن میں شامل کرلئے - بظاہر یہ معلوم ہوتا

ہے کہ انکو ان جعلی (Evangiles) کا علم تھا - انہیں در اصل مسیحی مذہب کی دیو مالا سے زیادہ وقعت نہ دینی چاہئیے تھی مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تخیل کو یہ مبالغہ امیز قصے ایسے پسند آئے کہ انہوں نے انہیں سچ جان کر قابل قبول سمجھا -- میرا خیال ہے کہ باوجود ان تمام باتوں کے ہمیں قران کو قطعی طور پر جھوٹ نہیں سمجھنا چاہئیے -- تاریکیوں میں بھی کہیں نہ کہیں روشنی کی جھلک موجود ہوتی ہے -- سیل اور اوتدول کی طرح میں بھی سینٹ آگسٹین کے اس مقولہ کا قائل ہوں کہ دنیا میں کوئی ایسا جھوٹا عقیدہ نہیں جس کی تہ میں تھوڑا بہت سچ نہ موجود ہو" -- *

قران بھی ہمارے (Saints) (حواریوں) کی کتابوں کے مثل آیات پر مشتمل ہے - پھر آیات کی بھی دو قسمیں ہیں ؛ محکمات اور متشابہات - مجھے یہ تقسیم بہت پسند آئی - کیا اچھا ہو اگر توریت و انجیل کے لئے بھی اس تقسیم کو اختیار کر لیا جائے - خاصکر انجیل کے متعلق اگر ہم اس تقسیم کو قبول کرلیں تو بہت آسانی ہو جائے - انجیل میں بعض جملے ایسے ہیں (خوش قسمتی سے ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے) جنہیں انسانی عقل و فہم سمجھنے سے قاصر ہے اور ان کی کوئی معقول تاویل بھی ممکن نہیں - وہ کٹر عیسائی جو انجیل کو الہامی کتاب سمجھتے ہیں ان جملوں کو پڑھکر بڑے سٹ پٹاتے ہیں - ہمارے نزدیک یہ بہت اچھا ہو اگر ہم کھلم کھلا کہہ دیں کہ ہم ان جملوں کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہیں اس لئے کہ وہ بے معنی ہیں - یا تو یہ ہے کہ ہمارا علم اس قدر محدود ہے کہ ہم ان مخصوص مطالب

* Quæstiones Evangelicæ

کو نہیں سمجھہ سکتے یا یہ کہ بعد کے تصرفات یا ابتدائی انجیل نویسوں کی غلط نقل کی وجہ سے بعض مبہم جملے انجیل کے متن میں شامل ہوگئے بعد میں آنے والوں نے انجیل کے احترام و تعظیم کی خاطر کوئی تبدیلی کرنا گوارا نہ کی - میں سمجھتا ہوں یہ بہتر ہوگا اگر ہم صرف آیات بینات کو شمع ہدایت بنائیں - یہ بھی ضرور نہیں کہ مہمل جملوں کو خواہ مخواہ معنی پہنائے جائیں - ممکن ہے کہ خدا کو یہی منظور ہوکہ وہ اسی طرح رہیں - بہر حال ہمیں اس باب میں سینٹ پال کے مقولہ کو یاد رکھنا چاہئے کہ " لفظ باعث ہلاکت ہوتا ہے مگر الفاظ کی روح (یعنی اس کا اصلی مدعا) زندگی عطا کرتی ہے " —

بہر حال مسیحی مبلغین کے لئے یہ از بس ضروری ہے کہ وہ قران کا مطالعہ کریں اگر واقعی وہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کی طرف راغب کرنا چاہتے ہیں - ورنہ مسلمانوں کو مسیحی تعلیمات کی جانب متوجہ کرنا بہت دشوار ہے - قران میں انجیل و توریت کے الہامی کتابیں ہونے کے متعلق بہت ساری آیتیں ملتی ہیں - خود محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) نے ان دونوں کتابوں کي صداقت کو تسلیم کیا ہے - ولیم میور نے جن کی کتاب " حیات محمد " (صلی اللہ علیہ و سلم) آج کل بڑی مقبول ہو رہی ہے، قران کی ان سب آیتوں کو ایک جگہ جمع کردیا ہے جن میں انجیل و توریت کے آسمانی کتابیں ہونے کے متعلق تصدیق ہوتی ہے * وہ لوگ جو اس مضمون سے بے خبر ہیں انہیں یہ دیکھکر بہت تعجب ہوگا کہ قران نے بارہا توریت

---

* The testimony borne by the Coran on the Jewish and Christian Scriptures. Agra, 1856.

و انجیل کی صداقت تسلیم کی ہے —

اب ہم پھر ہندوستان کی جانب رجوع کرتے ہیں —

مجھے کپتان فلر کی مرتب کردہ رپورٹ کا ایک نسخہ حال ہی میں ملا ہے - اس میں پنجاب کے سرشتہ تعلیم کے متعلق پوری معلومات جمع کردی گئی ہیں - اس رپورٹ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۶۰ - ۶۱ ع میں ۳۷ ہزار ۲ سو ۸۰ طالب علم اردو زبان میں تحصیل علم کرنے میں مشغول ہیں - اردو کی صرف و نحو کی تعلیم با قاعدہ دی جاتی ہے - اور فارسی سے زیادہ زور اردو کی صرف و نحو پر دیا جاتا ہے - فارسی زبان کا میں نے مقابلتاً اس لئے ذکر کیا کہ ہندوستانی لوگ اور خصوصاً ہندوستانی مسلمان فارسی زبان کو بہت عزیز رکھتے ہیں اور اسے اپنی کلاسک زبان خیال کرتے ہیں اسی طرح تحصیلی مدارس میں ہندو اور مسلمان طلبا کی کل تعداد چھ ہزار تین سو ہے - اس میں سے ۴ ہزار تین سو طالب علم اردو زبان پڑھتے ہیں اور صرف ۲ ہزار نو سو چونتیس طلبا فارسی پڑھتے ہیں - دیہاتی مدارس کا بھی یہی حال ہے - کل طلبا کی تعداد ۳۲۱۶۵ ہے اس میں سے ۳۱۱۶۰ اردو پڑھنے والے ہیں اور ۱۴۲۳۷ فارسی پڑھنے والے - نارمل اسکولوں میں جہاں استادوں کی تعلیم ہوتی ہے ' طالب علموں کی کل تعداد ۴۵۱ ہے - اس میں سے ۴۱۶ اردو پڑھتے ہیں اور صرف ۵۲ ہندی پڑھتے ہیں - اور فارسی پڑھنے والوں کی تعداد ۳۹۳ ہے - اضلاع کے مدارس میں طلبا کی تعداد ۲۳۱۹ ہے - اس میں سے ۱۸۴۹ اردو پڑھنے والے اور ۴۷۲ فارسی پڑھنے والے ہیں —

ہندوستانی مدارس میں انجیل پڑھانے میں اب کوئی دشواری نہیں ہوتی - چنانچہ بنگال کے ایک ہندو اخبار میں اس مسئلہ کی نسبت ان

الفاظ میں اظہار خیال کیا گیا ہے :—

"جس طرح نیشکر کی ہر پور میں جڑ سے چوٹی تک رس بھرا ہوتا ہے اسی طرح انجیل کے ہر صفحے میں تعلیم کے جواہر ریزے پنہاں ہیں —

صوبہ شمال مغربی کی حکومت قابل مبارک باد ہے کہ اس نے دیسی لوگوں کی تعلیم کی طرف خاص شغف ظاہر کیا - اس صوبے کے مدارس میں محض انگریزی زبان اور یورپی علوم ہی کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے بلکہ خود دیسی لوگوں کی زبان اور ان کے علوم کا بھی خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے - چنانچہ حکومت کی سرپرستی میں سنسکرت کی کتابوں کے ہندی میں ترجمے کرائے گئے ہیں ان ترجمہ کرنے والوں کی یہ کوشش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سنسکرت کے اصلی الفاظ اور محاوروں کو ہندی ترجمے میں کھپایا جائے - اس سے یہ ہوتا ہے کہ ترجمہ کی مدد سے سنسکرت کی عبارت بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے - اس قسم کے ایک ترجمے کی کتاب میرے پاس ہے - جیمس آر بلنٹائن کے مشورہ اور ہدایت کے مطابق یہ ترجمہ کیا گیا ہے - سنسکرت کتاب ہتوپادیسا کی یہ پہلی فصل ہے - اور پنڈت بدری لال نے اس ترجمے میں وہ حصے چھوڑ دئے ہیں جنھیں طالب علموں کی کتاب میں رکھنا کسی طرح مناسب نہ تھا —

حال ہی میں کلکتہ میں ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ شام کے وقت علمی اور ادبی مجالس منعقد کرے تاکہ ہندوستانی اور یورپین آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اختلاط بڑھا سکیں - اس میں دونوں کا نفع مد نظر ہے - ہندوستانی یورپین لوگوں کے میل جول

سے بہت سی ایسی باتیں سیکھہ سکتے ھیں جن سے وہ مطلق بے خبر ھیں - یورپین لوگ اگر ھندوستانیوں کے ساتھہ میل جول بڑھائیں تو اس سے انھیں ان کے مزاج اور طبیعت کو سمجھنے میں اسانی ھوگی اور ھندوستانی زبان و ادب کا ان میں ذوق پیدا ھوگا —

ھندوستان میں تعلیم نسواں کی طرف بھی توجہ کی جارھی ھے - شہر دھلی میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لئے چار مدارس کھولے گئے ھیں - لڑکیوں میں بھی علم کا شوق پیدا ھوچلا ھے - ایک پانچواں مدرسہ اور حال ھی میں قائم کیا گیا ھے اس مدرسے میں صرف تیموری خاندان کی شہزادیاں داخل ھوسکتی ھیں اس وقت ۵۰ شہزادیاں تعلیم پارھی ھیں - شہر 'بنارس' میں با حیثیت ھندؤں کی ایک انجمن قایم کی گئی ھے جس کا مقصد یہ ھے کہ ھندو عورتوں میں تعلیم کو رواج دیا جاے - اس کے ساتھہ ساتھہ انجمن کے پیش نظر یہ بھی ھے کہ ھندی زبان میں لڑکیوں کے لئے کتابیں چھاپی جائیں- کتاب صرف اس وقت انجمن کی طرف سے چھاپی جاتی ھے جب کہ انجمن کا صدر اور ارکان کی اکثریت اس کتاب کے متعلق اپنی پسند کا اظہار کر دے - * 'بمبئی' میں ایک دولتمند پارسی مانک جی 'کرستجی' نے اپنے خاندان کی لڑکیوں کو یورپی طرز کی تعلیم دینا شروع کی ھے - موصوف نے یہ اعلان کیا ھے کہ وہ اپنے مکان کے ایک حصے کو لڑکیوں کے مدرسہ کے لئے وقف کردیں گے - ان کا ارادہ ھے کہ اس میں ایک مدرسہ قایم کریں اور تعلیم دینے کے لئے ایک انگریز استانی کو رکھیں - ان کی دو صاحبزادیاں بھی اپنے ہم وطنوں کی ھمدردی میں اس مدرسہ میں

---

* ملاحظہ ھو Delhi Gazette اور Delhi Journal (Allen,sInd, Mail Nov. 27, 1862.)

کام کریں گی - 'بمبئی' کے گورنر لارڈ 'الفنسٹن' نے اس تجویز کی پورے طور پر ہمت افزائی کی ہے - لارڈ موصوف نے اس مدرسہ کی تجویز کے متعلق فرمایا کہ دنیا میں جہاں کہیں عورتوں کو تعلیم دی گئی ہے وہاں لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت بڑھ گئی ہے اور خود مردوں کے اخلاق پر عورتوں کی تعلیم کا اچھا اثر پڑتا ہے - ہم یورپ میں مشکل ہی سے ان عورتوں کی حالت زار کا اندازہ کر سکتے ہیں جو محلسرا کی زندگی میں بہت جلد اپنا حسن و شباب کھوچکتی ہیں اور ان کے چاہنے والے ان کی طرف سے بے پروائی برتنا شروع کردیتے ہیں بقول ایک شاعر :—

پژ مردہ اور ذلیل

گلچیں نے انہیں توڑ کر ایک طرف بے پروائی سے پھینک دیا تازگی فنا ہوگئی اور ان کا حسن کمہلا گیا —

اب وہ قابل نفرت چیزیں ہیں - سبھوں نے انہیں چھوڑ دیا - اب ان کا ہر قدم بربادی کی جانب اُٹھہ رہا ہے —

میری طرح جن صاحبوں کو گذشتہ ماہ ستمبر میں ان دونوں پارسنوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ غالباً میرے اس دعوے کی تائید کریں گے کہ مانک جی کو اپنی بیٹیوں کے انگریزی تعلیم دلانے میں پورے طور پر کامیابی ہوئی - یہ 'پارسن' پہلی ہندوستانی عورتیں ہیں جو یورپ آئی ہیں - وہ ہندوستانی میں جو ان کی مادری زبان ہے اور انگریزی اور فرانسیسی میں بلا تکلف گفتگو کر سکتی ہیں - مسٹر 'مانک جی' پہلے پہل سنہ ۱۸۴۱ ع میں یورپ آے تھے - اس دفعہ وہ اپنی دو بیٹیوں کے ساتھہ دوبارہ آے ہیں تاکہ 'لندن' جاکر ان کے قیام و تعلیم کا انتظام کریں - 'لندن'

میں پہلے سے کئی ایک پارسی موجود ہیں جو نہایت دولتمند ہیں۔ موصوف 'لندن' سے واپسی پر 'پیرس' میں چند روز ٹھیرے تاکہ اپنی صاحبزادیوں کو شہر پیرس کی سیر کرائیں —

حضرات! ہم یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اردو زبان دن بدن ترقی کر رہی ہے۔ چنانچہ بمبئی گزٹ مورخہ ۲۷ فروری سے مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بنگال اور بہار و اڑیسہ کے زمینداروں اور دوسرے باشندوں نے وائسرائے گورنر جنرل بہادر کو ایک عرضداشت بھیجی ہے جس میں یہ درخواست کی ہے کہ جدید ہائی کورٹ میں اردو زبان میں کاروائی کی جائے —

'اودھ' کے صوبے میں صرف ان وکلاء کو وکالت کی اجازت ملتی ہے جو اور دوسری شرائط کے ساتھ اردو دانی کی شرط بھی پوری کریں۔ ان کا امتحان بول چال اور تحریر دونوں میں لیا جاتا ہے تاکہ ان کی اردو دانی کی پوری تصدیق ہوجائے —

حال میں متعدد اشخاص کو حکومت برطانیہ نے اسٹار آف انڈیا (ستارۂ ہند) کا خطاب عطا کیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو تقریبیں ہوئیں ان میں اردو زبان ہی میں تقریریں کی گئیں۔ اسی طرح نومبر سنہ ۱۸۶۱ع میں مہاراجہ 'کشمیر' کی گدی نشینی کے موقع پر 'جموں' میں جو دربار منعقد ہوا اس میں مسٹر 'ڈیوس' نے اُردو میں تقریر کی۔ مسٹر ڈیوس اس موقع پر گورنمنٹ ہند کے نمایندہ تھے۔ جب موصوف تمغے راجہ کے سینے پر تمغے لگا چکے تو راجہ نے بھی ان کی تقریر کا جواب اردو میں دیا —

ہندوستان کے ایک دوسرے حصے بنگال میں جس وقت سر جے پی گرانٹ سابق لفٹننٹ گورنر یورپ واپس جا رہے تھے تو 'کلکتہ' کے باشندوں

نے ۱۶ اپریل کو ایک جلسہ منعقد کیا جس میں موصوف کی ہر دلعزیزی اور خلوص کا اظہار کیا - جلسہ کی صدارت راجہ ' رادھا کنت دیو ' بہادر نے کی - موصوف بڑے فاضل آدمی ہیں اور ایک ضخیم سنسکرت کی لغت کے مصنف ہیں - اس موقع پر موصوف نے جو تقریر کی وہ اردو میں تھی - ان کی تقریر کے بعد راجہ ' کالی کرشن ' بہادر کھڑے ہوئے - موصوف بھی مشہور مصنف ہیں اور آپ نے ' گے ' (Gay) کی کہاوتوں کا اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے - آپ نے بھی حسب موقع اردو میں تقریر کی نہ کہ بنگالی میں - ہندوستان کے اخباروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سر جان ' گرانٹ ' کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا - اس میں تشکر و احترام کے جذبات کا اظہار تھا - اور ان گرانقدر خدمات کا ذکر تھا جو موصوف نے اپنے زمانے میں صوبۂ بنگال کی کیں - یہ سپاس نامہ تجویز کی شکل میں جلسہ میں متفقہ طور پر منظور ہوا - اس کے بعد راجہ اپروا کرشن نے اردو میں تقریر کی اور یہ تجویز پیش کی کہ کلکتہ میں کسی جگہ سر جان گرانٹ کا مجسمہ نصب کیا جائے —

(Haileybury کے کالج کی جگہہ Woolwich) کی فوجی اکادمی میں مشرقی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا - یہاں مسٹر کاٹن ماتھر ہندوستانی زبان کی تعلیم دیتے تھے - مگر اب لندن کے (King's Collage) کنگس کالج میں مشرقی علوم کا ایک علاحدہ شعبہ قایم ہوا ہے - (Haileybury) کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد متعدد اشخاص نے ملکی نظم و نسق اور علم و فضل میں بڑا نام پیدا کیا تھا - امید ہے کہ وہی روایات اب بھی قایم رہیں گی - (King's College) کے مشرقی شعبہ میں مسٹر فنز ایڈورڈ ہال اردو زبان کی تعلیم دیتے ہیں اور مسٹر بلنٹائن سنسکرت پڑھاتے ہیں - اس

شعبے میں صرف درس ھی نہیں ھوں گے بلکہ یہیں سے تحریری اور زبانی امتحانوں کے بعد قابلیت کے اعتبار سے سند ملے گی - اس سند کی بدولت هندوستان میں سرکاری خدمات بآسانی مل سکیں گی —

میں اپنے پچھلے خطبوں میں ذکر کر چکا ہوں کہ آکسفورڈ اور کیمبرج میں بھی اردو کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے - سنہ ۱۸۵۶ ء میں ڈبلن یونیورسٹی میں بھی اردو فارسی اور عربی کی تعلیم شروع ہو گئی ہے - لندن کے یونیورسٹی کالج کی طرح ڈبلن میں بھی ایک هندوستانی عالم مولوی اولاد علی ان زبانوں کی تعلیم دینے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں —

حضرات ! همیں چاهئے کہ اپنے سامنے ایک اعلیٰ علمی نصب‌العین رکھیں- دوسرے ممالک کے لوگ هم فرانسیسیوں پر یہ الزام لگاتے هیں کہ سارا عالم فرانسیسی بولتا ھے مگر فرانسیسی سوائے اپنی زبان کے اور کوئی زبان نہیں بولتے * همارا فرض ھے کہ اس الزام کو اپنے سر سے دور کرنے کی کوشش کریں - همیں غیر زبانیں بولنے کی عادت ڈالنی چاهئے - اور غیر زبانوں سے میری مراد صرف یورپی زبانیں ھی نہیں بلکہ مشرقی زبانیں بھی هیں - همیں اپنے پڑوسیوں (انگریزوں) سے اس باب میں سبق لینا چاهئے —

مسٹر جان 'میور' نے جو مسٹر ڈبلو 'میور' کے بھائی هیں ' یہ خوب کیا کہ ۳۰ هزار روپے کی رقم اپنے شہر 'اڈنبرا' کی یونیورسٹی میں سنسکرت ادب اور مقابلتی لسانیات کی "چیر" قایم کرنے کے لئے وقف کردی - حکومت کی طرف سے اس رقم میں اور اضافہ کیا جاے گا اور

* ' فرانسیسی کا خیال ھے کہ سب لوگوں کو چاهئے کہ اس کی زبان سیکھیں - خود اس کا یہ فرض ھے کہ سوائے اپنی زبان کے اور کوئی دوسری زبان نہ بولے " (The Forgery - G. P. R. James.) —

اس طرح یہ ممکن ہوگا کہ سنسکرت کی تعلیم کے پہلو بہ پہلو یہاں اردو کی بھی تعلیم شروع ہو جائے ہمیں پوری توقع ہے کہ یہ انتظام جلد مکمل ہو جا ے گا اور علم لسانیات کو ترقی دینے کی ایک شکل پیدا ہو جائے گی ۔ یہ علم کیا بہ اعتبار اپنی دلچسپی اور کیا بہ اعتبار اپنے مفید ہونے کے نہایت اہمیت رکھتا ہے ۔ اس سے فلسفۂ تاریخ اور دینیات دونوں مستفید ہو سکتے ہیں ۔ چنانچہ میرے اس دعوے کا اگر آپ ثبوت تلاش کرنا چاہیں تو وہ 'مکس ملر' کے " لکچروں " میں موجود ہے ۔ مو سیو سینٹ ہلیر نے ان لکچروں کا خلاصہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے ۔ لسانیات کے متعلق میں اس وقت صرف ضمناً اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے زمانے کے ماہرین لسانیات نے صرف و نحو کے اعتبار سے زبانوں کو تین خاندانوں میں تقسیم کیا ہے ۔ ایک انفرادی (Monosyllabie) دوسری سلاحقی (Agglutinatine) تیسری تصریفی (Amalgamic)

پہلی قسم کے تحت چینی زبان آتی ہے ۔ دوسری قسم کے تحت ترکی اور دوسری تورانی زبانیں اور تیسری قسم کے تحت آریائی زبان میں آتی ہیں ۔ ان میں ایرانی اور اندو آریائی زبانیں سب شامل ہیں ۔ اردو زبان دوسری اور تیسری قسموں کے تحت آتی ہے اس میں تورانی ارر ایرانی عناصر پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں ۔ صرف و نحو کے اعتبار سے اردو زبان ایرانی ہے اور الفاظ کے اعتبار سے سامی * —

---

* 'گارساں دتا سی' کی اس رائے کو آج ماہرین لسانیات تسلیم نہیں کریں گے ۔ لیکن ہمیں یہ ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جس زمانے میں اس نے اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی اس وقت علم لسانیات کی ابتدا تھی ۔ تقریباً ۸۰ سال کی تحقیق نے پرانے نظریوں کو بالکل درہم برہم کر دیا ۔ مترجم

موسیو ' دیو پان ' نے جو انسٹیٹیوٹ کے رکن اور سینیٹ کے ممبر ہیں اور ایک فاضل شخص ہیں اپنی کتاب " اقوام کی پیدائشی قوت " میں ہندوستان کے متعلق ایک باب رکھا ہے - اس باب کا عنوان " تصویر ہند " ہے - اس میں وہ کہتے ہیں کہ برطانوی ہند کی مردم شماری سرکاری کاغذات کے مطابق اس وقت ۱۸ کروڑ ۷۰ لاکھ ہے - آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان تقریباً ۲۰ کروڑ نفوس کے درمیان جو چیز ایک مشترک رشتے کا کام دیتی ہے وہ اردو زبان ہے - یہ زبان پورے یورپ کے برابر رقبہ زمین میں بولی جاتی ہے - اس سے بھی زیادہ تعجب اس پر ہے کہ آج یہ بیس کروڑ انسانی نفوس برطانیہ کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں - اس انتظام میں یقیناً مشیت ایزدی کو دخل ہے —



بادِ کہن

" گلزار شہادت "

از

غلام ہمدانی مصحفی تصنیف سنہ ۱۲۱۶ ھ

(یہ مثنوی میرے کتب خانے کے دیوان مصحفی کے قلمی نسخے سے نقل کی گئی ہے اور اس کا مقابلہ اور تصحیح جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا بانکی پور پٹنہ نے اپنی مہربانی سے خدابخش خاں لائبریری کے نسخے سے کی ہے - " ن خ " سے مراد نسخہ خدابخش خاں ہے - خدا بخش خاں مرحوم کے کتب خانے میں یہ مثنوی دیوان پنجم مصحفی میں ہے - میرا نسخہ غالباً مصحفی کی زندگی ہی میں لکھا گیا تھا - خدا بخش خاں مرحوم کے کتب خانے کا نسخہ مصحفی کی وفات کے دو ایک برس بعد لکھا گیا ہے - اس میں دو شعر زیادہ ہیں ' باقی ایسے اختلافات جو قابل لحاظ تھے حاشیے میں درج ہیں - یہ مثنوی جیسا کہ خود مصحفی نے لکھا ہے سنہ ۱۲۱۶ ھ میں تصنیف ہوی - مثنوی " بحرالمحبت " کا زمانۂ تصنیف بھی اسی کے قریب ہوگا کیونکہ یہ مثنوی بھی خدا بخش خاں لائبریری کے دیوان پنجم میں موجود ہے) —

اڈیٹر

بسم‌اللہ الرحمن الرحیم

مثنوی عشقیہ

(۱) ہے یہ جو نئی سی ایک حکایت	ایک زن سے ہے اسکی یوں روایت
(۲) یعنی کہ ہے مجکو اس قدر یاد	ہمسایہ مری تھی ایک پری زاد
(۳) سن دس کی دوازدہ کی تھی وہ	میں حور جو تھی تو تھی پری وہ
(۴) کھیلیں تھیں ہمیشہ‌ہو بہم شاد	ہم جولی مری تھی وہ پری زاد (۴)
(۵) باہم یہ رہے تھا عہد و پیماں	یعنی کہ سنو ہو میری بھیناں (۵)
(۶) جس وقت کہ بیاہ ہو تمھارا	ملنا مت چھوڑیو ہمارا
(۷) یا پہلے میں ہی بیاہی جاؤں	جس وقت کہ تم بلاؤ آؤں
(۸) چاہت میں ہماری اور تمہاری	آوے نہ فراق و اضطراری
(۹) ناگاہ پھر گردش ستارہ	منسوب ہوئی وہ ماہ پارہ
(۱۰) بیاہی گئی ایک مغل کے گھر میں	رہنے لگی قید بام و در میں
(۱۱) اتنے میں بحکم اعتقادی	کچھ گھر میں اوتھی ہمارے شادی
(۱۲) عورات قبیلہ ہر طرف سے	آئیں کچھ اپنے ساتھ لے لے
(۱۳) شادی کی سدی جوھیں ادائی	بن ٹھن کے وہ رشک مہ بھی ائی
(۱۴) اوتری جو محفہ میں سے وہ ماہ	کی دیکھ کے آسمان نے بھی آہ
(۱۵) چھوٹی بہن اوسکی چشم بد‌دور	یہ حور تو وہ تھی (۱۵) بچۂ حور
(۱۶) وہ حور بتجمل عروسی	چھوٹی کا لباس سندروسی
(۱۷) نسبت میں وہ ماہ اور یہ ناہید	صورت میں سہا یہ اور وہ خورشید

(۴) ن‌خ بہم ہمیشہ دل شاد　　(۵) ن‌خ گوئیاں　　(۱۵) ن‌خ وہ بھی

(۱۸) پوشاک بلا تو زیور آفت   دو نو بہنیں سراسر آفت
(۱۹) کانوں میں جڑاؤ اوس کے بالا   ہو جیسے ستارہ دار ہالہ
(۲۰) بینڈی کی چمک جبیں پہ ایسی   جو تانک نہو نگیں پر ایسی
(۲۱) نتھہ ناک میں ہالۂ قمر تھی   یا قلزم حسن کے بھنور تھی
(۲۲) کانوں میں وہ بالیاں طلائی   کرتی تھیں ادا سے کچھ ادائی
(۲۳) بازو پہ کسا ہوا وہ بھوجبند   تھی جس کی پری بھی آرزو مند
(۲۴) الماسی کڑے کلائیوں میں   حل کردہ قمر صفائیوں میں
(۲۵) ہاتھوں میں وہ پور پور چھلے   تھے جن سے بغوں طپاں مچلے
(۲۶) جگنو وہ گلے میں ماہ پارہ   جوں ماہ کے پاس ہو ستارہ
(۲۷) الماس کی اربسی وہ سادہ   موتی کوئی ہوئے جو بیادہ (ن ا)
(۲۸) پاوں میں وہ موتیوں کی پازیب   ہو جاوے پری کو جس سے آسیب
(۲۹) پھر تسپہ کڑی غضب وہ خمدار   ہو جس کی صدا (ن) سے فتنہ بیدار
(۳۰) پھر رنگ کفک وہ تشنۂ خون   لیلیٰ ہو جائے جس کی مجنون
(۳۱) با ایں ہمہ شان خود نمائی   جب پردہ اوٹھا وہ باہر آئی
(۳۲) نزدیکی میں اک جوان سادہ   تھا کرسی رت پر ایستادہ
(۳۳) دیکھہ اوس کو بد باہال نظارہ (ن)   کرسی سے گرا وہ جوں ستارہ
(۳۴) ہو کر کے خدنگ خوردۂ عشق   دل اوس کا ہوا فشردۂ عشق
(۳۵) سو جان سے ہو وہ اوس پہ شیدا   لیلیٰ نے کیا ہے قیس پیدا

---

(۲۷) ن خ (بمجلسد بہادہ)   (۲۹) ن خ کھنک
(۳۳) اغلب یہہ ہے کہ ''باہال نظارہ'' کی جگہ جو دونوں نسخوں میں ہے " بآول نظارہ " ہو اور پہلے مصرعہ میں " بد " نہ ہو جو فور ضروری ہے -

(۳۶) دل اوس کا بنا تمام (ن) حسرت — کچهه اوس میں رهی نه تاب و طاقت

(۳۷) هم عهد هوا بناصبوری — مرنا هی پڑا اوسے ضروری

(۳۸) حیرت زده هو نگاه ره گئی — آکر کے لبوں په آه ره گئی

(۳۹) برق ایک دهاک میں اوس په پڑ گئی — تهی طاقت تن سو سب نبڑ گئی

(۴۰) سودے نے کیا مقام سر میں — اوٹهنے لگی سول سی جگر میں

(۴۱) مژگاں هوئیں اشک خوں سے تڑائیں — رنگیں بهی (ن) برج عقد پروئیں

(۴۲) وه ساده بعالم جوانی — آیا به بلائے نا گهانی

(۴۳) الفت سوں زبس که نو هوس تها — خود وه بمقام شعله خس تها

(۴۴) دیکهی جو یه حسن کی تجلی — بے خود هو گرا بسان موسی

(۴۵) لب خامش و شور و ناله دل میں — ایک طرفه خروش آب و گل میں

(۴۶) اوس شادی کے گهر میں ایک زن تهی — گویا بشگفتگی چمن تهی

(۴۷) گهر کا بس اوسیکی دم سے تها بند — وه زن یه کهے تهی تهی مری ننند

(۴۸) که پردے میں اوس کے حلوا سوهن — بهیجا تا کهاویں اوس کو سب زن

(۴۹) که لونگ چڑے باین بهانه — ارسال کئے درون خانه

(۵۰) که پهولوں کے هار مول لیکر — بهیجے پئے نذر آں سمن بر

(۵۱) تا دیکهے وه گل بهی خوئے الفت — آوے اوسے دل سے (ن) بوئے الفت

(۵۲) القصه تمام دن وه بیتاب — اوس در په رها بسان سیماب

(۵۳) وهاں سب کو وه شب کٹی بشادی — دل اوس کے یه داغ نامرادی

(۵۴) انکهیں سوئے چرخ باز اوس کی — جوں چشم نظاره ساز اوس کی

(۵۵) تاروں سے وه زخم دل نمک سود — لب پر وهی آه حسرت آلود

(۵۶) سردے کا سا ایک خیال دل میں — اک دغدغه کمال دل میں

(۵۷) حرماں سے بمرگ دل نهاده — بدنامی کا اوس کی تر زیاده

---

(۲۶) ن خ میں "تمام" هی هے لیکن حاشیه پر لفظ "مقام" لکها هوا هے۔

(۴۱) ن خ آنکهیں بندیں   (۵۱) ن خ اون سے

(۵۸) یہ سوچ کہ دیکھوں صبح کیا ہو　　تن میں رہے جان یا ہوا ہو
(۵۹) ہے شاہ ی کے گھر وہ آج مہمان　　کل ہوویگی اپنے گھر میں پنہان
(۶۰) میں غمزدہ آہ کیا کروں گا　　بن آئی اجل ہی مر رہوں گا
(۶۱) کاری ہے خدنگ عشق پرشور　　خوننابہ کرے ہے جسم (ن) پر زور
(۶۲) اس خستہ کی آہ کیا کہوں بات　　یہ تھااوسی گفتگو میں بس (ن) رات
(۶۳) جو اتنے میں مرغ صبح بولا　　سورج نے در فلک کو کھولا
(۶۴) ہوئی روز کی روشنی نمایاں　　رخصت لگے ہونے شب کے مہمان
(۶۵) تا چاشت وہ مہمان خانہ　　باہم ہوئے پیش و پس روانہ
(۶۶) آیا جو میانہ اوس پری کا　　تھا کشتہ یہ جس کی کافری کا
(۶۷) جوں اوس میں ہوئی سوار بہ شتک　　تھے اس میں اور اوس میں لاکھہ فرسنگ
(۶۸) کرکے وہ قہار (ن) اوس کو پامال　　روح اوس کی گئی انہوں کے دنبال
(۶۹) لیلی کی گئی اودھر سواری　　مجنوں کے لگی ادھر کٹاری
(۷۰) دل خون ہو چشم تر کو آیا　　یعنے یہ فراق رنگ لایا
(۷۱) بے ساختہ چاہ کام کر گئی　　کیا جانئے جی پہ کیا گزر گئی
(۷۲) بال اوس نے بڑھائے اپنے سر کے　　درہم ہوئے لوگ دیکھہ گھر کے
(۷۳) ناخن بھی کئے سب اوس نے ناشی　　سودے میں بڑھائے دل خراشی
(۷۴) فوج غم اوس پہ جو پڑی ٹوٹ　　کھانا پینا بھی سب گیا چھوٹ
(۷۵) کھائے تن زار نے زبس پیچ　　جوں موئے کمر وہ رہ گیا ہیچ
(۷۶) جان ہونٹوں پہ آئی اوس کی سو بار　　پر اوس سے کیا نہ اس نے انکار
(۷۷) دیکھے شب و روز عشق کے جور　　ایک سال بسر کیا اسی طور
(۷۸) اس حال سے تھی وہ بی بی آگاہ　　لے گئی یہ فسانہ پیش آ نماہ

---

(۶۱) ن ع چشم　　(۶۲) ن ع اوس　　(۶۸) ن ع کہار

(۷۹) کاے رشک پری ہے ایک نوزاد — ہمسر مجنون قیس و فرہاد
(۸۰) مہمانی کے روز تجھ کو اوس نے — دیکھا تھا محافہ سے اوترتے
(۸۱) اوس دن سے ہوا ہے وہ بد احوال — دو دو انگل کے سر پہ ہیں بال
(۸۲) لب خشک ہیں اور چشم تر ہے — مژگاں پہ چکیدۂ جگر ہے
(۸۳) دشوار ہوا ہے اوس کو جینا — سب بھول گیا ہے کھانا پینا
(۸۴) کچھہ اوس کو نہ تن بدن کا ہے ہوش — جامہ کا نہ پیرہن کا ہے ہوش
(۸۵) رہتا ہے وہ دل گرفتہ غمناک — عریانی تن ہے اوس کی پوشاک
(۸۶) نہ منھہ سے کبھی کہے ہے کچھہ بات — ہے جذب کي طور اُس کے حالات
(۸۷) رہتا ہے اوسے ملال تیرا — سودا تیرا خیال تیرا
(۸۸) تھی وہ جو صنم بحسن مغرور — اور آپ کو سمجھے تھی بہت دور
(۸۹) کانو سے سنا تو گر چہ قصا — پر کچھہ نہ دیا جواب اس کا
(۹۰) خاموش رہی وہ سن یہ مذکور — پر دل نے کہا ہوا میں نا سور
(۹۱) ہوئی جا کے وہ صاحب تامل — پوشیدہ بقاعدۂ تغافل
(۹۲) کچھہ دھیان نہ اوس کا دل پدلائی — بیگانۂ طور آشنائی
(۹۳) جب اوس کی سنی تو ٹال دی بات — کچھہ اور وہیں نکال دی بات
(۹۴) دلبستۂ عیش و ناز رکھا — رسوائي سے خود کو باز رکھا
(۹۵) مقدور تلک رہی وہ خندان — گہر اوس کا رہا بہ از گلستان
(۹۶) یوں یہاں سے لکھے ہے کلک تحریر — افسانۂ عاشق جوان سیر
(۹۷) اوس کہنہ شراب کا وہ مخمور — یعنی وہ جو تھا کمال (ن) رنجور
(۹۸) جب تنگ ہوا رواق اوس پر — اور ٹوٹ پڑا فراق اوس پر
(۹۹) وہ سال دگر بھی کاٹ اُسی طور — کر کر کے وداع عقل فی الفور

---

(۹۷) ن ع بحال

(۱۰۰) ہو وادئی عشق میں پیادہ　　مجنوں سے قدم رکھا زیادہ

(۱۰۱) ہجراں کی جو دیکھی محنت شاق　　تن سو کھہ کر اوس کا ہوگیا تاق

(۱۰۲) آنکہیں یرقان گرفتہ ہوگئیں　　پلکیں اوسے خون میں ڈوبو گئیں

(۱۰۳) چہرے پہ جو رنگ زعفراں تہا　　لب خندہ موں ابہی (ن) وہ جواں تہا

(۱۰۴) تہا کلفت دل سے جو مکدر　　خاک اوڑتی تہی بہیگتی مسوں پر

(۱۰۵) وہ طاقت زور نوجوانی　　تہا مصرف چرخ ناتوانی

(۱۰۶) بالوں نے کیا اوسے نمدہ سو　　تن جیسے بتاب شاخ آہو

(۱۰۷) آنکہیں بہیں سلہ پہ دجلہ ہوکر　　پہر رونے لگا اوتہا جو سو کر

(۱۰۸) سونا تو نصیب میں کہاں تہا　　ایک خواب غشی کا وہ سماں تہا

(۱۰۹) دن رات اوسے نصیبوں سے جنگ　　ایک کوچہ رہ ہزار (ن) نو سنگ

(۱۱۰) رنگ اوس کا بہار میں زریری　　حال اوس کے سے جلوۂ فقیری

(۱۱۱) کپڑے سو وہ تیلیا بدن میں　　جیتا ہے اجل کے وہ دہن میں

(۱۱۲) سو پردہ میں وہاں وہ رشک خورشید　　یہاں ایک جہلک تلک یہ نومید

(۱۱۳) تنہائی میں پاس اوس کے غمخوار　　پاس اوس کے نہ غیر چار دیوار

(۱۱۴) اس عرصہ میں وہ زن وفادار　　آئی گئی درمیاں میں سو بار

(۱۱۵) جب خوب یہ سوکھکر ہوا زار　　گو یندہ کہے ہے آخر کار

(۱۱۶) با وصف غرور کبریائی　　اس کی بہی طبیعت ایدہر آئی

(۱۱۷) گہر والوں سے اپنے بیٹہہ کر دور　　سننے لگی جیسے اس کا مذکور

(۱۱۸) پایا جو زاج نازایدہر (ن) کو　　وہ زن ہوئی اوس سے یوں سخن گو

(۱۱۹) کاے حور نژاد ہے وہ مہجور　　دوری سے تری کمال رنجور

---

(۱۰۳) ن خ آپہی　　(۱۰۹) ن خ رہ و ہزار　　(۱۱۸) ن خ اودہر

(۱۲۰) آزردۂ رنج شاق ھے وہ — مدقوق تپ فراق ھے وہ

(۱۲۱) مشتاق نظر وہ جاں بلب ھے — دیدار کی اوس کو بس طلب ھے

(۱۲۲) تب اوس نے کہا یہ بھر دم سرد — میں کیا کروں زن ھوں وہ تو ھے مرد

(۱۲۳) زن پر اگر آے مرد کا دل — پھر کہا کوئی ھو جو پاے در گل

(۱۲۴) افتادہ میان چار دیوار — تم جانتی ھو کہ ھوں میں لاچار

(۱۲۵) ھوں لاکھہ قفس میں اک تو محبوس — اس پر مانع ھے پاس ناموس

(۱۲۶) دن رات ھے اتنی قید مجھہ پر — رکھہ سکتی نہیں میں پاوں بر در (ن)

(۱۲۷) روزن ھے جو گھر کا دیدبان ھے — نظارہ کی جا کہو کہاں ھے

(۱۲۸) ناموس سے سہل تھا گذرنا — مجھکو تو پڑا ھے غم میں مرنا

(۱۲۹) چارہ نہیں کچھہ مگر کہ اس سال — ایک شادی ھے گھر میں میرے فی الحال

(۱۳۰) آویں گی قبیلہ کی زناں سب — یعنی مرے رت جگا ھے اس شب

(۱۳۱) پہنا کے اوسے زنانی پوشاک — اور ڈال کے چشم فتنہ میں خاک

(۱۳۲) بھجواونگی یہاں سے میں میانا — ساتھہ اپنے سوار کر لے آنا

(۱۳۳) ٹھہرا جو مدار وصل اس طور — جب آئی وہ رات اس نے فی الفور

(۱۳۴) پوشاک زنانی اور زیور — بھجوا دئیے اوس کو خوان میں دھر

(۱۳۵) جوڑا وہ برنگ زعفرانی — ھو دیکھہ جسے پری دیوانی

(۱۳۶) کمخواب کی وہ ازار گلبدنہ — تارے کرتے تھے جس کو اسپند

(۱۳۷) معجر وہ برنگ لالہ تر — دیکھا کرے جس کو چشم اختر

---

(۱۲۶) ن خ در پر

ن خ میں شعر نمبر ۱۳۶ کے بعد یہ شعر ھے جو میرے نسخے میں نہیں -

" تسبہر وہ ازار بند زریں — جوں دامن کہکشاں میں پرویں "

(۱۳۸) پھر تسمہ وہ سینہ بند گل دوز | جو دل سے فرشتہ کے چلے سوز
(۱۳۹) پھر نیمتنہ وہ دام بلبل | کاڑھے ہوے جس میں سیکڑوں گل
(۱۴۰) پھر کفش وہ رشک ماہ و خورشید | ہم پنجہ بتا ہے فرق جمشید
(۱۴۱) جب گھر میں میانجی کے یہ پوشاک | آئی ہوئی (ن) دیکھکر (ن) طرب ناک
(۱۴۲) اوس زن نے کہ تھی وہ محرم کار | اور رہتی تھی ہردم اوسکی غمخوار
(۱۴۳) کنگھی چوٹی کر اوس جوان کی | دی وضع نکال سب زنان کی
(۱۴۴) پوشاک جو اوسکو وہ پہنائی | حورا کے تئیں پری دیکھا ئی
(۱۴۵) زیور سے کیا جو پھر تزئین | پڑنے لگی اوسپہ چشم پروین
(۱۴۶) انکھو نمیں دیا یہ وہ اس کے کا جل | جو دیکھے ہے اسکو شب کٹی جل
(۱۴۷) چوٹی گوندھی وہ بور یا بات | چون مار سیاہ ہو پس قات
(۱۴۸) رکھا وہ ذقن پہ خال میگوں | جو چشم فرشتہ جس سے پر خوں
(۱۴۹) از بس جعلی نہ تھے جو وہ بال | تھی مانگ کی اوس کی ٹھیک تمثال (ن)
(۱۵۰) سینہ پہ وہ چھاتیاں چکنی سی | تھیں تعبیہ کی ہوی روئی کی
(۱۵۱) اون پر وہ صالحہ (ن) دار انگیا | جلسے عجب ایک بناؤ پیدا
(۱۵۲) پورونپہ وہ خندقین بنائیں | جو حور و پری کے جی کو بھائیں
(۱۵۳) وھاں وہ تو دو کوی بال طاؤس | یہاں مد نکالا دست افسوس
(۱۵۴) القصہ بناو اوس کا کر خوب | ہوتا ہے جو بانکی زن کو مطلوب
(۱۵۵) اوس رشک پری کے جب وہ آئی | ایک حور پری کی گھر میں لائی
(۱۵۶) الفت نے جو اوسکی جوش مارا | وھاں سب سے جدا اوسے اتارا

---

(۱۴۱) ن خ ہوا - ن خ دیکھ وہ
(۱۴۹) ن خ میں شعر نمبر ۱۴۹ کے بعد شعر نمبر ۱۵۲ ہے - ن خ میں شعر ۱۵۲ حاشیہ پر درج ہے - غالباً نسخہ خ کی ترتیب صحیح ہے —
(۱۵۱) ن خ مسالہ

(۱۵۷) ایک حجرہ نفیس وفرش بمعقول قالین پہ ہزار رنگ کے پھول
(۱۵۸) وہ چاندنی اوسپہ رشک مہتاب ہو آئینہ جسکو (ن) دیکھہ سیماب
(۱۵۹) ایک گوشہ بچھا پلنگ سادہ گل تکیہ سرھانے دونہادہ
(۱۶۰) بے دخل کنار وبوس و آغوش ایک اوسپہ پڑا ہوا پلنگ پوش
(۱۶۱) شادیمیں ایدھراودھر وہ پریاں یہ تشنہ نظر نظارہ جویاں
(۱۶۲) انکھوں سے سرشک وصل جاری دل پر وہی جوش بیقراری
(۱۶۳) اوس عین خوشی میں هجر کا غم اجزاے نشاط وصل درہم
(۱۶۴) آجانا ایدھر اودھر سے اوسکا پاس اپنے فلک زدے کے تنہا
(۱۶۵) پھروہیں ٹھہر کے ایک دو دم کرنا اوسے غم کو غم میں مدغم
(۱۶۶) تھیں عمدہ زنان جو قوم کی وهاں تمکیں میں رهیں وہ اوسکی حیران
(۱۶۷) کہتی تھیں یہ بی بی ہے بہت دور دیکھی نہیں همنے ایسی مغرور
(۱۶۸) نہ حجرہ سے باهر آتی هے یہ نہ همکو وهاں بلاتی هے یہ
(۱۶۹) نہ هنستی هے اور نہ بولتی هے نہ عقدۂ دل کو کھولتی هے
(۱۷۰) خجلت نے دیا هے جام اس کو همدم سے هے اپنے کام اسکو
(۱۷۱) کرتی نہیں یہ گھمنڈ اسپر هم پاس بهی هے لباس و زیور
(۱۷۲) هر ایک کو جواب دے وہ عیار آئی دل شب اودهر بیکبار
(۱۷۳) چوسرکی دوبازی کھیلیں اوس سات بس اس هی میں کی سوکی کوئی یہ بات
(۱۷۴) تھا وصل سے بس کہ وہ نراسا اولٹا پڑتا تھا اوسکا پاسا
(۱۷۵) وهاں عرصۂ تنگ همدمی کو یہاں هارے هوئے یہ اپنے جی کو
(۱۷۶) اس امر محال پر نظر کر اس تنگ وصال پر نظر کر
(۱۷۷) پھر اوٹھہ گئی وهاں سے دے تسلی مجنوں نے کیا وداع لیلی

(۱۵۸) ن خ شکل

(۱۷۸) پھر اس کا کلیجہ منہ کو آیا — خون جگری نے جوش کھایا

(۱۷۹) آنکھوں سے گرے وہ اشک خونیں — جو اون سے ہوا بساط رنگین

(۱۸۰) اتنے میں پیام روز آیا — منھہ صبح وداع نے دیکھایا

(۱۸۱) زایل ہوئی وہ سیاہیء شب — تاریک ہوا وہ نور کوکب

(۱۸۲) انجم چھپے آفتاب نکلا — رخصت کا پڑا جو گھر میں غوغا

(۱۸۳) پہلے کر اوسی جواں کو رخصت — اوس نے بھی کیا وداع طاقت

(۱۸۴) ہو بازی چرخ سے مشوش — آپھی وہ جلی مثال آتش

(۱۸۵) بدنامی کا لاکے دل میں وسواس — ناموس کا اپنے یوں رکھا پاس

(۱۸۶) بعد اوس کے زنان قوم ساری — رخصت ہوئیں اوس سے باری باری

(۱۸۷) آشوب جو شب کا تھا ہوا کم — وہ رہ گئی اور گھر کے محرم

(۱۸۸) کر یاد وصال دوست روئی — محرم اوس کا ولے نہ کوئی

(۱۸۹) وہاں جو گیا تھا بادل زار — بستر پہ کراہی ہوکے بیمار

(۱۹۰) آئی جو ہواے اُنس اوسے راس — بھجوانے لگی اصیل اوس پاس

(۱۹۱) پردہ وہ حجاب کا ہوا دور — موصول ہوے یہ دونو مہجور

(۱۹۲) کہتے ہیں رہا وہ خستہ و زار — اوس سیج میں نو مہینے بیمار

(۱۹۳) آخر کو گذر گیا جہاں سے — دھو بیٹھا ہی ہاتھہ اپنی جاں سے

(۱۹۴) بے شربت وصل یار جانی — ہوئی اوس کو جو تلخ زندگانی

(۱۹۵) ٹوٹا جو یہ کوہ ہجر اوس پر — صحراے فراق میں کیا سر

(۱۹۶) پرسش کو اجل جو اوس کے آئی — ماں اوس کی نے سر پہ خاک اوڑائی

(۱۹۷) اوس گھر سے اوٹھی نواے ماتم — گھر ہوگیا اوس کا خانۂ غم

(۱۹۸) یعنی بفراق روئے دلدار — دنیا سے گیا وہ عاشق زار

(۱۹۹) ہمسائیو یار اور برادر — آئے جو یہ مرگ تازہ سنکر

(۲۰۰) جوں ابر بہار زار روئے — آہستہ (ن) نہ بل پکار روئے
(۲۰۱) ایک یار نے وہاں پچھاڑ کھائی — دندان زدہ اک نے کی کلائی
(۲۰۲) سر پیٹ کر ایک غش میں آیا — ایک سینہ زنی کا سانگ لا یا
(۲۰۳) ایک خستہ نے پیرہن کیا چاک — ایک روتے نے سر پہ ڈال لی خاک
(۲۰۴) جب آہ و فغاں ہوی فلک رس — آ صبر نے یوں کہا کہ بس بس
(۲۰۵) نہلا چکے اتنے میں جو غسال — پہنا کے کفن بھی اوس کو فی الحال
(۲۰۶) پھر بوریہ پر سے جو اٹھا یا — تابوت میں لاش کو لٹا یا
(۲۰۷) وارث چلے اوس کے بال زار — لے کر وہ جنازہ رو بہ بازار
(۲۰۸) تابوت پہ سبز ایک دوشالا — لا کر پے زیب و شان ڈالا
(۲۰۹) چادر پھولوں کی لہلہاتی — پھٹتی تھی صبا کی جس سے چھاتی
(۲۱۰) یوں سبز دوشالہ کی تھی تزئین — جس طرح کہ آسماں پہ پروین
(۲۱۱) تابوت کہ تختۂ چمن تھا — جس تختہ پر جوش نسترن تھا
(۲۱۲) پہونچا جو قریب (ن) کوئی معشوق — آئی اوسے وو ہیں بوئے معشوق
(۲۱۳) تابوت کش اور طرف (ن) رواں تھے — یہاں پاؤں میں رسی تواساں تھے
(۲۱۴) جاتے تھے کھچے اوسی گلی کو — تک دیکھیو جذب رفتگی کو (ن)
(۲۱۵) معشوق کا تھا جہاں در و بام — سنگین محل اوس مکاں کا تھا نام
(۲۱۶) پیش در خانۂ بت چین — جاکر کے ہوا جنازہ سنگین
(۲۱۷) تا دیر رہا وہ ہو گراں بار — حمالوں کی سر پہ بیستوں وار

---

(۲۰۰) ن خ ہوکر کھڑے داڑھیں مار وئے (۲۱۲) ن خ قرین (۲۱۳) ن خ سو
(۲۱۴) ن خ میں اس کے بعد یہ شعر ہے —
تابوت کے ساتھہ نوحہ کرتے — آخر سب اوسی گلی کوگذرے

(۲۱۸) از بس کہ ہجوم جزو و کل تھا　　اوس واقعہ سے گلی میں غل تھا
(۲۱۹) حیران تھے نظارگیء بازار　　بر وقفۂ مردۂ گرانبار
(۲۲۰) کھلتا ہی نہ تھا سبب کسی پر　　ہنگامہ تھا ایک اوس گلی پر
(۲۲۱) ہر گھر کے نظارگی دواں تھے　　مرد اور زن (ن) پیش و پس رواں تھے
(۲۲۲) پہونچی یہ خبر اوسے بھی جوہیں　　کر فصل وہ رشک ماہ و پروین
(۲۲۳) پردے پردے کے بیچ رو کر　　جان اپنی سے اپنے ہاتھ دھو کر
(۲۲۴) ہوی از رہ فرط بیقراری　　آمادۂ مرگ اختیاری
(۲۲۵) لے ہاتھہ میں پیش قبض شوہر　　آئی ایک بار کوٹھے اوپر
(۲۲۶) از بہر طواف کشتۂ خویش　　مشتاق تھی بس کہ وہ جگر ریش
(۲۲۷) گردن کو اوٹھا کے جوہیں جھانکا　　دیکھا کہ جنازہ ہے جواں کا
(۲۲۸) چلتا نہیں جا سے اڑ رہا ہے　　کہرام گلی میں پڑ رہا ہے
(۲۲۹) بس دیکھتے ہی اوسے بہر اک آہ　　مارا بشکم وہ دشنہ ناگاہ
(۲۳۰) تھا بدرقہ جوئے عاشق زار　　کیا بدرقہ مل گیا ہے ایک بار
(۲۳۱) جب خون میں تر ہوا وہ خنجر　　تھی رشک چمن وہ لالۂ تر
(۲۳۲) ملبوس جو اوس کا لالہ گوں تھا　　بے دشنہ ہی گرچہ غرق خون تھا
(۲۳۳) پر خون نے اور تہ چڑھادی　　اور آگ کو آگ سی لگادی
(۲۳۴) عمداً وہ موئی برائے عاشق　　روح اوس کی گئی قفائے عاشق
(۲۳۵) تھا گرچہ لباس اوس کا گل گوں　　تھی اوس سے زیادہ سرخی خون
(۲۳۶) افتادہ بخون وہ کوٹھے اوپر　　خاموش زبان بریدہ خنجر

---

(۲۲۱) ن خ مرد و زن

(۲۳۷) اتنے میں کسی نے جو دیا سرار (ن) جانا که کهلی لهو کی گلزار
(۲۳۸) نا گاه محل میں پڑ گیا غل یعنی که سوئی وه غیرت گل
(۲۳۹) دیکها جو اوسے در آب و آتش شوهر بهی بهت هوا مشوش
(۲۴۰) الفت کا جو راز تها گیا کهل خم هو گئے صد سر تا مل
(۲۴۱) یکبار اٹها جو شور و شیون گئے پردهٔ گوش اسمان چهن
(۲۴۲) تهی بام په غرق خون وه گلفام خورشید هو جیسے بر لب بام
(۲۴۳) همسایه بهی ره گئے عجب میں باقی تها کچهه ایک وصول سب (ن) میں
(۲۴۴) هر ایک وهاں جو پر عجب تها دندان کے ساتهه ربط لب تها
(۲۴۵) کهتے تهے که ان میں چاه هوئی مدت سے دلوں میں راه هو گئی
(۲۴۶) دے غسل اوسے هاتهوں هاتهه ایکبار اوس کا بهی کیا جنازه تیار
(۲۴۷) صندوق میں رکهه دفینهٔ عشق معلوم کیا قرینهٔ عشق
(۲۴۸) بازار میں اوس کو جب نکالا ملهه اپنا کیا فلک نے کالا
(۲۴۹) سقوں کی جلو میں آب پاشی تابوتوں په پهر گلاب پاشی
(۲۵۰) معشوق کا تها جنازهٔ در پیش پیچهے وه جنازهٔ جگر ریش
(۲۵۱) دونوں وه جنازے جب رواں تهے حیرت زده پیر اور جوان تهے
(۲۵۲) کهتے تهے یه طرفه ماجره هے کیا مرده نے زنده کر لیا هے
(۲۵۳) عاشق معشوق کا جو هے سات بس آج کهلی هے هم په یه بات
(۲۵۴) آخر کو اونهیں به تکیهٔ بهیم جا کرکے (ن) دیا بخاک تسلیم
(۲۵۵) تا شاه رهیں وه دونو غمناک یک چند میان خلوت خاک
(۲۵۶) یه عشق عظیم بیگ مرزا رکهتا تها (ن) جو عشق بیگماں کا

---

(۲۳۷) ن خ خوں بالسرار (۲۴۳) ن خ شب ۲۲۵ ن خ لوچها کے ن خ تها کشتهٔ حسن

(۲۵۷) اک طرفه فسانه هے جنوں خیز　　هر حرف هے جس کا وحشت انگیز
(۲۵۸) تها بس که گمان عیب سے پاک　　مدت سے رها تها اس کو میں تاک
(۲۵۹) ماه رمضان کی تیرهویں شب　　کر نظم اسے کیا مرتب
(۲۶۰) تاریخ رقم هوئی هے اس کی　　باره سے سولهه سن هجری
(۲۶۱) کی هے جو یه مثنوی میں ارقام　　گلزار شهادت اس کا هے نام
(۲۶۲) یه صنعت کلک مصحفی هے　　هر حرف میں اس کے ساحری هے
(۲۶۳)　　خوانندہ کو چاهیے جو هو شاد
سجهه کو بهی بفاتحه کرے یاد

~~§ * §~~

اُردو کے اَن پڑھ شعرا

از

[جناب مرزا فداعلی صاحب ' خنجر ' لکھنوی]

-()*()-

غلامی

" غلامی تخلص - درشاھجہاں آباد بود - از قوم اَرذل "

" بہ پیشۂ خبرداری نوکری داشت لیکن در فن شعر "

" بکمال بے خبری بسر می برد مگر طبع موزونے داشت "

" از تذکرہ میر حسن "

یہ شاعر بھی اُمی تھا اور کسی ادنیٰ طبقے سے متعلق - دھلی میں پیدا ھوا اور وھیں زندگی کے دن گذار دئیے - ھرکارہ یا جاسوسی کی خدمت انجام دے کر پیٹ پالتا تھا - شاعری کا عروج اور طبیعتیں ذوق سخن سے آشنا ھورھی تھیں - سچ تو یہ ھے اُن دنوں ھوا نے ذوق پاشی کا اثر پیدا کر لیا تھا - ھندو مسلمان ' یہود و نصارا لیلائے سخن کے والہ و شیدا ھو رھے تھے - گھر گھر سے نغمہ شعر و سخن بلند تھا - عالموں کی کون کہے جہلا بھی طبع آزمائی میں ھم عصروں سے پیچھے نہ تھے - اگر امرا کے کاشانوں میں نور سخن جگمگاھٹ اور چکاچوندہ پیدا کر رھا تھا تو غربا کے جھونپڑوں

میں بھی آفتاب شاعری کی شعاعیں ضیا بار دکھائی دیتی تھیں - پھر غلامی کا شوق سخن جائے عجب "کیوں ہو" ؟ اُس نے بھی دورِ حاضرہ کے بہاؤ میں بہنا شروع کیا -- افسوس ! اِس کے حالات بالکل دریافت نہ ہوئے میر حسن نے اِس کی نسبت بہتر رائے قائم نہیں کی -- اُن کی رائے ہمارے لئے چراغ ہدایت ہے -- پھر بھی اُسی ہونے کی جہت سے اُس کی سعی و کوشش اور ذوق فطری اِس قابل ہے کہ ہم اُسے داد دیں - اِس کے نام سے صرف ایک مطلع دیکھا گیا جو نمونۂ کلام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے —

سرخ لاتی ہیں نشے بیچ جو تورے آنکھیاں
دل زخمی پہ لگاتی ہیں تکورے آنکھیاں

غمگین

میر عبداللہ نام غمگین تخلص - میر حسین تسکین کے فرزند تھے جو سرکار رام پور کے دامن دولت سے وابستہ تھے - حسن مردانہ میں یوسف وقت ولاثانی تھے - عادات و اطوار پسندیدہ - مزاج میں انکسار و تواضع بکثرت - کس و ناکس سے جھک کے ملنا اور خندہ جبینی سے پیش آنا شعار تھا - جس صحبت میں جاتے عزت سے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے -- طبیعت مرنجِ مرنجاں واقع ہوئی تھی - احباب کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملنے پایا - شرم و حیا کی تو گویا مجسم تصویر تھے —

حب وطن نے دہلی سے کبھی قدم نکالنے کی اجازت نہ دی -

میر حسین " تسکین " کا قیام رام پور میں تھا جو " غمگین " کی تعلیم علمی کے نقصان کا باعث تھہرا اور یه علم کی طرف سے بالکل کورے رہ گئے لیکن شرافت خاندانی نے همیشه تہذیب و شائستگی کا پابند رکھا ۔ شاعری کا شوق بچپنے هی سے پیدا هوا ۔ گویا یه میر " تسکین ". کے خون کا اثر تھا ۔ پہلے بطور خود کہا کئے پھر اپنے والد سے مشورۂ سخن کرنے لگے ۔ فن لطیفه کے لئے طبیعت مناسب واقع هوئی تھی ۔ جو شعر نظم کے سانچے میں ڈھلتا فصاحت کی جان معلوم هوتا ۔ عنفوان شباب کے کیف اثر و لولوں نے رنگینی پیدا کردی ۔ متانت و سنجیدگی نے جا بجا نمایاں هو کر لطف شعر کو اور بھی دو بالا کردیا ۔ تھوڑی هی مشق میں وہ پختگی پیدا هو گئی جو دوسروں کو سالها سال کی محنت میں نصیب هوتی هے ۔ افسوس ! زندگی نے وفا نه کی اور یه جواں طبیعت شاعر عالم شباب میں میر حسین " تسکین " کو غم مفارقت سے بے تسکین و غمگین کر گیا ۔ بقول مولوی عبدالغفور خاں " نساخ " ان کا انتقال رام پور میں هوا ۔ واقعه یوں هے که ایک مرتبه دهلی میں رهتے رهتے طبیعت اچاٹ هوئی ۔ هم جلیسوں کی صحبت کا رنگ پھیکا پڑا ۔ خاک رام پور نے کشش کی اور اجل راهبر بنی یعنی " غمگین " وطن (دهلی) سے نکل کر عازم رام پور هوئے ۔ ان کے حسن صورت و حسن سیرت نے احباب کو گرویدہ کرلیا تھا ۔ سب کو ان کی مفارقت کا قلق هوا ۔ بعض بے تکلف احباب نے روکنا چاها لیکن یہاں تو قضا دامن گیر تھی ۔ کسی کی بات نه سنی اور اپنے والد میر حسین " تسکین " کی خدمت بابرکت میں حاضر هو گئے ۔ رام پور کی سکونت کو چند روز گذرے تھے که بیمار پڑے ۔ غم نصیب باپ نے تا مقدور دوڑ دھوپ کی لیکن موت سے زور

نہ چلا اور غمگین با دل غم زدہ رام پور میں پیوند زمیں ہوگئے - سدا جا تا ہے " غمگین " بڑے پر گو واقع ہوئے تھے - ایک دیوان غزلیات بھی جمع کر لیا تھا جو زمانہ کی نا مہری سے رواج نہ پاسکا - طراوش سخن کا اسلوب ملاحظہ ہو —

شور بختی نے مزہ زور چکھایا دل کو　　نالہ ' سو زخم جگر پر نمک افشاں نکلا

حشر میں فریاد کیا کرتا مجھے یاد آگیا　　قہر آلودہ نگہہ سے دیکھنا جلاد کا

وہ خبر ہی جانگزا تھی جس کو سن کر مر گیا　　ورنہ اک تیشہ سے ہوتا کام کیا فرہاد کا

ت نوح پہ طوفاں ہی آیا یارو !　　شکر یہ ہے کہ مرا دیدۂ خوں بار نہ تھا

ہر چند رشک ہے ' پہ بنی اب تو جان پر　　توہی صبا اُلٹ کہیں گوشہ نقاب کا

آتے زرا نہ اور تو مرہی چلے تھے ہم　　تم نے تو کہہ دیا کہ ہمیں کچھ خبر نہیں

عدو سے کیوں ہنسے تم جو اُٹھایا اس نے طوفان کو

بہانا ہوگیا رونے کا مہری چشم گریاں کو

کمی کریں جگر و دل تو کیا کروں یارب !　　کچھ اور دے مجھے مژگان خون فشاں کے لئے

اب آ - یو نہیں مرے سینے سے لگ جا　　گرہ وا ہو چکی بند قبا کی

چاہئے تھا میرے مرنے کا بہانا دل کو تم چلے روٹھ کے ' اب دیکھئے کیا ہوتا ہے



کی مری مٹی عزیزوں نے خراب ہائے ! لا کر خانۂ خمار و بیہ

فصاد

نور نام فصاد تخلص تھا - ایک حجام تھا جس کی زندگی کا آغاز و انجام دھلی میں ہوا - شاہ نصیر کا زمانہ پایا تھا - اکثر اُن کی خدمت میں حاضر رہتا - شاہ نصیر کے گرد دائرہ صد ہا شاگردوں کا ھجوم رہتا - ہر وقت شعر و شاعری کا چرچا ہوا کرتا - کوئی نؤ تصنیف غزل سناتا ' کوئی شعرائے وقت کے چیدہ چیدہ اشعار پڑھتا اور شاہ نصیر اُن منتخبات سے ہر ایک کی طبیعت اور ذوق سخن کا اندازہ کرتے - اِس صحبت میں فصاد کو بھی بیشتر نکات شعری سننے کا موقع ملتا اور اکثر باتیں حافظے میں محفوظ ہوتی جاتیں - آخر صحبت شعرا رنگ لائے بغیر نہ رہی - دل میں گدگدی شروع ہوئی - جذبات و حسیات ھمکے اور فصاد نے شعر گوئی کا آغاز کیا - پیشے کی مناسبت سے فصاد تخلص اختیار کیا - اِس فن لطیف کے لئے طبیعت بالکل ہی نا مناسب واقع ہوئی تھی اُس پر بے علمی المضاعف - بہت کچھ زور لگائے لیکن ذوق صحیح نہ پیدا ہونا تھا نہ ہوا - اس کی شاعری کا زیادہ تر حصہ تک بندی اور مہملات پر دلالت کرتا ہے - اُستاد کی اصلاح سے جو اشعار درست ہو گئے ہیں اُن میں بھی تخیل کی پستی نے پھیکا پن پیدا کر دیا ہے - نموتاً ایک شعر

درج تذکرہ ہوتا ہے :-

بادہ کے ہمیں پینے سے کیا کام ہے ساقی مئے خون جگر' آبلہ ہے جام ہمارا

فضل

فضل مولا خاں نام فضل تخلص - وحید العصر افضل الشعرا خطاب ہے جو ایک مدحیہ قصیدے کے صلے میں حضرت ظل سبحانی ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی المتخلص بہ " شعاع " بن شاہ عالم ثانی " آفتاب " کے دربار فیض آثار سے حاصل کیا تھا - ان کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی اور یہیں کھیل کود کر بچپنے کا زمانہ بسر کیا اور جوان ہوئے - ان غریب کے خاندان پر اوائل سے کچھ ایسی مصیبتیں نازل ہوئیں کہ یہ لکھ پڑھ نہ سکے - مگر نہایت خلیق و متواضع - پابند وضع اور بھی خواہ خاص و عام واقع ہوئے تھے - کبھی کسی کی برائی مد نظر نہ ہوتی - دوسروں کی امداد و استعانت کے واسطے درمے ' قدمے ' سخنے موجود رہتے - آفریں عالم کی بارگاہ سے کمال حسن صورت و وجاہت پائی تھی اُس پر جامہ زیبی بلا کی تھی - ہر وضع و ہر لباس غضب کا کھلتا - گویا میر عبدالحیٔ " تاباں " کی طرح ان کا حسن و جمال بھی مشہور آفاق تھا - ان خوبیوں اور اوصاف کے ساتھ ساتھ مغرورالمزاجی کا عیب بھی موجود تھا - ذرا ذرا سی بات میں روٹھ جانا اور غصہ کرنا تو کوئی بات ہی نہ تھی - اپنی ذات کو اول ترین ذات تصور کرتے اور دوسروں پہ فخر و مباہات کا اظہار ہوتا - اس نقص نے بیچارے کو ساری عمر

چین نہ لینے دیا - جہاں گئے وہاں والوں سے ان بن رہی اور ایک جگہہ اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا —

انھیں بارہ برس کے سن سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا تھا - اس فن کے لئے دل و دماغ بھی مناسب و موزوں ودیعت ہوا تھا - شعر کہتے اور خوب کہتے تھے - اس فن میں کسی مقامی شاعر کے شاگرد تھے - بہر نوع فضل ان پڑھ شاعر تھے اور اپنے ہم جنس شعرا میں پایہ امتیاز رکھتے تھے - جس طرح اور ان پڑھ شعرا حافظے کے تیز اور زود گو ہوتے ہیں ان میں یہ وصف نہ تھا - کم کم شعر گوئی کا اتفاق ہوتا - جو کچھہ کہتے کسی سے لکھوا لیتے - بعض اوقات ایسے وقت طبیعت حاضر ہوتی جب کوئی لکھنے والا نہ ہوتا تو اشعار حافظے سے اُتر جاتے - ان موقعوں پر ان کی جھلاہٹ دیکھنے کے قابل ہوتی - ان میں فصاحت کا عنصر بہت کافی تھا - جب باتوں کا لچھا باندھتے تو سننے والے الف لیلہ کی دلچسپ کہانیوں کو بھول جاتے - جس صحبت میں جاتے عزت کے ہاتھوں لئے جاتے - کبھی کبھی طبیعت داری اور مزاج کی شوخی بداخلاقی کا موجب ہو جاتی اور یہ دوسروں کے چیدہ اشعار بطور تفریح اپنے نام سے پڑھ دیا کرتے —

یہی وجہ ہے کہ تذکرہ نویسوں نے بالا تفاق ان کے اس عیب کو مشتہر کیا ہے —

انھوں نے ایک مرتبہ فکر معاش سے تنگ آکر لکھنؤ کو خیر باد کہا اور سامان سفر سے آراستہ ہوکر " دہلی " کا عزم کیا اُن دنوں شاہان مغلیہ کی حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا - ملک پر انگریزوں کا قبضہ تھا لیکن اورنگ حکمرانی پر ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی برائے نام جلوہ گستر

تھے - قلعہ کے باہر ایسٹ انڈیا کی حکومت اور قلعہ کے اندر بادشاہت کا دور دورا تھا - قدامت پرستی کے اُصول پر معمولاً دربار آراستہ ہوتا ' اراکین جمع ہوتے ' احکام نافذ اور انعامات و خطابات کی تقسیم ہوتی -

اکبر شاہ ثانی کو شاعری کا اتنا شوق تو نہ تھا جو اُن کے والد شاہ عالم ثانی " آفتاب " یا اُن کے خلف دوم بہادر شاہ " ظفر " کو تھا لیکن دستور قدیم کے موافق شاعروں کی قدردانی و حوصلہ افزائی فرماتے - گاہ بگاہ خود بھی مینائے سخن کا جام نوش کرتے - مقطع میں اپنا تخلص " شعاع " جو آفتاب کی مناسبت سے ہے نظم کرتے - اس فن میں فخرالشعرا میر نظام الدین ممنون کو شرف اصلاح عنایت ہوا تھا - شعرائے وقت میں شاہ نصیرالدین ' نصیر ' غالب علی خاں ' سید ' آشفتہ وغیرہم درباری شاعر تھے - اسی زمانے میں فضل بھی وارد دہلی ہوئے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ موزوں کرلیا تھا ' کوشش کرکے دربار میں رسائی پیدا کی - اگرچہ وہاں بھی بعض ان پڑہ شاعر موجود تھے لیکن ان کی شاعری اس حد پر نہ تھی جو فضل کے مقابلے میں لائی جاتی - ہر شاعر کو ان کی بے علمی اور پختہ کلامی پر تعجب تھا - خصوصاً دربار میں جب قصیدہ پڑھا تو لوگ حیرت زدہ ہوگئے ! شاہ اکبر نے ان کا کلام بے حد پسند کیا - قصیدے کے صلے میں خلعت فاخرہ اور وحیدالعصر افضل‌الشعرا خطاب عطا کرکے امتیاز و اعزاز بخشا - اس روز سے فضل بھی شعرائے دربار کے زمرے میں داخل ہوکر وظیفہ خوار ہوگئے لیکن وہی نقص لاف زنی جس کا مذکور ہوچکا ہے باعث بے لطفی ہوا - شعرائے دہلی نے ان کی باتوں کو نا پسند کیا اور آپس میں نزاع پیدا ہوئی جس کا خاتمہ فضل کے اخراج پر ہوا اور انہیں چار و ناچار ملازمت ترک

کرکے مرشدآباد کا طول و طویل سفر اختیار کرنا پڑا جہاں دہلی سے زیادہ قدر و منزلت ہوی - نواب ناظم نے فوراً خلعت و انعام دے کر درباری شعرا میں شامل کرلیا اور رفتہ رفتہ مصاحب خاص ہونے کی عزت حاصل ہوگئی - اطمینان ہوتے ہی انہیں زمین شعر میں مضامین تازہ بتازہ کے باغ اگانے کا کافی موقع ہاتھہ لگا - ہر عید بقر عید میں قصائیدہ کا صلہ پاتے اور سرکار نظامت کے عروج و ترقی کے لئے دست بہ دعا رہتے —

اس زمانے میں جانعالم 'اختر' متیا برج (کلکتہ) میں مقیم تھے - بیس ہزار سے زیادہ نمک خوار دامن دولت سے وابستہ تھے - برق' بحر' قلق' اسیر' یاور اور صدہا شعرا کا مجمع تھا - شاہزادوں کے یہاں مشاعرے منعقد ہوتے' شعر و سخن کا چرچا رہتا - مولوی عبدالغفور خان 'نساخ' بھی کلکتے ہی میں موجود تھے - فضل بھی گئے اور شعرا کے گروہ میں شعر خوانی کرکے داد کلام حاصل کی - وہاں کے اساتذہ سے صحبتیں رہیں بڑے بڑے معرکہ خیز مشاعروں میں شریک ہوئے - مولوی عبدالغفور خان 'نساخ' سے بھی مراسم دوستانہ پیدا کئے - جب تک کلکتے میں قیام رہا شعر و شاعری کا چرچا رہا - افسوس! اس ان بڑہ و خطاب یافتہ شاعر نے عین عالم شباب میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر عالم ہستی کو وداع کیا - اس سے زیادہ افسوس کے قابل یہ امر ہے کہ ایسے طبیعت دار شاعر کا کلام بھی دستبرد زمانہ سے تلف ہو گیا اور آج اس کی یاد تازہ کرنے کے لئے بجز ان چند بیتوں کے کچھہ نہیں جو ناظرین تذکرہ کی ضیافت طبع کے واسطے درج تذکرہ ہوتی ہیں —

کبھی تو چشم عنایت حضور کی ہوگی کبھی تو ہم بھی نکالیں گے حوصلہ دل کا

نکلا نہ اس کے دل سے ابھی تک غبار حیف　　　اے 'فضل' ! خاک قبر بھی برباد ہو چکی
لب وہ، کہ لعل کے بھی نگینے پہ حرف ہے　　　اودی و مسی اس کی، کہ مہندی پہ حرف ہے

صبح محشر بھی مجھے شام شب دیجور ہے　　　دل خیال زلف سے اس کی زبس رنجور ہے
کیا کرے عادت سے وہ بیچارہ خود مجبور ہے　　　جس جگہ دھا بیٹھتا، ناصح کو کچھ کہنا ضرور
چارہ گر کس کو نکالے، کس کو چھوڑے کیا کرے
ہر دہان زخم میں سوفار اک مستور ہے

ترکوں کی اسلامی خدمات

(ایک خطبہ جو جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد میں پڑھا گیا)

نوشتہ ڈاکٹر جولیس جرمانس

مترجمہ

مولوی سید وہاج الدین صاحب ، لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد

(ڈاکٹر جولیس جرمانس وی اینا یونیورسٹی میں علوم اسلامی کے پروفیسر ہیں - کچھ عرصہ ہوا ریاست حیدر آباد دکن کی طرف سے سر رابندر ناتھ ٹیگور کی درخواست پر ان کی یونیورسٹی شانتی نیکیتن میں اسلامیات کی ایک پروفیسری قائم کی گئی تھی - ڈاکٹر صاحب موصوف کی خدمات تین سال کے لئے سر رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی یونیورسٹی کے لئیے مستعار لیں - ڈاکٹر صاحب ترکی اور عربی زبانوں کے عالم اور اسلامی تہذیب و شائستگی اور مذہب کے ماہر دلدادہ ہیں - بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اچھے خاصے مسلمان ہیں - جامعۂ عثمانیہ کی درخواست پر انہوں نے تین توسیعی لکچر حیدرآباد میں دئے جو نہایت پسند کئے گئے اور بڑے شوق سے سنے گئے پہلے لکچر کو جس کا ترجمہ اس وقت شائع کیا جارہا ہے اگرچہ بظاہر رسالہ "اردو" کے مقاصد سے کوئی تعلق نہیں لیکن کسی قوم کی زبان و ادب کو بخوبی سمجھنے کے لئے اس کی نسلی حقیقت اور اس کے تمدن و تہذیب اور مذہب کا جاننا ضروری ہے - گویا یہ لکچر مقدمہ ہے آیندہ دو لکچروں کا جو ترکی زبان و ادب کے متعلق ہیں —

پروفیسر صاحب موصوف کی نظر اس مبحث میں بہت وسیع

اور فائز ہے اور انہوں نے ترکوں کے تمدن اور ان کی زبان و ادب کی کیفیت اس دلآویزی اور جامعیت کے ساتھ بیان فرمائی ہے کہ متعدد کتابوں کے پڑھنے کے بعد بھی یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی ۔ یہ گویا ڈاکٹر صاحب کے وسیع مطالعہ اور ایک مدت کے غور و خوض کا نچوڑ ہیں —

ہم ڈاکٹر جرمانس کے نہایت ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنی خاص عنایت سے ان لکچروں کا ترجمہ " اردو " میں شایع کرنے کی اجازت دی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ " اردو " کے ناظرین انہیں بڑے شوق اور غور سے مطالعہ فرمائیں گے اور ان معلومات سے مستفید ہونگے جو انہیں اردو میں تو کیا کسی دوسری زبان میں بھی اس طرح یکجا نہیں ملیں گی —

ان لکچروں کے عمدہ ترجمے کے لئے ناظرین کو مولوی سید وہاج الدین صاحب بی اے بی ٹی کا شکر گزار ہونا چاہئے جو ایسے وقت پر اکثر ہمارے کام آتے ہیں — [اڈیٹر اردو]

وسط ایشیا کا بے آب وگیاہ کوہستان جو ہمیشہ سے خانہ بدوش اقوام کی جولان گاہ رہا ہے ، غالباً ان نسلوں کا بھی اصلی وطن ہے جنہیں اگرچہ ہم عام طور پر ' ترک ' کہتے ہیں ، لیکن جو نسلی خد و خال اور عادات زندگی نیز اشتراک زبان کے اعتبار سے منگولوں سے بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں ، ان ترکوں کی تاریخ تحریری دستاویزات سے بھی قدیم تر ہے - اور انسانیاتی (Anthropological) اور لسانیاتی (Linguistic) حیثیت سے نسلوں کی جو تقسیم اور درجہ بندی کی گئی ہے ، اس سے بھی بہت پہلے ان کا اثر ایشیا کی تاریخ میں نظر آتا ہے -- چینی زبان کے تاریخی وقائع میں ، ہیں ان کا ذکر سنہ ۱۲۰۰ قبل مسیح

میں ملتا ہے ' اور دوسری صدی قبل مسیح ہی میں 'ہمیں ان کے گروہ چین کی شمالی سرحد پر تاخت و تاراج کرتے نظر آتے ہیں 'جو گویا ان کی آیندہ تاریخ کا پیش خیمہ تھا - یہ " ہیونگ نو " (Hiung - Nu) ' جو غالباً آگے چل کر از منہ وسطیٰ میں ہن (Huns) کہلائے ' اور " یوئن یوئن " (Yuen Yuen) جو شاید بعد میں " اوار " (Avar) اور تو کیو (Tu-kiu) کے ناموں سے معروف ہوئے ' جنگجو قبیلے تھے ' جو آپس میں متحد ہو کر کسی طاقتور سردار کی ماتحتی میں ' بیگانوں اور یگانوں دونوں کے خلاف لوٹ مار کیا کرتے تھے - اس زمانہ میں ان کے گروہوں میں کسی طرح کا قومی یا نسلی احساس موجود نہ تھا ' بلکہ ان من چلوں کی صفوں میں اکثر غیر ترکی عناصر بھی موجود رہا کرتے تھے ' اور ان کے دوش بدوش لڑتے تھے - چونکہ پاستانیوں کی طرح سے از منہ وسطیٰ کے باشندوں کے کان بھی باریک لسانیاتی فرقوں سے آشنا نہ تھے ' بلکہ وہ صرف دوسروں کے مسلک زندگی اور عادات و خصائل ہی پر توجہ کرتے اور انہی کی بنا پر ان کے نام مقرر کرتے تھے ' اس لئے ' بجائے اس کے کہ وہ لسانیاتی نقطہ نگاہ سے ان قبیلوں کا کوئی نام تجویز کرتے ' انھوں نے انھیں " سی تھی ین " (Scythians) یا " ہیونگ - نو " (Huing - nu) یا " ترک " کہا - ان قبائل کی کوئی مشترک زبان نہ تھی - " یورالی " (Uralian) " ایرانی " " منگولی " تینوں زبانیں ان کے جرگوں میں بولی جاتی تھیں - لیکن ان کی داخلی تنظیم ' اور ان کا ابتدائی مسلک آتش پرستی جس نے رفتہ رفتہ " شامانیت * (Shamanism) " بہ مت "

---

* ایک مذہبی فرقہ ہے ' جس میں سحر پرستی اور ارواح پرستی کی جاتی ہے ' یہ اب بھی وسطی اور مغربی ایشیا کے بعض حصوں میں پایا جاتا ہے - شامان روح اعلی ہے ' جس کے تابع دوسری ارواح خبیثہ ہوتی ہیں ۱۲ - مترجم

اور بعد کو "مسیحیت" اور اسلام کی شکل اختیار کی ' علاوہ بریں ان کی نسلوں میں نئے خون کی آمیزش اور پھر ان کی مخصوص خانہ بدوشی کی زندگی - یہ سب باتیں ان میں اور ایرانی آباد کاروں ' چین کے چاول بونے والوں ' ہندوؤں ' اور یورپ کے مسیحی آریاؤں کے درمیان مابہ الامتیاز تھیں - ان کی اس داخلی تنظیم کو ' جس کا مرکز ایک ایسا سردار ہوتا تھا جو اپنے ماتحت متعدد قبائل پر مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرتا تھا ' اور جس کی معاشی اور سیاسی حیثیت صرف یہ تھی کہ یہ لوگ زرخیز خطوں کی رعایا پر تصرف اور غلبہ حاصل کرکے انھیں تو صنعت و حرفت کے پر سکون مشاغل سپرد کر دیتے تھے اور خود اپنی توجہ تمامتر انتظامی امور پر مبذول کرتے تھے ' ہم تورانی تنظیم کہہ سکتے ہیں - واضح رہے کہ یہ لفظ تورانی کسی لسانیاتی مفہوم پر دلالت نہیں کرتا ' اس لئے کہ اس اصطلاح میں اکثر یورل الطائی (Ural - Altain) اور آرین باشندے بھی داخل تھے ' بلکہ ایرانیوں ' اور ان مستقل زندگی بسر کرنے والے شہری باشندوں کے بالمقابل جو اپنا ایک الگ مسلک ' اپنی علیحدہ دینیات اور اپنی ایک مخصوص معاشرتی تنظیم رکھتے تھے ' تورانیوں کی اصطلاح ان خانہ بدوش جرگوں پر حاوی ہے جو ہمیشہ ایک مرکز پر مجتمع ہوتے ' پھر بکھرتے ' پھر جمع ہوتے رہتے تھے ' اور جن کا اپنا کوئی خاص تمدن نہ تھا ' بلکہ جن باشندوں سے ان کا سابقہ رہتا تھا ان کے اجزائے تمدن کا ایک خاصہ معجون مرکب تھا - حکمران طبقہ کی زبان عموماً ترکی ہوتی تھی - گمان غالب یہ ہے کہ اٹیلا * (Attila)

---

* ہنوں کی جماعت کا سردار ' پانچویں صدی عیسوی میں گزرا ہے ' یہ لوٹ مار کرتا ہوا جرمنی اور فرانس تک پہونچ گیا تھا - ۱۲ - مترجم

بیان (Bayan) ' بلکہ شاید چنگیز خان کی مادری زبان بھی ترکی ھی تھی - اس کا ایک ثبوت یہ ھے کہ ان کے تمدن کے جو چند تحریری آثار آج تک موجود ھیں ' مثلاً وی اینا (Vienna) کے عجائب خانہ میں 'اٹیلا' کے سونے کے ظروف وغیرہ ' ان پر ترکی کتبے موجود ھیں ' اس کے علاوہ ' " اور خان " (Orkhan) اور ' ینی سی ' (Yenisey) کے کتبوں کی زبان بھی ترکی ھی ھے —

اپنی اسی حد درجہ بے چین اور سیال معاشرت ھی کی بدولت تورانی حدود چین سے لیکر مشرقی یورپ تک دھاوے مارتے رھتے تھے ' اور چونکہ اثر قبولیت بھی ان کی معاشرتی خصوصیت خاصہ تھی ' اس لئے انھوں نے تمام تمدنوں کا رنگ قبول کیا - نسطوری مسیحیت اور ایرانی مجوسیت کو چین تک پہونچانے والے یہی لوگ تھے ' خشکی کے راستہ چین اور ھندوستان کے درمیان آمد ورفت کا سلسلہ بھی انھی کی بدولت قائم ھوا ' اور آگے چل کر سر زمین یورپ میں اسلام کا بیج بونے والے بھی یہی ھوے —

ولادت مبارک آنحضرت صلعم کے زمانے میں یہ لوگ ' بازنطین ' (Byzantium) کو ' چین ' نے ریشم کی بر آمد کیا کرتے تھے ' اور اسی تجارت کی وجہ سے ان میں اور ایرانیوں میں تصادم ھوا ' انھوں نے ' بازنطین ' اور ' حبش ' کے ساتھہ سمجھوتا کرلیا - کتنی حیرت انگیز بات ھے کہ ' جاپان ' کے قدیم ترین بودھہ مت کے مندر مین ایرانی اشیاء موجود ھیں ' جنھیں ایشیاء پار لانے والے یقیناً یہی ترکی کاروان ھون گے —

تورانیون کی ریاستوں کی بنیاد ھمیشہ شخصی نفوذ اور سطوت پر ھوا کرتی تھی - چونکہ ان کے گروھوں میں دو براعظموں کے باشندے داخل تھے ' اس لئے انھوں نے کبھی بھی کوئی قومی شکل اختیار نہیں کی - لیکن اگر

کوئی اولوالعزم شخصیت نظر آجاتی تو اس کی اطاعت یہ لوگ دل و جان سے کرتے، اس کی ماتحتی میں ایک مرکز پر جمع ہوجاتے - اور ایک جری، اور جوان، اصول حرب کی ماہر ہستی کا خیمہ ہی سلطنتوں کا محور بن جاتا - ترک اطاعت اور قیادت دونوں کے گروں سے بخوبی واقف تھے، اور ایک باعزیمت ہستی کی کشش بات کی بات میں لاکھوں ترکوں کو مطیع اور فرمابردار بنا دیتی تھی - تورانی سلطنت کے انمل بے جوڑ عناصر کی شیرازہ بندی کرنے والی ہمیشہ کسی ایسے ہی صاحب قوت و ارادہ فرد کی ذات ہوا کرتی تھی، اور جب کبھی اس شخصیت کا اثر مٹتا، یا کوئی دوسری قوی تر شخصیت اس کی مد مقابل ہو جاتی، تو سلطنتیں جس آسانی سے بنی تھیں اسی سرعت کے ساتھ متزلزل ہو جاتیں، اور ان کی بنیادوں پر دوسری سلطنتیں قائم ہوجاتیں - تورانیوں کے مزاج پر ان کے مخصوص جغرافی طبعی حالات اور ان کی تاریخ کے نقوش اتنے گہرے بیٹھے ہیں کہ آسانی سے مٹ نہیں سکتے - چنانچہ آپ ان کی صدیوں کی تاریخ پڑھ جائیے، آپ یہی دیکھیں گے کہ تورانی باشندوں کی سیاسی تشکیل ہمیشہ ایک سی رہی ہے، یعنی مخوف آبادی پر مسلح معسکر کی حکومت، اور اس حکومت سے ہمیشہ ایک مرکب تمدن پیدا ہوا ہے، جو بجائے اس کے کہ قوم سے منسوب ہو، بانی خاندان کے نام سے معروف ہے - واقعہ یہ ہے کہ تورانی اقوام ہمیشہ بڑی بڑی شخصیتوں کے ناموں سے معروف رہی ہیں —

تورانی نوجوان ہمیشہ ایک زبردست "شخصیت" پیدا کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا - واضح رہے کہ شخصیت کا مفہوم ان کے یہاں ہندوؤں کی طرح سے گیان دھیان کرنے والی اور مادی دنیا کو تج کر ذات مطلق میں

ضم ہو جانیوالی ذات کا نہ تھا' شخصیت سے مراد ان کے یہاں' جنگجویانہ فعالیت ہوا کرتی تھی : یعنی فتح وتسخیر ' حکومت ' عمل ' اور اگر سیاسیات بھی ایک طرح کی فعالیت ہی ہے' تو ماننا پڑے گا کہ ترک پیدائشی سیاست دان تھے' اور ایک اکیلی ان کی قوم نے جتنی سلطنتوں کو مٹایا اور قائم کیا ہے ' اس کی نظیر دنیا کی کوئی اور سلطنت نہیں پیش کرسکتی - مثلاً ' سلجوقوں ہی کو دیکھہ لیجئے کہ وہ ایک غیر معروف خاندان کی حیثیت سے منصہ شہود پر آتے ہیں اور اپنی خوش بختی اور جانبازی کی بدولت تین سلطنتوں کو اپنے زیرنگیں کرلیتے ہیں- اور پھر ان کی مثال کو سامنے رکھکر ایک اور ترکی قبیلہ یعنی ' غزنوید ' ہندوستان میں اپنی سلطنت کا پایہ رکھتا ہے - ترکی سورما ہمیشہ ہر بطل اعظم کی صدا پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہتے تھے ' اور اگرچہ انھوں نے ' ایران ' ' شام ' ' ایشیاے کوچک ' ہندوستان ہر جگہ اپنی سلطنتیں قائم کیں ' لیکن اپنی قومیت کی طرف سے انھوں نے اتنی بیگانہ منشی برتی کہ ایرانی تمدن کو اختیار کرلیا اور ایرانی المذاق بن گئے- کیا بوالعجبی ہے کہ ' شاہ نامہ ' جس میں تورانیوں کے مقابلہ میں ان کے حریف ایرانیوں کے رزمیہ کارناموں کو زندہ جاوید بنایا گیا ہے ' ایک ترکی النسل بادشاہ کی سرپرستی میں لکھا جاتا ہے' اور ایشیاے کوچک کے سلجوق بادشاہوں کے محلوں میں فارسی کے اشعار آبدار کندہ نظر آتے ہیں!

یہ سلجوق ترکوں ہی کا کارنامہ ہے انھوں نے شام کے صلیبی مبارزوں کے مقابلہ میں عباسیہ کی زوال آمادہ سلطنت کو سنبھالے رکھا' اور ایشیاے کوچک

میں سلطنت قائم کی ' جس نے دو سو سال سے زیادہ عرصہ تک اسلامی تمدن کے بیج وہاں بوئے - " قونیہ " میں (جس کا قدیمی نام " آئی کونی " یم تھا) " سینٹ پال کے غاروں سے صرف چند ہی میل کے فاصلہ پر ایک سبز گنبد کے نیچے ' ایران کے بزرگ ترین شاعروں میں سے ایک شاعر - یعنی " مولانا جلال الدین رومی رح " دفن ہیں - سلجوقوں کے مدرسے اور محل ' جن کا طرز تعمیر ایرانی ہے ' اور بازنطینی یونانی فن تعمیر کی آمیزش لئے ہوے ہے ' آج تک ان کے اعلی اور شستہ مذاق اور علم و فن کی سر پرستی کی یاد تازہ کئے ہوے ہیں —

بازنطینی سلطنت ' جو مشرق میں مسیحیت کا بعید ترین ناکہ تھی ' فرقہ وارانہ جنگوں کی بلا میں گرفتار اور ایسی بد نظمی کا شکار تھی جس کی نظیر مشکل سے ملے گی جبری محصولوں ' دربار کی عیاشیوں اور سفارش گردیوں * نے اس سلطنت کی ' جس کا شمار کسی زمانے میں دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں ہوتا تھا ' ساری قوتوں کو چوس لیا تھا ' اور اگر یہہ اپنی سخت جانی سے ایک مدت دراز تک سنبھالے لیتی رہی ' تو اس کی وجہ یہہ نہ سمجھنا کہ اس میں اندرونی طور پر کچھہ جان باقی تھی ' بلکہ صرف رعایا کا جمود ' اور بعض جنگ جو قیصروں کی عارضی کوششیں اس کے ڈھچر کو سنبھالے ہوے تھیں - اس کا انجام بد یقینی تھا ' اور اس کے زرخیز علاقے اور بد دل باشندے خدا سے چاہتے تھے کہ کوئی فاتح آے اور ملک میں نظم و نسق

---

* ہم نے یہہ ترجمہ انگریزی لفظ Favouritism کا کیا ہے ' شاید سند قبول حاصل کرے ۱۲ مترجم —

اور ضبط قائم کرے —

منگولوں کے حملہ کی آندھی نے ' جو اسی قسم کی اور آندھیوں کی طرح ' " چین " کے حدود سے اُٹھی ' اور کوہ " ایلپس " تک بڑھتی چلی گئی ' سارے " ایشیا " کو تہ و بالا کر ڈالا ' کچھ قومیں تو بالکل ہی نیست و نابود ہوگئیں ' بعضوں کے پاؤں اکھڑ گئے ' ترکوں کے چھوٹے چھوٹے جرگے بھی ' جن کا تعلق " کے خان " (Kay khan) کے قبیلہ سے تھا ' اسی کی رو میں " کوہ قاف " کے پار ایشیاے کوچک تک پہونچ گئے ' یہاں پہونچکر انہوں نے " علاؤالدین کیقباد " سلجوق کے دربار میں پناہ لی ' جس نے ان کی خدمات کے صلہ میں انھیں " انگورہ " کے پاس متوطن ہونے کی اجازت دیدی - مزید خدمات کے معاوضہ میں ' ان کی جاگیروں میں اضافہ کیا گیا ' جو ایشیاے کوچک کے مغرب رخ واقع تھیں - " اناطولیہ " میں ' سلجوقیوں کی سلطنت کی آخری ساعت آن لگی تھی - جب منگولوں نے تازہ دم ہو کر اس پر دوبارہ تاخت شروع کی ' تو ماتحت امرا اور جاگیرداروں نے سلطنت کا ساتھ نہ دیا ' بلکہ اس تاک میں رہے کہ موقع ملتے ہی کچھ علاقہ دبا بیٹھیں - " کے خان لی " ترکوں نے بھی ایشیاے کوچک کے شمال مغربی سواحل پر یونانیوں کے کچھ قلعے تسخیر کر لئے ' اور کمال ہوشیاری کے ساتھ بعض مقامی عیسائی جاگیرداروں کے ساتھ ساز باز کر کے " عین گل " " بلے جیک " اور " یار حصار " پر قبضہ کر لیا - رفتہ رفتہ " کے خان لی " قبیلہ کا شمار زوال آمادہ سلجوقی سلطنت کے زبردست ترین جاگیرداروں میں ہونے لگا —

اپنے پیش رووں کی طرح ' جنھوں نے ایشیاے کوچک میں بود و باش

اختیار کرلی تھی ' " کے خان لی " بھی ترک ھی تھے ' البتہ ان کی بولی ذرا اُن سے مختلف تھی - ایک اور فرق یہہ تھا کہ سلاجقہ تو صدیوں سے اسلام لا چکے تھے ' لیکن یہہ نووارد ھنوز اپنے قدیم ' خانہ بدوشی کے زمانہ کے ' مسلک پر قائم تھے - ان کے سردار " ارطغرل " کے بیٹے " عثمان " کی شادی کے متعلق جو روایت مشہور ھے ' اس سے ھمارا یہہ قیاس حق بجانب ھے کہ انھوں نے ایشیاے کوچک کی اسلامی فضا میں داخل ھونے کے بعد اسلام قبول کیا - " عثمان " نے سنہ ۱۳۰۰ ع میں سلجوقی سلطنت کے جوے کو اتار پھینکا ' اور یونانیوں کو پسپا کرتا ھوا آگے بڑھا ' سنہ ۱۳۲۹ ع میں اس کا انتقال ھوا ' اور اس وقت اس کی سلطنت کی حدود جنوب میں " قتیہھ " شمال میں بحر " مار مورہ " اور " سقاریہ " اور " ادرانوس " کی وادیوں تک پھیلی ھوئی تھیں ' اور اس کی ساری قلمرو میں نظم و نسق بخوبی قائم ھو چکا تھا —

سلجوقیوں کے زوال کے بعد ' " قرامان اوغلو " ان کی مملکت کا وارث جائز بن بیٹھا تھا ' لیکن متعدد جاگیرداروں نے اس کی شہنشاھیت کو تسلیم نہیں کیا ' اور خود مختار ھوگئے - " اے دین " .. " سارو خاں " " منتشہ " " قرمیاں " اور کئی دوسرے باجگزار امیروں نے اپنے اپنے علاقوں میں اپنے الگ دربار جمالئے تھے ' وادیوں میں ترکمان قبائل گشت کرتے پھرتے تھے - چونکہ " عثمان لی " خاندان نے عروج پاکر شمال مغرب میں اپنی بنیادیں مستحکم کرلی تھیں ' اس لئے جغرافی محل وقوع کے اعتبار سے اسے اپنے دوسرے حریف قبائل پر تفوق حاصل تھا ' جو فوجی قوت کے اعتبار سے اس سے بڑھے ھوے تھے - " قرامان لیون " کا راستہ سمندر کی طرف بند تھا ' اور چونکہ وہ گرد و پیش حریفوں میں گھرے

ہوے تھے ' اس لئے ان کی حدود میں توسیع کی گنجائش نہ تھی ' باقی رہے ' " اے دین " " منتشہ " اور " قرمیان " کے قبا ئل ' تو ان کا محل وقوع سمندر کے بالکل نزدیک تھا ' اور اگر وہ ادھر ادھر ھاتھہ بڑھاتے ' توصلیبی مبارزین ان کی تعزیر کے لئے موجود تھے - '' عثمانی '' یا " عثمان لی " جو دوسرے ترکوں کی طرح سے' آئندہ اپنے بہادرسردار(عثمان) کےنام سے موسوم ہوے ' اناطولیہکے زرخیز ترین علاقوںمیں آباد تھے' اور بازنطینی سلطنت کے دارالسلطنت کے پڑوس ھی میں تھے - یورپ کے صوبجات تک ان کی رسائی بہت آسان تھی ' جہاں کی رعایا حکومت کے جبر و تعدی سے اس حد تک عاجز آگئی تھی کہ اب نہ تو ان میں مقاو مت کی تاب ھی تھی ' اور نہ اس کا کوئی خیال - ' عثمان ' اور اس کے جانشین ' اورخان ' اور ' مراد ' اگر چاھتے تو لالچ میں آکر ایشیاے کو چک کو بہت آسانی کے ساتھہ فتح کرلیتے اور سلجوقی سلطنت کے وارث بن سکتے تھے ' لیکن اس پالسی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انھیں اپنے حریفوں کے ساتھہ تباہ کن لڑائیاں لڑنی پڑتیں ' اور چونکہ ان کے پاس مشرق اور جنوب میں فوجی نقل و حرکت کے لئے کوئی مرکز نہ تھا ' اور نہ کوئی بیڑہ تھا ' اس لئے بازو کی طرف سے آکر ایجین (Aegian) ترک انھیں گھیر لیتے ' غرض کہ یہ پالسی عثمانی خاندان کے حق میں پیام مرگ ثابت ہوتی - سلجوقیوں کے دارالسلطنت کا محل و قوع ' یعنی ایک طرف بحیرہ ' مارمورا ' اور دوسری طرف وسط ' اناطولیہ' کا کوھستان - ایسا تھا کہ اگر کوئی اسے فتح کرنا چاھتا تو اسے چکر کاٹ کر آنا پڑتا - غرض کہ مشرق کی طرف کے حریفوں سے بے خدشہ ہوکر ' عثمان لیون نےبلقان کو اپنی تگ وتاز کا مرکز قرار دیا - بہت پہلے ھی ' یعنی سنہ ۱۳۶۶ ع میں ' وہ دھاوے مارتے اور لوٹ مار کرتے ہوئے دریاے ' ڈینیوب ' کے نشیبی حصہ تک پہونچ چکے تھے اور ' لوی آت آن ژو ' کو

اس بری طرح شکست دے چکے تھے کہ وہ بمشکل اپنی جان سلامت لیکر بھاگ سکا تھا - 'فلپا پولس' اور 'ادرنہ' اس سے بھی چند سال پہلے * ان کے ھاتھہ میں آچکے تھے —

'بروسا' صرف چالیس سال تک اس نوخیز سلطنت کا دارالخلافہ رہا' اور اس کے بعد مرکز ثقل جزیرہ نمائے بلقان کی طرف منتقل کردیا گیا جہاں 'ادرنہ' ان کا دارالخلافہ قرار پایا - اس کار روائی نے 'یورپ' کو سراسیمہ کردیا' اور وہ بدحواس ہوکر عثمانیوں کو نکالنے کے لئے فوجیں جمع کرنے لگا' لیکن دوسری طرف ان کے ایشیائی حریفوں کو اس کا گمان بھی نہ تھا کہ یہ (ترک) آئندہ چل کر ان کے حق میں کتنے خطرناک ثابت ہوں گے' اور وہ ان کی طرف سے بالکل مطمئن تھے - یہاں تک کہ سنہ ۱۴۵۳ م میں' 'قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد' 'سلطان محمد فاتح' نے اپنی ظفر یاب عساکر کی عنان اناطولی حکمرانوں کی طرف بھی پھیر دی —

عثمانی فتح و ظفر کا یہ سیلاب بے مزاحمت برابر آگے بڑھتا گیا سنہ ۱۴۹۲ ع میں انھوں نے 'استیریا' + (Styria) کو تاخت و تاراج کیا' اور اس طرح اگر ایک طرف 'اندلس میں اسلام کا آخری مرکز' مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا' تو دوسری طرف اسی زمانے میں ترکوں نے اپنی فتوحات سے اس کی بخوبی تلافی کردی - ادھر 'اندلس' میں مور جنگ 'توروز' (Tours) میں ہزیمت اٹھانے کے بعد 'ھسپانیہ' کے قصبوں میں منتشر

---

* 'سلطان مراد اول' نے 'ادرنہ' سنہ ۱۳۶۱ع میں تسخیر کیا تھا اور سنہ ۱۴۵۳ع میں فتح 'قسطنطنیہ' کے زمانے تک یہی مقام ترکوں کا دارالخلافہ رہا — ۱۲ - مترجم -

+ یہ سلطنت آسٹریا کا ایک صوبہ تھا - ۱۲ مترجم -

ہوکر اسلامی تعلیم کے فروغ و نشو و نما میں مشغول تھے، ادھر مشرق میں یورپ کا نیا دشمن، یلغار کرتا ہوا 'وی اینا' (Vienna) کے دروازوں، بحیرۂ اوقیانوس اور بحیرۂ اسود کے شمالی سواحل تک بڑھ گیا تھا، خصوصاً 'فتح مصر' کے بعد تو ترکی سلاطین کے کلاہ تفاخر میں "خادم الحرمین الشریفین" کا طرۂ امتیاز بھی لگ چکا تھا - غرض کہ دو صدی کے اندر اندر، ایک چھوٹے سے دیہاتی قبیلہ نے یہ عروج حاصل کیا کہ اب اس کا شمار دول عالم میں ہونے لگا تھا، اور اس کی سلطنت اپنی وسعت، قدرتی وسائل کی مالا مالی اور تمدن کی بوقلمونی کے اعتبار سے تاریخ عالم کی بزرگ ترین سلطنتوں کی ہم پایہ ہو چکی تھی - اگرچہ مذہبی اور تمدنی حیثیت سے سلطنت ترکی اسلامی تھی، لیکن وسط ایشیا کے خانہ بدوشوں کی ساری خو بو اس میں موجود تھی - اس کی رعایا میں یونانی، کرد، ایرانی، عرب، البانی، سلاوی، ہنگروی، جرمن غرض کہ سب ہی ملکوں اور ملتوں کے باشندے داخل تھے - ترک کا نام ہی ہیبت پیدا کردینے کے لئے کافی تھا، اور انھیں شکست دینا یا ان کی قوت کو تباہ کرنا ایک ناممکن امر سمجھا جاتا تھا - لیکن جو چیز انسانی کوششوں کے لئے امر محال تھی، زمانہ کے ہاتھوں پوری ہوکر رہی، امتداد زمانہ اور تورانی نظام حکومت کی اندرونی خامیاں ترکوں کی قوت کو توڑ کر رہیں - سنہ ۱۶۰۰ ع وہ زمانہ تھا جب کہ عثمانی شوکت و عظمت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، لیکن ایک صدی بعد ہی اس کا زوال شروع ہوگیا تھا - 'ہنگری' کے صوبجات ان کے قبضہ سے نکل چکے تھے، اور اس کے بعد سے جلد جلد اور پے در پے ناکامیوں اور ہزیمتوں کا سلسلہ کچھ اس طرح شروع ہوا کہ بدنصیب ترکی مدبروں کی نالایقی کو موردالزام ٹھہرانا، یا دشمنوں کی اعلیٰ قابلیت

اور حسن تدبیر کو اس کا سبب قرار دینا درست نہیں معلوم ہوتا ، بلکہ ماننا پڑتا ہے کہ اصل میں یہ مرض نظم سلطنت کا تھا ۔ جس کی معاشرت ، طرز حکومت، اور اصلی روح کو گھن لگ گیا تھا ۔ چونکہ ہم ایک ایسی سلطنت سے بحث کر رہے ہیں جو یورپ کی دشمن تھی ، اس لئے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کون سے اسباب تھے ، جنھوں نے عثمانیوں کے مقابلہ میں یورپ کو ضعیف کردیا تھا ، اور پھر کون سے اسباب اٹھارویں انیسویں صدی عیسوی میں اس کے (یورپ) از سر نو عروج کے محرک ہوے —

یورپ کے ضعف کے اسباب کچھہ داخلی تھے ، اور کچھہ خارجی ۔ اپنے عروج کے زمانہ میں ترکوں نے جن قوموں سے لڑائیاں لڑیں ۔ ان کے مقابلہ میں خود ان کا (ترکوں کا) محل وقوع حربی نقطہ نگاہ سے بہت بہتر اور مفید مطلب تھا ، اور پھر ان قوموں کی سلطنت کے کل پرزے بالکل فرسودہ ہو چکے تھے ، اور وہ مساوی تعداد کی فوجوں سے بھی ، ترکوں کی زیادہ مسلح اور زیادہ جوشیلی سپاہ کا مقابلہ نہ کرسکتے تھے ۔ مسیحی یورپ آپس کے نفاق کا شکار بنا ہوا تھا ۔ بلقان کی چھوٹی چھوٹی ہمسایہ سلطنتیں ایک دوسرے پر خار کھاتی تھیں ، اور جب کبھی ان کی متحدہ فوجیں میدان جنگ میں ترکوں کے مقابلہ کے لئے اتریں ، تو دمی مرتبہ بری طرح سے شکست کھائی ۔ حد تھی کہ سارا یورپ چالیس ہزار باقاعدہ فوج بھی ترکوں کے مقابلہ کے لئے میدان میں نہ لاسکتا تھا ، جن کی جانثاری افواج کے متعلق یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ان سے بڑھکر میدان کا دھنی یورپ میں اور کوئی نہیں ہے ۔ یورپ کے جاگیری نظام نے سلطنتوں کی مرکزیت کو توڑ کر ، ان میں ضعف پیدا کردیا تھا ، مغرور اور سرکش امرا قوت پکڑ چکے تھے ، اور سلطنتوں کی پالیسی ، اور حربی کار روائیوں کا انحصار

صرف انہیں امرا کے رحم و کرم پر رہ گیا تھا، جو لڑائی کو قوموں کی زیست و موت کا سوال نہیں، بلکہ صرف جھوٹ دکھانے کا ایک مشغلہ سمجھتے تھے۔ ان کے مقابلے میں ترکی عساکر کی جان، "جانثاری" تھے، جو فطرتاً جیالے، فوجی ضبط کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے، سخت مزاج اور بہادر افسروں کے سدھائے ہوئے کار آزمودہ سپاہی تھے، اور کٹھ پتلیوں کی طرح ترکی سلطان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ تورانی تہذیب جتائی پچکلیاں تھی اتنی ہی ان کی فوجی قابلیت اور فنون جنگ بر محل اور مناسب موقع ہوا کرتے تھے۔ اگرچہ وسط ایشیا کے گیارہ زاروں کے حربی اصول اصل میں قدیم ایرانی حربیات سے ماخوذ تھے، لیکن ترک، چونکہ پیدائشی سپاہی تھے، اس لئے ان کی تیز نگاہیں بدلے ہوئے حالات کو فوراً تاڑ لیتی تھیں، اور نئی نئی ایجادوں، یا نئے نئے حالات کے اقتضاء سے وہ فوراً اپنے فنون جنگ میں بھی رد و بدل کردیا کرتے تھے۔ ترکی فوج کے پاس سارے یورپ کے مقابلے میں جدید ترین اسلحہ موجود تھے، حالانکہ جس واحد یورپی سلطنت پر انھوں نے حملہ کیا، اس کا ساز و سامان صرف تھوڑا بہت جدید تھا۔ انھوں نے توپ خانے کی اھمیت اور ضرورت کو بھی بہت جلد سمجھہ لیا تھا، اور مختلف دھانے کی توپیں ڈھالنے میں ایسا کمال دکھلایا تھا کہ کوئی قلعہ ان کی تباہ کن گولے باری کی تاب نہ لاسکتا تھا۔ قسطنطنیہ کے محاصرے میں انھوں نے ۶۵ سنٹی میٹر دھانے کی برنجی توپیں استعمال کی تھیں۔ مشرقی یورپ کے تمام قلعے صرف سواروں کے حملے اور ھلکی توپوں کی گولہ باری کی رعایت سے بنائے گئے تھے، اور اسی غرض سے ان کی دیواریں سیدھی اور اونچی رکھی گئی تھیں، لیکن ترکوں کی بھاری توپوں کو دیکھکر، سولھویں صدی کے آخر زمانے میں نئے اصولوں پر قلعوں کی تعمیر

ہونے لگی، یعنی ان کی فصیلیں ڈھلواں اور توپیں بنائی جانے لگیں۔ ان فنی حیثیتوں سے بڑھے ہوے ہونے کے علاوہ، ترک جوش شجاعت میں بھی یورپ والوں سے بمراتب زیادہ تھے، ہر فتح کے بعد ان کی ہمتیں بلند تر ہو جاتی تھیں، مال غنیمت ان کے ہاتھ آتا تھا، اور جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ ان میں جوش زن ہو جاتا تھا۔ ترکوں کی پے در پے فتوحات میں، اسلام اور اس کی مجاہدانہ تاثیر کا بہت کچھ دخل تھا۔ پہلے وہ بت پرستوں کی حیثیت سے محض غارت گری اور نام آوری کے خیال سے لڑا کرتے تھے، لیکن اسلامی تبلیغ و اشاعت کے بعد جوہر ایمان کی آمیزش سے ان کی شجاعت کا ایک اخلاقی نصب العین پیدا ہو گیا تھا، اور اس سے ان کی جنگ جوی کے جوہر اور کھلتے تھے۔ ان کے شروع زمانے کے سلاطین کی تربیت بھی معسکر کی سادہ اور صحت بخش فضا میں ہوئی تھی، ان کے خمیر میں بھی، اپنے سپاہیوں کی طرح، شجاعت اور بسالت کے جوہر موجود تھے، اور ان کی حربی قابلیت بھی اپنے تمام ہم عصر بادشاہوں سے کہیں زیادہ تھی —

جب ترکوں نے اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا، تو انہیں صرف زوال پذیر بازنطینی سلطنت اور ریاست ہاے بلقان ہی سے مقابلہ کرنا پڑا تھا، لیکن جب وسعت حدود کے اعتبار سے عثمانی قوت اپنے پورے عروج پر پہونچی، تو اب اسے متعدد قوی تر دشمنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حربی نقطہ نظر سے اب اس کا محل وقوع بھی کمزور ہو گیا تھا، اس لئے کہ جیسے جیسے حدود سلطنت 'اناطولیہ' سے دور ہوتی گئیں سلسلۂ رسل و رسائل طویل ہوتا گیا۔ اُدھر، سترویں صدی میں یورپ بھی ایک نیا جنم لے چکا تھا۔ نئی نئی ایجادیں اور اکتشافات ہو چکے تھے، تحقیق کے علمی

اصول بن چکے تھے ، جنگ ہائے اصلاح (Wars of Reformation) ختم ہوچکیں تھیں ، قومی احساسات رکھنے والی مستقل قومی سلطنتیں مستحکم ہوچکی تھیں ، اور از منہ وسطی کے دور جاگیریت کے کم مایہ اور نیم علم افراد کی بجائے ، اب یورپ والوں کی ایک قابل نسل پیدا ہوچکی تھی - سلطنتوں کے آپس کے سمجھوتوں اور صلح ناموں نے لشکر آرائی کا راستہ کھول دیا تھا ، اور اب باقاعدہ یورپی فوجیں ، جو فنی حیثیت سے اعلی درجہ کی اور روحانی اعتبار سے ترقی یافتہ ہوچکی تھیں ، ترکوں کے حق میں خطر ناک اور نا قابل تسخیر دشمن بن گئی تھیں - سترھویں صدی میں امریکہ کی دریافت ، اور اس کی پیداوار کی خرید و فروخت نے بحیرہ قلزم کی بجائے بحر اوقیانوس کو دنیا کی تجارت کا راستہ بنا دیا تھا - افریقہ کا چکر کاٹ کر جانے ' اور دنیا کی تجارتی گزرگاہوں میں تبدیلی ہو جانے کی وجہ سے ترکی کی ترقی میں بہت کچھہ خلل واقع ہوا ، اس لئے کہ اب وہ ، ایک اعتبار سے ، ترقی یافتہ قوموں کے ربط و اختلاط سے محروم ہو گیا - مذکورۂ بالا اسباب نے ترکی کی طرح ، اٹلی کو بھی اقتصادی حیثیت سے نقصان پہونچایا ، لیکن اس نے پھر بھی اپنی تہذیب اور تمدن کے سرمایہ کو محفوظ رکھا ، بلکہ اس کی توقیر بھی کی ، لیکن ترکی میں ، جیسے ہی فتوحات کا سلسلہ بند ہوا ' ویسے ہی وہ اپنی مفتوحہ طباع قوموں کے تہذیبی سرمایہ سے بھی محروم ہو گیا ، اور اس کا تمدنی ارتقاء رک گیا -- وہ دنیا سے الگ تھلگ اور نئے ترقی یافتہ خیالات سے محروم ہو گیا ' چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کو تو ان جدید خیالات نے ہمیشہ نئی زندگی بخشی ' اور اسے مشرقی تہذیبوں

کے تقابلی مطالعہ پر آمادہ رکھا ' لیکن ترکی انہیں فرسودہ نظامات کا پابند ' اور انہیں بوسیدہ ادارات کو سنبھالے رہا - یورپ نے تو اصلاح کے بعد سے توہمانہ اور ملایانہ خیالات کو بالائے طاق رکھہ دیا ' لیکن ترکی ایک ایسے مخصوص مراعات رکھنے والے طبقہ کا شکار بن گیا ' جس نے اسلام سے ارتقاء کی روح کو سلب کرنے کی کوشش کی —

جن داخلی اسباب نے ترکی کو کمزور بنایا ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جیسے جیسے اس کی حدود میں توسیع ہوتی گئی ' ویسے ویسے رسل و رسائل کے طویل سلسلوں کی کماحقہ نگرانی ناممکن ہوتی گئی ' اور سرحدی مقامات کے ساتھہ سلسلہ اخبار و اطلاعات برقرار رکھنے کے لئے بعض درمیانی علاقوں کو ایک طرح کی نیم خود مختاری دیدی گئی ' مثلاً "گریمیا" "والیشیا" اور "هنگری" ان کے علاوہ ' "عرب" شمالی "افریقہ" "مصر" "طرابلس" اور الجزائر ' نیم خود مختار صوبجات تھے - ان صوبجات کا علاقہ وطنی حکومت ' یعنی ایشیائے کوچک کے ساتھہ کچھہ زیادہ استوار نہ تھا - جیسے جیسے سلطنت بڑھتی گئي ' اس کے باشندوں کی قومیتوں اور مذہبوں کی بوقلمونی بھی زیادہ ہوتی گئی ' جن میں اور حکمران قوم میں کوئی وجہ اشتراک نہ تھی ' اور اندرونی ناچاقیوں اور شورشوں نے هیئت سیاسیہ کو کمزور کرنا شروع کردیا — '

سلطنت ترکیہ کے اختلال کا خاص الخاص سبب اس حس حکمرانی یا ملکہ بادشاہی کا زوال تھا ' جو پہلے حکمران کی شخصیت میں مجسم بن کر ظاہر ہوا کرتا تھا - ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ تورانی سلطنت کا مدار تمام و کمال شخصیت پر ہوتا تھا ' اور اس قسم کا نظام حکومت ' بہت آسانی

کے ساتھہ مذہب اسلام سے میل کھا سکتا تھا' اس لئے کہ اگرچہ اسلام کی اصلی روح جمہوریت ھی ھے' لیکن ساتھہ ھی ساتھہ مطلق العنان بادشاھوں کا ریاست کے جملہ عاملانہ اختیارات کو اپنی ذات واحد میں جمع کر لینا بھی اسلامی اصول کے منافی نہیں ھے - خلیفہ بحیثیت اعلی ترین محافظ شریعت کے - اور سلطان بحیثیت ترکوں کے ارضی حکمران کے' ان دونوں فرائض کے ایک ذات میں جمع ھو جانے کی وجہ سے ترکی سلطان کی شخصیت بمراتب زیادہ ھو گئی تھی' وہ سلطنت کا مالک تھا اور ساری رعایا اس کی حلقہ بگوش تھی - ھیئت سیاسیہ کی تنظیم سے تو ھم بعد میں بحث کریں گے - سردست اسی قدر کہہ دینا کافی ھے کہ حکمران کی قوت میں ضعف کے نمودار ھوتے ھی یہ سارا ڈھچر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگا - سلطان سلیم "مست" کے زمانہ تک جتنے بڑے بڑے سلاطین گزرے' وہ سب کے سب جوان اور جنگ جو بادشاہ تھے' جو نظم و نسق مملکت کی باگ اپنے ھاتھہ میں مضبوطی سے لئے رہتے تھے اور بہ نفس نفیس جنگی کار روائیاں کیا کرتے تھے -- لیکن "سلیم" کے بعد جو آٹھہ سلاطین یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے' ان میں سے پانچ تو کسی فوجی مہم میں شریک تک نہ ھوے' بلکہ رعایا سے روپوش ھو کر حرم سرا کے اندر رھنے لگے - ان کے ولی عہدوں اور شہزادوں کو شروع میں تو سازش کے ڈر سے قتل کر دیا جاتا تھا' لیکن بعد کو انھیں عمر قید دی جانے لگی - ان میں سے بعض' آئندہ چل کر تخت نشین ھوے' لیکن چونکہ ان کی ساری زندگی خواجہ سراؤں اور دوسرے غیر ذمہ دار جلیسوں کی صحبت میں گزری تھی' اس لئے ان میں سلطنت کا بار گراں اٹھانے کی اھلیت مطلق باقی نہ رھی تھی - سلاطین' خائن عہدہ داروں کے ھاتھہ میں نری کٹھہ پتلیاں تھے -

رشوت، سازش، غیبت، ان سب کا اثر محل سرا تک پہونچنے لگا تھا، اور صوبجات کے والیوں نے مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر، ہر ناجائز طریقہ سے دونوں ہاتوں سے دولت سمیٹنی شروع کردی تھی - غرض باز نطینی سلطنت کی ساری شامتیں اور عیاشیاں اس لاجواب ہیئت سیاسیہ پر مسلط ہوگئیں جسے ابتدائی سلاطین نے اپنی قابلیت سے قائم کیا تھا، اور ترکی قوم نے جس سلطنت کو اپنے خون سے سینچا تھا، اس کی بنیادیں کھوکھلی ہوگئیں - نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کی توسیع یک لخت بند ہوگئی، علاقوں پر علاقے ہاتھ سے نکلنے لگے، جس سے خزانہ شاہی میں تشویش انگیز کمی واقع ہونے لگی، لیکن نا عاقبت اندیش اور رنگین مزاج عمال سرکاری کے حلقوں میں بدستور رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں- بغاوتوں، شکستوں، اور تاوانوں کی گرانباری نے غریب رعایا کو، جس کی مصیبتیں دن بدن بڑھتی جاتی تھیں، پیس ڈالا - جان نثاری افواج بھی، جو ہمیشہ سے فوج کی جان اور ترکوں کی فتح کی ضامن تھیں، بکتاشیوں اور دوسرے شورہ پشت عناصر کے ساتھ جاملیں، اور ملک کے امن و امان کے حق میں دشمن ثابت ہونے لگیں، یہاں تک سلطان محمود ثانی نے جو ایک مصلح اعظم تھا، انھیں نیست و نا بود کر ڈالا - سلطنت کا نظم و نسق، خواہ بہتر سے بہتر طریقہ ہی پر کیوں نہ کیا جاتا، لیکن فرسودہ اور از کار رفتہ ہوچکا تھا، اور تنگ نظر اور قدامت پرست رعایا اور خائن عمال کی مخالفت کی وجہ سے اسے توڑنا اور اس کی جگہ بہتر اور مفید تر نظام قائم کرنا ممکن نہ تھا —

معاشرت کے اعلیٰ طبقوں سے ہوتا ہوا یہ اندرونی مرض آہستہ آہستہ ادنیٰ طبقوں میں سرایت کرتا گیا - اور صدیوں تک ترکی سوسائٹی نے اخلاقی کش مکش کی وہ سختیاں اٹھائیں کہ کوئی اور قوم اس طرح ٹھنڈے دل سے اسے گوارا نہ کرتی، نظم و نسق نے بد سے بدتر صورت اختیار کی، ترکی جنرلوں کے دامن تک رشوت ستانی کے دھبہ سے آلودہ ہوگئے، لیکن آفریں ہے ترکی قوم کو کہ ان کی معصوم سادگی اور اور دیانت میں آج تک فرق نہیں آیا ! —

عثمانی تہذیب کی خصوصیت خاصہ اور اس کے اجزا کیا تھے ؟ ہم دیکھہ چکے ہیں کہ جیسے جیسے وہ وسط ایشیا سے مغرب کی طرف بڑھتے گئے' جن جن باشندوں سے ان کا سابقہ پڑا' ان کی تہذیب انھوں نے اختیار کی - اسلام کی عجمی شکل' نیز شیعیت اور "صوفیت" نے' جن کے گروہ اسی زمانے میں منظم ہوچکے تھے' ترکوں کے تخیلات کو اپنی طرف کھینچا - ایشیاے کوچک صدیوں سے مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کا سنگم رہ چکا تھا - تو ہم پرستی کے زمانہ کے باقیات' بازنطینی' یونانی اور سلجوقی ایرانی تہذیبوں کے اجزا خلط ملط ہوکر ایک ایسا طرفہ معجون بن گئے تھے' جس کے اجزاے ترکیبی کی تحلیل تو ممکن ہے' لیکن جو خود محض ان مفرد اجزا کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک دوسری ہی چیز ہوکر رہ گیا ہے - ایشیاے کوچک سلجوقیوں ہی کے زمانہ میں ترکی رنگ میں رنگا جاچکا تھا' اور 'کے خاں لی' نو واردوں کو جن کی کل تعداد بمشکل دو ہزار سواروں سے زیادہ ہوگی' اپنی فوجی مہموں اور نئے مفتوحہ علاقوں کو بسانے کے لئے ہمیشہ کافی تعداد میں ترک مل سکتے تھے - تعداد ازدواج کے دستور نے بھی ترکوں کو بڑا فائدہ پہونچایا' اس لئے کہ مسلسل جنگوں میں انسانی جانوں کی جو زبردست قربانیاں انھیں دینی پڑیں' اس کی تلافی اضافہ آبادي سے ہوجاتی تھی - لیکن اس کے باوجود ترکی قوم آج تک یہ نہ کرسکی کہ اپنے علاقوں کواپنےہم قوموں سے آباد کردے' یا وہاں کی رعایا کو اپنی قومیت کے اندر جذب کرلے —

ترکی ہیئت سیاسیہ کا شروع ہی سے یہ خاصہ رہا ہے کہ حکمران طبقہ جمہور سے بالکل الگ تھلگ رہتا ہے- قومیت کے جدید تصور کی رسائی ترکی جمہور کے ذہنوں تک آج تک نہیں ہوئي ہے' اور عربی اسلام کے بر خلاف جس نے مذہبی تبلیغ کے ذریعہ غیر اقوام کو معرب بنا دیا' ترک نہ تو بلقان کو "ترکا" سکے اور نہ اناطولیہ کو بلکہ محض آباد کاروں کی حیثیت سے رہے اور کسی قسم کی قومی یک جہتی نہ پیدا کرسکے- ترکی

تشکیل سیاسی میں ہمیں ایک عجیب دو رنگی نظر آتی ہے، جو صرف اس حد تک کہ سلطان کی اطاعت شعاری کا تعلق ہے نسلی رشتوں کو منقطع کرکے سب کو ایک اسلامی شیرازہ میں منسلک کردیتی ہے - غیر ملکی اور غیر وطنی لوگ بھی اسلام قبول کرکے، سلطان کی ملازمت میں داخل ہوسکتے تھے - یہ گویا نسلی انضمام کی ایک ترغیب تھی، اور عثمانیوں کی تاریخ میں ہمیں اس کی مثالیں بکثرت نظر آتی ہیں کہ لوگ برضا و رغبت اسلام لاکر، حکمران طبقہ کی تعداد میں اضافہ کا باعث ہوے ہیں - عیسائیوں پر مسلمانوں کے مقابلہ میں محاصل کا بار زیادہ تھا، اور شاید اس کی وجہ سے بھی اسامی اور کاشتکار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوے - وسط اناطولیہ میں قراامانی، اور مغربی اناطولیہ کے باشندے نسلی حیثیت سے ترک نہیں ہیں بلکہ مذہب اور بعد کو زبان کے اثر سے ترکی بن گئے ہیں - جب ترکوں نے اپنی سلطنت کا پایہ رکھا، تو اس وقت بھی ان کا نظم و نسق وہی قدیمی پچکلیان قسم کا تھا، اور انتظام ملکی تقریباً تمامتر نو مسلموں کے ہاتھوں میں تھا - اس سے ایک نیا اور مصنوعی طبقہ پیدا ہو گیا، یعنی حکمران طبقہ، جو با وصف نسلی اختلاف کے، ملازمت سلطانی میں آکر مسلمان ہوگیا تھا - مرور ایام سے اور جیسے جیسے فتوحات کا سلسلہ بڑھتا گیا، یہ طبقہ دن بدن کثیرالتعداد اور جمہور سے الگ تھلگ ہوتا گیا - یہ ایک عجیب و غریب تاریخی معما ہے کہ ترکی جمہور نے، جو قدیم‌الایام سے فتح و تسخیر کی قوت اور نظم و نسق کی صلاحیت میں بڑھی چڑھی تھی، غیر ترکی اجزا کی ایک ایسی فاتح فوج اور ایسی انتظامی جماعت پیدا کردی، جو اپنے کو خود ترکوں سے الگ اور بڑھا ہوا سمجھتی تھی - یہ لوگ خود کو 'عثمان لی' کہتے تھے، جس کے معنی ہیں خاندان عثمان کے حلیف، اور جمہور کو جنھیں وہ 'ترک' کہتے تھے، نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے - 'عثمان لی' کے اس حکمران طبقہ کا صدر اعلی سلطان ہوتا تھا، جو اپنی رعایا کے جان و

مال کا حاکم علی الاطلاق تھا - اس استبدادیت کا اصول یہہ تھا کہ عوام الناس کے نفع کو مد نظر رکھتے ہوے ' ان کے ساتھہ پدری شفقت برتی جاے ' اور جمہور کی قوتوں پر اقتدار کلی حاصل رہے - اس ہیئت سیاسیہ کی مثال بالکل لشکر گاہ کی سی تھی ' جہاں سالار عسکر اپنی افواج کی ضروریات زندگی مہیا کرتا اور جس طرح چاہتا ان سے کام لیتا ہے - رعایا سلطان کی غلام تھی - شروع میں " عثمان " اور " اور خان " جیسے سردار اپنے لئے قدیم ترکی لقب " بے " استعمال کرتے تھے ' سب سے پہلے " سلطان " اور " خان " کے القاب " یلدرم " نے اختیار کئے - رعایا کے حال پر ترکی سلاطین کی پدری شفقت کی مثالیں ہمیں شروع کے سلاطین میں نظر آتی ہیں ' جن کی زندگیاں بہت سادہ ہوتی تھیں ' اور جو جمہور کے قدیم مراسم و رواج پر کار بند تھے - جیسے جیسے ممالک محروسہ میں توسیع ہوئی ' اور محل کے عہدہ داروں کی تعداد بڑھی ' ویسے ویسے نمائش اور تصنعات بھی بڑھنے لگے ' اور سلطان اپنے مشیروں سے دور دور رہنے لگا - " سلطان محمد ثانی " اپنے وزیروں کی مجلس میں بیٹھا کرتا تھا - ایک مرتبہ ایک دہقان کچھہ فریاد لیکر ایوان میں آیا ' اور پوچھنے لگا کہ " تم میں سے سلطان کون ہے ؟ " اس واقعہ کے بعد سے سلطان دریچہ کے پیچھے بیٹھکر اپنے وزراء کی بحثوں کو سننے لگا - " سلیمان " کے زمانے سے یہہ دستور ہوگیا کہ اب سلطان مجلس وزراء میں شرکت کی زحمت گوارا نہ کرتا تھا ' بلکہ وزیر اعظم تخلیہ میں مجلس وزراء کے تصفئیے گوش گزار کیا کرتا تھا اور سلطان کا حکم آخری اور قطعی ہوتا تھا - تعجب کی بات ہے کہ جیسے جیسے سلطنت میں زوال آنے لگا اور صوبجات یکے بعد دیگرے ہاتھہ سے نکلنے لگے ' ویسے ویسے

سلطانوں کا غرور اور تمکنت بڑھتے گئے اور ان تک باریابی دشوار ہوتی گئی ' اور ساتھہ ھی محل سرا کے نا عاقبت اندیشانہ اور بد تر اثرات ان کی مرضی پر حاوی ہوتے گئے - شروع کے جنگ جو سلاطین اپنے بیٹوں کے اندر اپنی جنگی روح پھونکا کرتے اور ان میں سے اپنا جانشین نامزد کرتے تھے - " سلطان احمد اول " کے عہد سے قانون وراثت بدل دیا گیا اور اب تخت کی جانشینی خاندان کے بزرگ ترین رکن کے حصہ میں آنے لگی —

باب حکومت ' جو سلطان کی مجلس شوریٰ تھی ' ان ارکان پر مشتمل تھی - صدر اعظم ' دو قاضی عسکر ' قاضی قسطنطنیہ ' جانثاریوں کا افسر اعلیٰ ' نشانجی (مہر بردار شاہی) ' خزانچی اور سالار عساکر - باب حکومت کے اجلاس روزانہ صبح میں ہوتے تھے ' اور اس کی کارروائیاں اس طرح شروع ہوتی تھیں کہ رئیس الکتاب تجویزیں اور کاغذات پڑھکر سناتا تھا - " خوجگیان " احکامات قلم بند کر کے مختلف عہدہ داروں کے پاس روانہ کرتا تھا - اہم قانونی معاملات میں ' باب حکومت ہی اعلے ترین مجلس مرافعہ ہوتی تھی - اجلاس کے بعد سلطان تخلیہ میں صدر اعظم اور دوسرے وزراء کو طلب کرتا ' اور ان کی تجاویز سنتا تھا - نئے تقررات اور مختلف عہدوں کی خلعت بخشی بھی اسی موقع پر ہوتی تھی - سترھویں صدی عیسوی میں یہہ دستور العمل متروک ہوگیا ' اور اب باب حکومت کے جلسے گاہ گاہ صدر اعظم یا شیخ الاسلام کے محل میں منعقد ہونے لگے - جب " محمود ثانی " نے نظام و نسق کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور وزیرون کا تقرر کیا تو اس نے یہہ قاعدہ بنایا کہ صدر اعظم کی صدارت میں ہفتہ میں دو مرتبہ اجلاس ہوا کرے - وزیروں کو ' ان کے منصب کے

اعتبار سے سہ اسپ (*) د مہ نشان عطا ہوتا تھا اور صدر اعظم کو چہار اسپ د مہ - سلطان کے خیمہ کے سامنے سات دموں کے نشانات نصب کئے جاتے تھے - وزیر کے خیل و خدم میں بعض اوقات کئی کئی ہزار آدمی ہوتے تھے —

اصطلاحی حیثیت سے ' عثمانی نظم و نسق کے اہم شعبے ' یعنی دیوانی ' فوجی اور عدالتی آپس میں بہت کچھہ میں غلط ملط تھے 'لیکن ایک حد تک درجہ بندی کی کوشش بھی کی گئی تھی - ساری سلطنت کو ولایتوں ' سنجقوں اور قضاۃ میں منقسم کیا گیا تھا - ولایتوں اور سنجقون کے والی فوجی افسر بھی ہوا کرتے تھے ' فوجیں ان کے جلو میں رہا کرتی تھیں اور لڑائی کے زمانے میں جاگیردار اور امرا جو فوجی دستے بھیجتے تھے ' ان کی سرداری بھی یہی والی کیا کرتے تھے - سنجق کے افسر اعلی کو ایک اور ولایت کے والی کو دو نشان عطا ہوتے تھے - " انا طولیہ " اور " روسیلیا " (یعنی یوروپین ترکی) کے " بے " ان کے اوپر دو بگلر بے مقرر ہوتے تھے ' جو فوجی دستوں کی کمان بھی کیا کرتے تھے - اگر میمنہ اور میسرہ کی کمان پر کوئی شہزادہ نہ ہوتا ' یہی دونوں ' بے ' میدان جنگ میں ان کی کمان پر مقرر کئے جاتے - ان اہم خدمات پر تقررات ایک خاص طریقہ پر ہوتے تھے ' جیسے " دوشرمہ " کہتے تھے ' یعنی بلقان اور دوسرے مقامات سے عیسائی بچوں کو اٹھالے جانا ' اور انھیں مسلمان بناکر ان مخصوص خدمات کے لئے تیار کرنا - یہہ لوگ سلطان کے خاص محافظ ہوتے تھے —

دوسری اہم خدمات یہہ تھیں: دفتر دیوانی ' جو مجلس وزراء کے

(*) یہہ ترکی نشان تھا ' گھوڑے کی دم نیزے کے سرے پر باندھی جاتی تھی ' دموں کی تعداد کی مناسبت سے ' پاشاے دو نشان پاشاے سہ نشان وغیرہ کہلاتے تھے - ۱۲ - مترجم —

فیصلوں کو ضبط تحریر میں لاتا اور دوسرے دفتروں کو بھیجتا تھا ' دفتر حقانی ' جس میں اراضیات کے متعلق کاغذات رہا کرتے تھے ' اور خزانہ - دیوانی دفتر کا صدر اعلیٰ رئیس الکتاب ہوتا تھا ' جو سفارت خانوں کے ساتھہ مراسلت کرتا ' اور غیر قوموں کے ساتھہ امور سلطنت کی گفت و شنید کرتا تھا —

ایک اور اہم عہدہ ' نشانجی یا رجسترار کا ہوتا ' جو زمینات کی تقسیم کرتا ' سلطانی فرامین پر مہر لگاتا اور نئے مفتوحہ علاقوں کے متعلق اندراجات کرتا تھا - ' دفتر دار ' کا عہدہ وہی تھا جو آج کل صدر المہام فنانس کا ہوتا ہے - ابتداء میں صرف ایک ' دفتر دار ' ہوتا تھا ' لیکن بعد کو یورپی اور ایشیائی مقبوضات کے لئے علیحدہ علیحدہ دفتر دار ہوتے تھے - وہ محاصل کی جمع بندی اور اخراجات کی نگرانی کیا کرتے تھے -

علماء کا طبقہ ' جو اسلامی ممالک کے سیاہ و سفید میں بہت کچھہ دخیل تھا ' ترکی میں محمد ثانی کے زمانہ میں وجود میں آیا - شروع میں ان کے فرائض قاضی عسکر کی حیثیت سے صرف فوج تک محدود تھے اور پندرویں صدی کے ختم تک مفتی اعظم کی کوئی علیحدہ خدمت نہ ہوتی تھی ' بلکہ قاضی بروسا ' یا قسطنطنیہ کا قاضی یا کوئی اور عالم جو بادشاہ کے اشاروں پر چلتا ' اس خدمت پر مقرر کیا جاتا - اس طریقہ تقرر سے ' اس اعلیٰ عدالتی عہدہ کی اہمیت بہت کچھہ کم ہوگئی تھی ' اور اگرچہ بعض قوی الارادہ شیخ الاسلام کبھی کبھی اپنے خاص اختیار کو کام میں لاکر سلاطین کی فضول خرچیوں کو روک دیا کرتے تھے ' لیکن عموماً ان میں سے اکثر سلاطین کے ہاتھوں میں محض بے جان آلہ کی حیثیت رکھتے تھے اور خلاف احکام شریعت ' فتاوے صادر کیا کرتے تھے —

ترکی حکمراں طبقہ میں علماء کا طبقہ ہی خالص اسلامی عنصر تھا ' یعنی اس میں وہ عیسائی بچے شامل نہ کئے جاتے ' جو ترکی مقبوضات سے پکڑ کر لائے جاتے تھے ' بلکہ اس طبقہ کے افراد ترکوں اور عربوں کی اولاد ہوا کرتے تھے ' اور ان کی جماعت ' بعد میں غیر ملکی نسل کے عہدہ داروں کے خلاف بڑی ہوگئی تھی - اس ڈر سے کہ سلطان ' یا فوج ان کے اقتدارات میں مداخلت نہ کر سکے ' انھوں نے اپنے پیشہ کی حیثیت خاندانی اور موروثی بنادی تھی ' اور گود کے بچے بھی " علماء " (بشک علمائی غی) کہلاتے تھے - اس مذموم طریقہ نے جس کی ابتداء محض حفاظت خود اختیاری کے طور پر اور عمال سلطنت کی مداخلت بیجا کو روکنے کے لئے کی گئی تھی ' آگے چل کر علماء کی علمیت اور اعزاز کو بہت کچھ نقصان پہنچایا —

عثمانی سلطنت کی مخصوص ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے اس کا اہم ترین طبقہ ' اور اس کی ساری قوت فوج تھی - اس زمانہ میں بھی جب کہ اس سلطنت کی حیثیت محض ایک دیہاتی جماعت کی سی تھی ' اس کا دار و مدار اپنے جاگیری نظام اور فوجی تنظیم پر تھا ' مغربی ملکوں کی طرح سے ' ترکی کے جاگیر داروں کے فرائض میں بھی فوجی خدمت داخل تھی - پندرہویں صدی کے اوائل میں ' اورخاں ' اور مراد نے جاگیرداروں کی متلون المزاجی سے محفوظ رہنے اور شورشوں کو فرو کرنے کے لئے ایک ایسی تدبیر اختیار کی جس نے تھوڑی ہی مدت میں ترکوں کو دنیا کی بہتر سے بہتر جنگی دول کے دوش بدوش کھڑا کردیا ' انھوں نے ایک نئی فوج " ینی چری " بھرتی کی - عام روایت کے بموجب یہ سپاہ قلندروں کی جماعت بکتاشی سے بھرتی کی گئی ' لیکن زمانہ حال کی تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ بکتاشیوں کی جماعتیں جانثاریوں کی بارکوں میں سولھویں صدی میں داخل ہوئیں ' اور

وہ بھی اس خیال سے کہ ان پر الحاد کا جو شبہ کیا جاتا تھا' وہ مٹ جائے - جانثاری فوج' طبعاً اور اخلاقاً' ایک زبردست اور ناقابل تسخیر اور ہر حیثیت سے قابل اعتماد فوج تھی' اس میں زیادہ تر ایسے بد نصیب افراد شریک تھے' جنہیں بچپن ہی میں گھروں سے پکڑ کر ایسی جکڑ بند اور ایسے ماحول میں رکھا گیا تھا کہ ان کے دل والدین کی محبت یا حب وطن کے جذبات سے قطعاً نا آشنا تھے - انھیں صرف ایک ہی اخلاق کی تعلیم دی گئی تھی' یعنی آقا کی اطاعت' اور ان کے دل میں صرف ایک ہی امنگ اور آرزو تھی' یعنی ترقی پانا' اور روپیہ کمانا - ظاہر ہے کہ فتوحات ملکی کے لئے اس بے جگر گروہ سے زیادہ اور کون موزوں ہو سکتا تھا - یہ نئی فوج سات طبقوں پر مشتمل تھی جو سب کے سب محل شاہی کے غلام (قاپو قلعہ) تھے' بارکوں میں رہتے اور شاہی خزانہ سے مقررہ مشاہرہ اور روزانہ بھتا پاتے تھے - اس باقاعدہ فوج کا بہت بڑا حصہ پیدل سپاہ پر مشتمل تھا - اس کے ۱۹۶ دستے تھے اور ہر دستہ میں مختلف اوقات میں ۶۰ سے لیکر ۲۰۰۰ آدمی تک ہوتے تھے - 'محمد ثانی' کے زمانہ میں جانثاریوں کی جنگی جمعیت بارہ ہزار کی تھی' 'محمد ثالث' کے زمانہ میں چالیس ہزار اور 'سلیم ثالث' کے عہد میں ان کی تعداد ہر زمانہ سے زیادہ یعنی ایک لاکھ دس ہزار تھی - ہر دستہ کی وردی' اس کی مخصوص خدمت کے اعتبار سے الگ رنگ کی ہوتی تھی' اور ہر دستہ کا اپنا الگ معرکہ تھا' کسی کا معرکہ کنجی تھا' تو کسی کا مچھلی اور کسی کا جہاز کا لنگر - یہ معرکے ان کے اپنے جھنڈوں پر بنے رہتے اور اکثر سپاہیوں کے بازووں اور پنڈلیوں پر گودنے سے گدے ہوتے - ہر دستہ کے مغنی اس کے ساتھ رہتے' اور جانثاری افواج کے روایتی فوجی مراسم ہمیشہ پابندی

کے ساتھہ پورے کئے جاتے - 'اور خان' کے عہد میں ہر جانثاری کی روز کی تنخواہ ایک اقچہ تھی' جس میں ایک ثلث درہم کے برابر چاندی ہوتی تھی۔ بعد کو روزانہ تنخواہ پانچ یا چھہ اقچہ ہو گئی تھی - اور خاص خاص افراد کو اگر کوئی کار نمایاں کریں تو آٹھہ اقچہ تک دئے جاتے تھے - بعد کو جب مالیات ملکی کی بد نظمی کی وجہ سے ' چاندی کے سکوں میں میل ہونے لگا اور ان کی قیمت میں فرق آگیا ' تو تنخواہ بھی بڑھا کر بیس اقچہ کردی گئی - اس تنخواہ کے علاوہ ' ہر دستے کو باقاعدہ روٹی ' روغن ' دال ' موم بتی اور وردی کی رسد ملا کرتی تھی - رسد کی تقسیم سہ ماہی ہوتی تھی اور ہر سہ ماہی کا نام اس کے مہینوں کے پہلے حروف ملا کر رکھا گیا تھا ' مثلاً "مصر" (محرم ' صفر ' ربیع الاول) ' " رجج (ربیع الآخر ' جمادی الاول ' جمادی الثانی) وغیرہ —

رسد کی تقسیم ایوان باب حکومت کے سامنے ہوتی تھی ' اور اس کے لئے منگل کا دن مقرر تھا - تمام دستے فوجی ترتیب کے ساتھہ آگے بڑھتے ' صدر اعظم اور اس کے مقربین کو آداب بجا لاتے ' اور پھر اپنے سردار کا اشارہ پاکر کھانے بیٹھہ جاتے - کھانے میں شوربہ ' چاول ' اور گوشت ہوتا ' جو محل سرا کے مطبخ میں پکایا جاتا - کھانے پر بیٹھنا گویا اس کی علامت تھا کہ وہ اپنے آقا کے نمک حلال ہیں - کھانے سے فراغت پاکر پھر سب ایوان کے سامنے جمع ہوتے ' یہاں ان کے کپتان دونوں ہاتھہ سینے پر باندھ کر " گلبانگ " (جانثاریوں کا نعرۂ جنگ) پڑھتے —

" لاالہ الااللہ باش عریاں ' سینہ بریاں "

" قیلیج آل قان — بو میداندہ نیجہ باشلر "

" کسیلیر هیچ اولمای صوران - ایواللہ "

" ایواللہ قہر مُز قیلیجمز دشمانہ زیان ۔ "
" قوللغمز باد شاہہ عیاں - اوچلر یدیلر "
" قیر قلر گلبانگ محمدی ، نور نبی کرم علی "
" پیرمز خدا وندگار مُز حاجی بکتا شی ولی "
" دمنہ ، دو رانلہ ہُو ، د ییہ لم ہو ! "
(ترجمہ : لاالہ الااللہ ، برہنہ سر اور سینہ صاف
ہوکر اے میری تلوار خوں پی ؛ یہاں ہزاروں
سر دھڑ سے جدا ہوتے ہیں' اور کوئی نہیں پوچھتا
کہ کیوں ؛ واللہ ، باللہ ہماری فوج اور ہماری
تلوار دشمنوں کے حق میں زیاں ہے ۔ ہم
بادشاہ کے نمک خوار ہیں ، تین سات اور
اکتالیس نعرہ لگاؤ نور نبی ، کرم علی
اپنے پیر و مرشد حاجی بکتاش ولی کے لئے ۔ نعرہ
لگاؤ اس کے نام کے")

اس کے بعد ایک مقررہ اشارہ پاکر اپنی اپنی مقررہ جگہ کی طرف جھپٹ کر سکوں کی تھیلیاں اٹھا لیتے اور بارکوں میں جاکر انھیں تقسیم کرتے ۔ پیستھویں دستے کو اس رسم میں شرکت کی اجازت نہ تھی ، اس لئے کہ ان پر شہزادہ عثمان کے قتل میں حصہ لینے کا شبہ تھا ۔ چونکہ خود سلطان بھی جانثاریوں کے پہلے دستہ کا رکن سمجھا جاتا تھا ، اس لئے اس رسم کے چند روز بعد وہ جانثاری کی وردی پہن کر بارکوں میں جاتا اور تنخواہ لیتا تھا ، اور بارک کے دروازہ پر ۔ گھوڑا ٹھیرا کر جانثاریوں کے افسر کا دیا ہوا شربت کا پیالہ پیتا ، جس کا مطلب یہ ہوتا کہ اسے ان کی وفاداری پر

پورا پورا اعتماد ہے —

اس مخصوص فوج میں کسی باہر والے کو، الا اس صورت کے جب کہ اس میں کوئی خاص خصوصیت ہو ۔ شرکت کی اجازت نہ تھی۔ اگرچہ جانثاری افواج ، اپنی ترکیب کے لحاظ سے مخلوط تھیں ، لیکن ان کی حلقہ بندی اور رشتہ اتحاد مستحکم تھا ، البتہ سولہویں صدی کے آخر میں وہ بازیگر اور مسخرے بھی ، جو اپنے کرتبوں سے شاہی محفلوں میں سلطان کی خوشنودی حاصل کر لیتے ، اس میں بھرتی کئے جانے لگے۔ اس کے بعد سے تو جانثاریوں کی بارکوں میں ہر قسم کے غیر معتبر بیرونی لوگ داخل ہونے لگے ، جس نے اس فوج کی روایتی یک جہتی اور شیرازہ بندی کو صدمہ پہونچایا ، اور ان کی جو خاص شان تھی اسے مٹا دیا۔ اب یہ لوگ شادیاں کرکے بارکوں کے باہر رہنے اور امن و امان کے زمانہ میں کوئی نہ کوئی کاربار بھی کرنے لگے - غرض کہ وہی فوج جس کی بسالت اور ہیبت کی کسی زمانہ میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی ، اب اس کی حیثیت صرف ایک شورش پسند اور شورہ پشت انبوہ کثیر کی سی ہو گئی ، جس سے ملک کے امن و امان کے لئے اندیشہ پیدا ہو چلا — لڑائی کے کام کے تو یہ لوگ بالکل رہے ہی نہیں ، اور جب کئی مرتبہ ان کی جدید تنظیم کی کوشش کی گئی لیکن ناکامی ہوئی تو آخر کار سنہ ۱۸۲۶ م میں اس فوج کو بالکل ہی توڑ ڈالا گیا —

مذکورہ بالا باقاعدہ اور مستقل افواج کے علاوہ ، جاگیری امرا ، "تمار" "زیامت" اور " خاص " کی اپنی اپنی منتظم فوجیں بھی تھیں ، اور ان میں سے ہر ایک اپنی جاگیر کے شایان شان مسلح اور تربیت یافتہ سپاہ ، پیدل اور سوار ، معسکر سلطانی کو بھیجتا تھا — اپنے زمانۂ عروج میں ، سلطنت عثمانی ، بے خرخشہ اور صرفہ ایک لاکھ چالیس ہزار سوار میدان جنگ

میں لا سکتی تھی - نپولین کی جنگوں کے زمانہ تک یورپ کی کوئی سلطنت اتنا تڈی دل لشکر جمع نہ کر سکتی تھی - امرا کو جاگیریں خدمات سلطانی کے صلے کے طور پر عطا ہوتی تھیں، جن میں سے بعض تو حین حیات کے لئے ہوتیں' اور بعض ہمیشہ کے لئے اور موروثی - یورپ میں تو جاگیری نظام اپنے غیر منفک موروثی حقوق کی وجہ سے مرکزی حکومت کے لئے خطرناک بن گیا تھا' لیکن ترکی کے امرا اور جاگیر دار ہمیشہ اپنے بادشاہ کے پابند اور ماتحت رہا کرتے تھے - لیکن عثمانی سلطنت کو اپنے جاگیری نظام کی وجہ سے جو قوت حاصل ہوئی تھی' اس میں عام اخلاقی زوال اور بد ضبطی کی وجہ سے ضعف پیدا ہو گیا - بیگمات کے اثر اور رسوخ کی وجہ سے اکثر غیر مستحق لوگوں کو جاگیریں ملنے لگیں اور اکثر امرا اپنی جاگیروں سے دور بیٹھکر مزے کرنے لگے - جاگیروں کو پٹہ پر دینے کا دستور عام ہو گیا' اور اس نے اکثر جاگیرداروں کو تباہ کر دیا - کھیتوں سے کمال بے پروائی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ انتفاع کیاجانے لگا' نتیجہ یہ ہوا کہ اراضی بنجر اور مردہ ہو گئی اور سارے ملک میں غلہ کی قلت ہو گئی - ترکی فوج کا بیشتر حصہ جا نثاری اور جاگیری سپاہ پر مشتمل تھا - طلایہ یا دوسری معمولی خدمات کے لئے بے قاعدہ اور عارضی سپاہ استعمال کی جاتی تھی' ان کے پاس بندوقیں ہوتی تھیں' یا پھر سرنگیں بچھانے یا لشکر گاہ یا قلعوں میں خندقیں کھودنے کا کام ان کے تفویض ہوتا تھا - چونکہ بلقان کے مفتوحہ علاقوں کو بھی امدادی فوجیں بھیجنی پڑتی تھیں' اس لئے ان میں سے اکثر عیسائی ہوتے تھے -

چونکہ سولھویں صدی میں سارا " بحرقلزم " ترکوں ھی کے زیر اثر تھا' اس لئے ان میں بحری فاتحین اور امیرالبحروں کا بھی ایک لا جواب جھگڑا پیدا ہوا' مثلاً " خیر الدین بار بروسا " اور اس کا بیٹا " حسن " ' پیالہ تورغد '

'صالح رئیس' اور 'پیری رئیس' سب سے پہلا جہازی کارخانہ (ترسانہ) 'گیلی پولی' میں کھولا گیا تھا' جو 'سلیمان' کے عہد میں 'شاخ زرین' کو منتقل کر دیا گیا - 'قاپودان پاشا' یعنی امیرالبحر کا منصب صدراعظم کے بعد ہی ہوتا تھا - ترکی کے تمام بحری افسر اور ملاح عیسائی والدین کی اولاد تھے - یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے بہادرانہ کارناموں سے یورپ کو کس قدر سراسیمہ کر دیا تھا' لیکن اس کے علاوہ ان میں بعض بہت قابل ہوئے ہیں اور سائنس داں مصنفین کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں' مثلاً پیری رئیس نے بحیرہ ایجین اور بحیرہ روم کا ایک بحری نقشہ (بحریہ) تیار کیا تھا - وہ ان دونوں سمندروں کا چپہ چپہ چھانے ہوا تھا' اور اپنے نقشہ میں اس نے بحری روؤں' مختلف مقامات کی گہرائیوں' اترنے کی جگہوں اور بندرگاہوں کے متعلق جملہ معلومات فراہم کی ہیں - اسی طرح سے ایک اور علمی ذوق رکھنے والا امیر البحر سیدی علی تھا' جس کا جہاز باد مخالف کی وجہ سے ہندوستان کے ساحل پر آن لگا تھا' وہ خشکی کے راستہ' یعنی سندھ' خراسان' بلوچستان اور ایران ہوتا ہوا ترکی واپس گیا تھا - اس نے اپنے اس رسالہ سفر کی واردات لکھی ہے اور ساتھ ہی اصطرلاب کے استعمال پر ایک ہندسہ کی کتاب' اور ہندوستان کے سمندروں پر ایک کتاب "محیط" کا مصنف بھی ہے —

ترکی نے اپنے اعلیٰ درجہ کے منظم جہازی کارخانوں کی مدد سے ایک ایسا بیڑا تیار کرلیا تھا جس میں ہر خدمت کے لئے خاص طور پر تربیت یافتہ ملاح اور سپاہی' مامور تھے' ان کی ایک جماعت کو جاگیری حقیت اراضی کے طریقہ کی رو سے بحری خدمات انجام دینی پڑتی تھیں - غلاموں' قیدیوں اور سزا یافتہ مجرموں سے جہازوں کی مرمت اور دیکھ بھال کا کام لیا جاتا تھا' اور ان سے غلاموں کا سا سلوک کیا جاتا تھا - دوسری اقوام کی فوجوں کے بر خلاف' ترکی

فوج کی وردیاں شوخ رنگ کی ہوا کرتی تھیں - چونکہ اس زمانہ میں لڑائیاں دست بدست ہوا کرتی تھیں، اس لئے خاکی وردی سے غنیم کو دھوکا دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی - وردی میں سر کا لباس خاص طور پر نمایاں ہوتا تھا - شلواریں، جن کی پنڈلیوں کے اوپر مختلف رنگوں کے تسمے بندھے رہتے تھے اور بے ایڑی کے پنڈلیوں تک کے جوتے جن کے ادھر ادھر بٹن ٹکے رہتے تھے - ان سے لمبے دھاوے مارنے میں سہولت ہوتی تھی - کوچ کی حالت میں لبادے کے دامن کمر پیٹی میں اٹکا لئے جاتے تھے تاکہ چلنے میں آسانی ہو —

عثمانیوں کے اسلحہ میں ایشیائی اسلحہ جیسے گرز، بھولے، تلواریں اور یورپی آتشیں اسلحہ دونوں مستعمل تھے - آتشیں اسلحہ میں سب سے پہلے توپوں کا استعمال شروع ہوا - اس کے بعد رائفلیں، جن کو سب سے پہلے جنگ کو سووو (Kossowo) سنه ۱۳۸۹ ع میں استعمال کیا گیا تھا - لیکن عثمانی، جو اپنی فوج کی اصلاح کے لئے غیر ملکیوں کو ملازم رکھتے تھے، بھاری بھاری توپیں ڈھالنے میں اپنے دشمنوں سے بہت آگے تھے سوار فوج کے حملہ کی مدافعت کے لئے وہ گھومنے والی توپیں اور ایک قسم کی مشین گنیں استعمال کرتے تھے —

جب اعلان جنگ ہوتا، تو مختلف پلٹنیں مقررہ مقامات پر جمع ہوتیں - مغرب کی طرف جو لڑائیاں ہوتیں، ان کے لئے کوچ کا راستہ ادرنہ، سوفیا، نش اور بلغراد تھا - روس کی طرف ادرنہ، سوفیہ، بداداغی، عراقچی اور دریائے نیس تر (Dniester) کے کنارے کنارے کوچ کیا جاتا - فوج کے لئے غلہ اور رسد کے ذخائر مہیا کرنے کے لئے بعض شاہراہوں کو اختیار کیا جاتا - ان سب راستوں کے پہلے ہی سے متعین ہونے کی وجہ سے اس کا اندازہ ہوجاتا تھا کہ معرکہ کہاں ہوگا،

یہ میدان جنگ عموماً ایسے وسیع میدان ہوا کرتے تھے جن کے چاروں طرف پہاڑیاں ہوتیں اور ہر فریق ان پر پہلے قابض ہونے کی کوشش کرتا تھا - ترکی فوجیں زمین پر لیٹ کر پیٹ کے بل چلتی تھیں اور اس لئے انہیں بعض مقررہ راستوں پر رہنا پڑتا تھا - جب فوج جنگ کے لئے روانہ ہوتی تو اس کے ساتھہ رسد پہونچانے والوں، مزدوروں، مغنیوں اور بازیگروں کا ایک جم غفیر ہوتا تھا - ترکی لشکر گاہ میں عجب رونق اور چہل پہل ہوتی تھی - دنیا کے ہر حصہ کی نسلیں اور لباس وہاں نظر آتے، اور ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کسی مشرقی شہر کا سارا بازار اپنے طرح طرح کے سامان اور تماشوں کے ساتھہ، فوج کے ہمراہ جارہا ہے- مشرق نے بلقان کے راستہ سے وی اینا (Vienna) کے کئی چکر اس طرح لگائے ہیں —

ترکوں کے حربی اصول، قدرتی طور پر، ان کے مخصوص فوجی نظام پر مبنی ہوتے تھے، اور ابھی زمانۂ حال تک ان میں وسط ایشیا کے میدانوں کی زندگی کے چربے نظر آتے تھے - شروع شروع میں تورانی اقوام نے قدیم ایرانیوں سے، جنھوں نے پیادہ اور سوار فوج میں اتحاد عمل کا ایک مخصوص طریقہ نکالا تھا، یہ حربی اصول سیکھا تھا کہ فوجوں کو کھڑی قطاروں کی بجائے صف میں پھیلا دیا جائے- ترکوں کی صف بندی اس طریقہ پر ہوتی کہ قلب میں تو پیدل سپاہ کا ایک مستحکم مرکز ہوتا جس کے آگے توپخانہ ہوتا اور میمنہ اور میسرہ میں سواروں کے دستے رکھے جاتے - لڑائی اس طرح شروع ہوتی کہ پہلے سامنے کی طرف سے بے قاعدہ رسالہ (آقنچی) چھاپے مارنا شروع کرتا، اور پھر جنگ مغلوبہ کے اصول پر اپنے کو شکست خوردہ ظاہر کرکے بے تحاشا بھاگتا - غنیم زعم میں آکر اس کا تعاقب کرتا، یہاں تک کہ توپخانہ کے نیم دائرہ کی زد میں آجاتا، اب بے قاعدہ سواروں کے دستے (جنھوں نے چھاپہ مارا تھا) تو دائیں بائیں پھیل جاتے اور دفعتاً توپخانہ غنیم پر باڑھیں مارنا شروع کرتا - ساتھہ ہی میمنہ اور میسرہ کے رسالے کے دستے چکر کاٹ کر اسے منتشر کردیتے اور دوسری طرف سے جانباز

جانثاری پیدل فوج شکست خوردہ غنیم پر ٹوٹ کر اور تعاقب کرکے ان کا کام تمام کردیتی - اگر یہ حربی چالیں کارگر ہوتیں، تو پوری طرح سے فتح حاصل ہوتی اور میدان جنگ ہی میں غنیم کا کام تمام ہو جاتا - ترکوں نے اس طرح سے ایک ایک معرکہ میں سلطنتوں کی قسمت کے فیصلے کردئیے ہیں - ترک پیدائشی سپاہی ہیں، اور جب انیسویں صدی میں یورپی تہذیب نے لمبی مار کے آتشیں اسلحہ تیار کئے اور پرانی حربی چالیں بیکار ہو گئیں، تو ترکوں نے نئے اصولوں کو بھی نہایت مستعدی کے ساتھ، سیکھ لیا، اور ان میں بھی اگر دوسری قوموں کے آگے نہیں، تو کم از کم ان کے برابر وہ ضرور ہوگئے - ترک ہی اسلام کے بہترین مجاہد اور مبارز ہیں، اور ان میں آج بھی اعلی درجہ کی خدا داد فوجی قابلیت رکھنے والے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں —

عثمانی سلطنت کا اگر کوئی کمزور ترین رخ تھا، تو وہ مالیات کا انتظام تھا، گویا کہ فطرت کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ سپاہی اقتصادیات سے بے بہرہ ہو، وہ کبھی سلطنت کے محاصل اور مخارج کی میزان برابر نہ کرسکے - ان کے یہاں کوئی باضابطہ میزانیہ تیار نہیں کیا جاتا تھا، اور سلطان کی طبیعت کی لہر مالیات کی مستحکم ترین بنیادوں کو متزلزل کردیتی تھی - شریعت اسلامی کے بموجب ریاست کی آمدنی کی مدیں عشر، نمک کے محصول، جزیہ، مفتوحہ یا ماتحت دول کے خراج اور مال غنیمت کا خمس ہوتی تھیں، سلطنت کے عروج کے زمانہ میں محاصل مخارج سے کہیں زیادہ ہوا کرتے تھے، اس کے بعد یہ دستور ہوگیا کہ ہر سلطان تخت نشینی کے وقت جانثاری فوجوں کو بڑی بڑی رقمیں تقسیم کرنے لگا اور حرم سرا کے اخراجات بے تکان بڑھنے لگے - آمد و خرچ کا کھاتہ رکھنے کا تو کوئی طریقہ تھا ہی نہیں، صوبجات کا پیسہ پیسہ کھینچ لیا گیا اور

وہ مفلس ہوگئے' اور جب نیا دور تمدن شروع ہوا تو چونکہ ترکی زراعتی ملک تھا' اس لئے اسے اپنی مصنوعات باہر والوں سے خریدنی پڑیں۔ اگرچہ 'سلیمان' "ذی شان" کے زمانہ میں ترکی اوج کمال پر تھا' لیکن مالی مشکلات اسی زمانہ میں شروع ہو گئی تھیں۔ جاگیری حقیت کو وقف میں منتقل کردیا گیا تھا اور زمین کو پٹہ پر دینے کا طریقہ شروع کردیا گیا تھا۔ باضابطہ میزانیہ تیار کرنے کی کوشش پہلی مرتبہ سنہ ۱۶۰۹ ع میں کی گئی' پھر سنہ ۱۶۵۳ ع میں اور اس کے بعد سنہ ۱۶۶۰ ع میں —

اس زمانہ میں دو 'قوپ رولو' * کے حسن انتظام سے مالیہ کی حالت کچھ سنبھلی' میزانیہ شکل سنہ ۱۸۶۲ ع تک رہی رہی' اس سال البتہ 'فواد پاشا' نے ملک کی مالی حالت کے متعلق جو رپورٹ پیش کی' اس کے ساتھ ایک باضابطہ میزانیہ بھی شریک کیا۔ یہ میزانئے کبھی صحیح نہیں ہوتے تھے اور کم عیار سکوں کی گردش اور سرکاری طور پر ضبطی جائداد کی کار روائیوں نے حکومت پر سے رعایا کا اعتبار بالکل اٹھالیا تھا۔

لیکن جب ہم ترکوں کے علوم و فنون اور خالص اسلامی تہذیب کی ترقی میں ان کا جو کچھ حصہ تھا' اس پر نظر ڈالتے ہیں' تو مذکورہ بالا ابتری کی کسی قدر تلافی ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ترکوں کی طبیعت میں' کسی طرح کی جدت طرازی نہ تھی' تاہم ماننا پڑتا ہے کہ وہ ہمیشہ علم کے شیدائی اور دوسری اقوام کے ہونہار شاگرد رہے ہیں۔ ترکی علماء عجمی اور عربی تمدن پر گہری نظر رکھتے تھے' اور چونکہ

---

* یعنی ایک تو 'قوپرولی محمد' جو سنہ ۱۶۵۶ ع میں صدر اعظم ہوا تھا' اور دوسرا اس کا بیٹا 'قوپرولی زادہ احمد' جو سنہ ۱۶۶۱ ع میں وزیر ہوا۔ یہ دونوں البانی الاصل تھے۔ ۱۲ — مترجم

ازمنہ وسطیٰ میں علم کا مطلب ھی "علم دین" ہوتا تھا، اس لئے اسلامی دینیات کے مطالعہ کا شوق بہت جلد ترکوں میں پیدا ہو گیا - ان کے ابتدائی زمانہ کے سلاطین مسجدیں اور ان کے قریب مدرسہ تعمیر کراتے تھے، جہاں ستونوں کے سامنے زمین پر دو زانو بیٹھکر، ترکی شاگرد عربی کا نصاب پڑھا کرتے تھے - جنھیں اعلیٰ تر تعلیم مطلوب ہوتی وہ 'مصر' کے مشہور زمانہ مدارس میں جا کر تعلیم حاصل کرتے تھے - جس طرح سے اس زمانہ میں یورپ میں درس و تدریس لاطینی میں ہوتی تھی، اسی طرح ممالک اسلامی کی علمی زبان عربی تھی، اس کی وجہ سے مختلف تمدنوں کے درمیان ایک طرح کا بین الاقوامی رشتہ اتحاد پیدا ہو جاتا تھا، جو آج کل اس وجہ سے نہیں پیدا ہوتا کہ "قومی زبان" کے شوق نے ہر ایک کی حد الگ الگ کردی ہے - شروع زمانہ کے ترکی علماء میں 'شیخ اودے بلی'، جو سلطان 'عثمان' کا خسر تھا، 'درسون فاتی'، 'چندرالی قارا خلیل' وغیرہ قابل ذکر ہیں، اس کے بعد 'ازنک' کے مدرسہ نے شہرت حاصل کی، جو سلطان 'اور خان' کا قائم کیا ہوا تھا - ادرنہ اور 'قسطنطنیہ' کی تسخیر کے بعد مختلف سلاطین نے ان دونوں مقامات میں لا جواب مسجدیں اور مدرسے بنائے، جن میں 'ادرنہ' میں سلیم کے بنائے ہوئے مدرسہ کو اور 'قسطنطنیہ' کے مدرسہ 'سلیمانی' کو خصوصیت کے ساتھ علمی مرجعیت حاصل تھی، اور دور دور کے طلبہ وہاں تحصیل علم کے لئے آتے تھے - اساتذہ میں 'عسکرے لی جلال الدین' اور 'سعدالدین تفتازانی' بہت مشہور تھے، جن کی تفاسیر آج تک اسلامی مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں - 'شیخ بدرالدین' نے تصوف پر کئی قابل قدر کتابیں تصنیف کیں، وہ اپنے ہم عصروں میں اپنے آزادانہ فلسفیانہ رجحانات و خیالات کی وجہ سے ممتاز ہیں - 'محمد فاتح' کے عہد

میں ' ملا خسرو ' نے کتب فقہ کے مصنف کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی - فقہ میں ان کی کتاب " غرر " اور اس کی شرح " درر " بہت معروف ھے - " سلیم اول " کے زمانہ میں " زنبلی علی جمالی " اور مفتی اعظم " کمال پاشا زادہ " علم و فضل کا مرجع تھے اور علماء جوق جوق آکر ان کے آگے زانوے شاگردی تہ کرتے تھے - اسی طرح " سلطان سلیمان " کا عہد بھی " ابو سعود آفندی " اور " ابن کمال " جیسے صاحبان علم و فضل پر بجا طور پر فخر کرسکتا ھے - " ابن کمال " نے تفسیر اور کمالیات میں خاص شہرت حاصل کی تھی ' انہوں نے تاریخ پر بھی قلم اٹھایا ھے اور شاعر بھی تھے - ان کی ذات جامع العلوم تھی اور وہ اپنے زمانہ کے بزرگ ترین عالم سمجھے جاتے تھے - " ابن سعود " اپنے زمانہ میں شریعت کے سب سے بڑے عالم تھے اور اسی حیثیت سے معروف ھیں - عربی میں انہوں نے وہ زور قلم پیدا کیا تھا کہ کوئی اور ترک ان کی برابری نہ کرسکتا تھا - یہ دونوں علماء یعنی ' ابوسعود ' اور ' ابن کمال ' آج تک بزم علم و فضل کے مسند نشین ھیں - عثمانی سلطنت کے زوال کے ساتھہ ساتھہ ترکوں کے قواے روحانیہ میں بھی انحطاط نمودار ہوگیا اور اگرچہ ابھی کچھہ زمانہ اُدھر تک ترکی کے مدارس میں ' کمالیات ' کا چرچا تھا ' لیکن فکر وخیال کی کوئی جدت ' یا فلسفہ ' کے میدان میں کوئی تازہ خیالی ھمیں نظر نہیں آتی - دینیات اور فلسفہ کی ترقی آج بالکل رک گئی ھے —

سائنس کے شعبہ میں ' ترکوں نے سب سے پہلے فن طب میں ترقی کی - قاموس المشاھیر میں ھزاروں نام ترکی النسل اطباء کے نظر آتے ھیں - سنگی تعمیر کا سب سے پہلا شفاخانہ ' برو سامیں ' بایزید ' نے سنہ ۱۴۰۱ ع میں بنوایا تھا - اس کے ساتھہ ایک مطب بھی تھا - ' مدرسہ سلیمانی ' اور مدرسہ مسجد فاتح '

میں بھی طب یونانی کی تحصیل ذوق و شوق سے کی جاتی تھی
یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ اگرچہ علوم دینیہ و فلسفہ کی تحصیل کا ذریعہ عربی زبان ہی تھی ' لیکن کتب طب ترکی زبان میں لکھی جاتی تھیں - ترکوں نے دماغی امراض ' اور ارثی بیماریوں کے قوانین کی دریافت اور تحقیق کرکے فن طب کی خاص خدمت کی ہے - ان کے مشہور اطباء میں سے اسحاق اور حاجی پاشا (جنھوں نے بعض بلند پایہ علمی رسالے لکھے) " بایزید " کے زمانہ میں ہوے - اور محمد ' فاتح ' کے عہد میں ' التنجی زادہ ' ' خاریجی زادہ '' احمد' ' علی احمد چلبی ' ' وسیم عباس ' و غیر ہم مشہور ہوے - فن جراحی میں ' خصوصاً کحل کی حیثیت سے ان لوگوں کی شہرت وسطی یورپ تک پہونچی ہوی تھی - دینیات اور طب کے علاوہ ' وقائع نویسی اور فن تاریخ میں بھی ترکی نے خاص مرتبہ پیدا کیا تھا - یہ صحیح ہے کہ ترکوں کے شعری سرمایہ کے مقابلہ میں ان کا سرمایۂ نثر نظر میں نہیں ' جچتا ' لیکن جہاں تک نثر کا تعلق ہے ان کا تاریخی سرمایہ ہی بہترین اور علمی حیثیت سے سب سے زیادہ قابل قدر ہے - شروع میں وہ ایرانی طرز تاریخ نویسی کی تقلید کرتے تھے ' لیکن بعد میں لفاظی اور عبارت آرائی کا شوق پیدا ہوگیا ' اور حسن الفاظ حجاب معنی بن گیا - یہ عیب آج تک باقی ہے - سلاطین بھی وقائع نویسی کی قدردانی کرتے تھے ' اس لئے کہ اس سے ان کے کار ناموں کو حیات جاریہ ملتی تھی ' اور اگرچہ اکثر ترکی تاریخیں اسی یک طرفہ نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں ' لیکن اگر ان کے متن کی تحقیق اور تنقید کی جاے تو آج بھی ان سے بہت قابل قدر معلومات حاصل ہوسکتی ہے —

'عاشق پاشا زادہ' سب سے پہلا ترکی مورخ تھا - وہ 'بایزید ثانی' کے عہد میں

گزرا ہے' اور اپنے ہم عصر 'نشری' کی ''جہاں نما'' کی طرح' اس کی تصانیف میں بھی ترکوں کی لڑائیوں کا حال نہایت سادہ اور صاف زبان میں بیان کیا گیا ہے۔
'ادریس بطلیسی' نے بھی 'ہشت بہشت' کے عنوان سے فارسی میں ایک تاریخ لکھی ہے' جس میں ادبی رنگ موجود ہے۔ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی کے ترکی مورخین نے فتح 'قسطنطنیہ' سے پہلے کے جو حالات لکھے ہیں' وہ عثمانی شاہنشاہیت کے نقطہ نظر سے لکھے ہیں' وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ترکوں کی ابتدا ایک دیہاتی جماعت سے ہوئی تھی' اور وہ اناطولیہ میں اپنے حریفوں کو صرف اس وقت زیر کر سکے تھے جب "قسطنطنیہ" کی فتح کے بعد ان کا شمار دول عالم میں ہونے لگا تھا۔ "سلیمان" کے زمانے سے ہمیں ترکی تاریخوں میں مقفی عبارت نظر آتی ہے' جس سے ان کا مطلب مبہم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر تو نرے قصیدے ہیں۔ سرکاری وقائع نویسوں کا سلسلہ "خوجہ سعدالدین صاحب تاج التواریخ" سے شروع ہوتا ہے' انہوں نے "سلیم ثانی" کے عہد کی تاریخ لکھی ہے' لیکن ان کا طرز تحریر نہایت مغلق اور بھونڈا ہے۔ ترکی تاریخوں میں نعیمہ کی کتاب سب سے زیادہ مستند ہے' اگرچہ اس کا طرز بیان بھی عیب سے خالی نہیں۔ دوسرے مورخین' رشید محمد' ' اسمعیل عاصم' ' عزی سلیمان' 'واصف احمد' ' پچوی' ' سلانیک لی مصطفی' "علی آفندی' ' کاتب چلبی' "اور منجم باشی' گزرے ہیں۔ ان سب نے تاریخ ترکی کے انقلاب آفریں واقعات پر نظر ڈالی ہے۔ ان کی جامع اور مبسوط تاریخوں کے علاوہ' سیرت' ادبیات' حرم سرا کی زندگی وغیرہ پر علحدہ علحدہ رسائل بھی موجود ہیں' مثلاً مصطفی پاشا کی 'نتائج الوقوعات' ' عطا بے کی 'اندرون تاریخی' ' علی آفندی' کی 'مناقب ہنروران' وغیرہ ' نتائج الوقوعات

میں صرف واقعہ نگاری ہی پر اکتفا نہیں کی گئی ہے بلکہ سلطنت کے نظم ونسق کی تصویر بھی کھینچی گئی ہے - ' اندرون تاریخی ' حرم سرا کی زندگی کا سچا خاکہ ہے ' اگرچہ اس کے طرز تحریر میں تصنع بہت زیادہ ہے - اور اکثر مقامات پر تو ادبیات کے درجہ سے گر کر اس کی حیثیت صرف تک بندی کی سی رہ جاتی ہے توچی بے کی تاریخی اور نقادانہ تصنیف میں زوال سلطنت عثمانی کے اسباب نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں -

اس مختصر تبصرے میں ترکی جغرافیہ دانوں کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہو گا - حدود سلطنت کی وسعت خود جغرافیہ دانی اور جغرافی معلومات کی محرک تھی - اور سولھویں صدی کے بعد سے ہمیں ترکی زبان میں متعدد کتابیں جغرافیہ اور فن جہاز رانی پر نظر آتی ہیں - ان مصنفوں کے علاوہ جن کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے ' ' سپاہ زادہ محمد ' اور " امیر محمد ابن حسن " نے سولھویں صدی میں امریکہ کے حالات پہلی مرتبہ ترکی زبان میں لکھے ہیں -

لیکن جو شخص باتفاق رائے ترکی کے باکمالوں کی بزم کا صدر ہے ' وہ ' کیاتب چلبی ' المعروف بہ ' حاجی خلیفہ ہے ' جس نے ' کشف الظنون ' کے علوان سے ایک قاموس لکھی ہے - اس کے علاوہ فن جغرافیہ پر ایک کتاب ' جہاں نما ' بھی اسی کی تصنیف ہے - اطلاس خورد (Atlas minor) کا ترکی ترجمہ بھی اس نے کیا ہے ' نیز بحری جنگ پر کئی تالیفوں کا سہرا بھی اس کے سر ہے - ' رئیف محمد ' نے سلیم کے عہد میں (سنہ ۱۷۸۹ ع - سنہ ۱۸۰۷ ع) انگریزی زبان میں ایک جغرافیہ کی کتاب لکھی اور ایک اطلس (Atlas) مرتب کیا تھا -

ترکی ادبیات شروع ہی سے ترکی قوم کی دورخی زندگی کا عکس رہی ہے - حکمران اور تعلیم یافتہ طبقہ کو جمہور کی سادہ اور صاف زبان سے

نفرت تھی' اس لئے رفتہ رفتہ ایک مصنوعی زبان پیدا ہو گئی' جس میں فارسی اور عربی کے لغات کی اتنی بھرمار تھی کہ اس کا سمجھنا عوام کی قدرت سے باہر تھا - عثمانیوں کی نظر میں ادبیات کی اصطلاح سے یہی بھرتی کا اور مصنوعی طرز تحریر مراد لیا جاتا تھا جس میں فارسی کی بہت زیادہ تقلید کی جاتی تھی' اور عوام کے جذبات کا سچا اظہار اگر کہیں نظر آتا تھا' تو اوریون یا "مدہ" کی کہانیوں میں' یا پھر "اوتا اوائے نو" کے سوانگ میں' جو اس میں شک نہیں کہ بازنطینی سوانگوں سے ماخوذ تھا' لیکن ترکی جمہور کی زندگی اور ذہنیت کا سچا خاکہ تھا - چین سے کٹھ پتلیوں کا ناچ ایشیا ہوتا ہوا ترکی بھی پہونچ گیا تھا' اور اپنی اسلامی شکل میں بہت مقبول ہوتا تھا - ٹھنڈی راتوں میں' باغوں کی بھینی بھینی خوشبوؤں' حقہ کی گڑگڑاہٹ اور اعلی سے اعلی ترکی قہوہ کی سوندھی خوشبو کا مزہ لیتے ہوئے' لوگ "مدہ" کی باتوں کو بڑے شوق سے سنتے اور اس کے ہاتھوں کے کرتب سے' نیز اس کی دلچسپ یا مضحک کہانیوں سے بہت کچھ لطف اندوز ہوتے تھے - حرم‌سرا کی خواتین چوبولے بناتیں اور تہوار کے موقعوں پر مذاقیہ طرز میں انہیں پڑھتیں - پرانی ترکی بحروں کے عام پسند گیت بھی صدیوں تک لوگوں کے دماغوں میں محفوظ اور زبانوں پر چڑھے رہے' اور بعض حلقے' مثلاً لیسودیون یا بکتاشیوں کے' اپنے پر معنے گیت ترکی زبان میں بناتے تھے —

لیکن ان چند باقیات کو چھوڑ کر' تعلیم یافتہ ترکی طبقہ کی ادبیات عروض اور جذبات دونوں حیثیتوں سے غیر ملکی تھی - جیسے جیسے جمہور کی سیاسی اہمیت بڑھتی گئی اور وہ اپنے حقوق کے لئے جد و جہد کرنے

لگے ' ویسے ویسے ' ادبیات نے بھی آہستہ آہستہ عوام کے جذبات کا رنگ قبول کیا - ترکی سر زمین پر سب سے پہلے ' اور سب سے بہتر تصنیف جو ادبیات پر ہوئی وہ " جلال الدین " رومی رح کی فارسی مثنوی تھی ' جس کے صرف دو ترکی شعر شاعر کی ترکی قومیت کا پتہ دیتے ہیں - ان کے فرزند " سلطان ولید " ترکی میں شعر کہتے تھے ' لیکن عروض عجمی تھی - سلطنت عثمانیہ کے قیام و استحکام کے بعد ' " عاشق پاشا " نے " غریب نامہ " اور " سلیمان چلبی " نے " مولودی " خالص ترکی زبان میں لکھے ' لیکن فارسی ادبیات نے بہت جلد ان سر سری کوششوں پر غلبہ پالیا ' اور " سلطان محمد فاتح " ہی کے عہد میں ہم ترکی زبان کو مفرس اور ترکی ادبیات کو فارسی اصل کی نقل پاتے ہیں - بحیثیت مجموعی یہہ کہا جاسکتا ہے کہ افق ایران پر جب کبھی کوئی درخشاں ستارہ طلوع ہوا تو اس کی کرنیں ترکی ادبیات پر ضرور پڑیں - مدرسوں کی عربی تعلیم کا اثر بھی تعلیم یافتہ طبقہ کے ادبی ذوق پر بہت کچھہ پڑا - ترکی ادبیات گویا مسلم ایران کے خیالات کا ذخیرہ ہے - حرمسرائے سلطانی میں ایک خاص قسم کی ادبیات پیدا ہوئی ' جس کا موضوع تمامتر تصوف تھا اور جس میں پروانہ کی داستان عشق و سوز بیان کی جاتی تھی - دیوان مرتب کرنے کا عام طور پر دستور تھا ' جن میں قصائد ' مدحیہ اشعار ' مناجات اور غزلیات ہوتی تھیں - " سلیمان ذی شان " کے عہد میں اس مذہب ادبیات کا سب سے پہلا اور مشہور نمائندہ " فضولی بغدادی " ہوا ' جس کی زبان اگرچہ غیر شستہ دیہاتی ترکی ہے ' لیکن اس کا دیوان اور " لیلی مجنوں " اس کے شاعرانہ کمال کا ثبوت ہیں " فضولی " سے زیادہ مشہور شاعر اور (وہ بھی صرف شستگی زبان کے اعتبار سے) " باقی " ہوا '

جس کا زمانہ سترھویں صدی کا ہے اور جسے ترکی غزل گو شعرا کا سر تاج کہا جاتا ہے ' لیکن جدت طبع کے اعتبار سے " فضولی " کا رتبہ " باقی " سے بڑھا ہوا ہے ۔ " باقی " کے ہم عصروں میں حسب ذیل مشہور ہیں ۔ " ذاتی " (صاحب " شمع و پروانہ ") " لامعی " " روحی " اور " یحیی بے " (صاحب " شاہ و گدا ") ۔ ترکی ادبیات کا طرز اور عام مذاق ہوبہو ایرانی اصل کی نقل تھا ۔ تقلید اور تصنع کا یہہ رجحان سترھویں صدی میں بہت زیادہ بڑھ گیا تھا ۔ " نفعی " اور اس کے معاصرین صرف صنائع لفظی پر جان دیتے تھے اور جذبات نگاری کی مطلق فکر نہ کرتے تھے ۔ خصوصاً " نرگسی " نے تو اس بارہ میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ اس کا سارا کلام شاعری نہیں بلکہ محض رعایت لفظی ہے —

اٹھارویں صدی میں طرز ادا اتنا پیچ در پیچ ہوگیا تھا کہ بغیر مبسوط شرحوں کے شعر پڑھنا اور سمجھنا ممکن نہ تھا " ندیم " کا طرز ' جو غزل گو شعرا میں سب سے زیادہ رنگین بیان ہے ' البتہ کسی قدر صاف اور سادہ ہے ۔ " راغب پاشا " فلسفیانہ شاعری کے نمائندے ہیں ' اور " فطنت خانم " اس عصر کے نسائی جذبات کی آئینہ دار ہیں ۔ انیسویں صدی سے صاف اور سادہ شاعری کا دور شروع ہوتا ہے ' اور شیخ " غالب " (" محمد اسد ") کی مثنوی " حسن و عشق " اور ان کا دیوان متقدمین کی لفاظی اور لفظ بازیوں سے پاک نظر آتا ہے ۔ دیوان مرتب کرنے کا مذاق بھی اسی زمانہ سے گھٹنا شروع ہوتا ہے ' اور " سنبل زادہ " ۔ " وھبی " " سروری " اور " کے چی زادہ عزت ملا " اس رنگ کی ادبیات کے آخری نمائندہ ہیں ۔ مصلح اعظم " سلطان محمود ثانی " کے زمانہ سے یہہ محسوس ہونا شروع ہوگیا کہ سلطنت عثمانی ' ذہنی اور مادی دونوں حیثیتوں سے زوال پذیر ہوتی جارہی ہے ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ کے مشہور مدبرین سلطنت ' مثلاً " پرتو " اور " عاکف پاشا " اور ان کے بعد ' " عبدالمجید " " رفعت " اور " رشید پاشا " سرکاری مراسلات کی مقفی اور مرصع عبارتوں سے بہت بد دماغ ہوتے تھے ' اور سلاست کی کوشش کرتے تھے - ادبیات میں بھی اسی قسم کا رجحان نظر آتا ہے - ایک اور چیز جس نے ادبیات کے رخ اور مذاق کو دوسری طرف پھیر دیا ' 'یورپ' کا اثر تھا ' جس کے ساتھ ترکوں کے براہ راست تعلقات ' نپولین ' کے زمانے سے پیدا ہوچکے تھے - اس اثر سے ادبیات میں ایک امیدافزا نشاۃ ثانیہ نمودار ہوگئی —

جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کرچکا ہوں ' ترکوں میں قدرت کی طرف سے تقلید اور اخاذیت کا ایک عجیب و غریب ملکہ ودیعت کیا گیا ہے ' جس کی وجہ سے وہ دوسری اقوام کی روح اور کارناموں کو اپنے اندر جذب کرکے ان سے اپنے حسب مطلب کام لے سکتے ہیں - ترکوں کی اس اخاذیت کی عظیم ترین یادگار ان کا فن تعمیر ہے - سلجوقی ترک ایران اور شام ہوکر آے تو اپنے ساتھ ' اناطولیہ میں عربی ۸ ایرانی طرز تعمیر بھی لاے اور یہاں بازنطینی طرز سے مدد لیکر اس میں مزید ترقی کی - ترکوں نے ان مختلف نمونوں اور طرزوں کی محض کورا نہ تقلید ہی نہیں کی' بلکہ ان کی طباعی نے ان اجزا سے ایک مخصوص ترکی فن تعمیر پیدا کردیا ' جو بذات خود عربی ' ایرانی اور یونانی فن تعمیر کی تمام حسین اور دلکش خصوصیات اپنے اندر رکھتا ہے —

ترکی فن تعمیر کی سب سے پہلی یادگاریں ' ازنک ' اور ' بروسا ' میں ملتی ہیں جو ہونہار سلطنت عثمانی کا پہلا دارالخلافہ تھا - یہ زیادہ تر سلجوقی طرز کی پبلک عمارتیں ہیں ' مثلاً مسجد ' مدرسے ' مقبرے وغیرہ -

مسجدوں کی دیواروں اور گنبد میں سبز پتھر دیا گیا ہے ' جس کی وجہ سے وہ " اخضر " کہلاتی ہیں - سلجوقی تعمیر میں دروازوں پر کھدائی اور آرائش کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا - یاد رکھنا چاہئیے کہ ایشیاے کوچک کی نسبتاً سرد آب و ہوا کی وجہ سے کھلے صحنوں میں محلے نہ بناے جاسکتے تھے ' اس لئیے بند دالانوں کی ضرورت پڑی اور دروازوں کی اہمیت زیادہ ہوگئی - مسجدوں کی دیواروں پر اعلیٰ درجے کے رنگین پتھر لگانے کا طریقہ ایرانی ہے اور ' بروسا ' اور 'ازنک' کی مسجدوں میں بھی یہی استعمال کیاگیا ہے - مسجدوں کی مکانیت کسی قدر کم ہوتی تھی اور چھتیں بغیر ستون کے بنائی جاتی تھیں - چونکہ ترک بڑی جگہ کے اوپر ایک گنبد نہ بناسکتے تھے ' اس لئے انھوں نے گنبد کی تعداد زیادہ کرکے ان کا دور کم کردیا' لیکن چونکہ یہ سب گنبد ایک ہی سطح پر ہوتے تھے جس سے بلندی کا اندازہ نہ ہوتا تھا ' اس لئے بہت جلد یہ ترمیم کردی گئی کہ بیچ کا گنبد ادھر ادھر کے گنبد سے اونچا بنایا جانے لگا —

ویسے تو بازنطینی طرز تعمیر کا اثر پہلے ہی سے بالواسطہ ترکوں پر پڑچکا تھا ' لیکن فتح ' قسطنطنیہ کے بعد وہ اور نمایاں ہوگیا - چونکہ سلطنت بہت وسیع تھی اس لئے پبلک عمارات کی تعمیر کے لئے روپیہ کی کمی نہ تھی ' اور پھر معاشرتی ضروریات کے روز افزوں اضافہ ' سے مسجدوں اور مقبروں کے علاوہ دوسری عمارتوں کی بھی ضرورت پڑی مثلاً کنوے ' کاروان سرائیں ' بازار ' محلات وغیرہ - ' ایا صوفیہ کا یونانی گرجا ترکی مساجد کے لئے نمونہ قرار پایا اور ' مسجد بایزید ' ' مسجد شہزادہ ' ' مسجد سلیمانی ' ' مسجد سلطان احمد ' اور ' ینی جامع ' سب اسی نمونہ پر بنائیں گئیں - ان سب عمارتوں کی خصوصیت یہ ہے کہ بیچ میں ایک بڑا بلند گنبد ہوتا ہے جس کے گرد و پیش چھوٹے چھوٹے گنبد ہوتے ہیں اور یہ سب کے سب نہایت پائدار گول

ستونوں پر قائم ہوتے ہیں - دیواریں اتنی موٹی اور بھاری نہیں ہوتیں جتنی کہ بازنطینی عمارتوں کی - محرابیں یا گول ہوتی تھیں یا نوکدار لیکن کشادہ بہت ہوتی تھیں ستونوں کی کارنس پر خوشہ نما کام ہوتا تھا - اندرون مسجد دالان در دالان ہوتے تھے اور اس کے پیچھے چھوٹی چھوٹی گمجیوں کے نیچے ' عمارت خانہ ' یعنی طالب علموں کے حجرے ہوتے تھے —

بازنطینی گرجوں کے سنہری بتوں اور مقدس تصویروں کی بجائے' مسجد کی اندرونی دیواروں پر عربی عبارتیں اور چاروں خلفاء کے نام کندہ ہوتے تھے - ایک ترمیم ترکوں نے ایسی کی جس سے بازنطینی طرز کی عمارتوں کا حسن دو بالا ہوگیا ' یعنی مینار کی تعمیر - عربی اور ایرانی طرز تعمیر میں میناروں کی شکلیں مختلف ہیں' مگر ترکوں نے اس میں اس طرح سادگی کی شان پیدا کی کہ انہوں نے چکنے سڈول اور بلند مینار بنائے جن کی چھت بہت سادہ ہوتی تھی ' البتہ برآمدوں پر گندھے ہوئے ہاروں کی طرح نقش و نگار بناکر ان کی شان دو بالا کردی جاتی تھی - جزیرہ نمائے ' استانبول ' کے اس حصہ پر جو آگے کی طرف نکلا ہوا ہے اور جو اپنے محل وقوع کے اعتبار سے دنیا کی بہترین جگہوں میں ہے ' ترکوں نے قدیمی بازنطینی محل کے موقع پر ایک محل تعمیر کیا تھا - اس محل کی تاریخ خاصی طویل ہے ' اس لئے کہ ہر سلطان نے اس میں متعدد عمارات کا اضافہ کیا ہے - اس کے سب سے زیادہ قابل توجہ حصوں میں ایک تو حرم ہے جس کی دیواروں پر پتھر کا کام لاجواب ہے ' اور دوسرا بغداد کو شک ہے جسے ' مراد چہارم ' نے دوبارہ بغداد فتح کرنے کے بعد تعمیر کیا تھا - ان عمارتوں کے معمار زیادہ تر نو مسلم یونانی تھے - انہیں میں سے ایک مشہور معمار ' سنان ' تھا جس کی تخلیقی قوت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنی عمر میں کم و بیش

اسی ۸۰ مشہور پبلک عمارتیں بنائیں !

دنیائے اسلام میں ایک جامع مسجد ایسی بھی ہے جس کے چھ مینار ہیں ۔ اسے ' سلطان احمد نے ' مشہور تاریخی رومی میدان پر ' تھیوڈوسی یس ' (Thodosi us) کے مخروطی مینار (Obelisk) اور ' پلے ٹائیا ' (Plataia) کے میدان جنگ کے سامنے تعمیر کرایا تھا ۔ اس کا معمار ' صنعان ' ہی کا ایک شاگرد ' محمد آغا ' تھا —

اٹھارویں صدی سے طرز تعمیر میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے: اس زمانے میں چاہات اور محلات بکثرت تعمیر ہوئے لیکن ان میں سے اکثریا تو اندر آتش ہوگئے یا زلزلوں سے مسمار ہوگئے ۔ 'احمد ثالث' کا بنوایا ہوا خوبصورت کنواں' اور مسجد نور عثمانی ' اور 'لالیلی جامع' جو دونوں حسین عمارتیں ہیں اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں ۔ ان معمار قوں کے کام میں ہمیں یورپی طرز تعمیر کا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ حد سے زیادہ نقش و نگار بنا دیے جاتے تھے — خفیف سا اثر نظر آتا ہے ' بعد کو نقش و نگار کی اس افراط ہی کی وجہ سے فن تعمیر میں زوال پیدا ہوگیا ۔ انیسویں صدی کی عمارتیں تو بالکل ہی یورپی نمونوں کی نقل ہیں —

قسطنطنیہ' جس سے زیادہ خوبصورت موقع دنیا کے کسی اور شہر کو نصیب نہیں ہوا' بہت جلد 'شاخ زرین' کے دونوں کناروں پر پھیلنے اور بڑھنے لگا ۔ لکڑی کی عمارتوں بنانے لگیں جن کے منقش بالا خانے آگے کی طرف نکلے ہوتے تھے' اگرچہ یہ مکانات انسانی مسکن کی بجائے پرندوں کی کابکیں معلوم ہوتی تھیں' تاہم ان سے شہر میں ایک خاص شان اور بوقلمونی پیدا ہوگئی ۔ جالی دار جھروکوں سے' جن کے پیچھے نازنینان حرم رہا کرتی تھیں' خاموش اور پر سکون گلیوں میں ایک خاص پر اسرار کیفیت پیدا ہوتی تھی ۔ امرا کے 'قونق' (محل) میں تو خیر بیش بہا قالین اور آرائش کی چیزیں ہوتی ہی تھیں' لیکن غریب سے غریب ترک بھی اپنے مکان کو صاف ستھرا اور قالین کے فرش سے آراستہ رکھتا تھا —

ہر اسلامی ملک کی طرح، ترکی میں بھی خاندانی معاشرت کی یہ خصوصیت تھی کہ عورت اور مرد الگ الگ رہتے تھے۔ جب سلاطین کا اقتدار بہت بڑھ گیا تو امرا کے گھرانوں میں شادیاں کرنے کی بجائے وہ اکثر لونڈیوں کو اپنے حبالہ عقد میں لاتے تھے، اور ان سے اولادیں پیدا ہوتی تھیں۔ لیکن یہ رسم امرائے سلطنت نے اختیار نہیں کی، وہ حسب دستور، شادی بیاہ کے قدیم طریقوں پر قائم رہے، اگرچہ غلاموں اور لونڈیوں کی کثیر تعداد کا رکھنا ان کے یہاں بھی فیشن میں داخل ہوگیا تھا —

ترکوں کی معاشرتی زندگی کے دو رخ ہوگئے تھے۔ مرد قہوہ خانوں میں بیٹھکر شعر شاعری یا قصہ خوانی سے اپنا دل بہلاتے تھے، عورتیں جمعہ کے روز کشتیوں میں بیٹھکر باغوں اور پھلواریوں میں تفریح کے لئے جایا کرتیں۔ شعر خوانی، موسیقی، اور ریشم اور سمور کے قیمتی لباسوں کی نمائش سے ان سیروں کا لطف اور دو بالا ہوجاتا تھا —

ترکی معاشرت کی اقتصادی بنیاد زمین اور اس کی پیداوار تھی۔ جاگیریں اسامیوں کو پٹہ پر دی جاتیں اور ان کی نگرانی بہت مشقت سے کی جاتی۔ یہی آبادی کی خوراک کا ذریعہ تھیں۔ زراعت کے علاوہ، صنعت و حرفت میں بھی، خصوصاً ایسی صنعتیں جن سے فوجی اغراض اور مشرقی زندگی کی ضروریات پوری ہوتیں، بہت جلد ترقی ہوئی، اور یہی شہری باشندوں کا وسیلہ معاش تھیں۔ ہر قسم کے صناعوں کی اپنی علحدہ علحدہ پنچائتیں تھیں، اور مختلف اہل حرفہ خود کو خاص خاص پیروں سے منسوب کرتے تھے۔ اولیائے چلپی نے جو سترویں صدی میں ترکوں کا سب سے بڑا سیاح ہوا ہے، پنچائتوں کے ایک جلوس کا نہایت مفصل حال لکھا ہے، اس میں ہمیں بعض ایسے پیشے بھی نظر آتے ہیں جو آج معدوم ہیں۔ بازار میں چمڑے، تانبے، تانبے، اون اور ریشم کا ہر قسم کا مشرقی سامان موجود رہتا، جو یا تو خود ترکی کا بنا ہوا ہوتا، یا پھر کاروانوں کے ذریعہ دنیا کے ہر

میں دنیا کی چیزیں بہت ہی کم کشش رکھتی ہیں وہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصے سے محروم رہتے ہیں - اُن کے دل کی کھڑکیاں تعداد میں کم اور وسعت میں تنگ ہوتی ہیں اور اسی لئے وہ دنیا میں رہ کر بھی اس دنیا سے الگ رہتے ہیں —

بعض اس طرح کے خوش قسمت لوگ بھی ہیں جن کی محبت، حیرت اور تخیل ہر جگہ بیدار رہتا ہے - فطرت کے گوشے گوشے سے انھیں ایک پیغام ملتا ہے - دنیا کی طرح طرح کی تحریکات اُن کے دل کی بین کے تاروں کو طرح طرح کی راگنیوں میں متحرک کر دیتی ہیں —

بیرونی دنیا ان کے دلوں میں احساسات کے مختلف رسوں، مختلف رنگوں اور مختلف سانچوں میں ڈھل کر کئی طرح کی شکلیں اختیار کر لیتی ہے —

حساس دل رکھنے والوں کی یہ دنیا بیرونی دنیا کی بہ نسبت انسان کی زیادہ اپنی ہے یہ دنیا دل کی مدد سے انسان کے دل کے لئے زیادہ قابل فہم بن جاتی ہے - یہ دنیا دل کے اثرات سے جو خصوصیت حاصل کرتی ہے انسان کے لئے وہی سب سے زیادہ قابل قبول ہوتی ہے —

اسی لئے دیکھا جاتا ہے کہ بیرونی دنیا میں اور انسانی دنیا میں بہت فرق پایا جاتا ہے - کونسی چیز سفید ہے، کونسی سیاہ ہے، کونسی بڑی ہے، کونسی چھوٹی ہے انسانی دنیا صرف ان کی اطلاع ہی نہیں دیتی بلکہ کونسی چیز پسند ہے کونسی چیز ناپسند، کونسی اچھی اور کونسی بری اسی بات کو مختلف سروں میں کہتی ہے

یہی انسانی دنیا ہر انسانی دل میں سے بہتی ہوئی آتی ہے - اس کی یہ روانی گو ہمیشہ قدیم لیکن نت نئی ہے - نئے نئے حواس اور

نئے نئے دلوں کے اندر ، ہوکر یہ ازلی سوتا ہمیشہ سے نیا ہوکر بہ رہا ہے —

لیکن اسے کس طرح حاصل کیا جائے اور کس طرح اس پر قابو کیا جائے ۔ اس عجیب و غریب و حسین دل کی اندرونی دنیا کو شکل دے کر دوبارہ ظاہر نہ کرسکنے پر یہ ہمیشہ پیدا ہوکر معدوم ہوتی رہتی ہے —

لیکن یہ چیز معدوم نہیں ہونا چاہتی بلکہ یہ اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے بے چین رہتی ہے ۔ اسی وجہ سے ازل سے انسان کے اندر ادبیات کی آمد کا تانتا بندھا رہتا ہے —

ادبیات کا خیال کرتے وقت دو باتوں پر غور کرنا پڑتا ہے ۔ ایک تو یہ کہ مصنف کا دل دنیا پر کس قدر محیط ہے دوسرا یہ کہ وہ کس حد تک دوام کی شکل میں ظاہر ہوا ہے —

ہمیشہ ان دونوں کے بیچ میں اتحاد نہیں ہوتا اور جہاں ہوتا ہے وہاں سونے پر سہاگا ہوتا ہے ۔ شاعر کا زندہ تخیل رکھنے والا دل جتنا بسیط ہوتا ہے اس کی تحریر کی گہرائی میں اُسی قدر ہمارا سکون بڑھ جاتا ہے، اتنی ہی انسانی دنیا کے وسیع ہوجانے سے ہماری دماغی مسرت کا جولانگاہ وسعت حاصل کرلیتا ہے —

لیکن شاعرانہ استعداد بھی ادبیات میں بہت قیمتی چیز ہے کیونکہ جس کا سہارا لے کر یہ استعداد ظاہر ہوتی ہے اُس کی بہ نسبت اس کے بے حقیقت ہونے پر بھی یہ استعداد بالکل ضائع نہیں ہوتی، یہ زبان اور ادبیات میں جمع ہوتی رہتی ہے ۔ اس کے ذریعے سے انسان کی قوت اظہار بڑھ جاتی ہے ۔ اس قوت کو حاصل کرنے کے لئے انسان ہمیشہ سے کوشاں رہا ہے ۔ جن مصنفوں کی مدد سے انسان کی یہ قوت تقویت حاصل کرتی ہے انسان اُن

کی عظمت کو بنا کر اُن کے احسان سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے —

جو دلی دنیا ہلی جذبات کے ساز و سامان سے پیدا ہوتی ہے اُسے ظاہر نمودار کرنے کا کونسا طریقہ ہے؟ اس کو اس طرح نمودار کرنا ہوگا جس سے دلی جذبات صاف طور پر ظاہر ہو جائیں - دلی جذبات کو صاف طور پر ظاہر کرنے کے لئے بہت سے ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے —

مرد کے دفتر جانے کا لباس سیدھا سادھا ہوتا ہے - وہ جتنا کم ہو اتنا ہی کام کرنے میں آسانی ہوتی ہے - صنف نازک کے لباس کو سج دھج، شرم و حیا، ناز و انداز یہ تمام چیزیں مہذب طبقوں میں مروج ہیں —

اس صنف کا کام دل کا کام ہے - اُن کو دل دینا پڑتا ہے اور دل کو اپنی طرف کھینچنا پڑتا ہے - اس لئے اُن کے بالکل سیدھے سادے اور نپے تلے ہونے سے اُن کا کام نہیں چل سکتا —

مردوں کو حتی الامکان مناسب و موزوں ہونا چاہئے لیکن عورتوں کا خوبصورت ہونا ضروری ہے - مردوں کا طرز عمل صاف اور سیدھا ہونا چاہئے لیکن صنف نازک کے طرز عمل بہت سے اشاروں اور کنایوں سے لبریز ہونا چاہئے —

ادبیات بھی دل پر اثر انداز ہونے کے لئے صنعتوں، تشبیہوں، بحروں اور اشاروں کنایوں کا سہارا لیتی ہے - فلسفہ اور سائنس کی طرح سیدھا اور صاف ہونے سے اس کا گزارا نہیں ہو سکتا —

اگر ہم کسی عجیب و غریب خوبصورت تصور کو باہر مشکل کریں تو زبان کے اندر اس کے اظہار کی ناممکنیت کی جھلک دکھائی پڑتی ہے - جس طرح صنف نازک کا حسن اور ضیا ہوتی ہے ادبیات کے اظہار کی ناقابلیت بھی ویسی ہی ہوتی ہے - وہ تشکیل کی حد سے باہر ہے اور تمام صنعتوں سے بالا تر ہو جاتی ہے - صنعتوں کے ذریعے سے اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا —

ادبیات اس بیان سے بالا تر چیز کو احاطہ کرنے کے لئے زبان میں خصوصیت کے ساتھہ دو چیزوں کو ملایا کرتا ہے ۔ایک شبیہہ کو اور دوسرے موسیقی کو —

زبان کے ذریعے جو چیز بیان نہیں کی جا سکتی اُسے تصویر کے ذریعے بتلانا پڑتا ہے ۔ ادبیات میں اس طرح کی مصوری کی کوئی حد نہیں ۔ جذبات ، تشبیہہ ، مقابلہ اور صنائع بدائع کے ذریعے سے پیش نظر ہونا چاہتے ہیں ۔ " دیکھوی بارے آنکھوی پانکھوی دھائے " یعنی دیکھنے کے لئے آنکھہ یہ پرندہ (آنکھہ کا پرندہ) دوڑتا ہے ۔ اس ایک بات میں شاعر بلرام داس نے کیا کچھہ نہیں کہہ دیا ۔ صرف بیان کرنے میں بے چین آنکھوں کے اضطراب کا اظہار کس طرح کیا جا سکتا ہے ۔ اظہار پرندے کی طرح اڑ کر دوڑی ہے اور پل بھر میں اس تصویر سے اس کے بیان کی بے چینی کو بڑی حد تک اطمینان ہو گیا ہے —

اس کے علاوہ بحروں میں ، لفظوں میں اور فقرہ بندی میں ادبیات کو موسیقی کا سہارا تو لینا ہی پڑتا ہے ۔ جس چیز کو کسی طرح بیان نہیں کیا جا سکتا اُسے موسیقی کے ذریعے کہنا پڑتا ہے ۔ جو چیز معنی کی تشریح کرنے پر بالکل معمولی سی معلوم ہوتی ہے وہی موسیقی میں آ کر غیر معمولی بن جاتی ہے ۔ یہ موسیقی ہی الفاظ میں درد پیدا کر دیتی ہے —

اس لئے مصوری اور موسیقی ہی ادبیات کے اصل اسباب ہیں ۔۔ مصوری جذبات کو مشکّل کرتی ہے اور موسیقی ان میں تحریک پیدا کرتی ہے ۔ تصویر جسم ہے اور موسیقی روح ہے —

لیکن صرف انسان کا دل ہی ادبیات میں مصور کرنے کے قابل نہیں ہے بلکہ انسان کی فطرت بھی ایک اس طرح کی تخلیق ہے جو بے جان مخلوق کی طرح ہمارے احساسات کے ذریعے ہمارے قابو میں نہیں آتی ۔ وہ صرف

" کھڑے " ہوجاؤ کہنے سے کھڑی نہیں ہو جاتی ' وہ انسان کے لئے بے انتہا حیرت پیدا کرنے والی چیز ہے - لیکن اُس کو (باڑے) کے جانور کی طرح باندھ کر ایک بڑے پنجرے میں بند کرکے ٹکٹکی لگا کر دیکھنے کا کوئی آسان طریقہ نہیں ہے انہیں سخت قانونوں سے بالاتر عجیب و غریب انسانی فطرت ہے - ادبیات اسی کو اندر کی دنیا سے باہر لاکر قیام کی شکل دیتا ہے - یہ بے انتہا نا قابل فہم کام ہے کیونکہ انسانی فطرت دوامی اور یکساں رہنے والی نہیں ہے - اُس کے بہت سے حصے اور طبقے ہیں - اس کے اندر باہر بے روک ٹوک آمد و رفت کرنا آسان نہیں ہے - اس کے علاوہ اس کی نمود و نمائش (لیلا) اتنی باریک اتنی نا قابل فہم اور ایسی دفعتاً ہونے والی ہوتی ہے کہ اُسے پورے طور پر ہمارے دل میں بٹھا دینا غیر معمولی قوت کا کام ہے - ویاس ' والمیکی ' کالیداس وغیرہ یہی کام کرتے آئے ہیں —

اگر ہمارے اس سارے مضمون متذکرہ کو مختصر طور پر کہا جائے تو یہی کہنا پڑے گا کہ ادبیات کا مضمون انسانی دل اور انسانی فطرت ہے —

لیکن انسانی فطرت کہنا بھی گویا ضرورت سے زیادہ ہے در اصل باہر کی قدرت اور انسانی فطرت انسان کے دل کے اندر ہر لمحہ جو شکل اختیار کرتے ہیں ' جس نغمے کو بلند کرتے ہیں زبان میں احاطہ کی ہوئی وہی تصویر اور وہی نغمہ ادبیات ہے —

خدا کی مسرت قدرت اور انسانی فطرت میں اپنے آپ کو پیدا کر رہی ہے - انسان کا دل بھی ادبیات میں اپنے آپ کو پیدا کرنا اور نمایاں کرنے کی کوشش کر رہا ہے - اس کوشش کی کوئی حد نہیں ہے یہی ایک عجیب بات ہے - شاعر انسانی دل کی اس دوامی کوشش کا صرف ایک معمولی توسط ہے —

خدا کی مسرت کا وجود اپنے اندر سے خود بخود نکل رہا ہے - انسانی

دل کی مسرت کا وجود اسی کی صدائے بازگشت ہے - اسی دنیاوی وجود کے نغمۂ مسرت کی جھنکار ہمارے دل کی بین کے تاروں کو آئے دن مرتعش کرتی رہتی ہے - یہی جو دلی نغمہ ہے ' خدا کی قدرت کے جواب میں ہمارے اندر جو قدرت نمایاں ہوتی ہے ' اس کا ارتقا ادبیات ہے - دنیا کی سانس ہمارے دل کی بانسری میں کس راگنی کو بجا رہی ہے ادبیات اُسی کو صاف طور پر ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے - ادبیات کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں ہے اور نہ اُس کی ملکیت ہے جو اُسے بناتا ہے وہ تو خدائی زبان ہے - باہر کی دنیا جس طرح اپنی اچھائی برائی اپنی غیر تکمیل یافتگی کو لے کر ازل سے نمایاں ہونے کی کوشش کر رہی ہے اسی طرح یہ خدائی زبان بھی ملک ملک میں زبان زبان میں ہمارے دل کی اندرونی لہتوں سے باہر آنے کے لئے لگا تار کوشش کر رہی ہے —

‡*‡

آزاد بدایونی کے متعلق غلطی کی اصلاح اور بعض آن پڑھ شاعروں کے حالات

از

" قمر " بدایونی

(ہم جناب قمرالحسن صاحب قمر بدایونی کا ممنون ہیں کہ انہوں نے آزاد بدایونی کے حالات کے متعلق مصنف سے جو بعض غلطیاں نا واقفیت کی وجہ سے ہوگئی تھیں اُن کی اصلاح اس مضمون میں فرمادی ہے اور اسی ضمن میں بعض ان پڑھ شعرا کے دلچسپ حالات بھی درج فرما دئے ہیں جو شکر گزاری کے ساتھہ درج کئے جاتے ہیں - اڈیٹر)

رسالہ " اردو " مطبوعہ جولائی سنہ ۲۹ ع میں " اردو کے آن پڑھ شاعروں " کا تذکرہ شروع کیا گیا ہے - اس میں " آزاد بدایونی کے متعلق فقرات مندرجہ ذیل قابل تصحیح ہیں —

(۱) " یہ امی شاعر قصبۂ بدایوں میں پیدا ہوا نہایت وارستہ طبیعت و آزاد مزاج تھا "

(۲) " خاندان میں لوہاری کا کام چلا آتا تھا اسے بھی یہی پیشہ تعلیم کیا گیا "

(۳) " مسلم هوسٹل اله اباد میں صحبت مشاعره تهی ... جناب " آسی " بهی بغرض شرکت مشاعره گئے تهے وهاں جناب قمر بدایونی سے ملاقات هوئی اور آزاد کا تذکره چهڑا ... "

تصحیح

(۱) آزاد مرحوم زیاده پڑهے لکهے نهیں تهے -- لیکن اپنی غزل اپنے هاتهه سے لکهه سکتے تهے -- ایک کتاب (غالباً زهر عشق) ان کے هاتهه کی لکهی هوئی ان کے صاحبزاده خان بهادر منشی احمد علی خاں صاحب " میکش " کے پاس موجود هے —

(۳۵۲) لوهارو سے ان سے کوئی تعلق نهیں تها -- اس مغالطه کی وجه غالباً یه هے که جب مجهه آسی صاحب نے ظریف اور هزل گو شعرا کا تذکره لکهنے کا ذکر کیا تها تو میں نے کاظم لوهار کا ذکر کرتے هوئے جو آزاد کے هم عصر تهے ان سے یه وعده کیا تها که بدایوں پهونچکر ان کے اشعار تلاش کروں گا اور اسی سلسله میں آزاد کا یه شعر سنایا تها جو رساله اردو میں شایع هوا هے -- ؛ آسی ' صاحب کے حافظے نے ان دو شاعروں کے حالات کو ایک هی ذات میں جمع کر کے محفوظ کرلیا - اور یه ایک اتفاقی غلطی هے مگر قابل تصحیح —

آزاد بدایونی کے صحیح حالات

" آزاد " مرحوم کا تذکره مختصر طور پر میں نے به سلسله مرحوم شعراء بدایوں " تجلیات سخن " کے مقدمے میں کیا هے - ان کا نام محمد علی خاں اور ان کے والد کا نام قادر خاں تها - بدایوں محله چاهسور کے ساکن تهے ان کا مکان اور خاندان اچهی حیثیت میں اب تک موجود هے - کلام ظریفانه نه تها - اور باوجود کم علمی کے شعر خوب کهتے تهے اور اگر کوئی قدیمه انام کرنے میں یا جدت کی رو میں کوئی ایسا مضمون جو اپنی کسی خصوصیت سے

ظرافت کی حد کے قریب پہونچ جائے جیسا کہ میں ان کے ایک شعر میں دکھاؤں گا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کا نام ظریف شعرا کی فہرست میں لکھ لیا جائے - کیونکہ یہ جدت بعض بعض موقعوں پر اچھے اچھے شاعر کر گزرتے ھیں مثلاً مرزا داغ مرحوم کا یہ مصرعہ " ایسے کے دولکائے بھگو کر شراب میں" مرزا غالب مرحوم کا یہ شعر - " دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں - ہم ھی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن " یا منیر شکوہ آبادی کے کلام میں - " ڈولی آتی ھےان کےکونے کی پھول تکتے ھیں راہ دونے کی " یا " اب کے سکان کوئے صنم بھیرئےھوے-" علی هذا سارےکھوتر آپ کےکلپوتئےھوے " اسی جدت یا زور طبیعت کی رو کے نمونے ھیں - آزاد مرحوم کا انتقال سنہ۱۲۷۶ ھ مطابق سنہ ۱۸۵۹ ع میں ھوا —

رسالہ اردو مذکورۂ بالا میں " آزاد " کا یہ مقطعہ درج ھے —

آزاد کی ھے خانہ بدوشی کا یہ عالم کا ندھے پہ لئے پھرتے ھیں چھپر کئی دن سے

اس کے متعلق یہ واقعہ مشہور ھے کہ جب مشاعرے میں آزاد نے مقطع کا دوسرا مصرعہ پڑھا تو قافیہ بجاے چھپر کے بستر تھا مگر یاران طریقت نے تعریف کے سلسلہ میں جب اس کو دھرایا تو بستر کی جگہ چھپر ترمیم کردیا اور یہ ترمیم اس قدر مقبول ھوئی کہ مقطعہ اسی طرح زبان‌زد عام ھوگیا . یہ روایت ان لوگوں کی ھے جو ان کے ھمعصر تھے اور اب تک زندہ ھیں - اس غزل کا مطلع یہ تھا —

شہرہ ترےوحشی کاھے گھرگھرکئی دن سے کوٹھوں‌پہ چلےجاتے ھیں پتھرکئی‌دن سے

آزاد مرحوم شعر اوائل عمری ھی سے کہتے تھے چنانچہ اسی زمانے میں اپنے ایک ہم سن دوست کی تلاش اور ان کے نہ ملنے کا حال اس شعر میں نظم کیا ھے :—

مکانِ حشر میں کوچہ میں اور طویلے میں کہاں کہاں ترا وحشی تجھے پکار ایا

مکان حشر سے مولوی رسول بخش حشر بدیوانی کا مکان کوچہ سے ایک محلہ کی مشہور گلی جو اسی نام سے مشہور ہے اور طویلے سے ایک مکان جو پہلے طویلہ تھا مراد ہے - آزاد مرحوم کا کلام باوجود اچھا کلام اور کافی ذخیرہ ہونے کے تلف ہوگیا - مذکورہ بالا اشعار کے علاوہ ذیل کے اشعار بھی مجھے یاد ہیں —

خلعت برہنگی کا جو بخشا بہار نے دست جنوں لگے میرے کپڑے اتار نے

داغ کی ایکے سپرھاتھہ میں آھی نکلا آپ کے باغ کا لالہ بھی سپاھی نکلا

کاظم اوھار کے اشعار با وجود تلاش کے مجھے دستیاب نہ ہوسکے - اگر اس سلسلے میں اضافہ کرنا مقصود ہو تو بدایوں کے آن پڑھ شاعروں میں ایک گھر کے تین شاعروں کا کلام اور حالات حسب ذیل ہیں :—

"غالب" - غالب علی نام تھا - ایک کامل فن سرقباز تھے - آخر میں کباب وغیرہ بیچکر بسر اوقات کرتے تھے لیکن جوتا ٹوپی بلکہ پگڑی تک سے درست رہتے تھے - شاعری کا شوق نہیں تھا البتہ چست فقرے اور برجستہ جملے روز مرہ میں داخل تھے اور اسی رو میں اپنی ضرورت کے مطابق وقتی شعر بھی کہہ اٹھتے تھے - پڑھے لکھے نہیں تھے مگر چونکہ قاضی ٹولہ کے رہنے والے تھے جو ذی علم شرفا کا مخصوص محلہ ہے اس لئے صحبت لفظی اور تہذیب و سلیقہ سے محروم نہ تھے - اور کسی قدر حرف شناس بھی تھے - ایک صاحب جن پر کبابوں کے دام آتے تھے بہ سلسلہ تلاش ملازمت جھانسی جارھے تھے - غالب علی نے ان کی روانگی کے وقت اپنے داموں کا تقاضا کیا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ انہوں نے جھانسی پہونچکر ان کے دام بھیجنے کا وعدہ کرتے ہوئے مزید احتیاط کے خیال سے یاد دہانی کے لئے

اپنا پتہ لکھہ کر غالب علی کو دیدیا ۔ غالب علی نے اس کو غور سے دیکھا
تو لفظ جھانسی پر نظر پڑی فوراً ان کا ہاتھہ پکڑ کر بولے "آپ تو جہان
سے جاتے" ہیں میں یاد دھانی کہاں کرونگا ۔ اسی طرح ایک صاحب اُن کے
مقروض تھے جب اُن سے تقاضا کیا گیا تو انہوں نے یہ وعدہ کیا کہ
علےالصباح میرے مکان پر آکر اپنے پیسے لیجانا ۔ یہ حسب وعدہ مکان پر
پہونچے تو وہ نہیں ملے ۔ دوسرے وقت پھر تقاضا کیا تو مقروض صاحب نے
کہا میں صبح کی اذان سنتے ہی ٹہلنے کو نکل جاتا ہوں تم ایسے وقت
آؤ کہ اذان میرے دروازے پر سنو ۔ غالب علی دوسرے دن صبح کی
اذان سے آدھہ گھنٹہ قبل ان کے دروازے پر پہونچے اور اذان کہنی
شروع کر دی ۔ اور چونکہ شیعہ مذہب رکھتے تھے اس لئے شیعوں کی
اذان کہی ۔ اس محلے میں شیعوں کی ایک ہی مسجد ہے اور وہ
بھی اس موقع واردات سے دور ۔ یہہ غیر معمولی اور قبل از وقت اذان
سنکر پاس پڑوس کے لوگ اپنے گھروں میں سے نکل آئے ۔ غالب علی کو
سخت سست کہا تو یہ قصہ معلوم ہوا اور ایک بزرگ نے اپنے پاس سے وہ
[illegible]
اور یہ ترمیم اس قدر مقبول ہوئی کہ [illegible] طرح [illegible] برس [illegible] دینے کی
قرضہ ادا کرتے ہوئے [illegible]
سختی سے ممانعت کردی ۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں
اسی قسم کی ضرورتوں سے کبھی کبھی غالب علی شعر بھی کہتے تھے اور
غالب تخلص کرتے تھے ۔ ۶ ۔ ۷ برس ہوئے ہونگے کہ ان کا انتقال ہوگیا
ساٹھہ اور ستر کے درمیان عمر پائی دو شعر مجھے یاد ہیں ۔

نقد کوئی نہ لے تو کیا کیجے آج ' غالب ' اُدھار ہی دیجو
بادل گرج رہا ہے یہ طوفان آب ہے غالب ہمارے برت کی مٹی خراب ہے

بد قسمتی یا خوش قسمتی سے ان کے دونوں لڑکے بھی شاعر ہوئے

جو بقیہ حیات ہیں —

غالب علی کے بڑے لڑکے جن کی عمر پچاس سے دو ایک برس زائد ہے - واحد علی نام - باپ نے برسوں مکتبوں میں پڑھوایا مگر وہ تشریح الصروف سے آگے نہ بڑھے جب سن شعور کو پہونچے تو ایک آوارہ عورت پر عاشق ہو گئے - دھن عشق میں شاعری شروع کر دی اور داغ تخلص اختیار کیا بیشتر بے تکے اشعار کہتے تھے اور عجیب عجیب طرح سے ان کا مطلب بیان کرتے تھے - مثلاً - ایک شعر تصنیف کیا - " کیا چاند میں بیٹھی ہے نرالی مگر بڑھیا - اس سبزی مائل سا قیا رخسار کو دیکھو "- لوگوں نے مطلب پوچھا تو چاند میں چرخہ کاتنے والی بڑھیا کو اپنی محبوبہ کی مادر مرحومہ اور چاند کی روشنی میں سبزی کی رمق کو سبزہ رخسار سے منسوب کرکے مطالب کا طومار باندھ دیا - کسی نے پوچھا کہ آپ کی محبوبہ کو سبزۂ رخسار سے کیا علاقہ تو فرمانے لگے اس سے نہ سہی ہم سے تو علاقہ ہے وہ ہمیں ساقیا رخسار سمجھتی ہے یہ مصرعہ ہم نے اس کی طرف سے لکھدیا - غرض اس قسم کے اشعار تو ہزاروں تھے جو نہ کسی دوسرے کو یاد رہ سکتے تھے نہ اب انھیں یاد ہیں - البتہ اسی زمانہ کی شاعری کا ایک کارنامہ قابل ذکر ہے ایک موقع پر ایک اچھے خاصے شاعر سے سازش کرکے واحد علی صاحب کا مقابلہ کرا دیا گیا اور ایک طرح تجویز کرکے فی البدیہ شعر لکھنے کی فرمائش کی گئی - طرح کا مصرعہ یا ردیف و قافیہ یہ تھا —

" توڑ ڈالے سبو تڑاق پڑاق ' - اس مقابلے میں اپنے حریف کے شعر لکھنے سے بلکہ شعر لکھنے کے لئے سنبھلنے سے پہلے واحد علی صاحب نے ذیل کا شعر سنا دیا —

رات غصہ میں آ کے ساقی نے   توڑ ڈالے سبو تڑاق پڑاق

غالب علی کے دوسرے لڑکے

کا نام واجد علی ہے پہلے ' ناسخ ' اس کے بعد ' راسخ ' تخلص تھا اور اب واجد ہے یہ بھی پڑھے لکھے نہیں ہیں لیکن حرف شناس ہیں کچھ الٹا سیدھا لکھ بھی لیتے ہیں اور صاف لکھا ہوا ہو تو پڑھ بھی سکتے ہیں ان کی طبیعت شاعری کے لئے زیادہ موزوں ہے - اکثر مشاعروں میں بھی شریک ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی وقت گزاری کے لئے مشاعرہ شروع ہونے سے قبل یا مشاعرہ شروع کرنے کے لئے ان کی غزلیں سننے کی نوبت آ جاتی ہے - گرمیوں میں برف خانوں میں چاء بیچکر بسر اوقات کرتے ہیں - برسات کے موسم یا خالی وقت میں ضرورتوں سے مجبور ہو کر زنانہ سواریوں کا دستی ٹھیلہ بھی چلاتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنا ٹھیلہ لے کر بریلی بھی چلے جاتے ہیں اور وہاں رہ کر بھی ٹھیلہ چلاتے ہیں - آج کل ان کا ٹھیلہ بریلی میں کرایہ پر چلتا ہے - تقریباً تیس سال کی عمر ہے بریلی کالج کے ایک مشاعرے میں شریک ہو کر غزل بھی پڑھ چکے ہیں - کبھی کبھی فلاس سے بھی دل بہلا لیتے ہیں - طبیعت تیز اور ذہن رسا پایا ہے - اس لحاظ سے خلف الرشید ہیں مگر باپ کی طرح پوشش کا لحاظ دونوں میں سے ایک کو بھی نہیں ہے - جوتا نہ ہو تو پروا نہیں - ٹوپی نہ ہو تو نہ ہو - ان قیدوں سے آزاد ہیں ان کے اشعار میں ان کے پیشے اور ان کے شوق کا بھی ذکر آ جاتا ہے —

کلام

ایک مشاعرے کی مختصر صحبت میں انھیں چاء کا ٹھیکہ دیدیا گیا تھا اس کا حساب ہوا تو فی البدیہہ یہ شعر پڑھا —

پیالے تیس پئیں بیس ہم کو پیسے ہیں ہماری جان الٰہی بڑے عذاب میں ہے

ایک مصرعہ طرح کی شکایت میں سر مشاعرہ یہ شعر پڑھا —

دی ہے مہمل یہہ طرح سوچکے جس نے " واجد "
اس میں لکھینگے غزل بھی وہی حضرت نہ کہ میں

اپنا فصلی پیشہ تبدیل کرنے کے متعلق فرماتے ہیں —

جب تلک سردی رہی تو چاء میں ڈوبا رہا
گرمیاں آئی ہیں " واجد " برت کا سامان کر

فلاس کھیلتے وقت جب شاعری زور پکڑتی ہے تو اس قسم کے شعر بھی تصنیف کرتے اور پڑھتے رہتے ہیں —

چال اک آنے کی ہے تو کررہا ہے کیا غضب
تکیوں کا جوڑ بورا (*) پھینک ہارا جانکر
ہاتھہ دھپل (+) پر سرا اٹھوا دیا بیرحم نے
آگئے گھاٹے میں ہم شیخا (‡) کا کہنا مانکر

ان کا کلام کافی تعداد میں ہے مگر سب حفظ ہے مشاعرے کی غزل کسی سے نقل کروا لیتے ہیں اور مشاعرے کے بعد کسی قدردان کو بخش دیتے ہیں - اکثر بیوقوت شعرا نے اصلاح لینے پر توجہ دلائی مگر کسی کی درخواست کو شرف قبولیت نصیب نہ ہوا - بریلی کالج کے مشاعرے کی غزل پر نمونہ کلام کا خاتمہ ہے —

غالباً سنہ ۱۹۲۸ کے مشاعرے میں یہہ غزل میری موجودگی میں پڑھی تھی جب کہ ان کا قیام بریلی ہی میں تھا —

(*) " بورا " - ایک شریک تفریح کا نام (+) " دھپل " فلاس کی یا اس قبیل کی ایک اصطلاح جس سے دھوکا مراد ہے (‡) شیخا - ایک ہم مشرب جلیس کا نام —

غزل

یاد اللہ کی ہم شام و سحر رکھتے ہیں — مہر کی ہم پہ ہمیشہ وہ نظر رکھتے ہیں
ان پہ ہم اپنی محبت کا اثر رکھتے ہیں — ہم پہ وہ لطف و عنایت کی نظر رکھتے ہیں
کس قدر ہے مرے ارمان و تمنا کا ہجوم — دیکھنا ہے وہ جنازے کو کدھر رکھتے ہیں
درد اٹھانے کے لئے ضعف بٹھانے کے لئے — تیرے بیمار کی یہہ دونوں خبر رکھتے ہیں
چھوٹکر قید قفس سے میں اُڑوں کیسے اُڑوں — پہلے ہی سے وہ پر و بال کتر رکھتے ہیں
میرے قاسم نے عطا کی مجھے خازن قسمت — میرے مقسوم میں 'واجد' وہ کسر رکھتے ہیں

میں نے یہہ غزل حاصل کرنے کے لئے آج بلایا تو یہہ شعر لکھا دئے اور فرمایا اُس کے اور شعر بھی ہیں جو اس وقت یاد نہیں آتے اس سلسلے میں ایک ان پڑہ شاعر کا ایک زبان کار نامہ مجھے یاد ہے اگر ان کے حالات شائع بھی ہوئے ہوں لیکن یہہ کار نامہ شامل حالات ہونے سے رہجائے تو نا قابل تلافی فرو گزاشت ہوگی - وھوھذا —

ایک دھلی کے شاھزادے جو بفضلہ بقیہ حیات ہیں مرزا چپاتی کے نام سے مشہور ہیں (ان کا نام نامی میں بھول گیا) مگر میں نے ان کو دیکھا ہے - پچاس ساٹھہ کے درمیان عمر ہوگی - زباں میں لکنت ہے پڑھے لکھے بالکل نہیں ہیں (یا شاید حرف شناس ہوں) پتنگ اور تکل بنانے میں کمال رکھتے ہیں کبوتر پالنے اور ان کا رنگ بدلنے یا اُنہیں حسب مراد رنگیں بنانے میں استاد ہیں - گردش زمانہ سے یہی کمالات ان کا ذریعہ معاش ہیں - زیادہ کہنے سننے سے مقامی مشاعروں میں بھی شریک ہوجاتے ہیں - دھلی کے شاھی دربار تاج پوشی منعقدہ سنہ ۱۹۰۳ ع میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کی طرح یہہ تھی —

سر عدو کا ہو نہیں سکتا مرے سر کا جواب

اس مشاعرے میں مرزا " داغ " مہر مہدی " مجروح " جناب " ظہیر " و مولانا " راسخ " وغیرہ ہم اساتذہ شریک تھے اور مصرعہ طرح کی گرہ لازمی قرار دی گئی تھی چنانچہ ہر شریک مشاعرہ شاعر نے اس شرط کی پابندی کی لیکن مرزا چپاتی کی گرہ سب سے بہتر تھی اور اس کا اعتراف اساتذہ نے سر مشاعرہ کیا تھا - مرزا چپاتی کا وہ شعر ملاحظہ ہو —

شہ نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے　　سر عدو کا ہو نہیں سکتا مرے سر کا جواب

کسی نے سچ کہا ہے —

تو دبنے پہ آئے تو اے رب کریم　　جو چاہے جسے پہاڑ کے چھپر دیدے

تبصرے

تبصرے

ادب

بہار گلشن کشمیر جلد اول

(مرتبہ و مولفۂ پنڈت برجکشن کول صاحب بے خبر و پنڈت جگموہن
ناتھہ رینہ صاحب شوق- مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد - صفحات ۷۶۰)

کشمیری پنڈت اپنی حسن صورت و سیرت اور ذہانت و فطانت کی وجہ سے خاص امتیاز رکھتے ہیں اور خصوصاً ہندوستان میں آکر ان کے جوہر خوب کھلے ہیں- انہوں نے ملک کی تہذیب و شایستگی اور ادب کی ترقی میں قابل تعریف کام کیا ہے- گو ان کی تعداد کم ہے- لیکن حسن قابلیت اور کمال کی وجہ سے وہ جہاں کہیں بھی ہیں صف اول میں نظر آتے ہیں —

بہار گلشن کشمیر جس کا دوسرا نام تذکرہ شعرائے کشمیری پنڈتاں ہے ان کے ادبی کمال کے ثبوت میں کافی شہادت ہے- پنڈت جگموہن ناتھہ رینہ صاحب شوق نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ان شعرا کا کلام اور حالات جمع کئے ہیں- اس کا اندازہ کتاب کے پڑھنے کے بعد ہوسکتا ہے- اس میں فارسی اردو دونوں زبانوں کے شاعر ہیں اور قدیم سے لیکر زمانۂ حال تک تمام شاعر آگئے ہیں اس ممتاز فرقے کا شاید ہی کوئی شاعر شوق صاحب کی نظر سے بچا ہوگا- شوق صاحب نے اس معاملے میں بڑی دیانت سے کام لیا ہے- بعض ایسے شاعر تھے کہ ان کا

کلام کسی بیاض وغیرہ میں ملا مگر ان کا حال دستیاب نہیں ہوا تو انہوں نے اسے آئندہ تحقیق کے لئے اٹھا رکھا اور اس کتاب میں درج نہیں کیا -

قابل مولف نے جہاں تک ان کی دسترس تھی شعرا کے حالات دریافت کرنے اور کلام تلاش کرنے کی کوشش کی ہے - ترتیب حروف ابجد کے لحاظ سے رکھی ہے - اس پہلی جلد میں حرف ' ظ ' تک پہنچے ہیں - باقی دوسری جلد کے لئے ہیں -

مولف نے صرف حالات اور کلام کے جمع کرنے پر اکتفا کیا ہے - کلام کے حسن و قبح سے بحث نہیں کی اور تنقید کی الجھن میں نہیں پڑے یہ انہوں نے ناظرین کے ذوق پر چھوڑ دیا ہے -

کتاب ختم ہو جانے کے بعد جن شعرا کے مزید حالات وغیرہ دستیاب ہوے یا نئے شعرا کا پتہ لگا تو وہ بطور ضمیمہ کے اضافہ کردئے گئے ہیں - چندر بھان برہمن کے حالات اصل کتاب نیز ضمیمے میں درج ہیں - برہمن کی کئی تصانیف کا ذکر تو کیا ہے اور ایک کتاب " انشاء چہار چمنی " کا ذکر مرزا سلطان احمد صاحب کے حوالہ سے کیا ہے - یہ چہار چمنی نہیں بلکہ چہار چمن ہے - ضمیمے میں ان کے دیوان اور مثنوی کا ذکر ہے لیکن ان کے علاوہ برہمن کی ایک نہایت عمدہ انشا " منشات برہمن " کے نام سے ہے - نیز تحفۂ انوار ' کار نامہ و تحفۃالفور اور جمع‌الفقرا بھی اس کی تالیفات سے ہیں - " منشات برہمن " میں بادشاہ کے نام کے عرائض اور وہ خطوط جو امرا اور بزرگوں اور عزیزوں کے نام لکھے تھے درج ہیں - ان کی عبارت بہت پاکیزہ اور رنگین ہے اور جگہہ جگہہ غزلیں اور حکیمانہ نکات بھی درج ہیں -

کتاب ایسی نفیس صاف ستھری اور اعلی درجے کی چھپی ہے کہ دیکھے سے جی خوش ہوتا ہے اور کاغذ اور جلد بھی نہایت عمدہ ہے - جن شعرا کے فوٹو مل گئے ہیں ان کی تصویریں بھی بہت خوبی سے چھاپی گئی ہیں -

غرض یہ کتاب ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے اور قابل مولف کی محنت اور ذوق لائق داد ہے -

کتاب ڈاکٹر سر سپرو کے نام معنون کی گئی جو اپنی ادیبانہ قابلیت کی وجہ سے اس کے مستحق تھے —

غالب اور مومن

(از مولانا حکیم سید اعجاز احمد صاحب حجم ۶۴ صفحے
قیمت آٹھ آنے - دائرہ علمیہ فیض آباد)

یہ رسالہ " مولانا حکیم سید اعجاز احمد صاحب معجز سہوانی - منشی فاضل و مولوی فاضل پنجاب" کے زور قلم کا نتیجہ ہے - آپ کے ہم وطن' حضرت 'نکہت' (سہواني) نے جن کے القاب مصنف سے بھی بڑھ چڑھ کر تحریر کئے گئے ہیں ' ایک " محققانہ " تبصرہ لکھکر اس "محققانہ " موازنے کا وزن بڑھایا ہے - اصل مقصد غالباً " مومن " خاں مرحوم کے محاسن کلام کو بیان کرنا تھا - " غالب " کی تنقید و تنقیص محض تصویر کا رنگ چمکانے کے لئے ضروری سمجھی گئی - لیکن موازنے کی غرض سے " غالب " کے جو اشعار چنے گئے ہیں ' ان میں ایسی نا انصافي یا نا واقفیت سے کام لیا ہے کہ کتاب کی وقعت نظر سے گر جاتی ہے - تبصرہ نگار صاحب تو یہاں تک جوش میں آئے کہ "غالب" کو "ذوق" و "مومن" جیسے استادوں کے مقابلے میں لانے کے قابل ہی نہیں سمجھتے بلکہ اردو شاعر تسلیم کرنے میں بھی متامل ہیں - قریب قریب وہی سب اعتراضات رسالے میں دھرائے گئے ہیں جو پچاس برس پہلے دھلی سے بازاری مرزا صاحب کے کلام پر کیا کرتے تھے - سب سے زیادہ ناراضی اس کے مُغلق و عسیرالفہم ہونے پر ظاہر کی ہے لیکن اس نکتہ چینی کے تو لائق مصنف کے ممدوح کا کلام بھی پاک و بری نہیں بلکہ بڑی مشکل یہ ہے کہ ان کے معمے حل کرنے کے بعد بھی " حاصل " کی صرف حسرت باقی رہ جاتی ہے - بے شبہ ان کے چیدہ اور صاف اشعار اپنے رنگ میں لاجواب ہیں - ان کی نازک خیالی اور رنگین بیانی میں کسی سخن شناس کو کلام نہیں ہوسکتا مگر اپنی ذہانت و جدت پسندی کے با وجود " مومن " اسی رسمی تغزل کی زنجیروں میں قید ہیں ' جس نے دو صدی تک ہماری شاعری کو محض ایرانی غزل نویسوں کی نقالی بنائے رکھا - اور حضرت " معجز " یا ان کے دوسرے ہم خیال کتنی ہي سینہ کوبی کریں ' عہد جدید کے تعلیم یافتہ

اہل ذوق ' شعر کے فن لطیف کو کبھی اس چھوٹی عاشقی اور شرمناک امرد پرستی کے مضامین تک محدود سمجھنے پر آمادہ نہ ہونگے جو ایک مدت سے ہمارے شعرا کا سرمایۂ فخر و مباہات رہا اور اب ہماری ساری تہذیب و اخلاق کے چہرے پر سیاہ داغ نظر آتا ہے - قادرالکلام اردو شعرا میں مرزا " غالب " پہلے شخص ہیں جن کی نگاہ بارہا امارد اور شاہدان بازاری کے کوٹھوں سے ہٹ کر انسانی زندگی کے دوسرے نازک و پیچیدہ تر مسائل تک پہنچتی ہے اور وہ نہایت لطیف اور فلسفیانہ انداز میں ان پر رائے زنی کر جاتے ہیں - یہی وہ خصوصیت ہے جس کے باعث زمانۂ حاضرہ کے اہل نظر ان کے اس درجہ گرویدہ و معتقد پائے جاتے ہیں - لائق مصنف رسالہ اور ان کے دوست نکہت صاحب اس خیال کو پیش نظر رکھکر غور فرمائیں گے تو عجب نہیں کہ انہیں بھی غالب اور اپنے دوسرے ممدوحوں کے کلام میں اس فرق عظیم کا مشاہدہ ہوجائے جسے دیکھنے سے وہ اب تک معذور و محروم رہے —

لائق مصنف مرزا غالب کی زبان دانی اور دہلوی نہ ہونے پر بھی منہ آئے ہیں اور شہادت میں " طبا طبائی " صاحب کا قول پیش کیا ہے - لیکن زبان دانی کے اگر ان پرانے اور بھولے ہوئے معیاروں سے کام لیا گیا تو ہمیں خوف ہے کہ سہوانی نقادوں کو اردو زبان کی شاعری کے متعلق کسی طرح لب کشائی کا حق نہیں باقی رہے گا - فتدبر —

(ش)

انار کلی

(از سید امتیاز علی صاحب " تاج " - دارالاشاعت - لاہور)

اس المیہ میں شہزادہ " سلیم " اور " انار کلی " کی باہمی محبت اور اس کے تلخ انجام کو بیان کیا گیا ہے - " انار کلی " کے افسانے کی

تاریخی صداقت اب تک ثابت نہیں ہوئی لیکن روایتاً یہ قصہ اس قدر عام رہا ہے کہ اس کی تہ میں ضرور کوئی نہ کوئی حقیقت ہوگی قصہ یہ ہے کہ 'اکبر' کے حرم میں نادرہ بیگم یا شرف النسا بیگم ایک کنیز تھی جسے شہنشاہ نے " انار کلی " کے خطاب سے سرفراز کیا تھا - " شہزادۂ " سلیم " کا عنفوان شباب تھا - " انار کلی " کے حسن و رعنائی نے اسے اپنی طرف مائل کیا - عشق رسمی فرق مراتب سے بے نیاز ہوتا ہے - " انار کلی " ویسے تھی تو ادنیٰ کنیز لیکن " سلیم " کی نظر میں اس کا رتبہ کچھ اور ہی ہوگیا تھا - ایک دن ہونے والی بات اکبر نے شیش محل میں ان دونوں کو اشارۂ و تبسم کرتے دیکھ لیا - دیکھنا تھا کہ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی - " سلیم " کے اخلاق اور ' انار کلی کی جرات سے اسے یہ توقع نہ تھی - برہمی کے عالم میں حکم دیا کہ ' انار کلی ' کو زندہ دیوار میں چن دیا جائے —

یہاں تک تو یہ افسانہ ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ' سلیم ' نے ' انار کلی ' کا مقبرہ اپنے زمانۂ حکومت میں بنوایا - اس کا تعویذ سنگ مرمر کی بڑی سل سے بنا ہوا ہے اور اس عہد کی سنگ تراشی کے عمدہ نمونوں میں اس کا شمار ہوتا ہے —

مصنف نے اس المیہ کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے پہلے باب میں ' سلیم ' اور ' انار کلی ' کی ابتدائی محبت کا حال ہے - اس باب میں چار منظر ہیں - دوسرے باب میں قلعۂ ' لاہور ' کی ایک بزم رقص کا ذکر ہے جس میں ' انار کلی ' کے کمال کا حرم کی دوسری سب کنیزوں پر سکہ بیٹھ گیا اس باب میں بھی چار منظر ہیں —

تیسرے باب میں ' سلیم ' اور ' انار کلی ' کے راز محبت کے طشت از بام ہونے کا حال ہے - اس باب میں پانچ منظر ہیں —

اس ڈرامے کی زبان میں مواقع کا پورے طور پر لحاظ رکھا گیا ہے - روز مرہ کی جگہ روز مرہ اور جہاں زور بیان کی ضرورت ہے وہاں اسے برتا گیا ہے ہمارے خیال میں اس ڈرامے کو ایکٹ کرنے میں کوئی بات مانع نہیں —

لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے - عبدالرحمن صاحب چغتائی کی پانچ تصاویر بھی ہیں جو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں بنائی ہیں —

(ی)

نغمۂ روح

(از اختر انصاری صاحب دهلوی - مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس - دهلی قیمت ۱۲ آنے) ۔

—

یہ مجموعہ اختر انصاری صاحب دهلوی کے قطعات ' غزلیات اور نظموں پر مشتمل ھے - موصوف کا کلام اسی رنگ میں ھے جو آج کل اقبال کے اثر سے ھماری زبان کے بیشتر نوجوان شاعروں نے اختیار کرلیا ھے - یہ واقعہ ھے کہ ھماری زبان کی تاریخ میں کسی اور شاعر نے اپنی زندگی میں اپنے رنگ اور اپنے طرز کو اتنا کامیاب نہیں دیکھا ' جتنا کہ اقبال نے - بڑے شاعر کی شخصیت زبان کو جہاں بہت سے فائدے پہنچاتی ھے وهاں نقصان بھی پہنچاتی ھے - اس کے هم عصر اس سے ایسے مرعوب هو جاتے هیں کہ وہ جو کچھہ دیکھتے هیں اسی کی نگاہ سے دیکھتے هیں اور جو کچھہ کہتے هیں اسی کی زبان سے - اس مجموعے میں اقبال کے رنگ کی جھلک هر صفحہ پر نظر آتی ھے - لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاهئے کہ اختر انصاری صاحب اپنی ذاتی اپج کو استعمال نہیں کرتے - دراصل جہاں کہیں وہ اقبالی طرز سے هٹتے هیں وهیں ان کے پیرایۂ بیان میں لطف آگیا ھے - بعض قطعے اس مجموعے میں خوب هیں —

"محبت" پر ایک قطعہ ھے : محبت ھے اک خوش نما شوخ کانٹا

جو چبھتا ھے آنکھوں کے پردوں میں پہلے
اتر جاتا ھے پھر وہ دل کی رگوں میں
خلش اول اور بعد میں درد بن کے

" آنسو " پر دوسرا قطعہ ھے : ان آنسوؤں کو ٹپکنے دیا نہ تھا میں نے

کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھہ کے تارے
میں ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی
پہلیں کے قلب میں بن جائنگے یہ انگارے

(ی)

ہندي اردو مالا

(مولفہ پنڈت ہری ہر شاستری پروفیسر انچارج ہندی سنسکرت
جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن - صفحات ۵۵ قیمت دو آنے)

——

یہ ہندی اردو کی دوسری کتاب پنڈت ہری ہر شاستری صاحب نے ان اردو داں طالب علموں کے لئے لکھی ہے جو ہندی سیکھنا چاہتے ہیں - شروع میں حروف کے باہمی جوڑ کا طریقہ بتایا ہے - اس کے بعد ہندی میں آساں سبق مختلف مضامین پر لکھے ہیں - اور اس کے مقابل صفحے پر اول مشکل الفاظ اور ان کے معنے اردو میں دیئے ہیں اور پھر تمام سبق اردو حروف میں لکھ دیا ہے - اس طریقے سے طالب علم بہت آسانی سے بغیر اُستاد کی مدد کے ہندی پڑھ سکتا اور اس میں مہارت حاصل کرسکتا ہے - اس کے بعد چند سبق صرف ہندی میں لکھے ہیں اور شروع میں اُن کے معنے بھی ہندی ہی میں دیے ہیں آخر میں ایک سبق ہندی محاورات کا ہے جن کے مقابل میں اردو ترجمہ بھی لکھ دیا ہے - سب سے آخر میں ہندي اعداد اور رقمیں درج ہیں اردو دانوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے —

شیطان سبھا

(مصنفۂ سید آل حسن صاحب بی - اے ' ایل ایل - بی ' وکیل
مرادآباد عالم بک ایجنسی مراد آباد - صفحات ۳۸ قیمت چار آنے)

یہ مثنوی ملٹن کی مشہور نظم پیراڈائس لوسٹ سے اخذ کی گئی ہے اس میں صرف شیطان اور اس کے ساتھیوں کي تقریریں نظم کي گئی ہیں - ملٹن

کی نظم کی قوت اور شکوہ تو اس میں نہیں ہے تاہم اس مضمون کو سادہ طور سے نظم کر دیا ہے —

یاد گار شیون

(مرتبہ بیضا خان صاحب ' اوسط درجے کی تقطیع ' صفحات ۶۰ ' لکھائی چھپائی اچھی ' ٹمائی برقی پریس اسلامیہ اسکول امرت سر)

—

یہ مختصر کتاب مرزا شجاع خاں شیون مرحوم کے اُردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے ' شیون مرحوم نوجوان شاعر تھے - ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو ضرور ترقی کرتے اور مشہور شعرا کی صف میں جگہ پاتے موجودہ مجموعہ میں اکثر اشعار اچھے ہیں ان میں جدت اور مضمون آفرینی کے آثار پائے جاتے ہیں - زبان بھی صاف پاک ہے —

(چ)

میکدہ

(مجموعہ کلام حضرت منیر واسطی - قیمت مجلد ۱۲ آنے ' غیر مجلد ۸ آنے - منیر دیسی دواخانہ - چوک چونے منڈی لاہور)

—

حضرت منیر واسطی کی اُن نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں - اس میں مختلف ۲۵ نظمیں ' ۶ غزلیں اور چند متفرق اشعار ہیں - جناب منیر کے کلام میں پختگی ہے ' زبان صاف' شستہ اور بیان رواں ہے مضامین میں تنوع ہے - کتاب اچھی چھپی ہے کاغذ بھی عمدہ ہے ' جلد خوش نما ہے —

(چ)

—

فروغ بیان

(مصنفہ جناب شاد صابری صاحب ' سوا سو صفحے ' چھوٹی تقطیع ' قیمت ایک روپیہ ' ملنے کا پتہ :- شاد صابری اور سیر ' میونسپلٹی ' کراچی)

یہ جناب شاد صابری کے کلام کا مجموعہ ہے - اس میں ۱۰۴ صفحوں پر غزلیں ہیں اور بقیہ ۲۰ صفحوں پر نظمیں - اس مجموعہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاد پر جدید انقلاب شاعری کا کم اثر ہوا ہے - وہ برابر پرانے طرز میں غزل گوئی کر رہے ہیں - اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں جو نام و صورت کے لحاظ سے تو جدید معلوم ہوتی ہیں لیکن مضامین کے اعتبار سے ان میں قدیم رنگ کی جھلک نمایاں ہے - غزلیں زبان و بیان کے اعتبار سے اچھی ہیں مضامین میں بھی ایک حد تک تنوع ہے شروع میں حضرت شاد نے خود اپنے حالات اس خیال سے لکھ دئے ہیں کہ آئندہ ان کے متعلق غلط فہمی نہ ہو اور آئندہ قیاس کی بناء پر لوگ ان کی تصویر کو مسخ نہ کردیں - اس کے بعد جناب قمر بدایونی کا مقدمہ ہے - مقدمہ کی تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسو برس قبل کی کسی کتاب سے ترجمہ کی گئی ہے - اس میں اصناف و ارکان سخن کو ارکان دین و ایمان سے تشبیہ دی ہے مثلاً رباعی کو چار مصلوں یا رسول اکرم کے ہر چہار یاران با صفا سے ' مخمس کو پنجتن پاک یا اوقات نماز پنج گانہ سے - غرض شعر و سخن کی عظمت اس تشابہ سے ثابت کی گئی ہے —

شروع میں مصنف نے اپنی تصویر سے کتاب کو زینت دی ہے —

(چ)

پریم گیتا

(مرتبہ ملک فضل حسین صاحب ' چھوٹی تقطیع ۳۲ صفحے
ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اسلام سکندر آباد دکن)

یہ ان نعتیہ نظموں کا مختصر مجموعہ ہے جو ہندو شعرا نے کہی ہیں - اس میں ۱۹ شاعروں کی نظمیں ہیں - شعراء تقریباً سب حال کے ہیں ' یہ اس عام اتحاد اور یگانگت کے آثار ہیں جو قدیم زمانے میں ہندو مسلمانوں میں پائے جاتے تھے اور دونوں قومیں ایک دوسرے کی تہذیب سے متاثر تھیں اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندو شاعروں نے اولیا اور انبیا کی ثنا و صفت میں بڑے خلوص سے نظمیں لکھی ہیں اس مسموم اور مکدر فضا میں بھی ایسے پاک نفس لوگ موجود ہیں جن کے آئینۂ دل پر کدورت نہیں آنے پائی اور وہ برابر پرانی روایتوں کو برقرار رکھتے چلے آ رہے ہیں - ایسے ہی نیک دل ہندو شاعروں کی نعتیہ نظمیں اس مجموعے میں ہیں —

(ع)

تعلیم

نو پیشہ مدرس

(مترجمہ عبدالنور صدیقی و عبدالشکور صاحبان ' صفحات ۸۶ ' چھوٹی تقطیع ' لکھائی چھپائی اچھی ' قیمت سوا روپیہ ملنے کا پتہ :- مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن)

فن تعلیم پر اردو زبان میں بہت کم ذخیرہ ہے خوشی کی بات ہے کہ

اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے - نو پیشہ مدرس امریکہ کے ایک ماہر تعلیم جے ' ایس ' ڈیوس کی کتاب " دی ینگ ٹیچرس پرابلم " کا ترجمہ ہے - اس میں ان تمام ضروری چیزوں کا ذکر ہے جن سے ایک نو پیشہ مدرس کو واقف ہونا لازم ہے - اس میں حسب ذیل نو باب ہیں ' ضبط جماعت ' داب نظر ' مدرس کی آواز ' ترتیب سوال ' سر انجام جواب ' تختہ سیاہ ' درس کی تیاری ' سبق کی توضیح ' متعلق اطفال - ان نو ابواب میں وہ تمام ضروری ہدایات ہیں جن پر اگر عمل کیا جائے تو ایک نیا مدرس اپنے پیشے میں کامیاب ہو سکتا ہے - مصنف نے بار بار حکم اور نصیحت کرنے کو منع کیا ہے - بے شبہہ لایق مصنف کا یہ خیال صحیح ہے کہ کم عمروں اور نو جوانوں کے لئے نصیحت اکثر الٹا اثر رکھتی ہے ' لیکن خود فاضل مصنف نے یہ کتاب جو نو جوان مدرسوں کے لئے لکھی گئی ہے تحکمانہ لب و لہجہ اور واعظانہ انداز میں لکھی ہے تا ہم اس میں نصیحت کی تلخی نہیں - امید ہے کہ یہ کتاب نوجوان تعلیم پیشہ اصحاب کے لئے مفید ثابت ہوگی - ترجمہ صاف سلیس اور عام فہم ہے - ایک آدھ باب میں فنی اصطلاحات آئی ہیں - اگر ان کی ضروری تشریح ایک مختصر ضمیمہ کی شکل میں کردی جاتی تو اچھا تھا —

(چ)

مختصر

(مصنفہ عبدالغفار صاحب ' صفحات ۴۸ ' چھوٹی تقطیع لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ - قیمت ۴ آنے - ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی)

یہ مختصر ڈراما بچوں کے لئے لکھا گیا ہے - اس میں یہ بات ثابت کی ہے کہ محنت سے انسان زندگی میں کامیاب و بامراد ہوتا ہے ' محض روپیہ

پیسہ اور دوسرا کوئی ذریعہ انسان کو محنت کے مقابلے میں کامران نہیں کرسکتا
ڈرامے کی روئداد اچھی ہے - بچوں کے لئے سبق آموز ہے —

(چ)

مذہب

یاد اسلام

(مصنفہ جناب منشی شاہ محمد ممتاز علی صاحب ' آہ ' امیٹھوی
صفحات ۷۶ - چھوٹی تقطیع لکھائی چھپائی اچھی قیمت دس آنے -
ملنے کا پتہ :- مولوی محمد ساجد - محلہ مغل پورہ فیض آباد)

اس مثنوی میں مصنف نے اسلام کی عظمت و شان ظاہر کی ہے ' آنحضرت صلعم کی سیرت پاک کو بیان کیا ہے - اسلام کو ایک فطری مذہب ثابت کرنے اور ان شبہات کو عقلی دلائل سے دور کرنے کی کوشش کی ہے جو جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے دل میں اسلام کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں - اس مثنوی کے بعض مضامین مولانا حالی کے انقلاب انگیز مسدس کے مضامین سے ملتے ہیں لیکن جو جوش اور فصاحت اس میں ہے اس میں مفقود ہے - تاہم یہ مثنوی اپنے موضوع ' زبان اور بیان کے لحاظ سے قابل قدر ہے —

(چ)

نیچریت

(مترجمہ جناب عبدالمنان صاحب، ۹۴ صفحات، چھوٹی تقطیع، لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی - قیمت ۶ آنے ملنے کا پتہ :-
کتب خانہ آصفیہ کشمیری بازار لاہور)

علامہ سید جمال الدین افغانی (رح)، کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ان کا شمار ان نامور بزرگوں میں ہے جنھوں نے مسلمانوں کو ابھارنے اور ان کی قومیت کو زندہ کرنے کے لئے بڑے بڑے جتن کئے ہیں - یہ مختصر رسالہ علامہ موصوف نے بزبان فارسی اس زمانے میں لکھا تھا جب کہ مادہ پرستی اور دہریت کے فلسفے سے اکثر مسلمان اندیشہ مند تھے - اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو مذہب کی طرف توجہ دلائی جائے اور نیچریت کا راز فاش کیا جائے - ہمارے کان اس قسم کے الفاظ سے آشنا ہوگئے ہیں اس لئے ہمیں اس کی کچھہ زیادہ اہمیت نہیں معلوم ہوتی - تقریباً نصف صدی قبل یہ خاص مسئلہ ہو گیا تھا - اس باب میں بے شمار مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں - مترجم عبدالمنان صاحب نے صاف ترجمہ کیا ہے - شروع میں علامہ موصوف کے سوانح حیات بھی ہیں —

(چ)

پارہ سورۂ شریف

یہ کتاب پیکوارٹ پریس لاہور نے بڑے اہتمام سے بہت خوش خط اور پاکیزہ کاغذ پر طبع کی ہے - چھپائی بھی اعلیٰ درجے کی ہے - ایسی نفیس طباعت دیکھنے میں نہیں آئی)

اس مطبع نے پارے الم بھی عکسی رنگین چھاپا بہت صاف ستھرا اور عمدہ چھپا ہے - طرز تحریر اس قسم کا ہے کہ بچے اور کم سواد شخص بھی آسانی سے پڑھ سکتے ہیں —

تاریخ

تاریخ الامت حصہ ہفتم

(مصنفہ مولوی محمد اسلم صاحب جیراجپوری - جامعہ ملیہ
اسلامیہ - دہلی - قیمت ایک روپیہ)

تاریخ الامت کے اس حصے میں سلاطین و خلفائے عثمانیہ کی سیاسی تاریخ کو اختصار کے ساتھہ پیش کیا گیا ہے - یہ دیکھہ کر تعجب ہوتا ہے کہ اردو میں آج تک دولت عثمانیہ کی تاریخ نہیں لکھی گئی - تاریخ الامت کے اس حصہ سے یہ کمی پوری ہوجائیگی - اس کتاب کے اور دوسرے حصوں کی طرح اس حصے کی زبان بھی نہایت سادہ اور عام فہم ہے - مولانا نے یہ سلسلہ در اصل تعلیمی غرض کے لئے تصنیف کیا ہے - علمی تحقیق کی بجائے مسلمہ تاریخی وقعات کو سلیس اور عام فہم انداز میں طلبہ کے لئے پیش کیا گیا ہے - چنانچہ طلبہ میں یہ پورا سلسلہ بہت مقبول ہوا اور ہر کالج میں اس سے استفادہ کیا جا رہا ہے —

تاریخ الامت کے ساتویں حصے میں دولت عثمانیہ کی بنیاد سے لیکر غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے بر سر اقتدار ہونے تک کے سارے اہم سیاسی واقعات موجود ہیں - ہماری رائے میں اگر مولانا آئندہ ایڈیشن میں سن ہجری کے ساتھہ ساتھہ سن عیسوی بھی درج کردیں تو طلبہ کے لئے اس میں اور بھی زیادہ سہولت ہوگی —

(ی)

اسلامی خلافت کا کارنامہ دوسرا حصہ

دوسری جلد - مصطفای کمال

(مولفہ حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڑہ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس - صفحات ۳۵۱، قیمت ایک روپیہ آٹھہ آنے - آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈہ سے مل سکتی ہے)

اس کتاب کے پہلے حصے پر گزشتہ کسی پرچے میں تبصرہ ہو چکا ہے

اس حصے میں حضرت محمد صلعم کے حالات ہجرت مکہ سے سنہ ٥ ہجری تک بیان کئے گئے ہیں - ان حالات کے ضمن میں بہت سے اخلاقی مسائل اور دوسرے ضروری امور اور معاملات پر بھی بحث کی گئی ہے - کتاب کا طرز بیان سادہ ہے اور ہر مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کے متعلق کافی معلومات ہوجاتی ہے اور غیر ضروری طول سے احتراض کیا ہے - جن لوگوں کی رسائی بڑی کتابوں تک نہیں ہے اُن کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے - قابل مصنف کی محنت قابل شکریہ ہے —

حیات احمد بن حنبل

(مولفہ مولانا ' شاہ محمد عزالدین صاحب پھلواری ' صفحات ٦٥ - قیمت بارہ آنہ - بک ڈپو پھلواری ضلع پٹنہ)

امام احمد بن حنبل اُن برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے علم اور اسلا م کی بڑی خدمت کی ہے جن کا ایمان ایسا سچا اور مضبوط تھا کہ اس کے لیے انہوں نے ہر طرح کی ایذائیں اور عقوبتیں سہیں اور سخت سے سخت ایذا اور بڑے سے بڑے انعام کے وعدوں سے بھی اس میں ذرہ برابر لغزش نہ ہوی - اس مختصر کتاب میں ان کے حالات اور عقائد وغیرہ بیان کئے گئے ہیں —

اسلامی نظام تعلیم

مترجمہ فضل کریم خاں درانی صاحب بی - اے صفحات ٥٦ - قیمت ٦ آنے
قومی کتب خانہ ریلوے روڈ - لاہور)

یہ رسالہ فاضل مستشرق ڈاکٹر دانیال ہانے برک کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے - جس میں فاضل مصنف نے مسلمانوں کے قدیم نظام تعلیم اور طریقۂ تعلیم کو

تحقیق و دیانت سے بیان کیا ہے - یہ بہت دلچسپ، پر از معلومات اور عبرت خیز مضمون ہے - اسلام کے ابتدائی زمانے میں تقریباً نویں صدی تک بلکہ کچھ بعد بھی مسلمانوں میں طلب علم کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا اور یہ شوق انہیں شہر شہر، ملک ملک اور جنگلوں اور صحراؤں میں لئے پھرتا تھا - اگرچہ اس کی ابتدا مذہب سے ہوئی اور سارا اہتمام اسی کی تعلیم کے لئے تھا لیکن اس کے طفیل میں دوسرے علوم مثلاً صرف و نحو رجال، فلسفہ و منطق لغت و معانی وغیرہ بھی رواج پاگئے اور رفتہ رفتہ مذہبی دباؤ سے نکل کر خود ایک مستقل حیثیت قائم کرلی - ایک بڑی بات یہ تھی کہ تعلیم میں حکومت کا اثر بہت کم تھا مسجدیں مکتبوں اور مدرسوں کا کام دیتی تھیں اور عام شوق حوصلہ افزائی کرتا تھا - گو بعد میں امرا و وزرا اور بادشاہوں نے بھی بہت کچھ مدد دی اور اس کار خیر کے لئے اوقاف کا انتظام کردیا —

قابل مترجم نے ترجمہ بہت شستہ اور رواں کیا ہے اور علم کی خدمت کی ہے —

دنیا کے بسنے والے

(مولفہ سید بشیر حسین صاحب زیدی بی - اے (کیمنٹب)
بیر سترایٹ لا - مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ - دہلی -)

—

اس رسالے میں دنیا کے مختلف حصوں کے باشندوں کے طرز ماند و بود اور ان کی مخصوص ملکی خصوصیت کو نہایت سادہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے - یہ رسالہ در اصل بچوں کے لئے لکھا گیا ہے اور ہمارے خیال میں وہ اس مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتا ہے - اس رسالے میں حسب ذیل ابواب ہیں :—

اسکیمو رتہ انڈین یا سرخ ہندی، وسط ایشیا کے کرغی، سوس، بدو عرب افریقہ کے بونے، سہوانا کے حبشی اور جاپان کے لوگ - ہر باب میں تصاویر کے ذریعہ سے باشندوں کی شکل و شباہت اور ملکی پیداوار کو پیش کیا گیا ہے - ان تصاویر کی وجہ سے کتاب کی دلچسپی میں اور اضافہ ہوگیا ہے - مولف نے اس کا خاص

طور پر اهتمام کیا هے کہ ان کے پیرایۂ بیان سے بچوں کی دلچسپی آخر تک بدستور باقی رهے —

(ی)

منطق و فلسفہ

مبادی فلسفہ حصۂ اول

(یا فلسفہ کی پہلی کتاب ، از مولانا عبدالماجد صاحب
بی - اے ، صفحات ۱۸۵ - معارف پریس اعظم گڈہ)

——

جیسا کہ فاضل مصنف نے دیباچے کے شروع میں بیان کیا هے یہ " کوئی مستقل تصنیف نہیں ، چند قدیم متفرق فلسفیانہ مقالات کا مجموعہ هے " - لیکن اُن پر بڑے غور اور احتیاط سے نظر ثانی کی گئی هے اور اس قدر قطع و برید ، تبدیل و ترمیم ، حذف و اضافہ کیا گیا هے اور زبان کو شگفتہ اور رواں بنانے میں اس درجے کوشش کی گئی هے کہ یہ ایک طرح کی جدید تصنیف هو گئی هے - اس میں چھہ مقالے هیں جن میں سے پانچ زمانہ هوا بعض رسالوں میں شایع هوئے تھے اور ایک (نفس و مفردات نفس) مصنف کی ایک غیر مطبوعہ و نا تمام تصنیف کا پہلا باب هے —

اگر چہ تمام مضامین فلسفیانہ هیں لیکن اس قدر صفائی ، شستگی اور خوبی سے لکھے گئے هیں کہ یہ صرف فلسفے کے طالب علم هی کے لئے مفید نہیں بلکہ هر پڑھا لکھا شخص جسے علم سے کچھہ ذوق هے ان سے لطف حاصل کر سکتا هے اور اپنی معلومات میں بہت کچھہ اضافہ کر سکتا هے - اردو زبان میں اس قسم

کی بہت کم کتابیں ہیں - اس زمانے میں مولانا عبدالماجد صاحب نے فلسفیانہ مضامین کی داغ بیل ڈالی اور اس شعبۂ علم پر مستقل تصانیف اُن کے قلم سے نکلیں اور اب تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے - اسی کتاب کے دیباچے میں دوسرے حصے کی بھی بشارت دی ہے اور امید ہے کہ وہ بھی جلد شایع ہو گی —

یہ کتاب علمی حیثیت بھی رکھتی ہے ادبی حیثیت بھی - اور علم و ادب دونوں کے شائق اسے شوق سے پڑھ سکتے ہیں اور ہماری یونیورسٹیوں کے نصاب میں دونوں حیثیتوں سے شریک ہونے کے قابل ہے —

اساس منطق

(تصنیف مولوی سید ابوسعید عبدالقدوس صاحب بہاری مدرس مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد - صفحات ۵۸ ، قیمت چھ آنے - سید رکن الدین صاحب مدرسہ مصباح العلوم سے مل سکتی ہے)

——

ہمارے ہاں کی منطق کو سہل زبان میں ادا کیا ہے - ہر بیان کے ساتھ مشقی سوالات بھی ہیں - طلبہ کے لئے مفید ہے —

———

آزادی

(ترجمہ مولوی سعید انصاری صاحب بی - اے ، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ - قرولباغ - دہلی)

——

جان اسٹوارٹ مل کی تصنیف لبرٹی ، علم سیاست کی مشہور کتابوں میں سے ہے - اس میں ان مسائل سے بحث کی گئی ہے جو انفرادی آزادی کی بنیاد ہیں - ' مل ' انفرادیت کا کھلم کھلا حامی تھا - وہ ریاست اور حیات اجتماعی کی

ضرورت کا منکر نہ تھا بلکہ انہیں فرد کا خادم اور اس کی نشو و نما کا آلۂ کار تصور کرتا تھا - اس کتاب میں اس نے فرد کے حقوق کی حمایت کی ہے —

اس کتاب کو سعود انصاری صاحب نے اردو کا جامہ پہنایا ہے - ترجمہ سادہ اور عام فہم ہے - لیکن بعض جگہ مطالب میں پورے طور پر صفائی نہیں پیدا ہوئی - اس ترجمہ کے شروع میں پروفیسر محمد مجیب صاحب بی - اے (اکسن) کا نہایت پر مغز اور ساتھ ہی دلچسپ مقدمہ بھی ہے - اس میں 'مل' کے فلسفہ پر بحث کی گئی ہے - کتاب حسب ذیل ابواب پر منقسم ہے - باب اول دیبا چۂ مصنف ؛ باب دوم آزادئی خیال ومباحثہ ؛ باب سوم انفرادیت بہبود انسانی کا ایک ذریعہ ہے ؛ باب چہارم فرد پر جماعت کے اختیارات کے حدود ؛ باب پنجم مثالیں (اس میں ان اصول و مبادیات کی عملی مثالیں پیش کی گئی ہیں جن کا تعلق نفس موضوع سے ہے) - یہ ترجمہ سلسلۂ اردو اکاڈیمی کا انیسواں نمبر ہے —

(ی)

(اس کتاب کا ترجمہ مدت ہوئی راجہ نرندرو ناتھہ صاحب نے کیا تھا ' کیا اچھا ہوتا کہ مترجم صاحب اُسے دیکھہ لیتے - اگر اُس سے مقصد پورا ہو جاتا تو مناسب تغیر و تبدل کے ساتھہ راجہ صاحب سے اجازت لے کر شایع کر دیتے اور اس زحمت سے بچ جاتے —

(اڈیٹر اردو)

متفرقات

Europe's Debt to Islam

یعنی اسلام کا احسان یورپ پر

(مولفہ سید ایم - ایچ زاہدی صاحب - کلکتہ - قیمت ایک روپیہ دو آنے - طلبہ سے بارہ آنے)

اس رسالے میں قابل مولف نے عربوں کی علمی ترقی کا خاکہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے -

اگرچہ یہ رسالہ مختصر ہے تاہم مولف نے اُن تمام علمی ترقیوں کو جو مسلمانوں نے ہر شعبے میں کی تھیں اس طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے کے بعد دل پر اس کا کچھ نہ کچھ نقش باقی رہ جاتا ہے - ملک کے مشہور سائنس داں ڈاکٹر پی - سی - رے نے اس پر ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے —

گلگشت دکن

(مصنفہ جناب مولوی محمد صبغت اللہ صاحب شہید انصاری
صفحات ۴۸ - چھوٹی تقطیع - مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ)

مصنف نے اس مختصر رسالے میں اپنے سفر دکن کے حالات لکھے ہیں - ان کا قیام دکن کے مختلف شہروں میں تین ہفتے رہا ہے اس عرصے میں انہوں نے دکن کی جن علمی، معاشی اور تمدنی ترقیوں کا مطالعہ کیا ہے ان کو سلیقے سے قلم بند کردیا ہے - جو لوگ دکن کے حالات سے بالکل ناواقف ہیں ان کے لئے یہ رسالہ مفید ہے —

(چ)

اردو کے جدید رسالے

المائدہ

(ماہانہ - اڈیٹر ایم - کے - خاں صاحب - لاہور سالانہ چندہ تین روپے آٹھ آنے)

یہ عیسائی مشنریوں کا ماہانہ رسالہ ہے جو اسی جنوری سے لاہور سے شایع

ہونا شروع ہوا ہے۔ اگرچہ عنوان پر مذہبی کے ساتھ "معاشرتی اور سیاسی ماہوار اردو رسالہ" لکھا ہے لیکن پہلے نمبر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیادہ تر مذہبی ہے جس کا مقصد عیسائی مذہب کی خوبیاں دکھلانا ہے۔ پہلے سولہ صفحوں میں چند مضمون مختلف مذہبی اور غیر مذہبی مضمون ہیں باقی ایک جز پر "سلطان التفاسیر" ہے جو مسلسل اس رسالے میں شایع ہوگی۔ یہ قرآن شریف کی تفسیر ہے جس کے لکھنے والے پادری مولوی سلطان محمد خاں صاحب پروفیسر عربی ایف۔ سی کالج لاہور و اڈیٹر نور افشاں ہیں معروف بہ پادری ایس۔ ایم پال جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ بڑے تحقیق اور مدت دراز کے مطالعہ اور غور کے بعد لکھی گئی ہے۔ تفسیر کا منشا معلوم ہے۔ لیکن ہم اتنا ضرور کہتے ہیں کہ پادری صاحب ایک عالم آدمی ہیں انہوں نے اپنی اس تالیف میں ہر بحث کو بہت تہذیب اور شایستگی سے بیان کیا ہے اور ادب و احترام کو ہر موقع پر ملحوظ رکھا ہے۔ ان سولہ صفحوں میں صرف سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے جو ابھی ختم نہیں ہوئی —

مارچ کے نمبر میں علاوہ تفسیر اور دوسرے مضامین کے یوسف علیہ السلام کا ڈراما اور ایک چھوٹا فسانہ بھی ہے —

رسالے کو سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے —

طبیب

(ماہانہ - انجمن خدام الطب پٹنہ - مدیر محمد شریف صاحب
بازید پوری - چندہ ایک روپیہ)

یہ رسالہ گورنمنٹ طبیہ اسکول پٹنہ کے اساتذہ کی سرپرستی میں اسی سال شایع ہوا ہے۔ طبی مسائل پر مضامین شایع ہوتے ہیں اور طبی کالجوں کے متعلق معلومات کا اندراج بھی ہوتا ہے عام فائدے کے مضامین بھی لکھے

جاتے ہیں۔ اور قدیم اور جدید طب دونوں پر بحث ہوتی ہے۔ مفید رسالہ ہے اور بہت سستا ـــ

ضیائے شمس

(ماہانہ۔ مدیر ظہیر احمد شمس صاحب سہارنپوری
سالانہ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔ سہارنپور

ادبی رسالہ ہے۔ سہارنپور سے شایع ہوتا ہے اس لئے بہت غنیمت ہے ـــ

ستارہ

(ماہانہ۔ اڈیٹر راجیشور ناتھہ ورما۔ سالانہ چندہ دو روپے۔ لاہور)

ادبی رسالہ ہے۔ جس میں زیادہ تر نظم، فسانے اور ڈرامے وغیرہ کی گنجائش ہے۔ اس کے لئے اڈیٹر صاحب نے اچھا سامان جمع کیا ہے۔ البتہ کوئی خاص بات نہیں ہے ـــ

رسالوں کے خاص نمبر

حریم

یہ عورتوں کا رسالہ ہے اور لکھنؤ سے نکلتا ہے۔ اس کا سال نامہ بہت خوش نما

چھپا ہے اور بہت کام کے اور لطف کے مضامین جمع کئے ہیں - حفظان صحت، تعلیم نسواں، اصلاح رسوم، طرح طرح کے فسانے، نظمیں، دستکاری کے گر اور سب سے زیادہ پر لطف بعض لذیذ کھانوں کے پکانے کی ترکیبیں، یہ سب کچھہ اس میں موجود ہے - پڑھی لکھی عورتوں اور لڑکیوں کے لئے اس رسالے میں تفریح و تعلیم کا اچھا خاصا سامان موجود ہے - قیمت اس سال نامے کی ایک روپیہ ہے حجم تخمیناً سوا دو سو صفحے ہے یہ قیمت کچھہ زیادہ نہیں —

ہمایوں

یہ رسالہ میاں بشیر احمد صاحب بی - اے (آکسن) بیرسترایٹ لا کی زیر ادارت ایک خاص اصول اور متانت کے ساتھہ شایع ہوتا ہے - جنوری میں اس کا سالگرہ نمبر شایع ہوا جس میں تنوع مضامین کے ساتھہ ہر قسم کی دلچسپی اور حسن خوبی کا خیال رکھا گیا ہے - معین تحریروں کے ساتھہ تفریحی مضامین بھی ہیں - حکیمانہ نظموں کے ساتھہ غزلیں بھی ہیں - چھوٹے فسانے ہیں تو ڈرامے بھی ہیں - خود فاضل اڈیٹر اور شریک اڈیٹر کی اچھی اچھی نظمیں درج ہیں - تصویروں کا معاملہ بہت بے ڈھب ہے تاہم ہمایوں کی تصویریں معقول ہیں اور مقابلتاً بہتر ہیں - اردو رسالوں کی تصویروں میں بہت کچھہ اصلاح کی ضرورت ہے —

الہام (عید نمبر)

یہ رسالہ پندرہ روزہ ہے اور مولانا ابوالکلام ماہر دہلوی کی زیر ادارت دہلی سے شایع ہوتا ہے - اس رسالے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شروع سے آخر تک منظوم ہوتا ہے - چونکہ یہ عید نمبر ہے اس لئے عید پر متعدد نظمیں ہیں -

مدت ہوئی لکھنؤ سے ایک منظوم اخبار نکلا تھا جس میں خبریں تک نظم میں ہوتی تھیں —

مشیر باغ بانی

پروفیسر جی۔ ایم۔ ملک ایم۔ ایس سی (زراعت امریکہ) کی اڈیٹری میں لاہور سے شایع ہوتا ہے۔ اس نے بھی اپنا سالگرہ نمبر شایع کیا ہے۔ اس میں کاشتکاری اور باغ بانی کے متعلق بہت سی کار آمد باتیں ملتی ہیں۔ جن لوگوں کو اس فن سے دلچسپی ہے وہ اس رسالے کو ضرور پڑھیں —

میخانہ (عید نمبر)

قابل اڈیٹر نے بڑی محنت سے عید پر مضامین اور نظمیں حاصل کی ہیں۔ شروع سے آخر تک سب مضمون عید سے متعلق ہیں۔ یہ کوئی آسان بات نہیں۔ رسالے کی حیثیت دیکھتے ہوئے یہ عید نمبر بہت غنیمت اور تعریف کے لائق ہے —

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری ، اپریل ، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم ایک سو اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑہ سو صفحے ہوگا —

۳ - بنظر احتیاط رسالہ ذریعۂ رجسٹری بھیجا جاتا ہے —

۴ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملاکر سات روپیہ سکہ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپیہ سکہ عثمانیہ) —

۵ - تمام خط و کتابت آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئے —

———()‡*‡()———

(باہتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن اردو پریس ، اُردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)




اردو
انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اردو

جلد ۱۲ جنوری سنہ ۱۹۳۲ ع حصہ ۴۵

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

تبصرے

—(*)—

ادب

مذہب

تاریخ و تمدن

تعلیم

منطق و فلسفہ

تصوف

متفرق

حکمت و معاشرت

معاشیات

اُردو کے جدید رسالے

رسالوں کے خاص نمبر



فہرستِ مضامین

خطبات گارساں دتاسی

گیارھواں خطبہ

۲ دسمبر سنہ ۱۸۶۱ ع

(مترجمۂ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی لٹ

(پروفیسر جامعۂ عثمانیہ)

جن صاحبان کو ہندوستان کے ساتھ انس ہے انہیں یہ دیکھکر مسرت ہوگی کہ اب وہاں ہر طرف ادبی اور علمی مشاغل کی ترقی رونما ہو رہی ہے - سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش کے دوران میں اردو زبان کی کتابوں کی اشاعت بالکل رک گئی تھی مگر اب پھر کثرت سے کتابیں طبع ہورہی ہیں - اردو کی اشاعت میں انگریز حکومت بھی حتی المقدور مالی امداد کر رہی ہے اور ہر طرح سے اس کی ہمت افزائی میں کوشاں ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان ہندوستان کی حرفت و تجارت اور سیاست میں بہت کام آتی ہے - اس کے علاوہ ہندوستان میں جتنے یوروپین اور یوریشین ہیں وہ اسی زبان کے توسط سے اہل ہند کے ساتھ تعلقات پیدا کرتے ہیں - ظاہر ہے اس صورت میں حکومت کا فرض ہے کہ اس زبان کی پرورش اور ترقی میں کوشاں ہو - ساتھ ہی ہمیں یہ بھی مد نظر رکھنا چاہئیے کہ اگرچہ اکثر تعلیم یافتہ ہندوستانی انگریزی زبان کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں

مگر باوصف اس کے وہ شاید بقول شیکسپیر یہ کہنے کی جرات نہ کریں گے کہ "میں اپنی بولی سے باز آیا" -

صوبجات شمال مغربی میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے اخبارات میں ان بڑی اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی تعداد اور اہمیت اس کے لگ بھگ ہو چلی ہے جو سنہ ۱۸۵۷ ع سے پہلے انہیں حاصل تھی - ان صوبجات کے ناظم تعلیمات مسٹر ایچ اسٹورٹ ریڈ نے ازراہ عنایت ان سترہ اخباروں کی فہرست مجھے بھیج دی ہے جو اس سال کے شروع سے شائع ہو رہے ہیں - ممکن ہے اس سال میں اور ایک ادھ کا اضافہ ہوا ہو - ان سترہ اخباروں میں گیارہ اردو کے ہیں اور چھ ہندی کے - ان میں سے آٹھ آگرہ میں طبع ہوتے ہیں ' دو اجمیر میں ' دو اٹاوہ میں اور ایک لدھیانہ میں ' ایک میرٹھ میں ' ایک جونپور میں ' ایک سہارن پور میں ' ایک الہ آباد میں اور ایک کانپور میں - تعجب ہے کہ اس فہرست میں ہمیں دہلی کا نام کہیں نہیں ملتا شورش سے پہلے وہاں آٹھ اخبار شائع ہوا کرتے تھے مگر ان میں سے اب ایک بھی باقی نہیں رہا - یہ سب کے سب شورش کے دوران میں ختم ہوگئے - مگر امید ہے کہ اس سال کے دوران میں پھر نئے سرے سے دوسرے اخبار جاری ہوں گے یا یہ کہ پرانے اخباروں کے مدیر دوسرے ناموں سے نئے اخبار ' یں گے —

آگرہ کے نورالابصار اور بدھی پرکاش کئی سال سے جاری ہیں اور ان کی نسبت میں پہلے کہیں ذکر بھی کرچکا ہوں - مفید خلائق بھی چل رہا ہے - اس کے مدیر شیو نرائن جن کا شمار اردو کے اچھے لکھنے والوں میں ہے ' اب یہ کرتے ہیں کہ اردو کے پہلو بہ پہلو ہندی زبان کے مضمون بھی شائع کرتے ہیں - ہندی کے مضامین سروپ کارک کے عنوان کے تحت میں

ہوتے ہیں۔ اس سے انکی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُن ہندؤں کو خوش کریں جو مسلمانوں کی زبان سے اپنی زبان کو تحریر کے ذریعہ الگ کرنا چاہتے ہیں —

ان اخباروں کے علاوہ آگرہ میں بغاوت ہند کے نام سے ایک ماہوار رسالہ اور نکلنا شروع ہوا ہے — اس کے مدیر سکند لال ہیں — آگرہ کے اور دوسرے نئے اخبار حسب ذیل ہیں —

القاب مالقاب ' یہ اردو کا اخبار ہے — اس کے مقابل میں ہندی رسم خط میں سورج پرکاش کے نام سے شائع ہوتے ہیں۔ ایک ہندو جنکا نام گنیش لال ہے اس کی ادارت کرتے ہیں —

اخبار حیدری اور اخبار حسینی دونوں اردو کے اخبار ہیں — پہلے کے مدیر مرزا علی حسینی حیدری ہیں اور دوسرے کے سید حسین علی جو دلی کالج میں پروفیسر ہیں اور انھوں نے الف لیلہ کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے —

" اجمیر " کے دو نو اخبار " جگت لابھ چنتک " اور " خیر خواہ خلایق " ہیں۔ پہلا اخبار ہندی کا ہے اور اس کے مدیر سوہن لال ہیں۔ دوسرا اردو کا ہے اور اس کے مدیر کا نام " اجودھیا پرشاد ہے جو اس وقت اردو کے مشہور لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے علم الحساب اور دوسرے موضوعوں پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں —

اٹاوہ سے پندرہ روزہ گزٹ شائع ہوتا ہے جس کا نام " پرجاہت " ہے۔ یہ مطبع " مصدرالتعلیم میں طبع ہوتا ہے — اس کے اردو ایڈیشن کا نام محبت رعایا ہے اور انگریزی ترجمہ جو اس کے ساتھ شائع ہوتا ہے اس کا نام People's Friend ہے۔ اس کے مدیر حکیم " جواہر لال ہیں — انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں اور انگریزی زبان سے ترجمے بھی کئے ہیں۔ اس

گزٹ کو آنرہ کے گزٹ " اخبار الاوام " کا قایم مقام سمجھنا چاهئے ۔ اخبار اللوام بهی حکیم " جواهر لال " هی کے زیرادارت نکلتا تها - ان دونوں اخباروں کا مقصد یہ رها هے کہ اپنے مضامین کے ذریعہ سے خلاقی اصول کی نشر و اشاعت کیجائے اور مختلف ملکوں کی ٹهیک ٹهیک خبریں درج کی جائیں اور یوں هی سنی سنائی باتوں کو بطور سند نہ پیش کیا جائے —

" لدهیانہ " کا هفتہ وار اخبار نور دلی نور اب نهیں شائع هوتا - اس کی جگہ اخبار مجمع البحر میں نکلنا شروع هوا هے - اس کے مدیر اصغر حسین هیں

جونپور سے نسیم جونپور شائع هوتا هے - اس کے مدیر سید مظفرالدین هیں - سہارنپور سے وکٹوریہ گزٹ نکلتا هے - اس کے مدیر ایک انگریز هیں اور اگرچہ اس کے نام سے یہ ظاهر هوتا هے کہ شاید انگریزی کا اخبار هے ' لیکن نهیں ' یہ اخبار نہایت شستہ اردو زبان میں نکل رها هے ۔ الہ‌آباد سے امین الاخبار عزیز الدین خاں کے زیر ادارت شائع هوتا هے - موصوف کا شمار مشہور و معروف مسلمانوں میں هوتا هے - " کانپور سے اخبار " شعلہ طور ، جمنا پر شاد کے زیرادارت شائع هوتا هے - یہ اخبار روزانہ هے —

بدقسمتی سے ان سب اخباروں کی اشاعت بہت تهوڑی هے - اور شمال مغربی صوبوں کی تین کروڑ تیس لاکهہ آبادی میں سے بہت کم لوگ ایسے هیں جو انهیں پڑهتے هیں —

هندوستان کے اور دوسرے صوبوں کے اردو اخباروں کے متعلق میری معلومات محدود هیں ۔ میں صرف آپ صاحبوں کو اسقدر بتلا سکتا هوں کہ سنہ ۱۷۹۰ ع میں سورت سے ایک اردو اخبار نکلتا تها جسکا نام منظور الاخبار تها ۔ اب آجکل اس کا نام نجم الاخبار هے - اتفاق سے کلکتہ کی Urdu Guide (و هنمائے کلکتہ) کا ایک نسخہ مجهے مل گیا هے جس سے معلوم هوتا هے کہ یہ

ہفتہ وار ہر جمعہ کے روز شائع ہوتا ہے —

سنہ ۱۸۶۰ م کی ابتدا تک شمالی مغربی صوبوں میں ۴۶ مطبع کام کر رہے تھے - اس تعداد میں مرزا پور مشن اور Medical Press کے مطبع بھی شامل ہیں - مسٹر ایچ اسٹورٹ ریڈ نے جو میرے لئے معلومات فراہم کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سال گزشتہ ۳۸۶ مطبوعات ان صوبجات میں شائع ہوئیں - اور یہ مطبوعات کل ۵۴۳ ۹۵۳ نسخوں پر مشتمل تھیں - ان میں ۴۶ مطبوعات جو ۳۵۱۹۰۰ نسخوں پر مشتمل تھیں نظامت تعلیمات کی طرف سے طبع ہوئی - باقی ۳۴۰ مطبوعات جو ۶۰۳ ۱۰۳ نسخوں پر مشتمل تھیں انہیں ہم حسب ذیل اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں —

(۱) ابتدائی مدارس کی کتابیں جیسے نصابی ، صرف و نحو ، فصاحت و بلاغت کی کتابیں - ۳۸ کتابیں اس قسم کے تحت میں آتی ہیں - ان کے کل مطبوعہ نسخوں کی تعداد ۴۸۷۰۰ تک پہنچتی ہے —

(۲) مذہب و اخلاق فلسفہ اور دینیات سے متعلق ۱۰۵ کتابیں طبع ہوئیں - کل نسخوں کی تعداد ۱۲۷۷۰۰ ہے —

(۳) فلکیات اور اختر شناس پر ۱۵ مطبوعات - نسخوں کی تعداد ۷۰۵۰

(۴) شعر و شاعری پر ۲۱ کتابیں - کل نسخوں کی تعداد ۱۸۰۴۴

(۵) تاریخ پر ۹ کتابیں کل نسخوں کی تعداد ۳۰۵۰

(۶) اصول قانون اور فقہ پر ۵۵ کتابیں - کل نسخوں کی تعداد ۲۶۲۲۹

(۷) طب پر ۷ کتابیں - کل نسخوں کی تعداد ۳۰۰۰ —

(۸) جغرافیہ پر ۷ کتابیں - کل نسخوں کی تعداد ۱۱۰۰ —

(۹) علم الحساب ، اقلیدس اور جبر و مقابلہ پر ۲۰ کتابیں کل نسخوں کی

تعداد ۱۸۵۰ —

(۱۰) جنتریاں - ۲۰ مطبوعات ذیل طبع شدہ نسخوں کی تعداد ۱۷۳۲۵ —

(۱۱) قواعد ڈاکخانہ - اس کے صرف ۲۰۲ نسخے طبع کئے گئے —

اس فہرست کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ پر مطبوعات کی تعداد بہت کم ہے - انسانی علم کی اس شاخ کو شاید ہندوستانی لوگ زیادہ اہمیت کی نظر سے نہیں دیکھتے - شاید ان کے نزدیک بھی تاریخ کی تعریف وہی ہے جو یہاں یورپ میں کسی نے جل کر کی ہے کہ تاریخ چند غیر معتبر روایات کا مجموعہ ہے جسے انفرادی تعصبات کے رنگ و روغن کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے —

حال کی اردو مطبوعات میں مجموعہ قوانین تعزیرات ہند کو بڑی اہمیت حاصل ہے - یہ بڑی تقطیع پر ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے - ہندوستانی فاضلوں کی جماعت نے اس کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے - مسٹر ایچ اسٹورٹ ریڈ نے بھی اس کی تکمیل میں بڑی مدد کی اور صوبجات شمال مغربی کے لفٹنٹ گورنر جی ایڈمنسٹن صاحب نے خود بہ نفس نفیس اس ترجمہ پر نظرثانی فرمائی ہے - اس سال کے ختم سے پہلے مجموعۂ قوانین تعزیرات ہند شائع ہوجائے گی اس واسطے کہ نئے تعزیری قوانین کا یکم جنوری سے نفاذ شروع ہوگا - ہندوستان سے میرے نام اس کا ایک نسخہ بھیجا گیا ہے جس کے متعلق مجھے اطلاع تو آ گئی ہے مگر ابھی تک وہ پہنچا نہیں - اس کے علاوہ جمع النفائس اور عجائبات صنعت شعاری کے نسخے بھی بھیجے گئے ہیں، مگر ابھی تک مجھے نہیں پہنچے - آخر الذکر انگریزی کتاب The Phenomena of Industrial Life and conditions of Industrial success سے خوشہ چینی کرکے لکھی گئی ہے -

اس کتاب میں ہندوستان کے موجودہ معاشی حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے —

ناصر خاں نے ڈاکٹر W. Anderson کی مدد سے ڈاکٹر Abercrombia کی کتاب " Inquiries on the intellectual Powers " کو اردو کا جامہ پہنایا ہے - اسی ترجمہ کا نام رہنمائے حکمت رکھا ہے - اس کا پہلا حصہ اسی سال آگرہ سے شائع ہوگیا —

ہمیں یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ صرف صوبجات شمال مغرب ہی میں اردو زبان کی ترقی کی کوششیں ہو رہی ہیں بلکہ اردو کی ترقی میں سارا ہندوستان شریک ہے - چنانچہ حال ہی میں لاہور میں پنڈت رام دیا نے مدرسے کے بچوں کے لئے ایک کتاب لکھی جس کا نام " ورتنت وفادار سنگھہ اور غدار سنگھہ " رکھا ہے - سورج بہان نجر نے وقائع " بابا نانک " لکھی ہے - ایک اور ہندو اجودھیا پرشاد نے جغرافیہ پر ایک کتاب لکھی ہے - یہ اور دوسری کتابیں بھی تصنیف کر چکے ہیں - مولوی کریم الدین نے جن کی نسبت میں اپنے پچھلے خطبوں میں ذکر کرچکا ہوں پنجاب کا جغرافیہ لکھا ہے - ان مذکورہ بالا چاروں کتابوں میں پہلی دو سنہ ۱۸۶۰ ع میں طبع ہوئی ہیں اور آخری دو سنہ ۱۸۶۱ ع میں - یہ کتابیں مجھے امرتسر کے پرجوش مستشرق مسٹر روبرٹ کسٹ نے حال میں بھیجی ہیں - فرانسوسی سفیر مقیم کلکتہ موسیو لمبار (Lombard) نے ازراہ نوازش میرا تعارف مسٹر روبرٹ کسٹ سے کرادیا چنانچہ موصوف نے اردو کی تقریباً بیس کتابیں مجھے روانہ فرمائی ہیں - ان میں بیشتر خود موصوف کی کتابوں کے اردو ترجمے ہیں - ان میں پنجاب کا اردو نقشہ

بھی شامل ہے - یہ تقریباً ایک مربع گز ہے اور لاہور کے مطبع کوہ نور میں سنہ ۱۸۶۰ م میں طبع ہوا ہے —

اردو زبان کے ادبی اور علمی مشاغل کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں آپ صاحبان کے سامنے مسیحی مبلغین کی انجمنوں کی کارگزاری کی نسبت کچھ نہ کہوں - جیسا کہ میں اپنے پچھلے خطبے میں کہہ چکا ہوں کہ " برطانیہ اور ممالک غیر کی انجمن انجیل " نے انجیل کا جو دلپذیر ترجمہ گزشتہ سال شائع کیا اسے یقیناً اردو زبان کی چوٹی کی کتابوں میں سمجھنا چاہئیے - یہ ترجمہ اس لئے اور بھی بہت اور معتبر ہے کہ ایک مشہور ہندوستانی فاضل نے اس کام میں ہاتھ بٹایا ہے کہا جاتا ہے کہ اس ہندوستانی فاضل کو اپنی زبان اردو کے علاوہ انجیل مقدس پر پورا عبور حاصل تھا - اس ترجمے کی ترتیب میں سلیقے کو ملحوظ رکھا گیا ہے - اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ لوگ بھی اسے پسند کریں گے جو کہتے ہیں کہ مسیحی انجمنیں بالعموم انجیل مقدس کو غیر مسیحی لوگوں اور جاہل عیسائیوں کے سامنے نہایت بھونڈے طریقے سے پیش کرتی ہیں - اس ترجمے میں حواشی کا بھی التزام کیا گیا ہے - ان حواشی میں ہم مضمون عبارتیں اور استعاروں کی تشریح کی گئی ہے - اس کے ساتھ واقعات کی تاریخیں ' مختلف ترجموں کے فرق اور بعض جگہ عبرانی یا یونانی کے لفظ بہ لفظ عبارتیں درج ہیں ہر باب کے شروع میں اس باب کے زیر بحث موضوع کا خلاصہ اور اسی طرح ہر حصے کے زیر بحث مضمون کے بارے موجود ہیں - جہاں جہاں نئے موضوع شروع ہوتے ہیں وہاں خاص خاص نشان کردئیے گئے ہیں جن کی حیثیت وہی سمجھنی چاہئیے جو مختلف جملوں کو جدا کرنے کے نشانات کی ہے

یہ کام نہایت دیدہ ریزی سے پایۂ تکمیل کو پہونچا اور اس سے انجمن اور مسٹر ساتھر دونوں کی شہرت کو چار چاند لگیں گے جنھوں نے انتہائی جانفشانی سے اس کی چھپائی کا انتظام کیا ــــ

ان مبلغین مسیحیت کی مختلف مطبوعات کے متعلق میں تفصیل سے ذکر نہیں کرونگا اس واسطے کہ پھر مضمون بہت طویل ہوجائیگا ۔ یہ لوگ انجیل مقدس کی تعلیمات کی بڑے جوش سے نشر و اشاعت کر رہے ہیں ان لوگوں کے لئیے مسلمان فقرا کی طرح " شاہ " کا لقب استعمال کرنا ٹھیک ہوگا کیونکہ واقعی یہ سب لوگ روحانی بادشاہ ہیں ۔ انھوں نے یہ بادشاہی اپنے جذبات کو مغلوب کرکے حاصل کی ہے ۔ ان کی بعض مطبوعات نہایت دلچسپ ہیں چنانچہ یک مذہبی افسانہ نیا کاش کھنڈ کے نام سے طبع ہوا ہے ۔ یہ ہندی میں ہے ۔ اس افسانے کی تمہید میں یہ بتایا گیا ہے کہ شہر بنارس کا ایک بوڑھا باشندہ اس فکر میں غلطاں پیچاں ہے کہ کسی تدبیر سے اس مقدس شہر کے سارے باشندے مسیحی مذہب قبول کرلیں اگر ایسا ہوجائے تو ان کے شہر کی قسمت جاگ جائے ۔ اس عالم فکر میں وہ خواب دیکھتا ہے کہ اس کی دلی تمنا بر آئی ۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو دیکھتا ہے کہ ایک کتب خانہ ہے جہاں جاکر اس نے نیاکاش کھنڈ کا ایک نسخہ خریدا ۔ اس کتاب میں اسے اپنے خواب کی تعبیر ملگئی ۔ اس میں ایک ہندو اور اس کے بیٹے کے درمیان جس نے مسیحی مذہب قبول کرلیا تھا فرضی گفتگو کا حال درج تھا ۔ چنانچہ اس گفتگو کے دوران میں مسیحیت ' اسلام اور بت پرستی کا مقابلہ کیا گیا ہے ۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مسیحی مذہب ہی انسان کی نجات کا ضامن ہے ۔ ساتھ ہی ہندوں کے بعض ناہکار رسوم اور ذات پات کے نقصانات واضح کئے گئے ہیں ــــ

مذہبی قسم کی مطبوعات میں جو حال میں شائع ہوئی ہیں اور جن کا مجھے علم ہے ' حیات پال (پولس) قابل ذکر ہے - اصل میں یہ کتاب مسٹر آرکسٹ نے انگریزی میں لکھی تھی پھر اسکا * پنڈت سورج دھان نہجر اور اجودھیا پرشاد نے اردو میں ترجمہ کیا - اس میں ایک نقشہ بھی ہے جس میں اس نامور شخص کے سفر کے متعلق معلومات درج ہیں اسی قسم کی ایک کتاب سچے اوتار کے متعلق لکھی گئی ہے ' ایک حقیقی تثلیث اور تری مورتی کے متعلق ہے ' ایک کتاب میں ایک مسیحی مبلغ اور ہندو جاتری کے درمیان مباحثہ ہے ' ایک میں قران اور انجیل کی تعلیمات کا مقابلہ کیا گیا ہے - ایک میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت مسیح کی تعلیمات کا فرق بیان کیا گیا ہے - ایک کتاب میں اسلام کی ابتدا - عروج اور زوال پر تبصرہ ہے - ان کتابوں کے علاوہ اور بہت ساری انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں جو فرانسیسی میں بھی موجود ہیں † حضرت " سلیمان کی کہاوتوں " اور " پہاڑی وعظ " کا اردو نظم میں ترجمہ کیا گیا ہے —

بمبئی کی مسیحی انجمن بھی اپنے کام میں مشغول ہے - اس انجمن نے اردو زبان میں ۲۳۰ چھوٹی بڑی کتابیں شائع کی ہیں - اردو کے

---

* یہ نام اسی خطبے میں پہلے بھی آیا ہے وہاں یہاں لکھا ہے - یہاں چھاپے کی غلطی معلوم ہوتی ہے - نیز نام کے آخری جز میں بھی کچھ غلطی ہوگئی ہے پہلے نجر لکھا ہے یہاں نہجر ہے (مترجم)

† مثلاً " The goldinakers villa e " ; " Life of Mahammap " Account From Umuasal History "

علاوہ اس صوبہ کی دوسری زبانوں میں بھی ان کی مطبوعات ہیں -
اس انجمن کا رسالہ " بامداد " برابر نکل رہا ہے جس کی نسبت میں
اپنے سنہ ۱۸۵۹ والے خطبہ میں ذکر کرچکا ہوں —

اس قسم کی تبلیغی کتب کو طبع کرنے کے علاوہ مبلغین مسیحیت
ملک کے طول و عرض میں کلیساؤں کی بنائیں ڈال رہے ہیں اور مدرسے
قائم کر رہے ہیں - یہ سب کچھ ان انجمنوں اور ان افراد کی فیاضی کا
طفیل ہے جن سے ہندوستان کی تبلیغی انجمنوں کا تعلق ہے - میں
سمجھتا ہوں اس ضمن میں اس کا ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا
کہ مسٹر " لیوپولٹ " کو جن کا تعلق چرچ مشن Church Mission سے ہے
۵ ہزار پونڈ کی رقم بطور عطیہ پیش کی گئی ہے تا کہ اس سے وہ
شہر بنارس میں ایک مدرسہ قائم کریں جہاں اردو زبان کے ذریعہ سے
تعلیم دی جائے —

جن ہندوستانیوں نے مسیحی مذہب قبول کیا ہے ان میں اچھی
خاصی تعداد تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے اور ان میں بعض اردو زبان کے
انشاء پرداز بھی ہیں - مسلمان لوگ حضرت مسیح کو عیسیٰ کہتے ہیں
اور ہندو لوگ عیسیٰ کو سیوا (مہادیو) سے تعبیر کرتے ہیں - مسیحی
دین کی اکثر یورپی اصطلاحوں کو اردو میں نہایت سلیقے سے سمو لیا گیا ہے
اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان میں سامی اور یافسی دونوں قسموں کی
زبانوں کے عناصر پائے جاتے ہیں - دونوں زبانوں کی ترکیبیں اس میں
نہایت خوبی سے کھپ جاتی ہیں - اسلامی اور سنسکرتی عناصر سے مل کر
اردو کی شاعری میں بڑی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے - یہاں تک کہ
انگریزی طرز کی نظمیں اس میں لکھی جا سکتی ہیں - اور انگریزی

مناجات کی لے تک اردو ٹائپوں میں اچھی طرح چھپ سکتی ہے * —

۱۰ اگست گزشتہ لکھنؤ میں "یوسف خاں" بہادر کا انتقال ہوا - یہ عیسائی ہونے کے ساتھ ہی اردو زبان کے بڑے عمدہ انشاپرداز تھے - ان کا لقب "کمبل پوش" مشہور تھا - مرحوم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے توپخانے میں تقریباً ۳۰ سال خدمت انجام دے چکے تھے - انھوں نے اردو میں سیر و سفر کے نام سے اپنا سفرنامہ لکھا ہے - یہ سفرنامہ دہلی میں سنہ ۱۸۴۷ ع میں شائع ہوا - اسٹورٹ ریڈ نے اس سفرنامہ کا مقابلہ Morier کی کتاب "Haji Baba in England" سے کیا ہے - اس ضمن میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ یوسف خاں بہادر ہندوستانی نہیں تھے بلکہ اطالوی تھے - یہ مسلمان بھی نہیں تھے - بلکہ کیتھولک مسیحی تھے - اور مرتے دم تک کیتھولک عقائد پر قائم رہے - اصل میں ان کا نام Delmerich تھا اور کہا جاتا ہے کہ ان کا فلورنس کے مشہور Medicis خاندان سے تعلق تھا † - کوئی پندرہ سال ہوئے کہ یوسف خاں بہادر سیاحت کی غرض سے انگلستان، فرانس، اسپین، پرتگال، اور جرمنی گئے تھے - واپسی پر "ترکی" اور عربستان کے راستے سے ہندوستان

---

* ستمبر سنہ ۱۸۵۲ کے خیر خواہ ہند میں ایک ہندوستانی مبلغ ہرمان کی نظم نقل ہے جو تین اور چار ارکان میں لکھی گئی —

ہم سجدہ کرتے بہ اداب
سر اٹھے تیری عطا

کہ تو خدا باپ تا ابد
ہر فانی حاکم رہتا

† ۱۵ اگست - (Indian Mail September 1861)

واپس آئے -- میں نے ابھی جس سفر نامے کا ذکر کیا ہے وہ در اصل انھیں ملکوں کے حالات پر مشتمل ہے - انھوں نے یہ سفر نامہ خود اردو میں لکھا تھا —

میں نے ابھی جن مذہبی کتابوں کا ذکر کیا ان میں ایک اور کتاب کو شامل کرنا ضروری ہے - یہ ہندی سے اردو میں ترجمہ ہے - ساتھہ ہی نہایت قابل قدر حواشی بھی ہیں - کتاب کا موضوع ہندؤں کے چھہ فلسفیانہ مسلکوں کی تردید ہے - اس کتاب کا مصنف ایک برہمن ہے جس نے مسیحی مذہب اختیار کرلیا تھا - اسے اپنے مضمون پر پورا تبحر معلوم ہوتا ہے - یہ کتاب ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے - مشہور مستشرق Fitz Edward Hall نے اس کو چھپوانے کا انتظام کیا اور اس پر فلسفیانہ تنقید لکھی - یہ کتاب اور یہ تنقید در اصل اس کام کی تکمیل کرتے ہیں جسے Colebrooke اور دوسرے ماہرین ہندیات نے شروع کیا تھا —

وہ کتابیں جو دوبارہ طبع ہوئی ہیں ان میں " تحفتہ اخوان الصفا " کا ہندی اڈیشن قابل ذکر ہے - کلکتہ ، ہگلی ، بمبئی ، اور دہلی میں متعدد مرتبہ یہ کتاب طبع ہوچکی ہے - مگر یورپ میں اب تک یہ مکمل نہیں چھاپی گئی - یہ کتاب " باغ و بہار " کی طرح سول امتحانوں کے نصاب میں داخل ہے - ڈاکٹر " ریو " نے بڑی محنت اور کاوش سے " باغ و بہار " کو پھر طبع کرایا ہے - موصوف آج کل یونیورسٹی کالج میں پروفیسری کے عہدہ پر ممتاز ہیں - مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ وہ بھی میرے خطبات سن چکے ہیں - میرے قدیم دوست اور مہربان Duncan Farbes نے اس کی طباعت کا انتظام کیا - موصوف نے اردو پر اور اردو میں متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں —

مسٹر E. H. Rogers نے ایک کتاب " How to speak Hindustani " لکھی ہے - یہ کتاب نہ صرف فوجی لوگوں کے لئے بہت مفید ہے جن کے لئے خاص طور پر یہ تصنیف کی گئی ہے بلکہ ان انگریز بیرسٹروں کے لئے بھی نہایت کار آمد ہے جن کا ارادہ ہندوستان میں وکالت کرنے کا ہے - ہندوستان میں آج کل مقامی عدالتیں ہر جگہ قائم ہورہی ہیں - ان نوجوان انگریزوں کے لئے جن کی اپنے وطن میں قدر نہیں ' یہ موقع ہے کہ وہ اس وقت ہندوستان میں اپنی قسمت آزمائیں - لیکن اس سے پیشتر کہ وہ ہندوستان جانے کا ارادہ کریں یہ از بس ضروری ہے کہ وہ دیسی لوگوں کی زبان کو مطالعہ کے ذریعہ سیکھہ لیں - انہیں ہندوستانی لوگوں کے ان محاوروں کو جاننا چاہئے جو ہر وقت گفتگو میں استعمال ہوتے ہیں - مسٹر " روجر " کی کتاب میں ان کے متعلق پوری معلومات مل سکتی ہے - موصوف پہلے Lawrence asylum کے ناظم تھے اور اب کل chatham کے Indian Depots میں ہندوستانی کے استاد ہیں —

ہندوستانی صرف و نحو پر " انگریزی " " لاطینی " " فرانسیس " " پرتگالی " اور " جرمن " زبان میں جو کتابیں نکل چکی ہیں ان میں دو کا اور اضافہ ہوا ہے - میری مراد Duncan Farbes کی کتاب سے ہے - اس میں صرف و نحو کے ساتھہ چھوٹی سی لغت بھی ہے - یہ کتاب اردو میں ہے مگر اس کا رسم خط رومن ہے - دوسری کتاب Monier Williams کی " Hindustani Primer " ہے - یہ بھی رومن رسم خط میں لکھی گئی ہے - اس میں بھی ابتدائی صرف و نحو کے ساتھہ ساتھہ کثیرالاستعمال الفاظ کے معنی اور کہاوتیں درج ہیں - اگرچہ موصوف آج کل اکسفورڈ یونیورسٹی میں سنسکرت زبان کے پروفیسر ہیں مگر انہیں ہندوستانی زبان سے جو ہمیشہ

سے شغف اور لگاؤ رہا ہے وہ بدستور قائم ہے ــــ

مسٹرسی ماتھر کی ہندوستانی اور انگریزی کی لغت دوبارہ چھپ چکی ہے۔ اس میں انجیل مقدس کی ساری اصطلاحوں کے معنی دئے ہیں۔ جو صاحب اس کتاب کو خریدنا چاہیں خرید سکتے ہیں۔ خود انجیل مقدس کا جو اڈیشن موصوف نے تیار کیا تھا جس میں ایک طرف اردو ترجمہ ہے، وہ ان کا بڑا کارنامہ سمجھنا چاہئے۔ اس ترجمہ کی قدر و قیمت میں اس لغت کی وجہ سے اور بھی اضافہ ہوجائے گا۔ ہندوستانی اور یورپین دونوں اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ بالخصوص وہ یورپین جو ہندوستانی زبان کا مطالعہ کر رہے ہیں اس کا بڑی خوشی کے ساتھ خیر مقدم کریں گے۔ انھیں ہندوستانی زبان سیکھنے میں اس سے بڑی سہولت ہوگی اگر وہ ذراسی بھی استعداد رکھتے ہیں تو اس کی مدد سے بآسانی آگے چل سکتے ہیں ــــ

آپ صاحبان پر اب یہ روشن ہوگیا ہوگا کہ ہندوستان میں رومن رسم خط کا اهستہ اهستہ استعمال بڑھ رہا ہے۔ خود ہندوستانیوں میں ایسے اشخاص موجود ہیں جن کا خیال ہے کہ عام طور پر انگریز لوگ جو رومن رسم خط استعمال کرتے ہیں اسے تھوڑی بہت تبدیلیوں کے بعد ہندوستان میں رائج کیا جاسکتا ہے۔ بابو شیو پرشاد نے جو بڑے فاضل آدمی ہیں اور شملہ اخبار کے مدیر بھی رہ چکے ہیں اور متعدد کتابیں تصنیف کرچکے ہیں، حال ہی میں کلکتہ میں ایک رسالہ شائع کیا ہے جس میں اردو کے رسم خط سے بحث کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ زبان کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ رومن رسم خط اختیار کرلیا جائے اور ولسن نے جو طریقہ رائج کرنے کی کوشش کی تھی اس میں بعض ضروری تبدیلیاں

کردی جاتی ہیں —

آپ سبھوں کو غالباً معلوم ہوگا کہ ۱۲ مئی سنہ ۱۸۵۷ ع دھلی کالج کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی - اس کے کتب خانے کو مشعلوں کے نذر کردیا گیا تھا اور اس کالج کے نیک دل پرنسپل کو قتل کردیا گیا تھا - مگر خوش قسمتی سے اس کالج کی آمدنی وقف سے تھی جو اب تک موجود ہے - چنانچہ اس وقف کی آمدنی سے چاندنی چوک میں ایک دوسرا کالج قائم کیا گیا ہے جسے ہم پرانے کالج کا قائم مقام تصور کر سکتے ہیں - اس کا نام دھلی انسٹیٹیوٹ رکھا گیا ہے - ابھی اسے قائم ہوئے ایسا زیادہ عرصہ نہیں ہوا مگر اس میں ۴۰۰ طالب کے قریب تعلیم پا رہے ہیں - بعض سخیر اشخاص اور گورنمنٹ کی فیاضی کی بدولت اس کالج کے کتب خانہ میں آج تقریباً ۱۲ ہزار کتابیں موجود ہیں - اس کے ساتھ ایک عجائب گھر بھی قائم کیا جا رہا ہے - چنانچہ وائسرائے لارڈ کیننگ کی سفارش پر اس کی امداد کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی سے دگنی منظور ہوگئی - اس عجائب گھر میں ایک قدم شریف (پتھر جس پر رسول مقبول کے قدم کا نشان ہے) ہے - یہ پہلے ایک صندوق میں بند تھا اس صندوق کی نگرانی پر ایک آدمی مامور تھا جسے ۵۰ روپے ماہوار دئے جایا کرتے تھے - ایک قدم حضرۃ فاطمہ (رض) کا ہے - دھلی کے آخری بادشاہ کے حمام خانہ کی چوکی ہے - ہندوستان Materia Medica کی مختلف جڑی بوٹیاں یہاں موجود ہیں - ہندوستانی عطریات ، صنعت و حرفت کے نمونے ، سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کی بنی ہوی اشیا ، مصوری کے نمونے ، موسیقی کے آلات ، صندل اور ہاتھی دانت کی صندوقچیاں ، زمرد و جواہرات کے ڈبے ، لکھنؤ کے مٹی کے کھلونے ، بچوں کے کھلونے اور مثال اور مختلف انواع کے دیسی کپڑے اس عجائب گھر میں ہیں —

کلکتہ یونیورسٹی جس کا اثر پشاور اور کٹک تک ھے آج کل اچھی حالت میں ھے - بمبئی میں جو حال میں یونیورسٹی قائم ہوئی ھے اس کی حالت بھی قابل اطمینان ھے - اس یونیورسٹی کا آخری سندی امتحان گذشتہ ستمبر کے مہینہ میں ہوا تھا - امتحان میں ۱۵ طلبہ نے شرکت کی تھی جن میں سے ۷ کامیاب ہوے - اس امتحان کے نصاب میں Rev .M Mitchell کی اطلاع کے مطابق' باغ و بہار جس کا میں اپنے ہر خطبے میں عادتاً ذکر کرتا ہوں' اخلاق ہندی' جو Hitopades کا اردو ترجمہ ھے' میرحسن کی مشہور مثنوی سحرالبیان اور دیوان ناسخ شامل تھے - لطف‌الله سورتی جن کی "خود نوشت سوانح عمری" بڑی مقبول ہوئی کہتے ہیں کہ ناسخ اردو زبان کے بہترین شعرا میں سے ہوا ھے —

Haileybwy اور Addisoncombe کی درس گاہوں کے بند ہونے سے میری دانست میں ہندوستانی زبان کے شوق مطالعہ کو کوئی صدمہ نہیں پہنچے گا - میں جس زمانہ میں اپنے درس پیرس میں شروع کرتا ہوں اسی زمانہ میں Woolwich کی فوجی اکاڈمی کے طلبہ بھی اپنا اردو کا درس شروع کرتے ہیں - اب ایسٹ انڈیا کمپنی کے فوجی مدرسہ کے طلبہ Woolwich کے مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں - لیکن ان کی تعلیم اور دوسرے طلبہ سے مختلف ھے - چونکہ بعد میں ان کا ارادہ ہندوستان میں فوجی خدمات پر جانے کا ہوتا ھے اس لئے خاص طور پر ان کے لئے علحدہ استاد مقرر کئے جاتے ہیں جو انہیں اردو اور دوسری مشرقی زبانیں سکھاتے ہیں جن کی انہیں آئندہ زندگی میں ضرورت پڑے گی —

ایسٹ انڈیا ہاؤس کا کتب خانہ Board of Control (بورڈ آف کنٹرول): کی

عمارتوں میں منتقل ہو چکا ہے - اس کتب خانے میں مشرقی علوم و ادب پر چوبیس هزار کتابیں موجود هیں- ان میں ۸ هزار قلمی نسخے هیں - میرا خیال ہے کہ ان کتابوں میں اردو کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جس میں مطبوعہ اور قلمی نسخے دونوں شامل هیں - ان قلمی نسخوں میں قرآن کا وہ مشہور قلمي نسخہ بھی ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان کے هاتھہ کا لکھا ہوا ہے - یہ کوفی خط میں ہے - اس پر متعدد مشرقی بادشاہوں کے دستخط اور ان کی مہریں ثبت هیں جس کی وجہ سے وہ ایک بے بہا اور نادر چیز سمجھی جاتی ہے - قرآن کي چند سورتیں حضرت علی کے هاتھہ کی لکھی ہوئی اس ذخیرۂ کتب میں ملتی هیں - اس کے سرورق پر تیمور صاحبقرآن کی مہر ثبت ہے اور شاهجہان کے هاتھہ کی لکھی ہوئی چند سطریں هیں - ان چند سطروں میں یہ تحریر ہے کہ اس نے ڈیڑھ هزار مہر میں اس نسخہ کو خریدا -

ایسٹ انڈیا هاؤس کا عجائب گھر آج کل Fife House میں ہے جو Whitehall - Yard میں واقع ہے - اس میں جب داخل ہو جیئے تو پہلے کمرہ میں ولنگٹن ' کلایو ' هسٹنگز" اور ان انگریزوں کے مجسمے نصب نظر آتے هیں جنھوں نے تاریخ هند میں کارهائے نمایاں کئے هیں - یہاں هر کمرے کی ایک خصوصیت ہے - ایک میں هندوستان کی دهاتیں هیں' ایک میں سونے چاندی کا کام ہے ' ایک میں هیرے جواهرات هیں ' ایک میں ریشمی کپڑے اور زیورات ' اور ایک میں آلات کشاورزی و جهاز رانی هیں - ان سب میں سب سے زیادہ دلچسپی اور بصیرت وهاں حاصل ہوتی ہے جهاں هندوستان کے مختلف نسلوں کے لوگوں کے مجسمے رکھے هیں - انهیں دیکھہ کر هندوستانیوں کے رسم و رواج کی نسبت معلومات میں اضافہ ہوتا

ہے - اسی طرح ہندوستانی چڑیوں اور مختلف قسم کے جانوروں کی نہایت محنت و احتیاط سے تقسیمیں کی گئی ہیں اور انہیں الگ الگ رکھا گیا ہے - مسٹر الیٹ کے پاس امراوتی کے مرمریں بتوں کے کچھ ٹکڑے تھے وہ بھی یہاں موجود ہیں - یہ بت بدھ مت کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں —

میں سمجھتا ہوں اس جگہ موقع نہیں کہ میں اس عالیشان عمارت کے متعلق کچھ کہوں جو وزیر ہند کے دفتر کے لئے بنائی گئی ہے - اس کا طرز تعمیر غیر گوتھکی اور خالص اطالوی ہے - آج کل ازمنۂ وسطی کے طرز کو پروٹسٹنٹ ملکوں میں بھی پسند کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے —

پیرس میں بدستور ہندوستانی درسوں میں لوگ آتے ہیں - یہ سچ ہے کہ تعداد بہت زیادہ نہیں مگر جو آتے ہیں وہ عموما اعلی تعلیمیافتہ لوگ ہیں - میرے درسوں میں بیرونی ممالک کے مشہور لوگوں میں سے جو بھی کبھی تشریف لاکر مجھے سرفراز فرماتے ہیں ' میں مہیپترام روپرام کا خاص طور پر ذکر کرونگا - یہ برھمن ہیں اور ساتھ ھی نہایت با مذاق آدمی ہیں - صوبہ بمبئی میں انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر ممتاز ہیں - موصوف قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے دیسی تعصبات کی مطلق پروا نہیں کی اور انگلستان کے انتظام تعلیم کی تحقیق کے لئے اتنی دور آئے - ہندوستان جاتے ہوئے وہ پیرس میں کچھ دن ٹھیرے تھے - میں نے سنا ہے کہ جب وہ احمدآباد واپس پہنچے تو تعلیمیافتہ ہندوستانیوں اور اس شہر کے اعلی یوروپین طبقے نے ان کے خیر مقدم میں ایک جلسہ منعقد کیا - اس جلسہ میں سفر سے واپسی کی مبارک باد دی گئی ایک دیسی شاعر نے کہا کہ روپ رام کے سفر یورپ نے یہ ثابت کردیا کہ ہندو لوگوں کو سفر کرنے میں جو تین بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا

یعنی اخراجات، آب و ہوا کی سختی اور اپنے دھرم اور رسوم کی پابندی نہ کرسکنے کا ڈر ' یہ تینوں دشواریاں ایسی نہیں جن پر قابو پانا انسانی امکان سے باہر ہو —

حضرات ! اس خطبے کا خاتمہ میں اس مبارک باد پر کرتا ہوں کہ ہندوستانی واقعی خوش نصیب ہیں ملکہ نے ان کے لئے لارڈ کیننگ کا جانشین جن کا زمانہ حکومت آئندہ ماہ مارچ میں ختم ہورہا ہے ' لارڈ الجن کو وائسرائے منتخب کیا ہے - لارڈ الجن بڑے مشہور مدبر ہیں - موصوف نہایت ہر دل عزیز ہیں اور ہر کوئی ان کی عزت کرتا ہے - موصوف کینڈا اور اور چین میں اپنی ذہانت اور اپنی بلند حوصلگی کا ثبوت دے چکے ہیں - ان کے والد فنون لطیفہ کے بڑے قدردان تھے اور انہوں نے برٹش میوزیم کو بعض نہایت قابل قدر تحفے عطا کئے - اگر موصوف نے انہیں سنبھال کر نہ رکھا ہوتا تو ممکن ہے ان میں سے بعض تباہ ہو جاتے - لارڈ الجن کی والدہ اپنے خلوص ' تقوے اور فیاضی میں مشہور ہیں - موصوفہ کی اعلی قابلیت اور علم دوستی کا بھی انگلستان بھر میں چرچا ہے - مجھے اس بات کا فخر ہے کہ موصوفہ میرے کرم فرماؤں میں سے تھیں اور آج تک ان کے الطاف کریمانہ میرے حافظے نے فراموش نہیں کئے - مجھے پوری توقع ہے کہ لارڈ الجن لارڈ بنٹنگ کی طرح ہندوستانیوں کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کریں گے اور اپنے حسن انتظام اور عدل گستری سے ان کے دلوں کو تسخیر کر لیں گے - مجھے پوری توقع ہے کہ وہ اپنے زمانہ قیام میں ہندوستانی لوگوں اور حکومت برطانیہ کے درمیان نہایت خوش گوار تعلقات قایم کردیں گے جس کے سائے عاطفت میں زندگی بسر کرنا ان کے لئے تقدیر الہی معلوم ہوتی ہے —

——‡✻‡——

روسی ادب

پانچواں باب

روسی شاعری : پارناسی شاعر ' استعاریت اور انقلاب

اپولون نکولائی یوچ مائی کوت (۱۸۲۱ تا ۱۸۹۷))

از

(جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب بی - اے آنرز (آکسن)

پارناسی شاعروں کی طرح مائی کوت قومی زندگی سے اس قدر بے تعلق رہا کہ اس کی اپنی زندگی میں کوئی خاص واقعات نہیں ہیں جو بیان کے لائق ہوں ' اور اس کے ذاتی معاملات معلوم بھی بہت کم ہیں اس کا ارادہ پہلے مصور بننے کا تھا لیکن شاعری کا ذوق اس ارادہ پر غالب آیا - اس نے چودہ سال کی عمر میں اپنی پہلی نظم شائع کی ' اور جس انداز سے اس کا ادبی دنیا میں استقبال کیا گیا وہ نوعمر شاعر کی ہمت افزائی کے لئے بہت کافی تھا - سنہ ۱۸۴۰ ع سے اس نے اپنی زندگی شعر و شاعری کے لئے وقف کردی —

مائی کوت کے کلام پر فرانسیسی شاعر اندرکئے شے نی ئے * اور

---

* فرانسیسی انقلاب کے زمانے کا ایک شاعر ' جس کی غزلیں اور مرثیے مشہور ہیں زبان اور طرز بیان میں اس نے یونانیوں کی تقلید کی ہے (۱۷۶۲ - ۱۷۹۴) —

کلاسیکی یونانی شعرا کا گہرا اثر پایا جاتا ہے اور اس کے مضامین بھی عموما خالص روسی نہیں ہیں بلکہ یورپ کی تہذیبی اور مذہبی تاریخ سے لئے گئے ہیں - مگر آرٹ کی پرستش اسے اپنے ملک کے حالات سے بالکل بیگانہ نہ رکھ سکی ' اور اس کے کلام کا رنگ قوم کے عام خیالات کے ساتھ بدلتا رہا شروع میں وہ خالص " پارناسی " تھا جب سنہ ۱۸۵۵ کے بعد ملک میں آزادی کا شوشا ہوا تو اس کی نظموں میں اس کا عکس نظر آنے لگا اور پھر جب سنہ ۱۸۶۴ کے بعد لبرل تحریک کچھ کمزور پڑ گئی تو وہ بھی اپنا دامن جھاڑ کر آرٹ کے حرم میں رو پوش ہو گیا - اس آخری تغیر سے اس کی شہرت میں بہت فرق آگیا ' ورنہ اس زمانے میں بھی جب دوسرے " پارناسی " شاعر قوم کی بے توجہی دیکھ کر بالکل خاموش ہو گئے تھے اس کا کلام شوق سے پڑھا جاتا تھا اب اس کے قدردان بہت کم ہیں —

" تین موتیں " اور " دو دنیا " جن میں مائی کوف نے یونانی اور عیسائی تہذیبوں کی جنگ دکھائی ہے ' اور یونانی تہذیب کو اس کے حریف سے بدرجہا بہتر ثابت کیا ہے مائی کوف کا شاہکار مانی جاتی ہیں - رومن کلیسا کی تاریخ پر بھی چند نظمیں ہیں جو روسی شاعری میں کچھ حیثیت رکھنے کا دعوی کرسکتی ہیں - لیکن مائی کوف نے جب کبھی معاصر روسی زندگی کو اپنا موضوع بنایا تو اسے بہت ناکامیابی ہوئی - تاریخی نظموں کے علاوہ جو کچھ ہیں وہ اس کی مختصر نظمیں ہیں - ان میں اس کے تصور کا زور اور اس کی طبیعت کی رنگینی کچھ نظر آتی ہے اس کی زبان شیریں اور پر ترنم ہے اور اس کی فصاحت کا معیار بہت بلند ہے - ذیل کی نظم میں اس کے کلام کا خاص رنگ کسی قدر ظاہر ہو جائے گا —

ابابیل

میرا باغ روز بروز کھلا رہا ہے '
ویران ' ' اجڑا ہوا اور خالی خالی نظر آتا ہے ' :
میرا دل غمگین ہے '
خزاں کے سورج کی چمک '
درختوں کی جھڑتی ہوئی پتیاں ' شام کے گتّوں کی آواز
طبیعت میں الجھن پیدا کرتی ہے -
جب حسب عادت میری نظر چھت پر پڑتی ہے
تو کھڑکی کے اوپر ایک خالی گھونسلا دکھائی دیتا ہے :
اس میں ابابیلوں کی سرگوشیاں نہیں سنائی دیتی ہیں '
اس کی گھاس اور تنکے ہوا سے لٹک آئے ہیں ...
مگر مجھے یاد ہے کہ اسے بنانے میں -
دو ابابیلوں نے کیا کیا کوششیں صرف کیں '
تنکوں کو مٹی سے کس طرح جوڑ کر مضبوط کیا '
اِدھر اُدھر سے بال اور پر کیسے جمع کرکے لائیں -
اپنا کام وہ کس خوشی سے کرتی تھیں ' کس صفائی سے !
ان کے دل کیسے باغ باغ اتھے جب گھونسلے سے
پانچ ننھے چلبلے بچوں نے
سر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا !
تمام دن ان کی چوں چوں جاری رہتی
جیسے ننھے بچوں کی بکواس -
اور پھر ایک دن سب کی سب اڑگئیں !

اس دن سے پھر میں نے انھیں بہت کم دیکھا،
ان کا گھونسلا خالی پڑا ہے!
وہ اب کہیں اور اڑ گئی ہیں،
کہیں اور، یہاں سے بہت دور...
آہ، کاش میرے بھی پر ہوتے!

افناسی ئی افناس یوچ فیت (۱۸۲۰ - ۱۸۷۲)

اس اصول کا کہ "آرٹ کی غرض آرٹ ہے" فیت سے زیادہ قائل پارناسیوں میں بھی کوی نہیں تھا، اسے روس کے سیاسی اور اقتصادی مسائل سے بہت دلچسپی تھی اگرچہ وہ صرف قدامت پسند نہیں بلکہ جدتوں کا جانی دشمن تھا اور اس نے ان مسائل پر متعدد مضامین لکھے - لیکن اس نے اپنی شاعری میں آرٹ کی پرستش کے سوا اور کسی غرض کو شامل نہیں ہونے دیا - سنہ ۱۸۵۵ء کے بعد نقادوں کی عداوت نے اس کے کلام کی اشاعت روک دی اورفیت نے اس زمانے کی نظموں کا مجموعہ ۱۸۸۵ء تک نہیں شایع کیا، اس وقت ادب پر سے مبلغوں اور مصلحوں کا اثر جاتا رہا تھا —

فیت کے کلام کی خاص صفت اس کے احساسات کی نزاکت ہے اس میں تخیل کی کوئی خوبی ندرت یا گہرائی نہیں، صرف الفاظ اور ترنم کی پیدا کی ہوئی ایک کیفیت ہوتی ہے جو جذبات میں گدگدی سی پیدا کرتی ہے - مجموعی حیثیت سے فیت کے کلام میں یکرنگی محسوس ہوتی ہے، اس لئے کہ نازک احساسات کے سوا اس نے انسانی جذبات کے کسی اور پہلو کو اپنی شاعرانہ توجہ کے لائق نہیں سمجھا ذیل کی نظم کا فیت کے مخالفوں نے بہت مذاق اڑایا تھا اس لئے کہ اس میں اول سے آخر تک کوئی فعل نہیں ہے —

زیر آواز - دبی سانسیں :
بلبل کے لہرے -
دریا کی چاندی جیسی چمک '
اس کی جھومتی چال -
رات کی دھیمی روشنی - دھندلی تاریکی کا سملدر —
تاریکی کا بے پایاں سمندر -
ایک محبوب چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیتیں '
مسحور کن ادائیں
دھوئیں جیسے بادلوں میں کہیں ارغوانی رنگ
کہیں کہربا کی جھلک '
پیار ' پیار اور آنسو —
اور آفتاب کا طلوع ! ...
اسی انداز کی ایک اور نظم ملاحظہ ہو :
میں تجھے مبارکباد دینے آیا ہوں —
یہ کہنے کہ سورج نکل آیا ہے '
اور اس کی گرم ' روشن کرنیں .
پتیوں پر کانپ رہی ہیں ؛
یہ کہنے کہ جنگل جاگ اٹھا ہے '
سارے کا سارا جاگ اٹھا ہے ' اس کی ہر شاخ '
ہر چڑیا چونک پڑی ہے '
اور وہ بہار کی آرزوؤں سے بھرا ہے ...
یہ کہنے کہ کل کی سی امیدیں اور جوش لے کر

میں پھر تیرے پاس آیا ہوں '
میرا دل اسی طرح مسرت کا '
اور تیری خدمت کرنے کا آرزو مند ہے :
یہ کہنے کہ ہر طرف سے میرے پاس
شادمانی کا پیغام آرہا ہے '
یہ کہنے کہ میرا دل نغمہ سرائی پر تلا ہوا ہے
مگر معلوم نہیں میں گاؤں کا یا نہیں ...

یا کوت پتر ووچ پولون سکی (سنہ ۱۸۱۹ ع - سنہ ۱۸۹۸ ع)

فیت اور مائی کوف کے مقابلہ میں پولون سکی کے مضامین کا میدان بہت وسیع ہے اور وعام زندگی سے بہت زیادہ وابستہ ہے ' اس کے احساسات میں بھی اتنی نزاکت نہیں کہ وہ معمولی انسان کی عقل اور سمجھہ کو عاجز کردیں - اس نے عوام کے طرز پر چند نظمیں لکھی ہیں جو ادبی نقطہ نظر سے قابل قدر تو نہیں ہیں مگر ان میں کچھہ ایسی سادگی ہے اور ان کی زبان اتنی سہل کہ وہ ایک زمانہ میں بچے بچے کو یاد ہوا کرتی تھیں اس کے کلام میں ظرافت بھی پائی جاتی ہے اور ساتھہ ہی ایک فلسفہ حیات جو بہت گہرا نہیں ہے مگر اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ لوگ اس سے نہایت درجہ مرعوب ہوتے ہیں - پولون سکی روس کی سیاسی فرقہ بندیوں سے ہمیشہ الگ رہا اس لئے اسے نقادوں کی عداوت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس کے کلام کی اشاعت میں کوئی دشواری یا رکاوٹ نہیں ہوئی مگر اعلیٰ ادبی مذاق کے لوگوں میں اسے بہت کم قدرداں ملے ہیں - اُسے وہی لوگ پسند کرتے ہیں جن کی علمی بساط کم ہے ' اور جو شاعری کے ذریعہ سے اپنے جذبات اور خیالات

میں ذرا سا هیجان یا هلکا سا سرور پیدا کرنا چاهتے هیں پولون سکی کی سب سے مشہور نظم " موسیقی کے شوقین تتدے " کا قصہ هے جو کسی بلبل کا گانا سن کر اس پر عاشق هو گیا اور ملاقات کے شوق میں اُس کا دل تڑپنے لگا - بڑی تمناؤں کے بعد آخر کار اُسے دیدار کا شرف حاصل هوا ، لیکن بلبل اُسے دیکھتے هی کہا گیا - اس نظم کے علاوہ پولون سکی نے " پارناسی " طرز کے مطابق مختصر نظمیں بھی لکھی هیں جن سے بعض هر لحاظ سے بہت اچھی هیں مگر یہ اعلیٰ نمونے اس کے کلام میں صرف کاهے کاهے نظر آتے هیں - اس کی بہترین نظموں میں سے ایک کا ترجمہ دیا جاتا هے --

گزرا هوا زمانہ

مجھے یاد هیں وہ بچپن کے دن ، جب همارے گالوں پر پھول کی سی سرخی تھی ،
هم تم بھرے بھرے برف پر کھیلتے پھرتے تھے ،
اور سردی ایک بوڑھی عورت کی طرح اپنے هاتھوں سے ،
همیں پیار کرتی اور پھر اپنی بیساکھی سے آگ کے پاس بھگا دیتی ،
شام کے اندھیرے میں تمہاری آنکھیں چمکتی تھیں ،
آتش دان کی چنگاری تمہاری صورت دیکھا کرتی تھی ،
اور بوڑھی کھلائی همیں کہانیاں سناتی تھی ،
ایک بے وقوف کی جو کسی زمانہ میں تھا ،
لیکن وہ جاڑا بہار کی طرح مسکراتا هوا چل دیا ،
گرمیاں بھی گذر گئیں - اور اب خزاں کے طوفان کا شور سن کر
ایک اور جاڑا آرها هے ، بالکل دوسری طرح کا ،
ایک بے حس جاڑا ، اور وہ بھی اپنی بیساکھی سے ڈرا رها هے ...

ہماری کھلائی پیر پھیلائے سو رہی ہے '
قبر میں آرام کر رہی ہے ' اور یہ بھی نہیں دیکھتی
کہ تم تھک کر میرے سینے سے چھٹ گئی ہو '
گویا سن رہی ہو کہ میرا دل کیا کہتا ہے -
لیکن کھلائی کی طرح میرا دل بھی آج پیار سے
متاثر نہیں ہوتا ' وہ چنگاری بجھ گئی ہے
اور میرا دل تمہیں کہانیاں سنا رہا ہے
ایک بے وقوف کی جو کسی زمانہ میں تھا -

سنہ ۱۸۵۵ ع سے سنہ ۱۸۶۳ ع کے سیاسی جوش کے رفتہ رفتہ ٹھنڈے ہونے کے ساتھ ہی روسی شاعری کا معیار گرتا گیا ، اس میں نہ فن کی وہ خوبیاں رہیں نہ تخیل کی وہ بلند پروازیاں جو پشکن ' لیرمنتوف اور ٹیوچف کے کلام میں پائی جاتی ہیں - نکراسوف نے مضامین میں بہت جدت پیدا کی اور اگر اسے اچھے پیرو ملتے تو ممکن ہے روسی شاعری کا باغ پھر سر سبز اور شاداب ہو جاتا ' اور اس میں نئے نئے پھول کھلتے - لیکن افسوس ہے ایسا نہ ہوا ، اور جب تک کہ صدی کے آخری سالوں میں ' استعاریت ' نے نئے باغباں نہیں پیدا کئے روسی شاعری کا باغ ویران ہوتا گیا - سمیون یاکوف لے وچ ناڈسون (۱۸۶۲ - سنہ ۱۸۸۷) ' الکسے ئی نکولایے وچ اپوختن (سنہ ۱۸۴۱ ع - سنہ ۱۸۹۳ ع) کونس تان تی کونس تان تی نووچ سلوچیف سکی (سنہ ۱۸۴۴ ع - ۱۹۴۰ ع - اور ولا دیمر سرگے یوچ سولوف یوف (سنہ ۱۸۵۳ - سنہ ۱۹۰۰ ع) کی شاعری میں اس دور کے تمام ذہنی اور فنی نقائص

نظر آتے ہیں - نادسون نے بہت شہرت حاصل کی ، اور غالباً اس کے کلام سے زیادہ اشاعت اور ہردلعزیزی اس دور کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی ' لیکن نقاد اس کی مقبولیت کو محض عام مذاق کی پستی کی ایک علامت مانتے ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو نادسون کی شاعری میں لفاظی کے سوا کچھہ نہیں ' اور اس کے خیالات بھی جو کچھہ ہیں وہ ذہن اور تصور کی بیماری کی دلیل ہیں - اپوخ تن کے کلام میں پھر بھی زیادہ جان ہے ' لیکن اس میں ایک دوسرے طریقے پر ظاہر ہوتا ہے کہ روسی قوم میں انحطاط کی کیفیت تھی - اپوخ تن کی نظمیں روس کے جپسی گوئیوں کی زبانی بہت سننے میں آتی ہیں اور ان جپسی گوئیوں کا کام عموماً میخانوں میں لوگوں کو مست کرنا اور عیاشی میں چٹپٹا پن پیدا کرنا تھا - سلوچیف سکی اور سونوت یوپ پر اس قسم کا کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا ' لیکن ان دونوں میں فنی خامیاں بہت ہیں اور تخیل کی کوئی خاص خوبی نہیں پائی جاتی - ان چاروں شاعروں کی یادگار بس اسی وجہ سے قائم ہے کہ ان کے دور میں ان سے بہتر کوئی اور شاعر نہیں تھا ' یہ ,, کلاسیکی " اور " استعاری " دوروں کی درمیانی کڑی ہیں —

استعاریت اس عام ذہنی ہیجان کا ایک پہلو اور اس کی ایک پیداوار تھی جو انیسویں صدی کے آخر میں نظر آتا ہے اور جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مہذب اور منظم ہونے کے باوجود روسی قوم اپنی سیاسی اور سماجی زندگی میں جان نہیں پھونک سکی تھی - ہر طرف خانہ ساز خیالات کا غوغا تھا ' ہر روشن خیال آدمی اپنا فلسفہ حیات بناتا تو سمجھ

اصلاح اور نئی زندگی کی تعمیر کی تدبیریں سوچتا‘کلیسا‘ مذہب‘ حضرت عیسیٰ کی شخصیت ‘ ریاست پرستی‘ زار پرستی ‘ قوم پرستی ‘ یورپ پرستی ان سب کے معتقد اور مبلغ تھے ‘ مگر سب یکساں ناکامیاب رہے اور وہم و گمان کے جال میں گرفتار ہو گئے - نکراسوت کے بعد سے سنہ ۱۹۰۵ ع کے انقلاب تک شاعری کا عام سیاسی اور سماجی زندگی سے بس اتنا تعلق تھا کہ بعض ناسون جیسے شاعروں نے قومی خدمت کی امنگوں کو نظم کا جامہ پہنایا‘ لیکن یہ زمانہ ایسے انحطاط کا تھا کہ ان شاعروں کے کلام میں نہ سلامتی روشنی کے اعلیٰ جذبے نظر آتے ہیں ‘ نہ قومیت کے بلند ولولے - استعاریت کی تحریک روسی شاعری کو نئے اسالیب کے ذریعہ سے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش تھی اس کا سلسلہ نسب فرانسیسی شاعری کی ہم نام تحریک سے ملتا ہے ‘ لیکن روسی استعاریت پسند شاعروں نے اپنے استادوں کی زیادہ پیروی نہیں کی ‘ اور دراصل ان سے سیکھا بھی بہت کم - امریکن شاعر ایڈ گرا یلن پو (۱۸۴۹ ع - ۱۸۰۹ ع) اورجرمن فلسفی اور شاعر گوئٹے کا اُن پر فرانسیسی استعاریت پسند شاعروں سے بہت زیادہ اثر تھا —

فرانسیسی شاعر بودیلیر (۱۸۲۱ - ۱۸۶۷) کا ایک مصرعہ جس میں کائنات " استعاروں کا ایک جنگل " بتائی گئی ہے اور جرمن شاعر گوئٹے کا ایک شعر کہ " سب فانی چیزیں محض مجازی نقوش ہیں " استعاریت کے فلسفے کی بنیاد ہیں استعارے اور مجازی نقوش جس حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں اس کی جستجو اور اس کے دیدار کا اشتیاق روسی استعاریت پسند شاعروں کا محرک ‘ ان کا " جنون " اور " سودا " تھا - انہوں نے اپنے فرانسیسی استادوں کی طرح اسے صرف ایک شاعرانہ انداز ‘ اور نظم میں جدت اور انوکھاپن پیدا کرنے کا ایک بہانہ نہیں بنایا بلکہ اسے ایک

مکمل فلسفہ حیات کی صورت دیدی اور اس سے وہ روحانی غذا حاصل کرنے لگے جو ان کا مذہب اور کلیسا فراہم کرنے سے معذور تھا یوں تو استعاریت شروع میں ایک مغربی چیز تھی اور مغربی رنگ میں ڈوبی ہوئی روس میں اس نے بہت جلد روسی بھیس اختیار کرلیا ' اپنا نسب بھول گئی اور روس کے گذشتہ ذہنی رہبروں ' خصوصاً دستہ ئف سکی سے بہت گہرا رشتہ قائم کر لیا - اس رشتے کے قائم ہونے سے روسی ادب کو سراسر فائدہ ہوا ' انحطاط کے زمانہ میں روسی ادبی مشاہیر کی طرف سے جو غفلت برتی جاتی تھی اس کے بجائے انھیں سمجھنے کا ایک نیا شوق پیدا ہو گیا ' ان کے فلسفہ پر غور کرنے کی ضرورت ہونے لگی ' اور جیسے کوئی گہری نیند سے چونک کر سونے سے پہلے کے واقعات یاد کرتا ہے اور انھیں اپنی زندگی کا ایک ضروری حصہ سمجھنے لگتا ہے ' انحطاط کے بعد استعاریت پسندی کے ذریعہ سے روسی ذہن نے بیدار ہوکر اپنی ذہنی جدوجہد کے ٹوٹے ہوئے سلسلہ کو پھر جوڑ دیا ' اپنی ذہنی دولت کو یوں بہت بڑھا دیا - اس کی سب سے روشن دلیل یہ ہے کہ روس کے استعاریت پسند شاعر آزاد خیال ' بلند حوصلہ ' اپنے دیس اور اپنی قوم کے سچے اور گہرے دوست اور خیرخواہ تھے - سیاسی تحریکوں میں ان میں سے کوئی شریک نہیں ہوا ' لیکن ۱۹۰۵ کے انقلاب میں انھوں نے دکھا دیا کہ وہ جابرانہ حکومت کے دشمن اور ہر تحریک کے حامی ہیں جس کا مقصد روس کی آزادی اور بہبودی ہو —

استعاریت‌پسند شاعروں کے کلام کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جمالیات پر تصوف اور فلسفے کا رنگ چڑھانا چاہا ' اور اپنے جذبات کو نفسانیت اور مجاز پرستی سے بڑی حد تک پاک رکھا - عشق کو وہ ایک خالص روحانی

کیفیت کی صورت میں پیش کرتے ہیں' جس کی پاکی اور صفائی پر انسان کے سرکش' نفس پرست جذبات دھبے لگاتے رہتے ہیں' حسن ان کی نظروں میں ایک جلوہ ہے جس کے دیدار سے انسان محروم رہتا ہے' کیونکہ وہ ہوس اور شہوت کا پردہ ہے - لیکن یہ شاعر مذہبیت کے یا تو قائل نہیں یا اس سے نا آشنا ہیں' اور ان کی روحانیت کو تصوف کا ہم معنی نہ سمجھنا چاہئے کائنات' دنیا اور دنیاوی زندگی استعارے ہیں' حقیقت نہیں' "استعاروں کے جنگل میں" بھٹکتے پھرنا انسان کے شایاں شان نہیں' بس اسی کو جتا کر استعاریت کا فلسفہ ختم ہو جاتا ہے - باقی جو کچھ ہے وہ انسان کی گمراہی پر افسوس' تمناؤں کی بیکسی کا گلہ ہے اور سرد آہیں اور آنسو - نامسوں اور اپوخ تن کے بعد شعر و شاعری کا ایسا موضوع اختیار کرنا بہت قابل قدر جدت تھی' اور اس کے ساتھ ہی استعاریت پسند شاعروں نے اپنے کلام کو فنی حیثیت سے بھی اس درجۂ کمال تک پہنچایا جو پشکن کے عہد کے سوا روسی شاعری کو کبھی نہیں نصیب ہوا تھا - یہ خاص طور سے تعریف کی بات ہے' کیونکہ ان شاعروں نے نئے مضامین نئے طرز پر ادا کئے' اور ایسے ادبی انقلابوں کے ہراولوں میں عموماً فنی خامیاں اس کثرت سے ہوتی ہیں کہ اہل ذوق کو ان کی جدتیں تسلیم کرنے میں بہت تامل ہوتا ہے —

استعاریت پسند شاعروں کی تیسری خصوصیت ان کی زبان اور الفاظ کا انوکھا استعمال ہے - وہ زبان کو محض خیالات ادا کرنے کا آلہ نہیں سمجھتے' بلکہ کیفیات اور فضا پیدا کرنے کا ذریعہ بھی' اور یوں وہ الفاظ کے معنی سے زیادہ ان کی آواز کی تاثیر کو توجہ کے لائق فرض کرتے' بحر اور قافیہ اور الفاظ کے ارکان کی اونچ نیچ سے وہی کام نکالنا چاہتے ہیں جو

کوئیے سروں سے جو زبان اور الفاظ بھی ان کے نزدیک استعارے ہیں جن کے توسط سے جذبات کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے ' اور چونکہ جذبات کا تعلق صرف انسان کے ذہن سے نہیں بلکہ اس کي ہستی سے ہے ' اس لئے وہ جذبات کے ادا کرنے میں شاعر کے لئے ایسا طرز اختیار کرنا لازم قرار دیتے ہیں جس میں تصویروں کے رنگ ہوں اور موسیقي کے سر اور ناچ کے بھاؤ - ظاہر ہے یہ معیار کس قدر بلند اور مشکل ہے اور کوئی تعجب نہیں استعاریت پسند شاعروں کے کلام کا اکثر حصہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا ' کبھی آواز کی تاثیر پیدا کرنے کی کوشش میں معنی خبط ہو جاتے ہیں ' کبھی کیفیت اور فضا کے چکر میں شاعر اپنے مطلب اور مقصد بھول جاتا ہے - پڑھنے والے کو بھی اپنا فرض ادا کرنے میں بہت دشواریاں ہوتی ہیں ' اور اگر استعاریت کے قدردانوں میں ہلکے سرور اور ذرا ذرا سی گدگدی کا خاص شوق نہ ہوتا ' اگر وہ نظم میں معنی اور مطلب اور فلسفے کی جگہ آوازوں کی خوش گوار گونج اور اس کیفیت کے جو موسیقی کے سروں سے چھا جاتی ہے خواہش مند نہ ہوتے ' تو ممکن ہے استعاریت ہر دلعزیزی اور شہرت سے محروم رہتی - لیکن استعاریت پسند شاعروں کے ہنر ان کے عیبوں کو نظر سے چھپا دیتے ہیں - ان کے کلام کے اعلی نمونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا تخیل صرف بلند اور پاک نہیں ' وہ اپنی زبان کے سب جوہر پہچانتے ہیں ' اس کے ہر رنگ سے واقف ہیں ' اور اس پر اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ نازک سے نازک احساس اور نادر سے نادر کیفیت انتہائی سہولیت اور صفائی سے بیان کرسکیں ' الفاظ کی جانچ پرتال اور انتخاب میں وہ ویسے ہی ماہر ہیں جیسے مئے فروش شرابوں کا مزہ پہچاننے ' یا جوہری نگینوں کے

پر کہنے ' یا سہا کویا اپنے راگ کو اور گیت کو خارجی فضا سے موزوں کرتے ہیں ' اپنے علم و ہنر کا کمال دکھانا بھی خوب آتا ہے —

استعاریت کا پیش خیمہ ولاجیمر سولوفیوت اور دمیتری مرژ کوسکی کا کلام تھا ' لیکن اپنی اصلی صورت میں وہ اس مجموعے میں نظر آئی جو سنہ ۱۸۹۴ ع میں بال مونت (پیدایش سنہ ۱۸۶۷ ع) اور بریوسوف (سنہ ۱۹۲۴ - سنہ ۱۸۷۳ ع) نے " روسی استعاریت پسند " کے عنوان سے شائع کیا - اُسی کے ساتھہ ھی بال‌مونت نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ بھی ناظرین کے سامنے پیش کیا - روسی نقاد ان جدتوں کو تسلیم کرنے پر نہیں تیار تھے جو ان نظموں میں اختیار کی گئی تھیں ' اور استعاریت پسندوں پر اعتراضوں اور تضحیک کی بوچھار ہونے لگی - مگر وہ ھمت نہیں ھارے اور بیسویں صدی کے شروع تک وہ روسی مذاق پر حاوی ھوچکے تھے سنہ ۱۹۰۵ ع کے انقلاب نے انہیں ہر طبقے میں ہر دلعزیز بنا دیا اور اس کے بعد سے دس سال تک میدان سخن میں انہیں کا راج رہا ان میں سے اکثر کو سنہ ۱۹۱۷ ع کے انقلاب کا منظر دیکھنا بھی نصیب ہوا ' اور جس صدق دل اور خلوص اور جوش سے انہوں نے اُس نئی زندگی کا استقبال کیا جس کی امید انہیں انقلاب کے بھونچال اور زلزلے دلا رہے تھے ' وہ ان کی پیداوار دلی ' قوم پرستی اور قوم کے مستقبل میں شاعرانہ عقیدت کو بہت سبق آموز بنا دیتی ہے ' اور ان کے کلام کی وقعت ہماری نظروں میں اور بھی بڑھا دیتی ہے —

بال‌مونت اور بریوسوف کے کلام پر مغربی ' یعنی فرانسیسی اور انگریزی اثرات غالب ہیں ' اور ان کی زبان میں نہ وہ فصاحت ہے اور نہ وہ ترنم جو استعاریت‌پسند شاعروں کا معیار تھا - بال‌مونت فطرتاً شاعر تھا ' مگر اس نے

زبان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، بریوسوت نے محنت اور مشق سے زبان میں پختگی اور لوچ پیدا کر لیا لیکن اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ذہن اور تخیل ایک سچے اور اعلیٰ شاعر کا نہیں تھا۔

بال مونت کے عروج کا زمانہ انیسویں صدی کے آخری سال تھے، اور گو اس کے بعد بھی وہ ہر سال اپنی نظموں کے مجموعے شایع کرتا رہا ہے، اس کا بعد کا کلام بالکل بے رس ہے۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں اس نے بولشوک انقلاب کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور فرانس میں جا بسا۔ بریوسوت کو شہرت سنہ ۱۹۰۵ کے انقلاب میں حاصل ہوئی، جب اس نے اپنی نظموں کا ایک مجموعہ جس کا عنوان "ستیے فانوس" تھا شائع کیا۔ اسے سیاسی معاملات سے کوئی گہری دلچسپی نہیں تھی، صرف اس کا شاعرانہ خیال تھا کہ

"مرکز حسن ہے مشرقی بادشاہ اسلاطنوں کی قوت اور شان کا جلوہ رعب دار ہے وہ منظر جب ایک بپھری قوم کا غصہ بادشاہ کے لڑکھڑاتے تخت پر طوفانی موجوں کی طرح تھپیڑیں مارتا ہے، مگر قابل نفرت ہیں درمیانی کیفیتیں۔"

طوفان کے شوق نے بریوسوت کو سنہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کا بھی ہمدرد بنادیا۔ لیکن اس کے کلام سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ اسے روس یا اشتمالیت سے واقعی کوئی روحانی تعلق تھا۔ آخر عمر میں اس کی سب سے قابل قدر خدمت تھی "مزدور" شاعروں کو اپنے فن میں تعلیم دینا۔ جس کا وہ شعر کہنے سے زیادہ اہل تھا۔

بال مونت کی ایک نظم جس کا موضوع ڈاکٹر اقبال کی "تنہائی" سے بہت ملتا جلتا ہے ترجمہ کی جاتی ہے:

"میں نے آزاد ہوا سے پوچھا

کہ جوانی کا راز کیا ہے ؟
ہوا نے کھیلتے کھیلتے جواب دیا :
„ تیھہ صورت سے نجات حاصل کرنا ' جیسے ہوا اور دھواں ! "
میں نے صاحب حشمت سمندر سے پوچھا
کہ زندگی کا سب سے اعلی مقصد کیا ہے ؟
سمندر نے اپنے راگوں میں جواب دیا :
„ ہمیشہ میری طرح محو فریاد رہنا ! "
میں نے آسمان کے بادشاہ ' آفتاب سے پوچھا
کہ وہ چمک کیسے حاصل ہوگی جو صبح کو شرمندہ کرے ؟
آفتاب نے کوئی جواب نہیں دیا '
مگر میرے دل میں کہیں سے آواز آئی : „ جلنے سے ! "

بال مونت اور بریوسوت ہراول تھے ' جو استعاریت پسند شاعری کے بعد میدان میں آئے انہوں نے استعاری شاعری سے بڑی حد تک وہ فنی خامیاں دور کردیں جوان دونوں کے کلام میں پائی جاتی ہیں' استعاریت کو مغرب کی رہنمائی سے بے نیاز کرکے اسے ایک خالص روسی ذہنی تحریک بنا دیا ' الفاظ اور طرز بیان خود ایک معیار ہونے کے بجائے شاعر کے فلسفۂ حیات اور نظام کے موضوع کے ماتحت کردئے گئے ' گو ان کی استعاری اہمیت صرف قائم نہیں رہی بلکہ اور بڑہ گئی - الکساں کونف سکوئی (سنہ ۱۸۷۷ ع - سنہ ۱۹۰۱ ع) ایک بہت ہونہار شاعر جو عین جوانی میں ڈوب کر مرگیا ، الک سانڈر میخا ئلووچ ڈوبرو لیو بوت ' (پیدائش سنہ ۱۸۷۶ ع) ایک بہت ہی سنکی اور مراقی آدمی تھو لاپتہ ہوا کرتا ہے اور اب معلوم نہیں زندہ ہے یا نہیں اور ہے تو

کہاں ہے ' سرژ کوت سکی کی بیوی ' زنئیدا نکو لا ئفنا ہپی ؤس (پیدائش سنہ ۱۸۶۷ م) یہ تھیئوں استعاریت پسندوں میں فلسفیانہ طرز کے شاعر مانے جاتے ہیں اور ان کے کلام میں کائنات اور انسانی زندگی کے معمے حل کرنے کی ایک بہت گرم آرزو پائی جاتی ہے - اِنو کنتی فیوتوررووچ آنن سکی (سنہ۱۸۵۶ م) سنہ۱۹۰۹ م) کے کلام میں استعاریت کا انداز خالص شاعرانہ ہے ' لیکن پس منظر میں وہی مسائل ہیں جن پر فلسفیانہ رجحان کے استعاریت پسند محو رہتے ہیں - ناول نویس فیوتوروسو لوگب (پیدائش سنہ ۱۸۶۳ م) نے اپنا ایک جمالیاتی اور اخلاق کا انوکھا فلسفہ گھڑا ہے ' ایکن ذیل کی نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فلسفہ میں بڑی وہ گہرے خیالات رکھتا ہے اور انہیں ادا بھی خوب کرتا ہے :

اس سے محبت کیوں کر ' دنیا تری محبت کی
سزاوار نہیں -
اس کے اوپر سے گذرجا ' شہاب ثاقب کی طرح
تیزی سے —
اس کی سرد فضا میں ایک لمحہ کے لئے
چمک اُٹھ ' —
ایک دم بھر ایمان و عقیدت کی مشعل بن '
اور گُل ہوجا - —

ویاچلاف اِوانوت (پیدائش سنہ ۱۸۶۶ م) اور الک سانڈربلوک (۱۸۸۰م۱۹۲۱م) استعاریت پسند شاعروں کے سر تاج مانے جاتے ہیں اور انہیں کے کلام میں استعاریت اپنی پوری شان میں نظر آتی ہے - اوانوت پیٹر برگ کے حلقے بلوک ماسکو کے گروہ کا سردار تھا ' اور دونوں اپنے طرز میں یکتا ہیں —

اوانوت نے سنہ ۱۹۰۳ م میں اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع

ان کیفیتوں سے جن میں عامی اور تہذیبی نکتہ سنجی نہیں ؟ اور جو در اصل اس کے کلام کا بہترین حصہ ہیں ' اس شراب کا مزہ چکھہ سکتے ہیں جس کے نشے میں شاعر خود چور رہتا تھا - اوانوت کا کلام کچھہ اس وجہ سے بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اس میں معاصر روسی ذہنیت کا تقاضا کہ ہر شاعر اور ادیب کا اپنا فلسفہ بھی ہونا چاھئے پوار کیا گیا ہے ' اور چونکہ شاعر کی طبیعت وہ پابندیاں نہیں منظور کر سکتی جو کسی خاص نظام فلسفہ یا مذہبی عقیدے کے مبلغوں پر لازم ہے ' اس لئے کوشش سے ان کے کلام میں خواہ مخواہ الجھاؤ اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے —

اوانوت نے سنہ ۱۹۰۵ ع کے انقلاب میں دستہ ئف سکی کے مشہور کیرکٹر اوان کرمازوت کے طرز پر انکار اور بغاوت کا فلسفہ اختیار کیا اور اس کی تعلیم دی کہ انسان کو تمام خارجی پابندیوں اور رکاوٹوں سے آزاد کرنا چاھئے - اس تخیل کا نام اس نے ,, صوفیانہ نراج " رکھا تھا ؟ انقلاب کی تحریک دب جانے کے بعد ,, صوفیانہ نراج " سے اوانوت کو زیادہ عقیدت نہیں رھی ' اور پیتر برگ کے استعاریت پسندوں کی رہبری کے زمانے میں اس نے ایک نیا فلسفہ اس بنا پر تعمیر کیا کہ آرٹ بھی ایک قسم کا مذہب اور تصوف ہے ' اور اس کا معیار مذہبی اور صوفیانہ ہونا چاھئے - لیکن اس حالت میں جب کہ مذہب اور تصوف خود تعریف اور تعین کے محتاج ہوں اس قسم کے عقیدے بالکل بے معنی ہیں اور یہ نہ اوانوت کے ذہن میں کوئی مستقل صورت اختیار کرسکے نہ اس کے چیلوں کے ذہن میں - اوانوت کے کلام میں جو شخصیت ظاہر ہوتی ہے وہ آزاد ہے ' نکتہ چیں ہے ' کبھی کبھی ہاکی بھی

ہوجاتی ہے ' اپنے احساسات اس متانت اور شوکت سے ادا کرتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے اسے مذہب اور تصوف کی سرپرستی بالکل درکار نہیں ' اور اس کے نغموں میں ایک سرور ہے جس کی تاثیر میں عقیدے کی موافقت اور مخالفت سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا —

اوانوف کی نظموں کا ترجمہ کرنا دراصل ان کی توہین کرنا ہے کیونکہ زبان کا ترنم اور الفاظ کے انتخاب کی باریکیاں جو اس کی نظموں کا خاص زیور ہیں ترجمے میں کسی طرح ظاہر نہیں ہو سکتیں ' اور اس کے خیالات اگر ان خاص الفاظ سے کر دئے جائیں جن سے آراستہ کرکے اوانوف نے انہیں پیش کیا ہے تو ان کی صورت بہت بگڑ جاتی ہے - تاہم ایک دو نظموں کا ترجمہ دیا جاتا ہے —

یونانی عشق کے دیوتا ایروس کی شان میں ایک گیت ہے جس کے آخر میں شاعر کہتا ہے —

تیرے تیر کا زخم کھاتے ہی
میں تیری تیر اندازی کا محرم راز بن گیا -
تیرا شاگرد بننے سے معلوم ہوا
کہ جدائی ایک بیش بہا دولت ہے -
موت عشق کی ضمانت ہے '
موت عشق کا ہم زاد ہے '
اُس روح کے لئے جو دنیا میں پھنسی ہو '
موت اور عشق ایک ہی انجام کے
دو نام ہیں ' پکارنے کے دو طریقہ -

جاڑے کے کھیتوں کی ایک شکایت سنئیے -

میرے ویران راستوں کے غیبی رہبر !
تو مدتوں سے میری آزمائش کر رہا ہے
امرات کے ان گہرے قعروں میں ' جہاں داخل ہونے کو
ہم اس دنیا میں پیدائش کہتے ہیں -
میری عزت چھن گئی ' اور مجھے ملا کیا :
اوروں کے ساتھ ایک کال کوٹھری میں بند رہنا '
جب تک کہ میں ان چیزوں سے جو میرے دل کو نہیں بھائیں
راضی نہ ہوجاؤں ' ایک بوسہ دے کر دل کا غبار دور نہ کردوں -
میں نے سنگ دل ' بے لطف جاڑوں کی صحبت سے گریز کیا '
اور عیاشوں کی طرح ان دیسوں میں جا کر جہاں جاڑے کی پہونچ نہیں
مناظر فطرت کو محبوب بنایا اور رنگ رلیاں مناتا رہا
لیکن میرے آقا اور استاد نے خفا ہوکر حکم دے دیا
کہ تاریکی کے بادل میری دنیا ہوں ' برف کے ڈھیر میری قبر
اور برف کے طوفان میری نجات کے لئے گیت گائیں ' دعائیں مانگیں -

استعاریت کے خاص طرز اور روسی کلاسیکی ' رومانی اور حقیقت نگار شاعری کے اسالیب کی بہترین آمیزش الکساندر بلوک کے کلام میں پائی جاتی ہے - شروع میں اس پر سولوفیوف کے فلسفے اور زنتی داہپی ئس کے طرز کا اثر تھا ' اور اس کے پہلے مجموعۂ کلام (سنہ ۱۹۰۴ ع) میں یہ ظاہر بھی ہوتا ہے - یہ نظمیں ایک " خوبصورت خاتون " کی شان میں تھیں ' اور یہ معلوم کرنا دشوار نہیں کہ یہ " خوبصورت خاتون " کوئی انسان نہیں ہے بلکہ عقل کامل کا وہ مجسمہ جسے بعض یونانی فلسفی " صوفیا " کہتے تھے اور جس کا ذکر سولوفیوف کی نظموں میں آتا ہے - لیکن " خوبصورت خاتون "

کی ذات و صفات اور نظم کی ساخت اگرچہ بلوک کی اپنی ایجاد نہیں ' پھر بھی اس پر سرقے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا اور اس کی ان نظموں میں بہت سی خوبیاں ہیں جو اس کی اپنی طبیعت کی پیدا کی ہوئی ہیں - اس مجموعہ نے شاعری کے عام قدردانوں میں تو بلوک کو مشہور نہیں کیا ' کیونکہ اس کے کلام کا استعارات کے خاص تخیل سے بہت تعلق تھا اور جو بلوک کے خیالات سے واقف نہ تھے انہیں ان نظموں کے سریلے الفاظ سوا اور کسی چیز سے لطف نہیں حاصل ہوسکتا تھا - لیکن خود شاعروں کے حلقوں میں بلوک اور اس کا کلام ہاتھوں ہاتھ لیا گیا - سنہ ۱۹۰۵ کے انقلاب میں بلوک کا خون بھی ابل اٹھا ' وہ نظموں میں " صوفیانہ نراج " کی تعلیم دینے لگا ' اور ایک موقع پر اس نے سرخ جھنڈا لےکر سڑکوں کا گشت بھی لگایا یہ جوش چند روزہ تھا - انقلابیوں کی ناکامی نے بلوک کو بہت مایوس کردیا ' اور وہ صرف " صوفیانہ نراج " کے عقیدے نہیں بھول گیا بلکہ اپنی " خوبصورت خاتون کو بھی ' اور سنہ ۱۹۰۶ میں اس کے کلام کا جو مجموعہ شائع ہوا اس میں ان دونوں کا پتہ نہیں ملتا - بلوک نے فلک پیمائی کے حوصلے چھوڑکر دنیا کی طرف رخ کیا ' شاعرانہ طبیعت کے نازک احساسات ترک کرکے دنیا اور زندگی کی حالتوں اور کیفیتوں کو اپنا موضوع بنایا - " خوبصورت خاتون " کی بجائے اب ایک " اجنبی عورت " کا تصور اس کے ذہن پر حاوی ہوگیا ' ایک انجان ہستی جو " خوبصورت خاتون " کی طرح آسمان کی رہنے والی اور ستاروں کی سہیلی نہیں ہے بلکہ ایک لڑکی جو طرح طرح کے بھیس بناکر دنیا کا تماشا دیکھتی پھرتی ہے ' اور اکثر ایسے مقامات پر نظر آتی ہے جہاں شرابی اور عیاش جمع ہرتے ہیں - کبھی شاعر اسے دوری سے دیکھتا ہے اور " تیز شراب دل کے گوشہ گوشہ میں سرایت

کرجاتی ہے " کبھی مت بھیز ہوجاتی ہے اور شاعر کو اس کے چہرے پر اس کے مزاج کی عجیب عجیب کیفیتیں اس کے دل کے راز ' اس کی آرزوئیں اور تمنائیں نظر آتی ہیں - لیکن گو " اجنبی عورت " کی کیفیتیں روشن ہیں ' شاعر اپنی امنگیں اور خواہشیں نہیں سمجھتا کہ کیا ہیں —

" میں ' اپنے نصیب کے ستارے کے چمکنے سے مست اور مسرور ہوں '
شراب نے اور صبح کی رونق اور دیدار نے
مجھے بے زبان کردیا ہے ' تڑپا دیا ہے '
مجھے امید اب کس بات کی ہے ' انتظار کا ہے کا ؟

" خوبصورت خاتون " اور " اجنبی عورت " دونوں کے عشق سے بلوک اپنے دل کو تسکین نہیں پہنچاسکا اس کا جذبہ نہایت پاک تھا - اور شوق بے انتہا لیکن یہ استعارے اصلیت کی شکل نہیں اختیار کرسکے ' اور بلوک اس میں جان ڈالنے کی کوشش سے اکتا گیا - آخیر میں روس ' اس کا دیس ' وہ سر زمین جس کی گود میں اس کی شخصیت پلی تھی ' جس کی مصیبتوں نے اس کا دل دکھا یا تھا ' جس کی فضا نے اسے نواسنجی سکھائی تھی ' اس کی معشوقہ بن گئی * نظموں کا دوسرا مجموعہ جس میں بلوک کے فلسفے کا یہ رخ نظر آتا ہے ' ہر صورت سے اس کے کلام کا بہترین حصہ ہے - وہ مایوسی جو اس سے پہلے کی نظموں میں محسوس ہوتی ہے ' اب حد سے گذر جاتی ہے' مگر اس کے ساتھ ہی بلوک کو روس کے مستقبل کا خیال کرکے کچھ روحانی سہارا بھی مل جاتا ہے ' اور اس کی مایوسی محض ایک ذاتی کیفیت ہوجاتی ہے ' کل کائنات پر چھائی ہوئی نہیں رہتی - اس مجموعے کی اشاعت کے ایک سال بعد ہی بولشوک انقلاب نے روسی زندگی کی کایا پلٹ دی ' اورگو بلوک کو

* روسی زبان میں روس مونث ہے

سیاسی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ' وہ بولشویکوں کے ساتھ شریک ہوگیا ' اور اپنی شاعرانہ امیدوں کو ان کی کوششوں سے وابستہ کردیا اس کی دو لمبی اور بہت سی مختصر نظمیں جو انقلاب کے دوران میں لکھی گئیں ان امیدوں کا رنگ دکھاتی ہیں لیکن اپنی نسبت اس کا وہی خیال رہا ' اپنی ذات کی طرف سے وہی مایوسی جو سنہ ۱۹۱۴ع کی ایک نظم سے ظاہر ہوتی ہے —

اور اگر ہمارے بستر مرگ پر
چیل کو چلائیں اور منڈلائیں تو پروا نہیں -
تو ان کو جو ہم سے زیادہ سزاوار ہیں
اے خدا اپنے جلوے کی دیدار سے سر فراز کر !

بلوک کے پہلے طرز کی دو نظمیں ملاحظہ ہوں :

مجھے مت بلا میں بن بلائے
تیرے حرم میں پہنچ جاوں گا -
خاموشی سے تیرے پیروں پر
سر کو جھکاؤں گا -
تیرے احکام سنوں گا '
چپ چاپ انتظار کروں گا -
دیدار کے لمحے کے مزے لیکر
پھر اسی آرزو میں محو ہو جاؤں گا :
تیرے جذبات کی شدت
میرے گلے کا طوق ہوگی -
کبھی خادم بنوں گا کبھی محبوب

اور ہمیشہ غلام رہوں گا :

شاعر کے دل کی ایک خاص کیفیت کا بیاں سنئے ۔

شام کو جب زمین کہرے کی نقاب ڈال لیتی ہے
تو بھونچال اور شعلوں سے گھرا ہوا
ایک فرشتہ قرآن کے صفحوں سے نکل کر
میری مردہ روح میں داخل ہو جاتا ہے ۔
دماغ کمزور اور تھکا ماندہ ہوتا ہے '
روح اڑتی چلی جاتی ہے ...
ہر طرف بے شمار پروں کی پھر پھراہٹ ہوتی ہے '
کانوں میں ایک پر اسرار گیت کی صدا گونجتی ہے ۔

تیسرے دور میں بلوک کی ذہنیت پر مایوسی کا غلبہ تھا ۔ ایک مختصر نظم میں وہ اسے اپنے خاص طرز میں ظاہر کرتا ہے :

عیش و طرب کی مجلس کا لطف اٹھا کر
میں رات کو بہت دیر سے گھر واپس آیا ۔
رات کا اندھیرا میرے کمروں میں منڈلا رہا تھا '
میرے گوشۂ عافیت کی حفاظت کرنے کو ...
صرف میرا شیطان دم بھر بھی چین نہیں لیتا ۔
وہ مجھ سے کہتا ہے : دیکھ یہ تیرا جھونپڑا ہے ۔
اب اس وقت کی کیفیت ' اس وقت کی بیہودگیاں بھول جا
اور پارساؤں کا سامنا بنا کر اپنے گیتوں میں گذشتہ زمانے کی جھوٹی تعریف کر۔

اس دور کی بہترین نظمیں وہ ہیں جن میں بلوک نے اپنے کو مخاطب کیا ہے ' مگر افسوس ہے طوالت کے اندیشہ سے یہاں ان کے ترجمے دینا ممکن

نہیں - بلوک کی استعاریت پر آخری دور میں حقیقت نگاری کا جو رنگ چڑھ گیا : اس کی بہت اچھی مثال ایک نظم میں ملتی ہے جس میں ایک فوج کا ریل پر سوار ہوکر پیٹر برگ سے میدانِ جنگ کے لئے روانہ ہونا بیان کیا گیا ہے —

اس ریل گاڑی کے مسافروں میں جدائی کے درد، محبت کی بے چینیوں ،
قوت ، جوانی ، امید کے ہزاروں پھول کھلے ہوئے تھے ...
اور دور مغرب کی طرف
دھریں جیسے بادل خون میں ڈوبے ہوئے تھے -

موت کا یہ شگون اور بھی واضح کردیا جاتا ہے -

گاڑی اسٹیشن سے نکل گئی
اندھیرے میں آخری ڈبے چھپ گئے ؛
اور خاموشی نے صبح تک کے لئے ڈیرے ڈال دئے ؛
لیکن بارش سے ، گیلے میدانوں سے " ہورا " کی آواز آتی رہی تھی "
جس کی ہولناک صدائے باز گشت تھی : آگیا ، وقت آگیا "

سنہ ۱۹۱۸ کے بعد استعاریت کا زور کم پڑگیا - اگرچہ بلوک اور ویا چلاتاوانوت ؛ اس کے دو عظیم الشان نمائندے زندہ تھے اور ان کا کلام بہت مرغوب بھی تھا ؛ اس سال سے ایک نئی تحریک شروع ہوئی جو " شاعری پیشہ برادری " کے نام سے مشہور ہے اور جس کا بانی نکولائی ستیپا نووچ گومی لیوف تھا - شاعری کے اس نئے معیار کے مطابق دنیا اور زندگی کو استعارہ سمجھنا غلط تھا ، اور شاعر کا فلسفہ حیات ایک حقیقت نگاری قرار دی گئی جو پھول کو پھول کہے ؛ اور خوبصورت سمجھے ؛ مگر

اپنے احساسات کے بیان میں وہ تازگی پیدا کرے ' اپنی نظر میں وہ سادگی جو اس انسان کی خصوصیات تھیں جس نے پہلے پہل دنیا میں وارد ہوکر دنیا کو دیکھا اور اس پر تعجب کیا - اس نئے معیار نے تصوف کو بھی شاعری سے خارج کردیا ' اور شاعر کو بجائے استعاریت پسندوں کی طرح عارف سمجھنے کے محض صناع قرار دیا - خود گومی لیوت کا کلام اس معیار پر پورا اترتا ہے ' کیونکہ وہ آدمی بہت من چلا تھا ' سیر و سیاحت اور درندوں کے شکار کا شوقین ' بالکل ویسا ہی دنیا میں دوبارہ انسان جیسا " شاعری پیشہ برادری " والوں نے شاعر کے لئے ہونا لازم کیا تھا - اس کی نظموں کے موضوع بھی جنگل اور شکار اور شکار کے حادثے ' سمندر کے سیاح اور بہادر سپاہی تھے - ایک نظم میں جہاں گومی لیوت نے جسم اور روح کا ایک مکالمہ بیان کیا ہے ' جسم کہتا ہے : مگر اس سب کے بدلے جو میں نے لیا ہے اور اب بھی لینا چاہتا ہوں ' اپنی خوشی اور حماقتوں اور رنج کے بدلے ' میں ' جیسا کہ ہر مرد آدمی کو چاہئے ' مرنے اور مٹ جانے پر بھی راضی ہوں - مردانگی کو اس درجے تک پہنچانا کہ وہ شعر ہی کر بھی ظاہر ہوا کرے آسان کام نہیں - اور " شاعری پیشہ برادری " کا گومی لیوت کے علاوہ ایک ہی اور رکن ہے جس نے میدان سخن میں نام پیدا کیا : آننا آخما تووا ' جو چند سال تک گومی لیوت کی بیوی بھی رہ چکی ہیں ــــ

آننا آخما تووا (پیدائش سنہ ۱۸۸۹ ع) کی نظمیں پہلی بار سنہ ۱۹۱۱ ع میں ' گومی لیوت سے شادی ہونے کے ایک سال بعد شایع ہوئیں - یہ نظمیں خاص شاعروں کے حلقوں میں بہت پسند کی گئیں ' عام شہرت آننا آخماتووا کو ان کے کلام کے دوسرے مجموعے کی اشاعت پر حاصل ہوئی

(سنہ ۱۹۱۴) - اس کے بعد دو اور مجموعے شائع ہوئے ' ایک سنہ ۱۹۱۷ ع میں دوسرا سنہ ۱۹۲۲ ع میں - بلوک کے انتقال پر پیٹر برگ کے شاعروں کی سرداری ان کا حصہ ہوئی —

آنا آخما توو کی نظمیں زیادہ تر ڈراما کے سے مناظر ہیں ' مگر بہت مختصر - ان کے جذبات میں کسی قسم کا شاعرانہ بناؤ سنگار نہیں ' لیکن شدت ہے اور خلوص ' طرزبیان کے اختصار سے ان کی نظموں میں ایک عجیب لطف پیدا ہوتا ہے ' اور گو وہ زیادہ تر آپ بیتی سناتی ہیں ' ان کی کیفیت ایک خواب کی سی رہتی ہے - دونمونے ملاحظہ ہوں —

جیسے کہ سیدھی سادی خوش اخلاقی کا تقاضا ہے '
تم میرے پاس آئے مسکرائے '
کچھ پیار سے ' کچھ بے پروائی سے
میرے ہاتھ پر بوسہ دیا '
اور مجھ پر ایک نظر ڈالی ' معلوم ہوا
کہ پرانی الجیلی صورتیں مجھے دیکھ رہی ہیں -
میں نے ایک لفظ کہا جس میں
دس برس کی آہیں ' اس مردنی کی جو مجھ پر طاری تھی '
ان راتوں کی جو میں نے جاگ جاگ کاٹی تھیں
ساری تاثیر جمع تھی - مگر اس کا کہنا بے سود ہوا
تم چلے گئے اور پھر میرا دل
سپاٹ اور ویران اور خالی ہوگیا

جدائی کی ایک صورت یوں بیان ہوئی ہے

میں تمہارا منھ دیکھنے سکی ' تمہارا خاموش ہاتھ چھوڑ نہیں سکی '

اس کی پروانہ کروں گی کہ میری زندگی ویران ہوگئی ' جیسے بے بادل آسمان ،
تیرا ' صرف تیرا اپنے گیتوں میں چرچا کروں گی ،
تجھے مشہور کروں گی ، جیسا کوئی عورت اپنے دوست کو نہیں کر سکی ہے -
تو اپنی عزیز دوست کو یاد کرے گا ، اس جنت کو
جو تونے اس کی آنکھوں کو فرحت پہنچانے کے لئے بنائی تھی '
اور میں سوداگری کروں گی ایک بیش بہا مال کی —
تیری الفت اور محبت کو شعر بنا کر بیچوں گی —

آننا آخماتووا کی ایک اور نظم کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس میں صرف روس کی نہیں بلکہ ہر اس قوم کی ذہنیت جو تنزل کی حالت میں ہوتی ہے بہت سچے اور دل کش طریقے پر بیان کی گئی ہے :

ہم نے سمجھہ لیا کہ ہم مفلس ہیں ' ہمارے پاس کچھہ بھی نہیں -
اور جب ایک کے بعد ایک نعمت ہمارے ہاتھہ سے جانے لگی ،
اور ہر دن ایک نئے نقصان کا ماتم ہونے لگا
تو ہم نے گیت بنانا شروع کئے
خدا کے عظیم الشان فیض و کرم پر '
اور اس دولت پر جسے کبھی ہم اپنی کہتے تھے "

استعاریت کے زوال پر روسی شاعروں کے اصولوں اور اسالیب میں انتشار پیدا ہوگیا اور ابھی تک یہی صورت قائم ہے - اوسپ یمییل یوچ ماندل ستام نے شروع میں ،، شاعری پیشہ برادری " کے اصول نظم اور گومی لیوت کی تقلید کی ' لیکن پھر اپنا نیا طرز ایجاد کیا ہے جس میں خیالات اور زبان کے اعتبار سے کوئی خوبی نہیں ' صرف الفاظ کے انتخاب اور ترتیب سے موسیقی کی خاص کیفیتیں شعر میں پیدا کر دی گئی ہیں - سنہ ۱۹۱۷ ع کے بعد دو اور

نئے حلقے وجود میں آئے ہیں ' " دیہاتی شاعر ن " یا " تصوری " اور " مستقبلی " دونوں پر اشتمالیت کی تعلیم اور انقلاب کی فضا کا بہت اثر ہے ' یعنی انھوں نے فن شاعری کے وہ بنیادی اصول اور وہ مقاصد جو شروع سے اس وقت تک ہر شاعر نے تسلیم کئے ہیں اور جو شاعری کا خاص میدان سمجھے جاتے ہیں ' بالکل رد کر دئے ہیں - ان کی شاعری کو جمالیات سے کوئی واسطہ نہیں ' وہ خود نہ لطیف جذبات رکھتے ہیں نہ دوسروں کی طبیعتوں میں ان کا وجود تسلیم کرتے ہیں ' جن سے انہیں کوئی سروکار نہیں ' خواہ وہ منظر فطرت کا ہو یا انسان کا یا تخیل کا - اس صورت میں ان کے کلام کا ذکر کرنا فضول ہے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرنا بیکار - ان جدتوں سے کہیں بہتر ان پرانے شاعروں کی نظمیں ہیں جو انقلاب کے زمانے میں انقلاب کی اخلاقی اور روحانی کیفیات پر لکھی گئی ہیں ' جن میں سچی باتیں اچھے طریقے سے کہی گئی ہیں اور جن کے مصنف روسی قوم اور روسی فطرت سے انقلابیوں سے بہت زیادہ گہری واقفیت رکھتے ہیں -

انقلابی دور کی پرانے طرز کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے بلوک کا نام زبان پر آتا ہے - جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ' بلوک نے " خوبصورت خاتون " اور " اجنبی عورت " کی طرف سے سرد مہر ہو کر اپنی سر زمین روس کو معشوقہ بنایا تھا - پہلے انقلاب کی ناکامی اور اصل حقیقت کے انکشاف نے اسے بہت مایوس کر دیا تھا ' مگر اس مایوسی کے باوجود اس کی محبت کا جذبہ بہت قوی رہا - ایک نظم میں وہ روس کو ایک دنیا دار عورت کی شکل میں پیش کرتا ہے - اور اس کی طرف ہر قسم کی اخلاقی پستی اور دل کا کھیلا پن منسوب کرکے آخر میں کہتا ہے ؛

مگر اس صورت میں بھی ' اے سر زمین روس

تو مجھے دنیا کے ہر ملک سے زیادہ عزیز ہے:

جہاں روسی فطرت کی خامیاں نہیں بیان کی جاتی ہیں وہاں اور باتوں پر افسوس ظاہر کیا جاتا ہے مگر شاعر کی محبت ہر دوسرے جذبے پر غالب رہتی ہے:—

روس، مفلس روس، میرے نزدیک
تیرے مٹیالے جھونپڑے،
تیرے کھیتوں کے سبک نغمے۔
گراں بہا ہیں جیسے محبت کے بہائے ہوے پہلے آنسو۔

کبھی کبھی اُمید نے بلوک کی دست گیری کی، اور اس نے اپنے ملک کی عظمت کے بیحد دل ربا خواب دیکھے، جن میں سے ایک اس کی نظم "نئے امریکہ" میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ترقی اور رونق کے یہ خواب اس کے دل سے بے چینی اور اندیشہ دور نہ کر سکے سنہ۱۹۰۸ء میں اس نے ایک نظم "میدان کولی کوو" لکھی جس میں جنگ عظیم اور انقلاب کے زلزلے کی پیشین گوئی ہے، اور انقلاب تک بلوک اپنے دل کو اسی امید سے تسکین دلاتا رہا کہ روسی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا بنیادی تغیر ضرور ہوگا جو حالات کو بالکل بدل دے گا، پرانے فلسفۂ حیات کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دے گا اور یوں روس کی نجات کا ذریعہ ہوگا لیکن حزن اور مایوسی بلوک کی طبیعت پر اس طرح حاوی ہوگئی تھی کہ جب مستقبل کے وجدانی علم نے اسے انقلاب کے آمد کی خوش خبری سنائی تب بھی وہ اپنے آپ پر، یا ان روسیوں پر جو اس کے ہم عصر تھے مطلق اعتبار نہ کرسکا، روس میں جان پھونکنے کی خدمت دوسروں کو سونپی، اور اپنے لئے روحانی تنہائی کے سوا اور کوئی انعام تصور نہ کرسکا۔ مایوسی اور امید کی یہ

عجیب آمیزش ان تمام نظموں میں پائی جاتی ہے جو اس نے انقلاب کے زمانے میں لکھیں، اور جو در اصل اس دور کی سب سے قابل قدر ادبی یادگاریں ہیں۔ اپنی کیفیت وہ ذیل کی نظم میں بہت پر درد مگر صحیح طریقے سے ظاہر کرتا ہے:

مجھ پر بیچارے جاہل ہنستے تھے،
کہتے تھے نوجوان شاعر شعبدہ بازی کر رہا ہے،
جہاں امید کی صورت نہ تھی، امید پیدا کردی،
جس کی کوئی انتہا نہ تھی، اس کی حد باندھ دی۔
مجھے خود بھی وہ شعلہ جو میں نے روشن کیا ہے
عجیب نظر آتا ہے، میرے دل کو اس سے وحشت ہوتی ہے،
میں خود اپنے تیر کا زخمی ہوں،
خود اِس نئی زندگی کا بوجھ اٹھانے سے ہمت ہار بیٹھا ہوں،
گزرنے والو۔ میرے پاس سے گزرتے جاؤ
میرے درد کا مذاق اڑاتے جاؤ۔
میں تو مر رہا ہوں، مگر مجھے معلوم ہے میری بنائی ہوئی دنیا،
میری موت کو برداشت کرلے جائے گی، اور تمہاری ہیبت ناک تضحیک کو بھی،

ایک اور نظم ملاحظہ ہو، اس میں مایوسی کی وہ شدت نہیں اور ناکامی کا کچھ اندیشہ جو ظاہر ہوتا ہے انقلاب کی عظمت کے احساس میں محو ہو جاتا ہے:

دنیا کی اس تاریکی پر جو صدیوں سے چھائی ہوئی تھی!
اس تاریکی پر جو نفرت اور شہوانیت سے بھری ہوئی تھی،
اس تاریکی، پر جنگی نعروں کے جواب میں آسمان پر

ایک نئی قوت کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔
وہ شعائیں جو اس آفتاب کے تاج کے گوشے ہیں
بہت جلد کالے بادلوں کی گھٹا کو پار کر جائیں گی،
اور لوگ میدان جنگ سے دریا کے دھارے کی طرح
اس کے چمکتے ہوے تخت کے سامنے پہنچیں گے۔
ہم جو صرف رات کے اندھیرے اور طوفان سے آشنا ہیں،
اس شاہانہ جلوے کے دیدار کی تاب نہ لا سکیں گے،
اور ہماری دنیا آسمان کا وحشت ناک منظر دیکھ کر،
راکھ کا ایک ڈھیر بن جائے گی۔

انقلاب کے زمانے کا ادبی کار نامہ بلوک کی نظم " بارہ سوار " ہے، جس کا اکیس مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اور بعض زبانوں میں متعدد بار۔ اس میں بارہ سواروں کا قصہ ہے جو رات کو شہر میں پہرہ دے رہے ہیں، اور فحش گیت گاتے اور ادھر اُدھر گولیاں چلاتے سڑکوں کی گشت لگا رہے ہیں۔ انقلاب کا زمانہ ہے، زیادہ رات گزرنے کے بعد لوگوں کو سڑکوں پر گھومنے کی اجازت نہیں ہے، اس لئے یہ بارہ سوار جب اپنے آگے ایک شخص کو سر جھکائے جاتے ہوے دیکھتے ہیں تو اسے فوراً للکارتے ہیں وہ شخص کوئی جواب نہیں دیتا، سوار فوراً گولی مارتے ہیں، مگر اس کا بھی راہ روا پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تب وہ گھوڑوں کے ایڑ لگا کر اس کے پاس پہنچتے ہیں، راہ رو منھ پھیر کر ان کی طرف دیکھتا ہے، اور سوار اس کی صورت دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں، کیونکہ وہ کوئی معمولی راہ رو نہیں، خود حضرت عیسیٰ ہیں، جو اپنی محبوب قوم میں روحانی بیداری کے آثار دیکھ کر آئے ہیں کہ شاید ان کی بھی اُمید یں پوری ہوں۔ اس نظم میں بلوک نے صرف انقلاب کی

روحانی اہمیت نہیں جتائی ہے بلکہ شاعری کا ایک کرشمہ دکھایا ہے۔ اس کی زبان وہی ہے جو عوام، خصوصاً شہری مزدوروں کے گیتوں کی، مگر اس کی بحریں موسیقی اور ترنم کے جواہر ریزے ہیں، اور اس میں ایک شان ہے جو بہت کم نظموں میں پائی جاتی ہے۔

بلوک کے علاوہ ان تمام شاعروں نے جن میں وطن پرستی کی ذرا بھی گدی تھی اپنے اپنے طرز پر انقلاب سے ہمدردی اور ان مصیبتوں پر افسوس ظاہر کیا جو انقلابیوں اور روس کی عام آبادی کو اس تحریک کے کامیاب بنانے کے لئے اٹھانی پڑیں، لیکن بلوک کے پایہ کو کوئی نہیں پہنچا آننا آخما تووا کو بھی اپنے وطن سے بہت محبت ہے، اور لڑائی کے زمانے میں انہوں نے اپنے جذبے کا یوں اظہار کیا تھا —

برسوں بیمار رکھ کر میری زندگی تلخ کردے۔

مجھے سانس کے روگ میں مبتلا کردے، میری نیند چھین لے، مجھے گرمی میں جلا

اولاد اور دوست سے محروم کردے —

نغمہ سرائی کی پراسرار نعمت واپس لے لے،

لیکن اے خدا، میری یہ دعا بھی قبول کرلے

کہ اتنے دنوں تکلیف دینے اور تڑپانے کے بعد

وہ بادل جو تاریک روس پر چھایا ہوا ہے

آخر کار افتاب کی شعاعوں سے چمک اٹھے

لیکن یہ وطن پرستی ایسی شدید اور دل افروز نہیں کہ شاعرہ کو مستقبل کے راز بتادے، یا انقلاب کے روحانی اسرار ان پر واضح کرسکے۔ انقلاب کی نسبت آننا آخما تووا صرف یہ کہہ سکیں:

گذشتہ عہدوں سے ہمارا زمانہ کس صورت سے بہتر ہے؟

کیا اس لحاظ سے کہ درد اور پریشانی کی انتہائی حالت میں
اس نے وہ روگ دور کرنا چاہا جو سب سے زیادہ زہریلا تھا '
اور نا کامیاب رہا ؟

ان شاعروں نے جو انقلاب اور انقلابیوں کے خاص حامی اور مبلغ مانے جاتے ہیں ' اور جن کا سردار ملا کوفسکی (پیدائش سنہ ۱۸۹۳ ع) ہے ' تخیل کی بلند پروازی اور ادبی کمال سے بالکل بیگانہ ہیں اور ان کی شاعری کو دراصل ادب میں شامل ہی نہ کرنا چاہئیے- البتہ انقلاب نے نئی زندگی کی تعمیر کا سچا جوش اور حوصلہ پیدا کردیا ہے ' اور یہ حوصلہ ممکن ہے رفتہ رفتہ نئے پھول کھلائے - ودلیرئی بریو سوف کی نظم " تیسری خزاں " کے آخر میں جو دعوی ہے اس میں مبالغہ بہت ہے مگر روسی قوم کی عام بیدار دلی دیکھتے ہوئے اس کا بھی امکان ہے کہ وہ ایک حد تک صحیح نکلے :

اے ہوا ' اے ہوا ' یہ یاد رکھ
کہ جھگڑوں ' اور بیکسی اور مفلسی کے باوجود
سارا روس تعمیر کی خوابوں سے مست
خدا کے حکم پر چلے گا اور فتحیاب ہوگا !
اے ہوا ، یاد رکھ کہ پرانی قوت پھر روس میں آگئی ہے '
فتحیابی کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے '
اور اس کی روز افزوں طاقت اور اقتدار
اسے دنیا کی ساری قوموں کا رہبر بنادے گا !

مغربی اسماء معرفہ اُردو قالب میں

از

(جناب احمد الدین صاحب مارہروی)

[یہ مضمون ایک مختصر تمہید و تشریح کا طالب ہے]

تقریباً پانچ سال کا عرصہ ہوا کہ الہ آباد میں چند علم دوست نوجوانوں نے نالج آفس کے نام سے ایک دارالاشاعت قائم کیا جس کا مقصد اردو زبان میں چند نایاب چیزوں کا اضافہ کرنا تھا - لیکن اس وقت خود ان لوگوں کو بھی ' جو اس دارالاشاعت کے بانی تھے ' معلوم نہ تھا کہ یہ " بیش بہا اضافہ " کیا ہوگا ' اور انجمن کا نصب العین مرتب کرتے وقت اس قدر متضاد تجاویز پیش کی گئیں کہ اگر ایک غیبی امداد نہ مل جاتی تو نالج آفس کام کرنے سے قبل ہی کالعدم ہو جاتا ' قصہ مختصر انجمن نے اپنی تگ و دو کو تین امور تک محدود رکھا (۱) ' ایک ماہوار رسالے کا اجراء جس کے ذریعہ سے پبلک کو سلیس زبان اور سادہ عبارت میں تمام علوم اور خصوصاً سائنس کے مسائل سے روشناس کیا جائے ' چنانچہ یہ رسالہ (معلومات) جنوری سنہ ۱۹۳۰ ع سے جاری کر دیا گیا (۲) پچاس جلدوں میں ایک فرہنگ اسموء شائع کرنا ' جس میں دنیا کے تمام مشہور مرد اور عورتوں کے خواہ وہ کسی ملک کسی زمانے کسی طبقے اور کسی فن سے تعلق رکھتے ہوں ' سوانح حیات بحساب حروف تہجی درج ہوں اور (۳) مصنفین انگلستان (English Man OF Letters) کی روش پر مصنفین اُردو کی سوانح عمریاں معہ تبصرہ کلام شائع کرنا —

دارالاشاعت کی تاریخ بیان کرنا چونکہ میرے موضوع سے باہر ہے اس لئے میں صرف دوسری شق کو لیتا ہوں اس فرہنگ کی تدوین کا کام میرے سپرد ہے اور چار سال کی مسلسل محنت کے بعد میں نے اپنے معاونین کی مدد سے ایک جلد مرتب

کرلی ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے * - جس وقت اس کام کو شروع کیا گیا تو ہمکو ان دقتوں کا مطلق اندازہ نہ تھا جو اس سلسلے میں پیش آئیں ۔ اسماء کی جستجو اور حالات کی تلاش جوئے شیر کے لانے سے کم نہ تھی اور بعض اوقات تمام تگ و دو کوہ کندن و کاہ بر آوردن یا سعی لاحاصل ثابت ہوتی اور ہم لوگ کام کی نوعیت سے گھبرا اٹھتے - تدوین کا کام بھی آسان نہ تھا اور اس وقت سب سے بڑی دقت جو پیش آئی وہ مغربی اسماء معرفہ کو اردو قالب میں ڈھالنا اور اسکے واسطے کوئی مستقل اور یکساں اصول مقرر کرنا تھا -
بہترین صورت تو یہ ہوسکتی تھی کہ تمام ناموں کو انگریزی تلفظ کے مطابق اختیار کرلیا جاتا ، لیکن اس زبان میں تلفظ کے اصول اول تو مقرر نہیں اور اگر معدودے چند ہیں بھی تو ان میں مستثنیات اس قدر ہیں کہ " المشاہیر " جیسی کتاب میں اس سے استفادہ کرنا تمام محنت کو ضائع کرنے کے برابر ہے —
اس گتھی کو سلجھانے کی صرف دو صورتیں تھیں ، ایک تو یہ کہ ہر لاطینی حرف کے واسطے ایک حرف مقرر کرلیا جائے اور جملہ یوروپین اور امریکن ناموں کو یکساں طور پر اردو میں ترجمہ کرلیا جائے لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ بعض نام اس طرح مسخ ہو جاتے کہ ان کا سمجھنا دشوار ہوتا ، مثلاً (George) جو انگریزی میں " ج ے آرج (ے) " اور فرانسیسی میں ژ ے آ ر ژ (ے) ہے اس اصول کی رو سے گیارگی بن جاتا اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ در اصل کیا نام ہے - اسی طرح (Churchli) جس کو انگریز چرچل کہتے ہیں تہار نہیل ہوجاتا - مگر ساتھ ہی اس میں ایک آسانی بھی تھی وہ یہ کہ تمام ناموں کے واسطے یکساں اصول مقرر ہوجاتا - اور انگریزی داں طبقہ کو اس میں کچھ زیادہ دشواری نہ ہوتی —

---

* پبلک اور خصوصاً پروفیسروں کے بیحد اصرار سے انجمن نے اس کا ایک انگریزی ایڈیشن شائع کرنا بھی منظور کرلیا ہے اور ہندی میں ترجمہ کی تجویز بھی پیش نظر ہے المشاہیر کے متعلق جملہ حالات نالج آفس الہ آباد سے معلوم ہوسکتے ہیں —

برخلاف اس کے دوسری تجویز یہ تھی کہ تمام اسماء معرفہ کو اسی طرح لکھا جائے جس طرح وہ اُس زبان کے قواعد کی رو سے متلفظ ہوتے ھیں - جہاں تک صحت تلفظ کا تعلق ھے یہ تجویز بہت معقول تھی مگر اس میں ایک دقت یہ پیش آنے والی تھی کہ اردو داں طبقہ ' جو ہر چیز کو انگریزی عینک سے دیکھتا ھے بعض ناموں کو غلط پڑھتا اور جب فرھنگ میں ان کو اس جگہہ نہ پاتا تو سخت مایوس اور ناراض ھوتا - مثلاً (Jean) انگریزی میں تو جین ھے لیکن فرانسیسی میں ژے وَنْ پڑھا جاتا ھے - اور بجائے ج کے ژ کے تحت میں لکھا جائیگا - یا (Vische غ) وسچر ' وسکر ' یا وشر نہیں لکھہ "ف ی ش (ے) ر" ھے اور بجائے و کے ف کے تحت میں ملے گا

یہ ایک اصولی فرق تھا اور چونکہ مجھہ کو پبلک کے سامنے ایک نئی مگر مستقل چیز پیش کرنا تھی اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ملک کے مشہور اہل الرائے حضرات سے اس کے متعلق مشورہ کر لیا جائے - چنانچہ میں نے دونوں تجاویز کو ایک گشتی خط کے ذریعہ سے ڈاکٹر سر محمد اقبال (لاھور) مولوی عبدالحق صاحب (انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد) نیاز فتحپوری (لکھنؤ) ڈاکٹر ذاکر حسین (جامعہ ملیہ دہلی) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد یونیورسٹی) سید سلیمان ندوی (دارالمصنفین ' اعظم گڑھ) مولوی نعیم الرحمان (ھندوستانی اکیڈیمی اور دیگر حضرات کے سامنے پیش کرکے ان کی رائے سے استصواب حاصل کیا، ان میں سے بعض نے تو (غالباً مصروفیت کی وجہ سے باوجود دو بارہ سہ بارہ یاد دھانی کے جواب نہ دیا ' لیکن جو جوابات موصول ھوئے ان کی تقسیم اس طرح کی جا سکتی ھے :-

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ' اور نیاز فتحپوری نے اصول ثانی سے اتفاق کیا ' مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اسی کو ترجیح دی اور میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی اگر جواب دیتے تو اس سے اتفاق کرتے

کرلی ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے * - جس وقت اس کام کو شروع کیا گیا تو ہمکو ان دقتوں کا مطلق اندازہ نہ تھا جو اس سلسلے میں پیش آئیں ' اسماء کی جستجو اور حالات کی تلاش جوئے شیر کے لانے سے کم نہ تھی اور بعض اوقات تمام تگ و دو کوہ کندن و کاہ بر آوردن یا سعی لا حاصل ثابت ہوتی اور ہم لوگ کام کی نوعیت سے گھبرا اُٹھتے - تدوین کا کام بھی آسان نہ تھا اور اس وقت سب سے بڑی دقت جو پیش آئی وہ مغربی اسماء معرفہ کو اُردو قالب میں ڈھالنا اور اسکے واسطے کوئی مستقل اور یکساں اصول مقرر کرنا تھا - بہترین صورت تو یہ ہوسکتی تھی کہ تمام ناموں کو انگریزی تلفظ کے مطابق اختیار کرلیا جاتا ' لیکن اس زبان میں تلفظ کے اصول اول تو مقرر نہیں اور اگر معدودے چند ہیں بھی تو اُن میں مستثنیات اس قدر ہیں کہ " المشاہیر " جیسی کتاب میں اس سے استفادہ کرنا تمام محنت کو ضائع کرنے کے برابر ہے —

اس گتھی کو سلجھانے کی صرف دو صورتیں تھیں ' ایک تو یہ کہ ہر لاطینی حرف کے واسطے ایک حرف مقرر کرلیا جائے اور جملہ یوروپین اور امریکن ناموں کو یکساں طور پر اُردو میں ترجمہ کرلیا جائے لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ بعض نام اس طرح مسخ ہو جاتے کہ اُن کا سمجھنا دشوار ہوتا ' مثلاً (George) جو انگریزی میں " ج ے آرج (ے) " اور فرانسیسی میں ژ ے آ ر ژ (ے) ہےاس اصول کی رو سے گیارگی بن جاتا اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ در اصل کیا نام ہے - اسی طرح (Churchill) جس کو انگریز چرچل کہتے ہیں تہار نہیل ہوجاتا - مگر ساتھ ہی اس میں ایک آسانی بھی تھی وہ یہ کہ تمام ناموں کے واسطے یکساں اصول مقرر ہوجاتا - اور انگریزی داں طبقہ کو اس میں کچھہ زیادہ دشواری نہ ہوتی —

---

* پبلک اور خصوصاً پروفیسروں کے بیحد اصرار سے انجمن نے اس کا ایک انگریزی ایڈیشن شائع کرنا بھی منظور کرلیا ہے اور ہندی میں ترجمہ کی تجویز بھی پیش نظر ہے المشاہیر کے متعلق جملہ حالات نالج آفس الہ آباد سے معلوم ہوسکتے ہیں —

برخلاف اس کے دوسری تجویز یہ تھی کہ تمام اسماء معرفہ کو اسی طرح لکھا جائے جس طرح وہ اُس زبان کے قواعد کی رو سے متلفظ ہوتے ہیں۔ جہاں تک صحت تلفظ کا تعلق ہے یہ تجویز بہت معقول تھی مگر اس میں ایک دقت یہ پیش آنے والی تھی کہ اردو داں طبقہ، جو ہر چیز کو انگریزی عینک سے دیکھتا ہے بعض ناموں کو غلط پڑھتا اور جب فرہنگ میں ان کو اس جگہہ نہ پاتا تو سخت مایوس اور ناراض ہوتا - مثلاً (Jean) انگریزی میں تو جین ہے لیکن فرانسیسی میں ژے وَنْ پڑھا جاتا ہے - اور بجائے ج کے ژ کے تحت میں لکھا جائیگا - یا (Vische) وسچو، وسکر، یا وشر نہیں لکہ "ف ی ش (ے) ر" ہے اور بجائے و کے ف کے تحت میں ملے گا

یہ ایک اصولی فرق تھا اور چونکہ مجھے کو پبلک کے سامنے ایک نئی مگر مستقل چیز پیش کرنا تھی اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ملک کے مشہور اہل الرائے حضرات سے اس کے متعلق مشورہ کر لیا جائے - چنانچہ میں نے دونوں تجاویز کو ایک گشتی خط کے ذریعہ سے ڈاکٹر سر محمد اقبال (لاہور) مولوی عبدالحق صاحب (انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد) نیاز فتحپوری (لکھنؤ) ڈاکٹر ذاکر حسین (جامعہ ملیہ دہلی) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد یونیورسٹی) سید سلیمان ندوی (دارالمصنفین، اعظم گڑھ) مولوی نعیم الرحمان (ہندوستانی اکیڈیمی اور دیگر حضرات کے سامنے پیش کرکے ان کی رائے سے استصواب حاصل کیا، ان میں سے بعض نے تو (غالباً مصروفیت کی وجہ سے باوجود دو بارہ سہ بارہ یاد دہانی کے جواب نہ دیا، لیکن جو جوابات موصول ہوئے ان کی تقسیم اس طرح کی جا سکتی ہے :-

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، اور نیاز فتحپوری نے اصول ثانی سے اتفاق کیا، مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اسی کو ترجیح دی اور میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی اگر جواب دیتے تو اس سے اتفاق کرتے

ڈاکٹر زبید احمد (الہ آباد یونیورسٹی) نے پہلی تجویز کو پسند فرمایا
سید سلیمان ندوی نے مجھ کو ڈاکٹر صدیقی کے مشورے پر کار بند ہونے کی صلاح دی ۔

مولوی نعیم الرحمن صاحب نے پہلی تجویز کو ناممکن القبول کہا ۔ یعنی دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ انہوں نے اصول ثانی کو ترجیح دی ۔

اس طرح گویا ملک کے زیادہ تر اہل الرائے اصحاب نے مغربی ناموں کو اردو قالب میں ڈھالنے کے لئے اس اصول کو پسند کیا کہ جہاں تک ممکن ہوسکے ان کو اہل زبان کی طرح متلفظ کیا جائے یہ بھی بذات خود ایک دقت طلب امر تھا اور اگر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی جو علاوہ السنہ شرقیہ کے انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں ید طولیٰ رکھتے اور لسانیات (فلالوجی) کے ماہر ہیں اپنے قیمتی مشوروں سے میری مدد نہ فرماتے تو معلوم نہیں اس اسکیم کا کیا حشر ہوتا]

اہل ہند نے چونکہ ایسے ماحول میں تعلیم پائی ہے، جہاں علاوہ انگریزی کے اور کوئی مغربی زبان بولنے یا سننے میں نہیں آتی، اس لئے وہ تمام چیزوں کو انگریزی کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں، اس وقت بھی جب کہ سیاسات عام ہو گئی ہے اور اہل ہند کا ایک بڑا طبقہ پولٹکل مسائل سمجھنے اور بولنے لگا ہے، آپ کو ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہوگا جو "یوروپین" کو انگریز اور "برٹش گورنمنٹ" کو گورنمنٹ کا مترادف سمجھتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ہم تمام مغربی ناموں کو

اسی طریقه پر ادتے هیں جس طرح ایک انگریز ان کا تلفظ کرتا هے' لیکن قباحت یه هے که انگریزی ایک بے اصول زبان هے اور پھر تمام انگریز بھی ایک نام کا یکساں طور پر تلفظ نہیں کرتے --

مثلاً (Vienna) کو کوئی انگریز ویانا کہتا هے اور کوئی وائنا' حالانکه اس کا اصل تلفظ وی ءن هے --

یا بولونیا کو بعض انگریز بولونا کہتے هیں' بعض بلونا اور اکثر بولگنا بھی کہتے هیں (Bologna) خود اپنے هی ناموں میں ان کو اختلاف هے' مثلاً (Chelemsford) کو کوئی چیمسفرڈ کہتا هے کوئی چیلمسفرڈ بکوئی کوئی شیمسفرڈ' اور آپ کو غالباً خیال هوگا که یه نام اُردو صحافت میں ایک عرصے تک زیر بحث رها هے --

یورپ کو جہاں تک السنه کا تعلق هے' دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا هے' (۱) وہ ممالک جنھوں نے لاطینی حروف تہجی کو اختیار کر لیا هے' اس زمرے میں یورپ اور امریکه کے تمام بڑے بڑے ممالک جاتے هیں - (۲) وہ ممالک جنھوں نے ابھی تک اس طرف توجه نہیں کی اور وہ اپنی پرانی روش پر قائم هیں - مثلاً روس و یونان وغیرہ --

جن ممالک نے لاطینی حروف کو اختیار کر لیا هے ان کے تلفظ میں چنداں قباحت نہیں هوتی' کیونکه ان سب میں حروف کی آوازیں قریب قریب یکساں هیں اور هر زبان کے قواعد نہایت جامع طور پر مرتب کر لئے گئے هیں - لیکن یونانی اور روسی الفاظ کے تلفظ میں غلطی هو جانے کا احتمال هے اور اس کی وجه یه هے که هم ان زبانوں کے حروف تہجی سے محض نا آشنا هیں - علاوہ ازیں ان میں چند کی آوازیں ایسی هیں که هماری زبان ان کا ٹھیک طور پر اعادہ نہیں کر سکتی اور همارے واسطے

بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ان کو اس طرح اختیار کر لیں جس طرح وہ انگریزی قالب میں ڈھلے ہوے ہم تک پہنچتے ہیں - اس کا البتہ خیال رکھنا چاہئیے کہ ان کا تلفظ انگریزی کے بے اصول قوعد کے مطابق نہ کیا جاے بلکہ یورپین اصول کو پیش نظر رکھہ کر ان کے واسطے جداگانہ طریقہ بنایا جائے مثال کے طور پر (Ivan) کا تلفظ انگریزی میں آئوِن ہوگا لیکن جامع اصول کے مطابق اس کو ایوآن پڑھا جاے گا اور یہی صحیح ہے —

اسی طرح (Cerigo) کو ہم ایک سیریگو کہیں گے لیکن یہ دراصل "چیری گو" ہے اب میں ان اصولوں سے اعتنا کرتا ہوں جن کو میں نے اپنے مقصد کے واسطے اختیار کیا ہے - قبل اس کے کہ میں اصل موضوع کی طرف راجع ہوں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حروف ہجا کی اہل قواعد نے تین قسمیں کی ہیں - (۱) حروف صحیح جس کو انگریزی میں (Consonant) کہتے ہیں (۲) حروف علت یا (Vowel) اور لفیف مقرون یا (Diphthong) حروف صحیح وہ ہیں جو بلا حروف علت کے تحریک میں نہ آسکیں ' جس طرح لاطینی (b, d, f, g, h, j, k,) اور اُردو ب ' پ ' چ ' د ' وغیرہ - حروف علت وہ حروف ہیں جو دو یا دو سے زیادہ حروف صحیح کو ساتھہ ملا کر پڑھنے میں مدد دیتے ہیں - لاطینی میں یہ حروف (a, e, i, o, u, w, y,) ہیں اور اُردو میں آ ' و ' ی ' ء کے علاوہ اعراب بھی یہی کام کرتے ہیں - لفیف مقرون بھی چونکہ دو حروف علت کے اتصال سے بنتا ہے اس لئے اس کو بھی حروف علت سمجھنا چاہئیے —

کسی زبان کے اسماء معرفہ کو اُردو قالب میں ڈھالتے وقت

سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہوگی کہ اس کے حروف علت اور لفیف مقرون کے مقابلہ میں مترادت الصوت اردو حروف کا تعین کرلیا جاے - اور پھر اسی طرح تمام حروف صحیح کو یکے بعد دیگرے لکھ لیا جاے —

جگہہ کی قلت مانع ہے کہ ہم تمام زبانوں کے قواعد کو فرداً فرداً سپرد قلم کریں اسلئیے اس مختصر مقالہ میں صرف فرانسیسی حروف ہجا سے اعتنا کیا جاتا ہے - فرانسیسی چونکہ یورپ کی مشترکہ زبان متصور ہوتی ہے اس لئے اہل یورپ عام طور پر ان اصولوں سے واقف ہیں اور اسی کے مطابق الفاظ کا تلفظ کرتے ہیں - البتہ انگریز اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتا ہے - مثلاً (george) بجز انگلستان کے کہ وہاں تو اس کو ج ے آرج کہیں گے ہر جگہہ ژ ے آرژ (ے) بولا جائیگا -

سہولت اور صحت دونوں اس کے مقتضی ہیں کہ جو الفاظ اردو قالب میں ڈھالے جائیں ان کو ملا کر نہ لکھا جائے بلکہ تمام حروف کو الگ الگ لکھیں تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ کونسا حرف ساقط ہے اور کونسا بعد میں آتا ہے اور تلفظ میں دشواری نہ ہو - ساکن حروف نکہکر قلمزد کر دئے جائیں کیونکہ اس قسم کے الفاظ مثلاً (Dnieper) یا (ptolemy) کو عموماً د اور پ کے تحت میں تلاش کیا جائیگا اس لئے ان کو " (ڈ) ن ی پ (ے) ر " اور " (پ) ت آ ل ے م ی " لکھنا زیادہ موزوں ہوگا —

اسکی بھی ضرورت ہے کہ اردو حروف علت کی مختلف آوازوں کا تعین کرلیا جائے - مثلاً جس طرح لاطینی کا (a) چار مختلف آوازیں دیتا ہے (آ - اَ - اے - آے) اسی طرح اردو حروف علت کی بھی مختلف آوازیں ہوتی

ہیں - مثال کے طور پر " واؤ " کو لیجئے - سودا ' سود - حوُر - دیوار ' میں ہر واؤ ایک جدا گانہ آواز دیتی ہے —

چنانچہ میلے حروف علت کی آوازوں کا تعین اس طرح کیا ہے :—

الف - آ - هندی (अ) مثلاً آسیر - توأم

آ - هندی (आ) مثلاً آم - کام - جا تا

اِ - هندی (इ) مثلاً اِتارہ - اِنعام

اُ - هندی (उ) مثلاً اُس - اُن - بعض لوگ اوس اور اون لکھتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں -

ا - هندی (ऊ) اس کو اُردو میں او کے لطیف نقروں سے ظاہر کیا جا تا ہے مثلاً اونت ' حالانکہ ہم اس لفظ کو بلا واؤ کے بھی درست لکھہ اور پڑہ سکتے تھے - اُنتْ

اسیطرح اِ - هندی (ई) ہے - اسکو اُردو میں ای کی متعدد آواز سے ظاہر کیا جاتا ہے - مثلاً اِیران حالانکہ ہم " اِراں " بھی لکھہ کر درست پڑہ سکتے تھے

واؤ - ساکن و جو دراصل پیش (ُ) کی مترادف ہوتی ہے ' مثلاً خرد - خورد ' جو پڑھنے میں خد اور خرد ہو جاتا ہے

و - جو اوَ - اَ کی اواز دیتی ہے مثلاً سوَد - امبود - هوَد وغیرہ

و - جو او کی آواز دیتی ہے - مثلاً موتی - گومتی وغیرہ

و - مثلاً کون - جونپور وغیرہ

و - یہ دراصل وّ ہے اور عموماً حروف کے آخر میں آتی ہے - مثلاً دیو - دیوار -

وِ - مثلاً - وِقار - وِلایت

یاء - ای - ي هندی (ई) مثلاً سیر -

ای - ی هندی (ई) مثلاً میزان - کھیپ -

آے - ے - مثلاً کینہ - بیرا —

اِے - ےِ مثلاً کیلا - جیب - سیب - وغیرہ

لفیف مقرون دو حروف علت کی ملی ہوئی آواز ہے - جس طرح لاطینی میں ان کی مختلف اجتماع سے مختلف آوازیں پیدا ہوتی ہیں اسی طرح اردو میں بھی ان کے مرکب بنائے جا سکتے ہیں - لیکن چونکہ ہمارے ہاں اعراب موجود ہیں اس لئے حروف کو ملانے کی زیادہ ضرورت نہ ہوگی —

فرانسیسی زبان کے قواعد تلفظ مندرجہ ذیل طریقہ پر منضبط ہوسکتے ہیں —

حروف علت و لفیف مقرون

(a) خواہ لفظ کے شروع میں ہو یا درمیان میں آ کی آواز دیتا ہے - مثلاً (Bonaparte) ب و ن آ پ آ ر (ت) (ی) اور (Agost) آ گ و س (ت) لکھا جاے گا —

(a) کے بعد اگر m یا n ہو تو اس کی آواز اؤ ہوجاتی ہے مثلاً (Ambois) اؤنْ ب وٓ اے (ز) یا (Andre) اؤنْ د رے

(ae) بھی آ کی آواز دیتا ہے مثلاً (Stael) س ت آ ل

(ai) اِے کی آواز دیتا ہے مثلاً (Calais) ک ا ل ےِ (س)

(ao) ا = آؤ مثلاً (Paoli) پ آ ؤ ل یِ -

(au) = او مثلاً (Auch) ا و ش

(Ay) اے ۔ مثلاً (D' Arablay) د ا ر ب ل ےِ

(e) ـ اے مثلاً (Bezier) ب ےِ ز ی ےِ (ر) مگر جب کسی حرف کے آخر میں ہو تو ساکن ہوتا ہے، مثلاً (Gironde) ژ ی ر و نٛ د (ے)

(ē, é, è) اےِ - ےِ کی آواز دیتا ہے اور کسی حالت میں ساکن نہیں ہوتا - مثلاً (Fécomp) ف ے ک و نٛ پ یا (Andre) ا وُ نٛ د رے

(eau) ـ ا و مثلاً - (Rousseau) ر و س

(ea) ـ اِ ے آ - مثلاً (Orlean) ا و ر ل ےِ ا و نٛ یا ( )

(i) ـ اِ - مثلاً (Diderot) د ی د (ے) ر و (ت)

(ie) اِ مثلاً (Amiens) آ م ی آ ن (س)

(o) ـ آو مثلاً (Condorcet) ک و نٛ د و ر س ے (ت)

(oi) وٓ آ مثلاً (Soissons) س و آ س و نٛ (س)

(oy) ـ وٓ آ ی مثلاً (Royer) ر و آ ی ے (ر)

(ou) ـ ا ُو مثلاً (Rousseau) ر و س و

(u) ـ یوٗ مثلاً (Ushant) ایوٗ ش و ن (ت) یا (Dumas) د یوٗ م ا (س)

حروف صحیح کی آوازوں کا بھی اسی طریقہ سے تعین کرنا چاہئیے ـــ

(b) بَ کی آواز دیتا ہے لیکن جب اس سے پہلے (m) ہو تو ساکن ہوجاتا ہے - مثلاً (Coulomb) ک و لْ و نٛ (ب)

(c) کے بعد اگر a, o, u, یا کوئی حرف صحیح ہو تو اس کی آواز سخت یعنی ک کی ہوگی مثلاً (Fecamp) ف ےِ ک و نٛ پ

لیکن اگر وہ e, i, y, سے قبل ہو تو س کی آواز دے گا مثلاً (Annecy) آ نٛ (ے) س ی

جب لفظ کے آخر میں آے تو ساکن رہتا ہے، مثلاً (Blanc) ب ل و نٛ (ک)

(cc) کے بعد جب e یا i ہو تو پہلا c 'ک' اور دوسرا 's' کی آواز دیتا ہے مثلاً (Acce) آ ک س ے پڑھا جاے گا —

(ch) = ش مثلاً (Auch) اوش

(d) د کی آواز دیتا ہے مگر لفظ کے آخر میں ساکن ہوتا ہے - مثلاً (Ronald) رو ن آل (د)

(g) a, o, u, سے قبل سخت یعنی 'گ' کی آواز دیتا ہے اور e, i, y, سے قبل 'ژ' کی مثلاً (Orange) ا و ر و نٛ ژ (ے)
لفظ کے آخر میں ساکن ہوجاتا ہے مثلاً (Long) ل و (گ)

(gn) یہ مرکب بہت دلچسپ ہے کیوں کہ اس میں n کی آواز ما قبل نکلتی ہے اور g ی میں تبدیل ہو جاتا ہے مثلاً (Bologna) بولنٛیآ اور (Digne) د ی نٛ ی ے متلفظ ہوتا ہے —

(h) عموماً ساکن ہوتا ہے مثلاً (Rouher) رُوُ(ھ) ے ر یا (Havre) (ھ) آ و ر (ے) لکھا جاے گا —

(j) - ژ مثلاً (Janin) ژ آ ن ی نٛ - (Majorca) م آ ژ و ر ک آ

(l) = ل

(ill) یہ دوسرا دلچسپ مرکب ہے کیوں کہ اس میں (ll) ی کی آواز دیتا ہے - مثلاً (Fille) ف ی ی ے یا (Marseille) م آ ر س ی ی ے - اس مرکب کے بعد (e) ضرور آتا ہے اور خواہ وہ حرف کے آخر میں ہو یا درمیان میں کبھی ساکن نہیں ہوتا —

m = م } لیکن حروف یا کسی ٹکڑے Syllable کے آخر میں ہوں تو غنہ
n = ن } ہو جاتے ہیں جن کو علی الترتیب 'مٛ' 'نٛ' لکھا جاے گا —

(P) = پ لیکن جب (t) سے قبل ہو تو ساکن ہوگا، مثلاً (Prompt)
پ ر و مْ (پ) (ت)

(q) } = ک
(qu) }

(r) = ر

(s) = س لیکن جب دو حروف علت کے درمیان ہو تو ز کی آواز دیتا ہے۔ مثلاً (Casale) ک آ ز آ ل (ے)—

حروف کے آخر میں ساکت ہوتا ہے، مثلاً (Orleans) او ر ل ے ا وںْ (س)

(ss) = س۔ (Rousseau) روس و

(sc) = ک، لیکن اگر اس کے بعد e, i, y, ہو تو 'س' کی آواز دیتا ہے۔ مثلاً (Scioto) س ی و ت و

(t) = ت، لیکن حروف یا ٹکڑے کے آخر میں ساکن ہوتا ہے، مثلاً (Rochefort) ر و ش (ے) ت و ر (ت)

(th) ت، کیوں کہ t عموماً ساکن ہوتا ہے، مثلاً (Thiers) ت ی ے ر (س)

V } = و۔ مثلاً (Weber) و ے ب ے ر—
W }

(x) = کس، لیکن جب a سے ماقبل ہو تو گز کی آواز دیگا۔ مثلاً (Alexander) آ ل ی گز ونْ د ے ر —

(y) = ی ا

(z) = ز

اسی طرح دوسری زبانوں کے قواعد مرتب کئے جا سکتے ہیں، البتہ اُن زبانوں کے واسطے، کوئی معلوی اصول قائم کرنا مشکل ہے، جو یا تو مردہ

ہوچکی ہیں یا انہوں نے ابھی تک لاطینی زبان کے حروف تہجی کو اختیار نہیں کیا - اس کے متعلق میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ ہمارے واسطے سہل ترین نسخہ یہی ہے کہ ہم بجائے اصل کی طرف دوڑنے کے ان کی لاطینی شکل سے اعتنا کریں اور اِن کے قواعد جہاں تک ممکن ہوسکے اصل کے مطابق مرتب کر لیں ، تاکہ تلفظ میں خامی نہ رہ جائے —

آئندہ اشاعت میں کوشش کی جائے گی کہ فرانسیسی کی طرح دوسری السنہ کے قواعد تلفظ کو بھی مشرح طور پر بتا دیا جائے اور اگر ملک اس اسکیم کو منظور کر لے تو گویا ہماری زبان میں ایک بیش بہا اضافہ ہوجائے گا۔ جہاں تک مجھ کو علم ہے کسی مشرقی زبان نے اس قسم کا اصول ایجاد نہیں کیا ، حتیٰ کہ مصر بھی باوجود اس قدر ترقی یافتہ ہونے کے ، اس بارے میں دوسرے ممالک کے دوش بدوش ہے ، اور ان کے ہاں بھی مغربی ناموں کو معرب کرنے کا کوئی ایک اصول مقرر نہیں—

اب میں چند فرانسیسی نام بطور مثال کے پیش کرکے بتانا چاہتا ہوں کہ ان کو اُردو سانچے میں کس طرح ڈھالا جائے —

۱ Louis le Blanc یوں لکھا جائے گا - " ل وُ یِ (س) - لُ - ب ل و نْ (ک)
کیوں کہ l = ل — ou = وُ i = یِ — s = س ساکن ، Le = لُ * b = ب —
l = ل — an = و نْ c = ساکن

۲ Count de Maurepas = ک وْ نْ (ت) دُ م و ر (ے) پ آ (س)
c چونکہ o سے قبل ہے اس لئے ک کی آواز دے گا - ou = وُ
n = نْ t چونکہ آخری ساکن ہے - t = ساکن de = دُ m = م

* de le کو غلطی سے بعض لوگ لے اور دے اور بعض ل و اور د و لکھتے ہیں لیکن یہ زیادہ صحیح نہیں —

au -- و r = ر e = ےِ p = پ a = ا s = ساکن

۳ (Chateauroux) = ش آ ت و روٗ (کس) ch = ش a = آ t = ت
eau = و r = ر ou = وٗ x = کس، لیکن چونکه آخر میں هے
اس لئے ساکن هوگا —

۴ Queret Demery = کےِ رے (ت) دےِ مے رِی۔ qu = ک
e = ےِ r = ر e = ے t = (ت) (ساکن) d = د e = ے
m = م e = ے r = ر y = ی —

[باقی آئنده]

مرزا غالب کا ایک غیر مطبوعہ رقعہ

(یہ رقعہ ہمیں جناب سید فرخ حیدر صاحب بی - اے ' ایل ایل - بی (علیگ) شمس آباد ضلع فرخ آباد نے عنایت فرمایا ہے جس کے لئے ہم صاحب موصوف کے بہت شکر گزار ہیں - اس میں حروف تہجی وغیرہ کی تذکیر و تانیث اور بعض اور ادبی نکات سے بحث ہے - خط میں تاریخ درج نہیں ہے - اڈیٹر)

سعادت و اقبال نشاں مرزا یوسف علی خاں کو بعد دعا کے دل نشین ہو کہ تانیث و تذکیر ہرگز متفق علیہ جمہور نہیں - اے لو "لفظ" اس ملک کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے ' اہل پورپ اس کو مونث بولتے ہیں - خیر جو میری زبان پر ہے وہ میں لکھہ دیتا ہوں ' اس باب میں کسی کا کلام حجت و برہان نہیں ہے - ایک گروہ نے کچھہ مان لیا ایک جماعت نے کچھہ جان لیا ' اس کا قاعدہ منضبط نہیں - الف مذکر ' ب ت ث مونث - ج مذکر ' ح خ مونث - دال ذال مونث ' رے زے مونث - سین شین مذکر ' ص ض ط ظ مونث - عین غین مذکر ' ف مونث - قاف کاف لام میم نون مذکر - واو ہے ی مونث ' ہمزہ مذکر - لام الف حروف مفردہ میں نہیں مگر بولنے میں مذکر بولا جاے گا ' لام الف کیا خوب لکھا ہے کہیں گے ' کیا خوب لکھی ہے نہ کہیں گے —

خزادہ خداوند زادہ کا مخفف ہے، لیکن فارسی نہیں عربی نہیں، اردو کا روزمرہ تھا؛ خزادہ خزادی مرادف صاحبزادہ صاحبزادی ہے، مگر فی زماننا متروک ہے۔ "فق" فارسی لغت نہیں ہوسکتا عربی بھی نہیں، روزمرہ اردو ہے جیسا کہ میر حسن کہتا ہے —

که رستم جسے دیکھ رہ جائے فق

شعرائے حال کے کلام میں نظر آتا۔ "تکیہ" لفظ عربی الاصل، فارسی اردو میں مستعمل، دونوں زبانوں میں ہم بمعنی بالش اور ہم بمعنی مکان فقیر آتا ہے، ایران میں تکیہ صاحب مشہور ہے۔ "گل تکیہ" لفظ مرکب ہے ہندی اور فارسی سے۔ گل مخفف گال کا اور تکیہ بمعنی بالش۔ وہ چھوٹا گول تکیہ جو رخسار کے تلے رکھیں، گل تکیہ کہلاتا ہے۔ گل بمعنی پھانسی انگریزی لغت ہے انگریزی زبان سے بنگالہ میں سو برس سے اور دلی اکبر آباد میں ساٹھ برس سے رواج پایا ہے۔ گل تکیہ وضع کیا ہوا نورجہان بیگم کا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں اہل ہند کیا جانتے تھے کہ گل کیا چیز ہے —

"معنی مفرد بہ تلفظ جمع" اس جملے کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا۔ معنی مفرد معانی جمع۔ اور یہ جو اردو کے محاورے میں تقریر کرتے ہیں کہ اس شعر کے معنے کیا ہیں یا اس شعر کے معنے کیا خوب ہیں، اس میں دخل نہیں کیا جاتا، خاص و عام کی زبان پر یوں ہی ہے، معانی کی جگہہ معنے بولتے ہیں۔ "رت" لفظ ہندی الاصل رتھ ہے بہ ہائے مضمرہ، بعض مذکر بولتے ہیں بعض مونث ۱۲ شعر بہت اچھا ہے صاف و ہموار —

راقم غالب

——‡•‡——

جنگ نامۂ سید عالم علی خاں

از

اڈیٹر

فرخ سیر کے عہد سے لیکر محمد شاہ بادشاہ کے کچھہ زمانے تک سید عبداللہ خاں (قطب الملک) اور سید حسین علی خاں (امیرالامرا) سادات بارہ سلطنت کے مالک و مختار تھے - یہ بادشاہ گر تھے اور بادشاہ ان کے ہاتھہ میں کٹ پتلي تھے - نواب نظام الملک (آصف جاہ) سے ان کی ان بن ہوگئی تھی - اس لئے دربار شاہی سے دور رکھنے کے لئے رفیع الدرجات کے عہد میں ان کو صوبہ داریٔ مالوہ پر مامور کیا گیا - نظام الملک بہادر نے انکار میں مصلحت نہ دیکھی اور بادل ناخواستہ تعمیل حکم کی اور وہاں کے نظم و نسق میں مصروف رہ کر اس خطے کو مفسدوں سے پاک کیا - چونکہ سادات کو نظام الملک بہادر کے بڑھتے ہوے اقتدار اور کثرت فوج کی وجہ سے اندیشہ ہوگیا تھا، حسین علی خاں نے نظام الملک کو لکھا کہ دکن کے صوبوں کے انتظام کے لئے ہمارا ارادہ ہے کہ ہم صوبۂ مالوہ میں رہیں آپ اپنے لئے اکبر آباد، الہ آباد، ملتان، برہانپور کے صوبوں میں سے کوئی ایک صوبہ انتخاب کر لیں - نظام الملک اس سے بہت مکدر ہوے اور اس کا جواب کسی قدر درشتی کے ساتھہ دیا - امیرالامرا اور قطب الملک نے نظام الملک کے وکیل کو خلوت میں بلاکر سخت سست کہا - جب اس کی خبر نظام الملک کو پہنچی تو وہ آمادۂ پیکار ہوگئے - کہتے ہیں کہ اس میں محمد امین خاں کے توسط سے شاہی اشارہ بھی تھا - غرض انھوں نے اپنے رفقا کو ساتھہ لیکر دکن کی جانب کوچ کیا اور نربدا کو عبور کیا - (وسط جمادی الآخر سنہ ۱۱۳۲ ھ مطابق مئی سنہ ۱۷۲۰ ع) - جب امیرالامرا کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے

دلاور علی خاں بخشی، راجہ بھیم سنگھہ اور راجہ گجک سنگھہ (قلعدار) کو نظام الملک کے تعاقب کے لئے بھیجا - نظام الملک کا ستارہ عروج پر تھا قلعۂ اسیر اور قلعۂ برھانپور بغیر جنگ و جدال کے ھاتھہ آے اور انور خاں صوبہدار برھانپور اور عوض خاں صوبہدار برار اور رنبھا جی سردار مرھٹہ اور بہت سے زمیندار اور پٹھان اُن کے شریک حال ہوگئے - جب دلاور علی خاں کا لشکر کوچ کرتا ہوا برھانپور سے جانب مشرق چودہ کوس پر پہنچا تو نظام الملک نے اپنا لشکر اس کے مقابلے کے لئے غیاث خاں کی سر کردگی میں روانہ کیا - لڑائی میں دلاور علی خاں اور اس کے دونوں راجہ رفیق مارے گئے (۱۹ جون سنہ ۱۷۲۰ ع) —

سید عالم علی خاں بارہہ جس کی عمر بیس سال کی تھی (دیکھو شعر ۴۹) فرخ سیر کے وزیر سید عبد اللہ قطب الملک کا بھتیجا اور متبنی تھا - وہ اپنے دوسرے چچا سید حسین علی خاں کے دھلی چلے جانے پر (دسمبر سنہ ۱۷۱۸ ع) دکن کے چھ صوبوں کا صوبہدار یا نائب صوبہدار مقرر کیا گیا تھا (شعر ۳۹) - اسے نظام الملک کے مقابلے کے لئے احکام پہنچے تو وہ فوج لے کر فردا پور میں جو اورنگ آباد سے ۶۰ میل کے فاصلے پر برھانپور اور اورنگ آباد کے درمیان واقع ہے، خیمہ زن ھوا - نظام الملک برھانپور سے مقابلے کے لئے روانہ ہوے - جب نظام الملک کے لشکر نے دریاے پورنا سے عبور کیا (۲۰ جولائی سنہ ۱۷۲۰ ع) تو عالم علی خاں ۵ شوال سنہ ۱۱۳۲ ھ کو مع اپنے رفقا منصور خاں (دیکھو شعر ۳۱۹)، غالب خاں (شعر ۲۵۳، ۳۰۵) عمر خاں (شعر ۱۹۸، ۲۹۳، ۳۷۴) میٹھے خاں (شعر ۱۹۸، ۲۵۳، ۳۰۷) محمدی بیگ (شعر ۱۹۸، ۲۵۴)، امین خاں (۱۲۵، ۲۵۶، ۲۵۹) غیاث الدین خاں، خواجہ رحمت اللہ، فدوی خاں وغیرہ اور سرداران دکن و مرھٹہ مقابلے کے لئے آگے بڑھا - نظام الملک نے محمد خاں کو اپنے فرزند غازی الدین خاں کی معیت میں ہراول کیا اور عبد الرحیم خاں، وجاہت خاں، غیاث خاں، اختصاص خاں وغیرہ کو میمنہ و میسرہ پر

مقرر کرکے خود مع عوض خاں قول لشکر میں متمکن ہوے —

عالم علی خاں بڑی مردانگی اور شجاعت سے لڑا اور اگرچہ اس کا سارا بدن زخموں سے چور تھا مگر اُس کا ہر قدم آگے ہی بڑھتا تھا۔ آخر اسی طرح لڑتے لڑتے یہ بہادر نوجوان اس دنیا سے کوچ کر گیا —

اس کے بعد سیدوں کے خاندان نے دولت آباد میں پناہ لی (دیکھو شعر ۴۰۱) خافی خاں کی تاریخ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

مجھے اس جنگ نامے کے تین نسخے دستیاب ہوے۔ ایک نسخہ میرا ذاتی ہے اسے (ا) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرا نسخہ مجھے مولوی عبدالصمد صاحب وکیل کلڑ نے عنایت فرمایا جو (ب) سے موسوم ہے۔ اور تیسرا وہ نسخہ ہے جو مسٹر ولیم آرون (William Irvire) نے مہاراجہ بنارس کے کتب خانہ سے حاصل کیا اور رسالہ انڈین اینٹی کیوری (Indian Antiquary) بابت ۱۸ جنوری و مارچ سنہ ۱۹۰۴ ع میں مع انگریزی ترجمے کے شایع کیا۔ یہ نسخہ (ج) ہے —

مسٹر آرون کا نسخہ اول و آخر سے ناقص ہے۔ عبدالصمد صاحب کے نسخے میں شروع کے کچھ اشعار غائب ہیں۔ میرا نسخہ مکمل ہے اور اس کی ترتیب اور تحریر دوسرے نسخوں سے بہتر ہے۔ اس لئے میں نے اس نسخے کو بنیاد قرار دیا ہے۔ البتہ دو ایک جگہ ایک ایک مصرع غائب ہے اور بعض مقامات پر کوئی کوئی لفظ رہ گیا ہے۔ کہیں کہیں مصرع پورا کرنے کے لئے قیاس سے جو لفظ بڑھا دئے ہیں انہیں قوسین میں لکھ دیا ہے۔ دوسرے نسخوں سے مقابلہ کر کے اختلاف نسخ بھی ظاہر کردیا ہے۔ تینوں نسخوں میں اشعار کی کمی بیشی بھی پائی جاتی ہے — جو اشعار نسخہ (ا) میں نہیں اور دوسرے نسخوں سے اضافہ کئے گئے ہیں ان پر علامت + لگا دی گئی ہے اور جن اشعار پر × نشان ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دوسرے نسخوں میں نہیں ہیں —

مسٹر ولیم آرون نے اس کا مصنف "سودشت" بتایا ہے — انہیں اپنے نسخے کے ایک شعر سے دھوکا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو شعر ۴۱۴ ان کے

نسخے میں اس شعر کا دوسرا مصرع یوں ہے —

سو د شتا یہ کیا کیا ستم ہا ے ہا ے

" سود شتا " الف نداہے اور " سودشت " تخلص قرار دیا ہے - یہ صحیح نہیں ہے یہ لفظ " دشتا " ہو گا کاتب نے غلط لکھہ دیا - دوسرے نسخوں میں یہ مصرع اس طرح ہے —

سو ایسا ستم پو ستم ہا ے ہا ے

یا یہ ممکن ہے کہ ایسا کر کاتب دھتا لکھہ گیا - کاتبوں سے یہ بعید نہیں - اب انھیں یہ فکر ہوی کہ اس نظم میں فارسی عربی کے لفظ بکثرت ہیں یہ ضرور کسی مسلمان کی لکھی ہوی ہے اور " سودشت " ہندی لفظ ہے تو انھوں نے یہ تاویل کی کہ اکثر مسلمان مصنف جب کوی چیز ہندی میں لکھتے تھے تو اس میں تخلص بھی ہندی رکھتے تھے —

آرون صاحب کے منشی نے مصنف کو پنجابی بتایا ہے مگر خود وہ اسے بالائی دواب کا خیال کرتے ہیں جہاں کے سادات بارہ رہنے والے تھے - لیکن اندرونی شہادت پر غور کرنے کے بعد انھوں نے یہ قیاس قائم کیا کہ مصنف دکنی ہے اور چونکہ ولی اس زمانے میں زندہ تھا اور ۱۱۳۲ ھ میں دہلی میں تھا اور یہ واقعات بھی اسی سنہ میں واقع ہوے اس لئے غالباً اس کا مصنف ولی ہے -

مسٹر آرون کا یہ قیاس بالکل صحیح ہے کہ مصنف دکنی ہے ' زبان صاف بتاتی ہے - لیکن مصنف کے متعلق ان کا قیاس غلط ہے - اس میں وہ مجبور تھے وہ اپنے نسخے کو کامل سمجھے ہوے تھے ' حالانکہ آخر سے کئی شعر غائب تھے - مصنف نے خود آخر میں اپنا نام بتادیا ہے - اگر یہ شعر ان کے نسخے میں ہوتا تو انھیں یہ الجھن نہ ہوتی —

یہ نظم تاریخی حیثیت رکھتی ہے - اس میں جو نام اور سنین آئے ہیں وہ تاریخ کے رو سے بالکل صحیح ہیں - مصنف کو عالم علی خاں سے ہمدردی معلوم ہوتی ہے - اور وہ حق بجانب ہے - اس سن میں جس دلیری اور جیوٹ سے لڑ کر اس نے جان دی ہے وہ بے شبہ

قابل تعریف ہے ۔ یہاں تک کہ اعظام الملک کے طرف دار مورخوں نے بھی اس کی بہادری کی تعریف کی ہے - نظم سادہ ہے اور کہیں تصنع اور تکلف سے کام نہیں لیا - بعضے اشعار موثر بھی ہیں خصوصاً جب عالم علی خاں ماں سے میدان جنگ میں جانے کی اجازت مانگتے ہیں اور رخصت ہوتے ہیں یا جب عالم علی خاں کے مرنے کی خبر آتی ہے اور ماں اس کا ماتم کرتی ہے —

یاقتاح بخشندہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شروع کے بیس شعر نسخہ (ب) سے لئے گئے ہیں نسخہ (ا) میں یہ موجود نہیں نسخہ (ج) میں بھی ابتدائی حصہ غائب ہے اور ۲۴ ویں شعر سے شروع ہوتا ہے —

(۱) اول حمد واجب ہے کر تار کا
دو عالم کے وارث خریدار کا

(۲) قضا اور قدر جس کے ہے ہاتھ میں
نہیں شک شبہہ کچھ کسی بات میں

(۳) حکم ہات اوس کے ہے حاکم ہے وہ
سگل عیش و عشرت کا عالم ہے وہ

(۴) نرنجن نرا دھار سبحان ہے
خدا وند برحق سہر بان ہے

(۵) ہے خدا وند قدرت کا قادر ہے وہ
نہیں دور ہر حال حاضر ہے وہ

(۶) کہ دہ بندے سرو پاے جلو ہ سپہر
دیوے راج سر پر رکھے تاج سر

(۷) اچھے کس کوں حافظ رکھے برقرار
عطا بخش مہرباں پروردگار
(۸) خرابی میں جس کے اشارہ کرے
اوسے ایک پل میں آوارہ کرے
(۹) کرے لطف کی جس کے اوپر نظر
ڈیوے راج سر پر پھراوے چھتر
(۱۰) کرے ملک سب اس کی تسخیر میں
کھماوے حکومت کی زنجیر میں
(۱۱) رکھے ھمر دولت کا روشن چراغ
کرے دل کوں ہر غم سوں اوس کے فراغ
(۱۲) رکھے ہر رنگ قدرت کا انسان میں
مکرم کیا اس کوں جس شان میں
(۱۳) جو کچھہ کھیل کھیلے سزاوار ھے
مزاحم نکوی اس کا اظہار ھے
(۱۴) کیا کن کے کہنے میں سارا ظہور
کفر ھور اسلام ظلمات نور
(۱۵) جو واقف ھے وحدت کے میدان کا
ھے غالب دو عالم کے میدان کا
(۱۶) لبھانے لگے جس کے ایمان کوں
مسلط کرے نفس شیطان کوں
(۱۷) رکھے تاابد اوس کوں گمراہ کر
سعادت کے راھاں سوں بیراہ کر

(۱۸) اچھے بے خبر حق سون بہ حال میں
گرفتار دنیا میں جنجال میں
(۱۹) نجانے خدا کون نجانے رسول
کرے عاقبت اپنی سب خاک دھول
(۲۰) اوسے ھے خبر جس کون محروم کیا
دنیا کی محبت سون بے غم کیا
(۲۱) یوہ دکھو (ن) شیران (ن) کون سر کھاے ھیں (ن) - ھے (ن) - شیرون کے
انک اس کے پھالہے میں پھنتاے ھیں
(۲۲) غنیمت سمجھہ عمر کیا شور ھے
انکھیاں کھول کر دیکھہ انگے گور ھے
(۲۳) یو دھن مال آخر کون رہ جائیگا
جو کچھہ یہاں کیا ھے سو وان پائیگا

در نعت محمد مصطفیٰ علیہ السلام

(۲۴) محمد نبی پر درود (ن) اور سلام ن/ب و
(ن) جتنے اهل اصحاب سب پر مدام ن/ب جتنے آل اصحاب پر نت مدام
(۲۵) شفیع ھے خلائق کے کردار کا
مقرب خدا کے سو دربار کا
+ (۲۶) اول ھیں ابابکر روشن هلال
صدق اور بزرگی میں ھیں بے مثال
+ (۲۷) دوجے ھیں عمر یار صاحب وقار
کہ دائم نبی سوں رهے یار غار

(۲۸) + تیھی یا رمنماں اہل جناں
جلو کیا جمع سارا قرآں

(۲۹) + کہ چوتھی علی شاہ عادل سوار
جنو کی کمر میں رہی ذوالفقار

(۳۰) + سبھی چار یاراں میں اہل قدر
حشر کے ہیں مسندکےصاحب صدر

(۳۱) زہے پنجتن ہیں خدا کے ولی
ہراں سو ہوا دین روشن جلی

(۳۲) کہا یوں حکایت غنیمت بیاں (ن) — (ن/پ) سنو اس حکایت کا کہتا ہے بیاں
سنو جان دل سے تمہیں بے گماں

(۳۳) عزیزاں ! یو قصہ ہے طوفاں کا
اس عالم علی صاحب شان کا

(۳۴) قضا نے سو ہر حال آخر زماں
کہے ہیں نہی سوچ دستا عیاں

(۳۵) عزیزان یو سب ھیچ در ھیچ ہے
یو قصہ عجب پیچ در پیچ ہے

(۳۶) سنو دوستاں ! ابتدا جنگ کا
زمانے کی گردش و نیرنگ کا

(۳۷) ہے عالم علی سید نام دار
دکھن کے چھ صوبوں میں صاحب مدار

(۳۸) X نہ دشمن کسی کانہ کس سوں فساد
و سید جواں مرد عالی نزاد

(۳۹) رہے شہر میں صوبہ‌داری کرے
تماشے کوں سواری شکاری کرے
(۴۰) X رہے رات دن سب سے اخلاص سوں
نہ دھوکا دھک کس کے وسواس سوں
(۴۱) نہت خوب صورت و صاحب جمال
کہ دنیاں میں کوئی نہیں اوس کے مثال (ن) — ت/ب کہ ثانی نہیں کوئی اسکے مثال ت
(۴۲) عجب قد و قا مت بڑی بہا ر کا
نہ را ضی ا تہا کس کے آ زا ر کا
(۴۳) لٹکتا چلے جب نکل ناز سوں
امیری کے پوشاک اور (ن) ساز سوں — ن/ب ہور ھان -
(۴۴) دسے کل پیاراں میں پیارا لگے (ن) — ن ب/ب شکل جس کی نیا روں میں نیارا لگے
چلن چال اوس کا سو نیارا لگے — چلن چال سگلیاں بہی نیارا لگے
(۴۵) جوانی میں (و ۲) ریش آغاز تہا
نہنی عمر میں صاحب راز تہا
(۴۶) بڑا قد دسے جوں برس تیس کا
ولے عمر تہا بیس اکیس کا
(۴۷) رہے سب سوں ھل مل کے آرام سوں
نہیں کام کچھہ صبح اور شام سوں
(۴۸) یکا یک خبر آشکا را ہوا
گھر سے گھر یو غل اور پکارا ہوا
(۴۹) کہ لے کر نظام الملک فوج سات
چلا آتا ہے سیدھا دکھن کیچ بات

(۵۰) سو ایتے میں آ کوئی خبر یوں دیا
کہ اوترا نظام الملک نر بدا
(۵۱) تمن سات ہے جنگ ھشیاری کرو
لڑای کی بیگی تیاری کرو
(۵۲) X سنا ہور رہا دل میں اپنے عجب
لڑای ھمن سات کیا ہے سبب
(۵۳) ہوی بات سید پہ تحقیق جب
بلا بھیج ارکان دولت کوں سب
(۵۴) (ن) دعایاں اسم سب پڑوھانے لگے
کہ نذراں بزرگاں چڑھانے لگے

ن/ب نذر جا بجا جب چڑھانے لگے
دوعایاں اسم تب پڑھانے لگے

(۵۵) X پکانے لگے ہر جنس کے طعام
کھلانے لگے دم بدم صبح شام
(۵۶) (ن)ہتی ہور گھوڑے تصدق دیے
جو کچھ لازماں تھا یوسب کچھ دئیے

ن/ب ہتی اونٹھ گھوڑے تصدق کئیے
جوکچھ جگ میں کرناسوان سب کئیے

(۵۷) تصدق دعا یاں اتارن لگے
روپے اشرفیاں اتارن لگے (ن)

ن/ج روپے خوان بھر بھر کے وارن لگے

(۵۸) جہاں (لگ) قطب غوث اور پیر تھے
جہاں لگ ولی خاص گنبھیر (ن) تھے

ن/م خابیر

(۵۹) جہاں لگ جوکوئی صاحب ہوش تھے
زمانے کی گردش (ن) کے سرپوش تھے

ن/ب ج آفت

(۶۰) Xب جہاں لگ مقرب تھے درگاہ کے
جہاں لگ ولی خاص اس راہ کے (ن)

ن/م جہاں تک جوتھے خاص اس راہ کے

(۶۱) سعد سانگ سب (ن) سوں کیتا سوال
جہاں اگ قلندر تے اہل کمال

ن/ب ج سکلیاں

(۶۲) میں فرزند علی کا هوں آل رسول
کرو عرض میری تم اپنی قبول (ن)

ن/ب ج کرو عرض میرا تم اتنا قبول

(۶۳) پڑی هے مجھے آکے مشکل محال
تمہیں مل کے سب لیو مجکوں سنبھال (ن)

ن اچھے جور ...... الخ

(۶۴) رکھو لاج مردوں کے میدان میں
اچھے جان جب لگ میری جان میں (ن)

ب ن/ج اچھے جان جب تگیں الخ

(۶۵) خدا باج نا کوئی مجھے یار هے
اسی کے کرم کا مجھہ آدھار هے

(۶۶) بلا پھر نجومی کُھلایا نجوم
کہو غلغه کیا هے کیا دھام دھوم (ن)

ن/ب ج کہو کیا هے یه غلغه کیا ؟ هجوم

(۶۷) کہو دن یو کیا هے ستاره هے کون (ن)
فتح کس کی هے اور آواره هے کون

ن/ج کہو دن هے کیسے ستاره؟ هے کون

(۶۸) X و و آیا هے کیوں ؟ کس طرف چال هے
کہو عاقبت کوں سو کیا حال هے
(۶۹) X هے غالب همنا پر یا مغلوب هے
سنا دو شتابی جو کچھه خوب هے

(۷۰) اچھے کا رمل میں سو سب بول دیو
بھلا اور برا ایک بیک کھول دیو

(۷۱) X ب نوازونگا تم کوں کرونگا نہال
اڑھاؤنگا تمنا دوشالے و شال

(۷۲) کہے تب نجومیاں نے (ن) سب خیر ہے — ن/ج: کہے سب نجو میاں نپٹ خیر ہے

ستاروں کی گردش تک پھیر ہے

(۷۳) یقیں ہے ہمن کوں فتح پاؤگے

فتح پاکے بیگی سوں پھر آؤگے (ن) — ن/ب: فتح پا کے بیگی سوں گھر آؤگے

(۷۴) پوچھا بات بعضے فقیراں پلا

تمھاری اس بات میں کیا صلا (ن) — ن/ب: سلا

(۷۵) کہے سب فقیراں سن اے نواب (ن) — ن/ب: کہیں تب فقیروں نے سن اے نواب

شہر چھوڑ جانا نہیں ہے ثواب — شہر چھوڑ جانے میں نہیں کچھ صواب

(۷۶) نجومی کہے ہیں خوش آمد کی بات

کہاں علم کامل ہے ان (ن) بیچ ہات — ن/ب: کہوں کے

(۷۷) نہ امرا کوئی صاحب فوج ہے

سپاہی نہ کوئی صاحب اوج ہے (ن) — ن/ج: شتابی کے کرنے میں کیا بوجھ ہے

(۷۸) نوی فوج ' لشکر نوا ہے (ن) سپاہ — ن/ب ج: کل

دغا ہے دغا ہے دغا خواہ مخواہ

(۷۹) اتھے بول یاراں سبھی اور ماہ

یو کیا بات ہے تمنا بوجھو صلاح

(۸۰) اچھیں خیر خواہی میں مستقیم

اوسے بس کتا بہت کر یکا فہیم

(۸۱) سپاہی نجانوں (ن) کہ کل باگ ہیں — ن/ب: نہ ہو جو

صف جنگ میں ایک سوں (ن) یک آگ ہیں — ن/ب: سے ' ن: تیں

(۸۲) سکت کیا جو کوئی روبرو ہوسکے (ن) — ن/ب: سکت کیا جو کوئی روبرو ہو کھڑا

زمیں چھانتی کے کوئی نہ ہرگز تلے — ن/ج: کھڑا ہو تو چھڑیوں سیں دیتا اُڑا

(۸۳) شجاعت میں (ن) ایک زور (ن) بازو کریں — سوں، — تیں
پہاڑاں اچھیں تو (ن) تراز و کریں — کر ج

(۸۴) که یو فوج هے آج دشمن شکن
اگر هوے جمع هند سارا دکھن (ن) — اگر هو جمع هند، اگر سبهه دکهن

(۸۵) کریں قتل اوپر مار تلوار سوں ج
سگل فوج لشکر کے سردار کوں (ن) — سگل فوج اور ان کے سردار کوں

(۸۶) لڑیگا وو هی مرد میدان میں
شجاعت هے جس مرد کی شان میں

(۸۷) قدیموں کی اپنے کرو دلبری
یو هے بات بهاری نہیں سرسری

(۸۸) قدیماں کا اس واسطے مان هے
سمجھیا هے وو جس میں کچهه گیان هے

(۸۹) رهے هو کے تم شاه اندیشه ناک (ن) — رهے شاه تب هو کے الخ
تمہارا هے حافظ وو اب ذات پاک تمہارا هے حافظ وهی ذات پاک ج

(۹۰) یوں ڈر (ن) دل میں مت لاؤ (ن) اس بات کا — پرا — لینا
بهروسه دشمن کوں هے اس سات کا (ن) — بهروسه نہیں دشمن کوں اس سات کا ج

(۹۱) فتح هے فتح پر فتح کار هے (ن) — فتح هو فتح ان اوپر مار هے
عزیزاں تمهارا خدا یار هے (ن) — فتح هی فتح هے میری یار هے ج

(۹۲) کهے سن کے نواب نے اپنی (ن) بات ج — اتنی
که مرنا و جیونا هے سب رب کے هات

(۹۳) جو یاری دے هملا نکل جاے گا (ن) — جو بازی دی هملا کو مل جاے گا
جتے لگ وو دنیاں میں پچتاے گا ج جتے تک وه دنیا میں اچ آے گا

(۹۴) مجھے عار ہے عار انکار ہے
کہ تحقیق مرنا سزا وار (ن) ہے
ن / ج سو یک بار

(۹۵) کروں کا جوکچھہ مجھہ سوں ہوآوے کا
یہی نام مردوں کا رہجا ئے (ن) کا
ن / ب یہی نام دنیاں میں رہ جائےکا

(۹۶) نگاہ داشت کی خوب کرنی کئے (ن)
نکلنے کی بیگی اوتاولی کئے
ن / ب اندیشہ سوں کل دل کو خالی کیا
که چلنے کی بھگی شتابی کیا

(۹۷) X کسب چھوڑبہوتوں نے گھوڑے لئے
سپر با نک بہوتوں نے توڑے لئے

(۹۸) X یونہی دیکھلے کے لڑن ھار نہیں
یو ہے مارکا * سخت بیوپار نہیں
* معرکہ

(۹۹) کرو گے جو کچھہ سو سمجھہ کر کرو
ہماری نصیحت یو دل میں دھرو

(۱۰۰) اٹہے بیگ بیگی سوں گھر میں گئے
ادب سوں کھڑے پاس ماں کوں کہے

(۱۰۱) کہ تم ماں میں فرزند بڑےماں کا (ن)
بڑے پیار (کا) ہور بڑے (ما) ن کا
ن / ب تہن ماں میں فرزند ہوں لاڑ کا
بڑے مان کا ہور بڑے پیار کا

(۱۰۲) سنو تم کہ دلی بہت دور ہے
ہمارا اسم جگ میں مشہور ہے

(۱۰۳) نظام الملک کی خبر ہے گرم
نہیں اب تو رہتی نہ دستی شرم

(۱۰۴) حکم ہو وے تو بہار تیرا کروں
برہان‌پور لگ ایک پھیرا کروں

(۱۰۵) میں پوتا ہوں اس شیر مرداں کا
ہوں فرزند نورالدین علی خاں کا
(۱۰۶) مجھے بیٹھنا شہر (ن) میں ننگ ہے — ن/ب رہنا بڑا ۔ ن/ج بیٹھ رہنا بڑا
اگر آج رستم ستی جنگ ہے
(۱۰۷) یو سن کے کہیں گے سو قطب الملک (ن) — ن/ب ہنسیں گے مجھ اُپر آل قطب الملک
دکن میں گیا تھا نظام الملک
(۱۰۸) یو سن کے تعجب کریں گے نواب
کہ فرزند عالم علی کامیاب
(۱۰۹) ترا جیو کوں اور نکل نا سکا
شجاعت کا ناموس کچھ نا رکھا (ن) — ن/ب نا کیا
(۱۱۰) دنیاں میں دوبارا کچھ آنا نہیں
یو دنیا جلم لگ تھانا (ن) نہیں — ن/ج تھکانا
(۱۱۱) اگر ہے دیاتی تو پھر آویں گے
فتح پاکے پھر موہ کوں دکھلائیں گے (ن) — ن/ج فتح ہو تو مکھ آکے دکھلاویں گے
(۱۱۲) اپس دل میں ہمنا بسارو (ن) نکو — ن/ج اتارو
دعا میں اچھو، نت بسارو نکو
(۱۱۳) پکڑ ہات سونپو خداوند کوں
رہو عیش آرام (ن) آنند سوں — ن/ج و
(۱۱۴) کہی ماں نے کیوں کر رضا دیوں تجھے
دکھن میں تیرے باج نہیں کوئی (ن) مجھے — ن ہے کون
(۱۱۵) خدا باج ہم کوئی سنگاتی نہیں (ن) — ن/ج خدا باج کو تجھ کوں ساتھی نہیں
مجھے مصلحت یو کچھ بھاتی نہیں

(۱۱۶) نہنا بڑا کوئی نہیں سات ہے
تو لڑنے کوں جانایو (کیا) کہات ہے (ن) — ن/ج توں جا تا ہے لڑنے یہ کیا بات ہے
(۱۱۷) X قسم ہے تجھے سیر نواب کا
ہے سوگند تجھے میرے ماں باپ کا
(۱۱۸) X میرے دل منے وہم و سو اس ہے — * نسخہ ا میں یہ شعر ناتمام ہے بقیہ
میرے پاس ... ... * — دونوں نسخوں بھی موجود نہیں —
(۱۱۹) X مجھے چھوڑ توں جا اکیلا نکو
یو جانے کا دل میں فکر نا کرو
(۱۲۰) پجد (۲ن) ہو پجد ماں کوں راضی کئے (ان) — ان/ج بہ جد و جہد — ن/ج ا کیا ۔ لیا
پہر حال چلنے کی رخصت لئے (ن ا)
(۱۲۱) X میری ننگ و ناموس اور لاج کا
کہا ہے قسم تجھ کوں معراج کا
(۱۲۲) X تیرا ملک تجھ کوں مبارک اچھو — † نسخہ ا میں یہ شعر ناتمام ہے بقیہ
مدد تجھ کوں ... ... † مبارک اچھو — دونوں نسخوں میں بھی موجود نہیں —
(۱۲۳) چھ سوار اوس وقت سید کے پاس ن — ن/ج چھ سواراہ اس وقت سید کے پاس
سپاہی قدیم تھے و گھر کے خواص — سپاہی و چیلا و کل عام و خاص
(پہلے مصرع میں کچھ غلطی ہوگئی ہے)
(۱۲۴) توکل کیا اور کیا دل کوں تھیت
میں سید ہوں اب کیا دکھاؤنگا پیٹ
(۱۲۵) بلاے شتابی سوں دیوان کوں
کہا تم لکھو خط علی خاں کوں (ن) — ن/ج کہا اب لکھو خط امین خاں کوں
(۱۲۶) دکھن میں تمی مرد ہونگے مشہور (ن) — ن/ج دکھن میں تمہیں مرد ہوکے مشہور
شتابی سے ہم پاس آنا ضرور — شتابی ہمن پاس آنا ضرور

(۱۲۷) جلد آؤ اور مہربانی کرو
رفاقت سوں مل جانفشانی کرو
(۱۲۸) کہ یو وقت ہے وقت اب کام کا
تمہاری شجاعت کے ننگ نام کا (ن)	ن/ب تمہاری شجاعت و ننگ نام کا
(۱۲۹) جو کچھہ تم کہوگے یہ سب ہے قبول
ہے شاہد ہمارا خدا کا (ن) رسول	ن/ب و
(۱۳۰) چلانے لگے جا بجا تہار تہار
روانہ کئے قاصداں ایک بار
(۱۳۱) نگہ داشت (ن) کا خوب گرمی کئے	ن/ب نگہہ داش
جنے جو سلگیا سوئیچ اس کوں دیے
(۱۳۲) اتھا بارواں ن ماہ رجب کا چاند	ن/ب اتھی بارویں
چلیا گھر سے شمشیر بکتر کوں باندھ
(۱۳۳) X زرہ بکتراں پاک کرنے لگے
جہاں کے تہاں خوب سرنے لگے
(۱۳۴) X کماناں و ترکش منگا بے شمار
لگے بانٹنے فوج میں ایک بار
(۱۳۵) X شہر میں ڈھنڈورا پورایا تمام
جہاں لگ سپاہی اچھے نیک نام
(۱۳۶) X پنجارے قصای و سبزی فروش
اٹھے دیکھہ دل میں ہوا سب کوں جوش
(۱۳۷) X کہ کنجڑے بھٹارے و دھوبی حجام
بھڑای بہشتی لہار کئے آ سلام

(۱۳۸) X کمر باندھ تتو پر ہو سوار ہو
لے نعل بند ... ... ہات دھو * — * نسخہ ا میں یہ شعر ناتمام ہے '

(۱۳۹) کہا جا کے ڈیرا دیو مہدان میں
معمدی باغ (ن ۱) کے خوب اوچان (ن ۲) میں — ن/ج ا نزک معمدی باغ ن ۲/ب ج انچان

(۱۴۰) نقارے ہمارے بجاتے چلے
روپے اشرفیاں (ن) لٹاتے چلے — ن/ج لٹی

(۱۴۱) X ب دھیوں سردار ساراں ملے (ن) — ن/ج دسے ہوں اور سردار ساریاں ملے
دسے چاند سارا ستاراں ملے — ج که جیون چاند ہے کل ستاریاں ملے

(۱۴۲) کیا جاکے ڈیرے میں وو دو (ن) مقام — ن/ب بارہ ' ن/ج چار ایک
کرے ملک (ن) تدبیر ہر صبح شام — ن/ب فکر

(۱۴۳) جہاں لگ تھے نوکر سپاہی امیر (ن) — ن/ج جہاں لگ تھے ب ج سردار ' جودھان' بلی
بلا کر کہے خان روشن ضمیر — بلا کر کہا سید عالم علی

(۱۴۴) شہر چھوڑ ڈیرا میں باہر دیا (ن) — ن/ب دیا
توکل خدا مصطفے پر کہا

(۱۴۵) کہ تم ہو سپاہی میں سردار ہوں
بھلے اور برے کا میں غمخوار ہوں (ن) — ن/ـ بھلا ' یا برا سب کا غم خوار ہوں

(۱۴۶) کہاں ہند یاراں کہاں ہے دکون — ن/ج بارہا
کہاں خویش قربت کہاں ہے وطن (ن) — ن/ب ج کہاں خویش قریب (اور) کہاں ہیں ہمن

(۱۴۷) X ب کہاں سوں کہاں (ن) اور کدھر سوں کہاں — ن/ج سوں
کدبارے (ن ۱) سوں قسمت نے لائی (ن ۲) یہاں — ن ۲/ج لے ای ن ۱/ج لا رہے

(۱۴۸) عزیزاں ! میں عالم علی خان ہوں
جوانی میں سگلیاں میں باجان ہوں

(۱۴۹) جوانی کا کچھہ دل میں غم نہیں سجے
سرن اور جیون کا وہم نہیں سجے

(۱۵۰ X) ب میرے دل کوں رحمت سوں شاباش ہے (ن)
جوانی میں جیو کا (ن) بڑی آس ہے — جیونا (ج)

(۱۵۱) جیون وو بھلا جو انگے لاج ہے
وگر نہیں تو کیا تخت اور تاج ہے

(۱۵۲) جتّے لگ ہو یاراں میرے سات میں (ن) — جو لگ ہیں یاراں میرے ہات میں (ب)
رہو وقت جون (جنگ) کے میرے ہات میں — اچھو وقت جنگ کے میرے سات میں

(۱۵۳) جدھر مار کا آ پڑ یگا وہاں (ن) — جدھر معرکہ آ پڑ یگا ندان (ب)
(ن) جدھر کے تدھر بار کرنا وہاں — ادھر ایک دل ہو کے کرنا ندان (ب) / وو ہر یک ہو کر سوکرنا اوڑان (ن)

(۱۵۴) کرو مرد سی دل کوں مردا نگی — مردو ہو (ن ج)
ہے مشہور مردوں کی مردا نگی (ج)

(۱۵۵) * ہے یاراں (ن) کا کل جگ منے ننگ نام — ہے ہارے کا ل ہند میں نیک نام (ب)
میں منگتا خدا سوں یہی صبح شام — میں منگتا ہوں نت ابرو صبح شام

(۱۵۶) جو آیا ہے وو پھر کے مر جائیگا (ن) — جو آیا ہے سو پھر وہ مر جائیگا (ب ج)
نہ کچھہ سات لایا نہ لے جائیگا

(۱۵۷ X) ب خبر س مقاماں کی ماں مہربان
ترپنے لگے دیکھنے جھو پران (ن) — (ن) ترپنا لگا جھو اور سبھہ پران

(۱۵۸) (ب ج) گئی شہر کے باہر جاکر ملی (ن) — گئی شہر کے باہرے جا ملی (ن)
نپت آرزو سوں لگائے لگی — نپت آرزو سوں لگایا گلی (ج)

(۱۵۹) کہے ماں سوں میں پھر تم کوں کہاں پاؤنگا
اگر جنگ میں سوں میں پھر آؤنگا — اگر جگ میں سو باز پھر آوں گا (ن ج)

* ہے کی بجائے غالباً رہے زیادہ موزوں ہو گا

(۱۶۰) عبث پھر کے تصدیع کیے تمی
پھر آتے تھے بیگی شتابی ہمیں
(۱۶۱) نکو دل کوں تم بیقراری کرو
شہر کی طرف اب سواری کرو
(۱۶۲) کبھی ماں نے نہیں چین دل کوں مجھے
میں دیکھونگی پھر کر سو کس دن تجھے
(۱۶۳) کروں کیا مجھے صبر آتا نہیں
تیرے باج مجھ کچھ سو بہاتا نہیں
(۱۶۴) یک یک دن مجھے ہے اک اک سال کا
خدا کوں خبر ہے میرے حال کا
(۱۶۵) نصیباں میں کیا ہے نہیں کچھ خبر
کہ جیوناں ہوا ہے مجھے جیوں زہر
(۱۶۶) منگاو سر و پا و دستار یو
میرے روبرو جواب بور سب کوں دیو
(۱۶۷) لے (ن) آئے سرو پا و بڑے مول کی
زر زر کشی و صاف لئی مول کی
(۱۶۸) بولاے لطیف خان (ن) عمر خان کوں
محمد و بیگ کوں او متھے خاں کوں
(۱۶۹) زاهد خان جہاں لگ آتھے اس پاس (ن)
پھر اے ... ...
(۱۷۰) سرو پا و ہر یک کوں سو دینے لگے
سلام اور تسلیم لینے لگے (ن)

(ن) بلا کر

ن/ج لطف خاں

ن/ج جہاں لگ تھے سردار تے روشناس
بلا بھیج کر سب کے آئیں پاس

ن/م بجالاے تسلیم، لینے لگے

(۱۷۱) کہی بعد ازاں سب کوں سوگند ہے
کہ عالم علی سبکوں فلہند ہے
(۱۷۲) نمک کی شرط سب بجا لاوگے
سو وہیں پھر کے سب مرتبا پاوگے (ن)　ن/ج تو دل سا چھہ پھر ... ...
(۱۷۳) خدا تم سبھوں کا نگہبان ہے
بڑی بست دنیا میں ایمان ہے
(۱۷۴) کئے عہد ساریاں نے سوگند کہا
کہ مالک ہمارا دلوں کا خدا
(۱۷۵) جب لگ * تن میں جیو ہے دمبدم (ن)　ن/ــ جب لگ جیوتن سوں ہے اودم میں دم * جنگ ہونا چاہئے
اچھیں گے حضوری میں ثابت قدم ج
۱۷۶ قدہ سوں قدم ہات سوں ہات جور ن/ــ کریں گے جب لگ ہوگی دشمن کی موز
رہیں گے کہ جب ہووے دشمن کا زور (ن) ج (کریں گے کی جگھہ لڑیں گے اور جب لگ جگھہ جنگ ہونا چاہئے
(۱۷۷) ہوں دل سوں قربان ہیں جاں نثار
رکھو دل کوں صاحب تدیں برقرار
(۱۷۸) کہی آفریں تم نمک خوار ہو
وفادار بےشک و غم خوار (ن) ہو　ن/ــ دلدار ج
(۱۷۹) کییے ماں کوں تسلیم دینی سلام (ن)　ن/ــ وداع ہو پراں ماں کو کہنا سلام
کییے کوچ بیگی سوں بس والسلام　ج (پراں کی جگھہ بڑاں ہونا چاہئے
(۱۸۰) چلے ہو کہ بیگی اوتر گھاٹ کوں
لے کر لاو لشکر بڑے ٹھاٹ سوں
(۱۸۱) گییے ایدلا باد دیرا کییے
ندی دیکھہ کر پور ستی کئے

(۱۸۲) کہے فوج اپنی کا کیا ہے شمار
جو دیکھے تو سوجوہ چالیس ہزار

(۱۸۳) تھے اتنے ہتر نال گلنج نال بان
سنے کوئی شلک تو جاوے پران

(۱۸۴) تھے توپاں اپتے رہکلے بے شمار (ن) — رہکلے و توپاں تھے اتلے سنگت
ج کہے کیا نہیں کوئی کہنے کی بات

(۱۸۵) نظام الملک پر ہوا جب یقین
کہ اب جنگ ثابت ہے بے کات وہیں

(۱۸۶) کہلا کر جو بہیجا سلام اور دعا (ن) — کہا یا سلام اور کہا یا دعا
لڑائی میرے سات کیا ہے نفا — ج کہ لڑنا مرے ساتھہ کچھہ نہیں نفا

(۱۸۷) کہے ہیں دکھن میں سبھی صوبہ دار
لڑائی کا ست دیو دل سوں بچا

(۱۸۸) چلے جا و سیدھے ہندوستان کوں
چھا پاس اپنے تم آمان سوں

(۱۸۹) میں لڑکے سوں کیا تیغ بازی کروں
بھلا ہے جو کچھہ کا رسازی کروں

(۱۹۰) سنا جب خبر سید عالی جناب
کہا دیو بیگی سو اس کا جواب

(۱۹۱) ننھی عمر ہے پن میں لڑکا نہیں
کسی بات کا دل میں دھڑکا نہیں

(۱۹۲) میں سید ہوں تم دل میں کیا لائے ہو
مہرے ملک پر چلکے کیوں آئے ہو

(۱۹۳) مجھے ماز ہے مار انگار ننگ (ن) — مجھے عاری عار ہے مار ننگ
چلے آ و بیگی نہ لاؤ درنگ　ج

(۱۹۴) اگر لاکھہ دو لاکھہ فوجاں ملیں
کہ (جس سے) طبق سب زمیں کے ھلیں

(۱۹۵) میں وو شخص ہوں جو تلن ھار نہیں
شجاعت میری کس پر اظہار نہیں

(۱۹۶) اگر ہے حیاتی تو غم نہیں مجھے
اگر موت ہے تو وھم نہیں مجھے

(۱۹۷) جو مارا ہے قسمت میں میرے قلم
نہووے زیادہ و ناں ھووے کم (ن) — نہو کا زیادہ نہووے کا کم

(۱۹۸) رضا پر میں راضی ہوں جو ہے رضا (ن) — ج ن میں راضی رضا پر ہوں جو کچھہ رضا
و ہی ہو ئیگا جو کریگا خدا　ج　وہی خوب ہے جو کرے کا خدا

(۱۹۹) میں راضی رضا پر ہو باندھا کمر
رکھا ہوں میں القصد حق پر نظر

(۲۰۰) خدا کا کرم مصطفے کی پناہ
میں رکھتا ہوں اس بات پر سب نگاہ

(۲۰۱) بہر حال لے فوج اُتر یا ندی (ن) — ن بہر حال اوہ فوج اتری ندی
پکڑ دل میں دعوی وو دندی بدی　ج پکڑ دل منے دند دعوی بدی

(۲۰۲) ایدھر سوں یو لشکر اودھر سوں وو فوج
پڑی آکر جس میں سمندر کی فوج (ن) — ن پڑے آ نزک جوں سمندر کی فوج
(۲۰۳) تفاوت رھا کوس دو چار کا　ج
حکم تب ہوا اس جو کرتار ۲

(۲۰۴) حکم تب ہوا صاحب ذوالجلال (ن) — نپٹ داب آبی لگے تب ابہال
ج
برسنے لگیا رات دن برشکال

(۲۰۵) کتیک دن سو گزرے اسی بات کوں
دیا کوئی خبر آدھی رات کوں

(۲۰۶) صبا جنگ ہوئیگا یو ہے خبر
یہی ذکر لشکر میں ہے گھر بہ گھر

(۲۰۷) کہا جھوٹ ہے کر کیا اعتبار (ن) — کہا جھوٹ ہے یا نہیں کیا اعتبار
ہمارے ہیں جاسوس ہر تہار تہار ج ہمارے ہوں جاسوس بھی ہوشیار

(۲۰۸) نجانے کہ جاسوس و قاصد تمام
ہوے ہیں نظام الملک کے غلام

(۲۰۹) تھی تاریخ چھٹی ماہ شوال کی
بڑی نحس تر سخت جنجال کی

(۲۱۰) اتھا روز ایتوار کا نابکار
گھڑی تھی وو مریخ کی آشکار (ن) — اشکہار
ج
(۲۱۱) تھی ساعت وساعت بہت خوں فشاں
ستارہ زحل کا اتھا بے گماں

(۲۱۲) صبح کے وقت سید نیک کام
اوتھا بولتا ہوا یہ خوش کلام (ن) — اٹھا اوز لگا بولنے خوش کلام
ج
(۲۱۳) کہو کیا خبر آج ہے دوستاں
اٹھا بول بیگی بڑے عباس خاں

(۲۱۴) خبر جنگ کی آج ہے تہار تہار
یہی غل ہے سب فوج میں آشکار

(۲۱۵) سو جاسوس ایسے میں آیا شتاب
پسینے میں دستا ہے جیوں غرق آب

(۲۱۶) کھڑا ہوکے بولیا کہ اے دستگیر
نظام الملک فوج لے کر کثیر

(۲۱۷) نقارا کرایا ہے اے قبلہ گاہ
حکم کر جو تیار ہووے سپاہ

(۲۱۸) وو عالم علی سید مہربان
شجاعت کا ظاہر ہے جس میں نشان

(۲۱۹) سنا سوتبھہ بکتر منگا یا شتاب
ہوا مستعد خان عالی جناب

(۲۲۰) کہا لاو میرا جو کچھہ ساج ہے
مجھے کام دشمن ستی آج ہے

(۲۲۱) کٹاری و نیزہ و شمشیر لاو
جو ترکش ہیں خاصے سو بیگی منگاو

(۲۲۲) منگا و میرا خود توڑا منگا و
میرے خاص گھوڑوں کوں پاکھر لگاو

(۲۲۳) منگا او کمانان میری سات کیاں
کہ ہیں رات دن وو میری ہات کیاں

(۲۲۴) منگا او سپر آہنی پھول دار
کہ رہتے ہیں وو نت میرے گلے میں ہار

(۲۲۵) منگا او میرا بانک خنجر سلگاو
میری خاص پالکی کوں جھالر لگاو

ا

(۲۲۶) میرے ہاتی کوں جاکے صندل لگاؤ
وقت لئی ہوا ہے درنگ مت لگاو

(۲۲۷) کیا جا غسل کر اوٹھایا دو ہات
کہا یا نبی سرور کائنات

(۲۲۸) تمن کوں میری آج یو لاج ہے
مدد کوں تم بن نہیں آج ہے

(۲۲۹) کمربانده بہاتا اشکوں پنہال (ن)
لگیا پونچھنے موکوں دے دے رومال

ن / ج کمربانده هتیار اس کو سنبھال

(۲۳۰) کہا لا وحقا دو دم ذرق ہے
کہ حقے سوں همدا بڑا شوق ہے

(۲۳۱) خبردار اتنے میں لایا خبر
کہ بیٹھے هو کیا سید شیر نر

(۲۳۲) نظام الملک فوج کل سات لے
تمہارے امیراں کے دل هات لے

(۲۳۳) کیا هیکا سب فوج بندی سنبهال (ن)
فتح دیوے تمناں کوں رب ذوالجلال

ن / ج کیا تم اوپر فوج بندی سوں چال

(۲۳۴) اگرنہیں‌خبرکس کوں‌کچھ علم‌غیب
سبوں کا سودستا ہےدل (ن) پرفریب

ن / ج بالکل قریب

(۲۳۵) سنا سودیکھ قاصدکوں جھڑکا دیا
حقا سامنے تہا سو سرکا دیا

(۲۳۶) کہا لوگ میرے وفادار هیں
میں چاکر سوجینا نہیں یار هیں

(۲۳۷) سبھی ایک جیو ہیں وسب ایک تن
شجاعت ملے ہینگے یک یک رتن
(۲۳۸) یو دانے تسبیم کے میں اسام
رھیں ایک ھو کر سو ھل مل مدام (ن)
(۲۳۹) میرے سات کیونکر جدائی کریں
مجھے چھوڑ کیوں روسیاھی کریں
(۲۴۰) لوٹایا ھوں اون پر یو سب ملک مال
نظام الملک کیا کر یکا نہال
(۲۴۱) اوتھا بول سب کوں سواری کرو
دنیا سہل ہے دل سوں یاری کرو
(۲۴۲) رفاقت کرو زندگی سہل ہے (ن)
شرافت میں نامردمی جہل ہے
(۲۴۳) خدا کے کرم کا ھوں امیدوار
رکھے لاج میری سو پروردگار
(۲۴۴) میں سیدھوں اُن دل میں کیا لاے ھیں (ن)
میرے گھر پہ ناحق خلل لاے ھیں
(۲۴۵) خدا شات انصاف مانو تمہیں
قسم ہے ھماری سو جانوں تمہیں
(۲۴۶) یکا ایک ۔۔۔ کار (ن) پیدا ھوا
نظاماں کا اشکر ھویدا ھوا
(۲۴۷) ھوی ھانک لشکر میں چاروں کنے
زمیں تھر تھری اور لرزا لگے

ن — رچیں ایک ھاگے میں ھل مل مدام
ج

ن ھٹسا مت کرو زندگی ہے سہل
ج شرافت میں مت لیو اپنے خلل

ن میں سیدھوں او مجھہ پہ چل آے ھیں
ج مرے گھر پہ ناحق ہلا لاے ھیں

ن — ھو نسو کار
ج

(۲۴۸) کھڑا چڑھ کے ھودے کماں کوں سنبھال (ن)
کہا جوش میں یوں انکھیاں کرکے لال

(۲۴۹) نپٹ کر کر شوخی یو چل آے ہیں
مجھے کیا مگر موم کا پاے ہیں

(۲۵۰) زمیں دھس کے غرقاب ہو جاے گا
گگن ٹوٹ کر سر اُپر آوے گا

(۲۵۱) لڑوں یا مروں یا فوجاں چلاؤں*
میں عالم علی لہو کی ندیاں بہاؤں

(۲۵۲) بحق خداوند پروردگار
جب *لگ تی جیو ہے کروں کارزار

(۲۵۳) ھراول کیا ہے غالب خان (ب) کوں
دیا ساتھ سلیم خاں متھے خاں کوں

(۲۵۴) دلیل خان، محمدی بیگ مرزا علی
جہاں لگ تھے سردار جودھا بلی

(۲۵۵) کہا تم ھراول کے سب ساتھ جاؤ
ھراول کوں لے سات بیگی ملاؤ

(۲۵۶) امیں خاں کوں بولے کہ سن لیو بات
تمہیں فوج کا مل لے جاو سنکات

(۲۵۷) چلو مہربانی سوں سیدھی طرف
تمہاری شجاعت میں کچھ نہیں حرف

(۲۵۸) نہیں کوئی ثانی تمہارے مثال (ن)
یہی بات تحقیق بے قیل و قال

ب — کھڑا ہو جلدی سوں نکال
ج

* نسخہ (ج) میں چلاؤں اور بہاؤں کی جگہ چلاؤ اور بہاؤ ہے اور دوسرے مصرعے میں میں کی جگہ تو ہے —

* تینوں نسخوں میں جب لگ ہے لیکن میری راے میں جلگ ہونا چاہئے۔

ب — ملور خاں ن — متہور خاں
ج ج

ب — تمہیں مرد دکن میں ہو بے مثال
ج

(۲۵۹) امیں خاں کہے رہ میں دستا خلل (ن) کہڑے ہو کے رہلے ہوں دستا خلل (ج)
گیا دور ہماوا ہراول نکل

(۲۶۰) مدد کو ہو آگے تو کچھہ کر دکھاؤ
ہو بےشک اپس دل میں کہانڈا چلاؤ

(۲۶۱) تلوگے تو سب فوج تل جائیگی
بلا منجھہ اکیلے او پر آئیگی

(۲۶۲) وہی ہو ئیگا جو ہے اب کی رضا (ن) میں ہوں سب عزیزاں ستہیں باوفا (ب)
کہ میں ہوں عزیزاں میں سہنے صفا

(۲۶۳) ہورخاں کوں بولے رہو دست چپ
رہتے کی لے فوج کوں سات سب

(۲۶۴) تماری میری کچھہ جدائی نہیں
تمہیں خویش ہو کچھہ سپاہی نہیں

(۲۶۵) تمہاری میری شرم سب ایک ہے
کروگے وہی جس میں جو نیک ہے

(۲۶۶) دنیاں میں دوبارا کچھہ آنا نہیں *
یو دنیا جنم لگ تہکانا نہیں

(۲۶۷) اگر ہے شرم سو یہچ جینا بہلا
وگر نہیں زہر کہا کے مرنا بہلا

(۲۶۸) خبردار ہو دل میں کچھہ ڈرنہ لاؤ
کہ جیوں شرط ہے خوب ہاتاں چلاؤ

(۲۶۹) لئے سات اپنے سرہانے (ن) حشم رہا سو شم (ج)
چلے خوش ہو رکہہ (ن) رکھہ کے یک یک قدم آہستہ (ج)

* یہ شعر اس سے پہلے آچکا ہے صرف تہکانے اور تہانے کا فرق ہے نسخہ (ب) میں یہ شعر اس مقام پر نہیں نسخہ (ج) میں اس طرح ہے۔
دنیا او پہر کیا یہ جوں چہاؤں ہے
جنم لگ کسی کا نہ اب تہاؤں ہے

(۲۷۰) سو ایسے میں آکر کہا کوی سوار
ہراول یو بھاری بڑی ہے جو پار (ن)
(۲۷۱) رہی فوج جاں کی تہاں سب ٹھٹک
(۲۷۲) چلے ہیں جدھر کے تدھر سب ٹھک
(۲۷۳) ہزاراں سوں جڑ دھا آگ ننگ * (ن)
سنا ارر چلا جیوں دیوے پر پتنگ
(۲۷۴) جو ہوتا اگر رستم افراسیاب
تو ہرگز نکرتا وہ ایتا شتاب
(۲۷۵) پڑیا ٹوٹ ایسا ہوا سار کڑک (ن)
کسی بت کا دل منے نہیں تھا دھڑک
(۲۷۶) اوٹھا فوج لشکر کا گرد و غبار
کہ جانو قیامت ہوا آشکار
(۲۷۷) ہوا شور و غل غلغلا فوج میں
سپاہت کے دریا رہے موج میں
(۲۷۸) مقابل ہوا اور کہا ھا لک مار
وطن ہے سپاہی کا کھانڈے کی دھار
(۲۷۹) عجب دن عجب وقت ہے آج کا
بھلے مرد کی قدر معراج کا
(۲۸۰) کہا کاں ہے سردار اس فوج کا
جو دیکھے تماشا میری موج کا
(۲۸۱) X تمہارے بن کاسپہ ازبس ہے (ن)
تلومت یو مرداں کا میدان ہے

ن/ج — ہراول پہ صاحب کے ہے روز گار

ن — بڑا شو رحودھا بڑا پر ٹھٹک
*ایسا سنگ
ج — سنا اور چلایا جیسے بجلی کڑک

ن ب ج — پڑیا ٹوٹ اسماں سوں بجلی کڑک
کسے ما جدی جو سنبھالے دھڑک

ن/ج — ملیں ہم و تم ہم کو ارمان ہے

(۲۸۲) سجے بان گرلے سوں کوئی (ن) مت تراؤ
نشا ہے تو ہووے سوں ہودا بھڑاؤ

ن — تم
ج

(۲۸۳) لگا مارنے تیر گولی چلاؤ (ن)
کہا فوج کوں سب کی گردی اٹھاؤ

ن — لگا مارنے تیر کر کوں پیا
ج دیا فوج یکبارگی سب ہلا

(۲۸۴) چلانے لگے تیر پر تیر کوں
ہزار آفریں مرد (ن) کے دھیر کوں

ن — مرد رندھیر کوں
ج

(۲۸۵) گزر جائے بکتر و چلتہ کوں پھوڑ
زرہ کی کڑیاں تھال کے پھول توڑ

(۲۸۶) جسے تیر ماریں ترازو کریں (ن)
سکت کیا تھی جو زور بازو کریں

(۲۸۷) ہوا دوگھڑی لگ بڑا رن کھندل (ن)
چلی فوج موں پر سے ساری نکل

ن — ہوا دوگھڑی لگ ہزاروں کا دھل
ج

(۲۸۸) جو ہودے کے موں پر سے سب ٹل گئے
پھرا پیٹھ یکبارگی چل گئے

(۲۸۹) نہیں ہے عزیزاں یو عالم علی
مگر آج حاضر ہوئے ہیں علی

(۲۹۰) الہی یو کس نور کا نور ہے
جواں یو شجاعت سوں معمور ہے

(۲۹۱) کیا تب حکم بیگ نوبت بجاؤ
رکیو دل قوی اور گھوڑے چلاؤ

(۲۹۲) رہے کیوں کھڑے جا بجا تہار تہار (ن)
تھنبے اور بڑے سب پہاڑے سوار

ن — رہو دیں کے تیوں ہو کھڑے تہار تہار
ج

(۲۹۳) چلا کوئی مشرق چلا کوئی غروب
چلا کوئی شمال اور چلا کوئی جنوب
(۲۹۴) بلانے لگے فوج کوں آو رے
فتح ہے فتح کوں مت جاو رے
(۲۹۵) پھرو و رے پھرو ننگ سوں دور ہے
نمک کھا کے بھاگے سو مزدور (ن) ہے — ن/ب ج — مقہور
(۲۹۶) یو سن کر کہا سید پاک باز
اِتا بس ہے دھنا مدد کار ساز
(۲۹۷ X) جو بھاگا سو کیا اس کی پھر آس ہے
یہ مرنا شہادت مجھے خاص ہے
(۲۹۸) کھڑا رن میں سید اپس ذات سوں
گئی فوج ساری نکل ہات سوں
(۲۹۹) سہاوت کوں بولا کہ ہاتی چلاؤ
کہا تب غالب خاں کوں بھگی ہلاؤ
(۳۰۰) ہزار آفریں خان عالی قدر
تماری ہے مجھ پر مہر کی نظر
(۳۰۱) میں اس فوج کوں ازمایا نہیں
کپٹ اون کے دل کا میں پایا نہیں
(۳۰۲) دغا دے کے مجکوں نکالے شتاب
قیامت میں کیا دیں گے حق کوں جواب
(۳۰۳) محبت کی کچھ کس سنے باس نہیں
دیکھو دوستاں کوں میرے پاس نہیں

(۳۰۴) پھر حال دنیا یہ گزران ہے
لگا رکھہ اب موت سوں دھیان ہے

(۳۰۵) غالب خاں نے بولے کہ سید انام (ن)   ن/ب ج — امام
نکو کچھہ کرو فکر اب دل میں خام

(۳۰۶) جب لگ دم میں دم ہے کریں کارزار (ن)   ن/ج — لڑیں جانثار
رہیگا جو عالم ملے یادگار

(۳۰۷) سہر خان (ن) غوری نے بولیا نواب   ن/ب — ناہرخاں غوری کوں بولے نواب   ن/ج — ناصرخاں
ملے مل (ن) گے سب یو خانے خراب   پلے پل / تلے تل

(۳۰۸) کیا شیخ اکبر نے (ن) آکر عرض   ن/ب — شیخ فیض   ن/ج — فیضو
کہ مرناں ہمیں اب ہوا ہے فرض

(۳۰۹) مقرر ہوا ہے جو تقدیر سوں
مٹنا نا سکے کوی تدبیر سوں

(۳۱۰) نواب اب رہا شہر کا دیکھنا
لڑای نہیں اب ہوا پیکھنا

(۳۱۱) اسی گفتگو میں کہ تھا یو بچار
پھری فوج سید کی کل ایکبار

(۳۱۲) پڑا مار کا * تیر اور بان کا   * معرکہ
پڑا رن کھنڈل خوب گھمسان کا

(۳۱۳) کئے قصد ایک دل ہو اہل غرور
کہ چڑیا ہے جیوں آکے دریا کوں پور

(۳۱۴) ہزار آفریں تجکوں عالم علی
کہوں سور ما بیر یا کوی بای (ن)   ن/ج — کہوں سور ما بیر جو دھا بلی

(۳۱۵) مہاوت پڑیا فیل سیتی نکل (ن)
لگا پانوں اپنے کوں ڈھکلنے اگل
(۳۱۶) تہورخاں (ن)کوں اتنے میں گولا لگا
(لگا سوبیچ ھاتی اوپر تے ڈھلا (ن) ہے
(۳۱۷) گریا سور چھل ھات سوں چھوٹ کر ج
رھا دیکھہ سید لہو گھونٹ کر
(۳۱۸) رہے تھے کم و بیش کل سو جواں
ھوے گرد سید کے سب خونفشاں
(۳۱۹) اہے تھا ھتی تھا و یک تھا خدا (ن)
ھوے شاہ سوں سب سنگا تی جدا
(۳۲۰) دو ترکش لے ایسے میں خالی کیا
سگل تن کو زخماں سوں جالی کیا
(۳۲۱) لگے تیر بھرنے اسی تیر کوں
چلا کر بھرا کر بڑی ڈھیر سوں
(۳۲۲) لگا وے جسے تیر کھہ کر کہاں (ن)
و و لاگے جسے سو کئے لا مکاں
(۳۲۳) یکا یک لگے موں اوپر پنج تیر
ھوے پارکالاں سوں پردے کور چیر
(۳۲۴) لیا کھینچ کر اور کیا خوب زور
آھستہ سٹیا تیر پیکاں مرّور (ن)
(۳۲۵) X لگے تیر پر تیر اوس شیر کوں
چلا وے پھرا کر اُسی تیر کوں

ن / ج بڑا چھوٹ آسن سوں مہاوت نکل
لگا پانوں ھاتھی ڈھکا یا اگل
لہ / ب عنایت ن / ج غیاث خاں
ہے KAC
ن / ج ھتی تھا وہ تھا آپ یا تھا خدا
ن / ب لگا کر چلے کوں بھی کھینچے کہاں
لگا وے جسے تو نر ھے کچھہ نشاں
(لگا وے جسے سور بھی الا ماں ج)
ن / ج رھا سو سٹیا پانچھ کوہ‌دا مرور

(۳۲۶) لگا تیر چلے کوں کھینچے کماں
لگا وے جسے سب کٹے وو جہاں
(۳۲۷) لگا تیر پھر آ بنا گوش میں
ستیاکاز بھی اس کوں آ ہوش میں
(۳۲۸) نزک آکے اس فوج کا کوئی امیر
لگا یا پیشانی پر آ سخت تیر
(۳۲۹) نکالے تو ہر گز نکلتا نہیں
کیا زور پر زور چلتا نہیں
(۳۳۰) ستیاچ اور بہار کاز وہاں کا وہاں
دیا جواب اوس تیر کا در زماں
(۳۳۱) پڑا آکے گھوڑے سے جب کھاکے تیر
کہا کیا امیروں میں تھا بے نظیر (ن)
(۳۳۲) سو ایتے میں کوئی اورھوڑے سوار
وو آ سامنے دل کوں کر استوار
(۳۳۳) لگا یا اوسے تیر ایسا شتاب
جو دے نا سکا پھر کر اوس کا جواب
(۳۳۴) بھی ایسے میں آ کوئی نیزہ سمھال
غروری سے سیدھ پو مارا نکال
(۳۳۵) X جو دیکھا اسے تیر مارا اچھل
پڑا پھر کر گھوڑے اوپر سے نکل (ن)
(۳۳۶) زرا مورچیا کھاے گردن پر آے
ھاتی کوں اشارہ سوں انگے چلاے

ن کہا کیا جوانمرد تھا بے نظیر
ج

ن پڑا نیچے گھوڑے اوپر تیں نکل
ج دکھا سونہہ جھکاوے نگا ھوں پھراے
ھتی کو اشارت سوں انگے چلاے

(۳۳۷) جو ایسے میں کوی پیرزادہ فقیر
بہوت خو بصورت وصاحب نظیر
(۳۳۸) ہتی ہو ل آ کر ہوا رو برو
کہ جا نو نظا م ا لملک ہیکا تو
(۳۳۹) کہ جلدی سوں دو تیر ایسا جڑا (ن)
سو ہودے میں بے ہوش ہوکر گرا
(۳۴۰) زخم پر زخم جب لگے بے حساب
ہوا سست (ن) تب سید عالی جنا ب
(۳۴۱) ہر آ ن آ پڑی ما ر تلوا ر کی
بڑے زور کی ا و ر بڑے مار کی
(۳۴۲) عزیزا ں گئے چھوڑ سا رے نکل
نمک کی شر ط نا رکھے گئے نکل (ن)
(۳۴۳) جدہر دیکھتا ہے اودہر مار مار
کہا جو رضا پاک پرو ر د کا ر
(۳۴۴) ستیا ہا ت ہمت سو ں شمشیر پر
سومارے دیکھو جھٹکہ ہودے اوپر (ن)
(۳۴۵) لہو لا ل موں کے ا و پر بہہ چلا
اودہر کا ادہر جا بجا بہہ چلا
(۳۴۶) لگے ڈھال موں پر اپس کو چھپانے (ن)
ایدہر کا اودہر مار کوں موں چکاے
(۳۴۷) ستے آئے ہودے کو ہودوں سے گھیر (ن)
ہوا تب ہر اسا ں کیا د ل دلیر

ن مت سانگ ہاتی میں صاحب سریر
م نیت بانک پٹے موں تہا بے نظیر

ن/م یکا یک اسے تیر ایسا جڑا

ن/ب تنگ

ن/ب م نہ سید ہے بغل نہ داریں بغل

ن/ب تو ہر کر لگا جس کے ہودے اوپر

ن لگے ڈہال ہودہ جکو ڈنڈیاں کوں کاٹ
ج لگے جہاں تہاں کھولدے جو کہات

ن لئے آکے جودہن نے ہودے کو گھیر
م رکھا دیوانات بہت ہیا دل دلیر (م)

(۳۴۸) سبھی مغل اور بان کے تنداں کوں کاٹ (ن)
لگے ھودے پر چڑھنے رسیاں کوں کاٹ

ن / ب — ستے تھاں ھودے کی تنتیاں کوں کاٹ
اگے جہاں تہاں کھول رھے چواہ ھات

(۳۴۹) دو ھاتاں سے تلوار بازی کری
مگر کربلا پھر کے تازی کری

(۳۵۰) سو ایسے میں ایک آ کے گولی لگی
وہ گولی نہیں بلکه ھولی لگی

(۳۵۱) کہا کوی نفر ھے تو پانی پلاو
کہا آبدار ھو تو بیگی بولاو

(۳۵۲) نه پانی اتھا وھاں ناتھا آبدار
لگیا وو ھیں لڑنے کیتئی پیاس مار

(۳۵۳) جسے ھات مارے کرے چور چور
جب لگ جیو میں جیو تھا تن پر نور (ن)

ن / ج — جب لگ تن میں جیو تھا وہ تب لگ شعور

(۳۵۴) انگوییاں پرتے لہو چلیا بے شمار
لگیا پونچھتے پونچھتے اپنی رومال کار

(۳۵۵) بونداں لہو کے سوں پرپو نچھا تمام (ن)
رھا دیکھنے سے وو سید انام

ن / ج — بند ھی منه په جالی لہو کی تمام
رھا دیکھنے سوں وہ سید امام

(۳۵۶) سنو اے عزیزان روشن ضمیر
لگے ایک تن پر سو چھتیس (ن) تیر

ن / ج — چالیس

(۳۵۷) تھے نو وار نھزے و تلوار کے (ن)
وھم نا کیا کچھ اس آزار کے

ن / ب — اتے وار نیزوں کے تلوار کے

(۳۵۸) فوارے لہو کے او چھلنے لگے
نکل بہار ھودے سوں چلنے لگے

(۳۵۹) اوتھے ایک تن پر ہزاروں کے غول
ہوا مار کے موں جدا سر سوں خول

(۳۶۰) لگیا جب سینے آ کے گولا نداں
نکل روح تن سوں گیا جیوں بوان

(۳۶۱) جگر ٹوٹ لہو ہو کر آیا اوبل
چلے حیف تن پر تے گردن پہ ڈھل

(۳۶۲) مغل آ چڑھے ٹوٹ ہودے اوپر
موئے پر لگے مارنے پھر خنجر

(۳۶۳) دیے ڈال ہودے تلے خان کوں
کہ دل سے پھرے لال بے جان کوں (ن)

(۳۶۴) نہ جیوتھا نہ کچھ روح تھاکچھ نشان
نہ دم تھا نہ کچھ نور تھا جیو بجان

(۳۶۵) وو اقبال ناصر کے گھر کا غلام
ہوا چور زخماں سے لہو کے تمام

(۳۶۶) سو بے ہوش ہو کر پڑیا کھیت میں
اوٹھایا سپاہی افسوس میں

(۳۶۷) توی تاریخ چھٹی ماہ شوال کی (ن)
بڑی سخت تر نحس جنجال کی

(۳۶۸) خبر ہوئی شہر میں سواس حال سوں
لئے مار کر جنت کے اس لال کوں

(۳۶۹) محل میں کیا جا کے کوی یو خبر
کہ تل مل (ن) ہوا آج سارا شہر

ن/۴ سو اُس کوں بھرے لعل بےجان کوں

ن/۴ تھی تاریخ نو یں جو شوال کی
ہو ی شہر میں خبر اس حال کی

ن/۴ تل اوپر ہے

(۳۷۰) لئیے مار عالم علی خان کوں
سیادت کے مسند کے سلطان کوں
(۳۷۱) لئیے مار لشکر آوارا ہوا
امامت کے گھر کا اندھارا ہوا
(۳۷۲) گیا (ن) جگ ستی وو مبارک بدن   ن ـــ چھپا ج
علی کے خزانے کا خاصا رتن
(۳۷۳) اوتھی ماں نے افسوس کہا آہ مار
کہی عمر خاں کوں کہ اب کیا بچار
(۳۷۴) زمین سخت اور آسمان دور ہے
ور ونا دیکھو جان کل چور ہے
(۳۷۵) لے جانے کی بیگی اوتاولی کئے
لے جا کر دیکھو کیا خرابی کئے
(۳۷۶) ہوا غل بڑا کل محل میں تمام
جو کھانا و پانی ہوا سب حرام
(۳۷۷) کہی ماں نے فرزند میرے نو نہال
ہوا دیکھنا مجکوں تیرا محال
(۳۷۸) کہاں ہے وو فرزند عالم علی
تبرے درکھ سور سر پانوں لگ سوں جلی
(۳۷۹) فلک بے مہر نے کیا کیا ستم
گنوایا میری دھکدھکی کا پدم
(۳۸۰) اوجالا میرے جیو کے ایوان کا
ستارا میرے ملک میدان کا

(۳۸۱) میرے زیب زینت کا تھا گل گلاب
تڑا کر کیا سب چمن کوں خراب
(۳۸۲) ہوا عیش آرام میں کیا خلل
عجب جیوتن سوں نجاوے نکل (ن) — قیا ست لگوں تب رہے کا یہ عمل (ج)
(۳۸۳) ہزار آرزو اور ارمان سوں ج
میں پائی تھی عالم علی خان کوں
(۳۸۴) کہاں او کہاں اوس کی خانی گئی
سگل خاک میں اوس کی جوانی گئی
(۳۸۵) کہوں کیا جو پوچھینگے مجکوں نواب
کہاں ہے وو فرزند مبارک نقاب
(۳۸۶) اپس ھات سوں کیوں گنوائی اوسے
نہلی عمر میں کیوں کٹائی (ن) اوسے — کہپائی
(۳۸۷) منانا کیئے کیوں تم اس بات سوں ج
گنوائی بہادر میرے ہات سوں
(۳۸۸) نہ کھاوے نہ پیوے روے زار زار
میرا جیوپیت بن یوں ہے بے قرار (ن) — مچھی جیوں تڑپتی ہے تیوں بے قرار
(۳۸۹) پکڑ ھات کوں میں نکالی تجھے ج
پھر آ کر تو مکھ نہیں دکھایا مجھے
(۳۹۰) کہے تھے فتح پا کے گھر آئینگے
یو صورت نورانی کوں دکھلا ئینگے
(۳۹۱) کہ مہراں روپے بھر کے خیرات کی
خبر کچھ نہ تھی مجکوں اس بات کی

(۳۹۲) کہیں سدھ میں آوے کہیں سدھ گنوائے
نینا ں سے انجھو تھال موتی بہائے
(۳۹۳) ہوے خود کہی تلملا ھانک مار
اے حافظ ! اے ناصر ! اے پروردگار
(۳۹۴) پکڑ ھات سونپی تھی یارب تجے
سبب کیا سو پھر نا دکھایا مجے
(۳۹۵) تھی امید یہ دل میں دیدار کی
میرے فوج لشکر کے سردار کی
(۳۹۶) پھر اون کی خبراں میں خیرات کی
خبر کچھہ نہ تھی مجھہ کوں اس بات کی
(۳۹۷) ارے کوئی اس غم کی دارو بتاؤ
مجے اس عزا باں سوں بیگی چھڑ ؤ
(۳۹۸) ہو بے ہوش سو بار یک بار بار
انکھیاں تے لہو روے وو زار زار
(۳۹۹) محل کے جتے لوگ زبر و زبر
بڑے حیف کھا کھا کے ہو بے خبر
(۴۰۰) تیرے باج پیارے اندھارا دسے (ن) ن کہیں کیوں محل میں اندھارا دسے
خدا باج پیارا نہیں کوئی دسے ج خدا باج کوئی نہیں کہیں اب کسے (ج)
(۴۰۱) نہ فریاد کوں کوئی نہ کوئی داد کوں
بہر حال جانا دولت آباد کوں (ن) ن/ج گئے ہر طرح دولت آباد کوں
(۴۰۲) شہر ملک تھا جس کے فرمان میں
سو وو جا پڑے کوہ و ویران میں

(۴۰۳) ہزاراں سپاہی ہزاراں غلام
کریں آ کے تسلیم ہر صبح شام
(۴۰۴) ہزاراں سوں گھو ڑے ہتھی بے شمار
ہزاراں چھڑی دار چیلے ہزا ر
(۴۰۵) ہزاراں امیراں رہیں نت مقام
چھہ صوبوں میں عزت تھا ازبس تمام
(۴۰۶) نہیں فکر کچھہ مجکوں سنسار کی
تھی امید واری سو دیدار کی
(۴۰۷) گیا لوٹ میں مال اسباب سب
یو قصا نہیں ہے حکایت عجب
(۴۰۸) نہ تھا زور کس کوں نہ کس کوں مجال (ن)
سکے مار دم اور کرے کچھہ سوال
+ ج (۴۰۹) چھڑاوے لے جا پل سوں افلاک پر
سٹے پل منے خاک کا خاک پر
+ ج (۴۱۰) تلا رام دیوان کا یتھہ قدیم
اتھا ساتھہ اس حادثے میں خدیم
(۴۱۱) پرندے کوں طاقت نہ پنکھہ مارنے
نہ یارا تھا وہاں کس کوں بچارنے
(۴۱۲) جو بولے بچن سوے دستور تھا
کرم رات دن جن کا مشہور تھا
(۴۳۱) انگے حوض لبریز اور گل بہار
صدر مسندایں جا بجا تہار تہار

ن ـــ نہ تھا کس کوں زہرہ نہ کس کوں مجال (ج)
ج

(۴۱۴) سوایسا ستم ہو ستم ہائے ہائے (ن)
نیو دنیا بھی رستم کوں کیا تیار (؟)

ن سو دشتا یہ کہا کہا ستم ہائے ہائے
ج یہ دنیا ہے ایسے کوں کیا کوئی نہ پائے

(۴۱۵) کہاں و و نقارے دما مے نشان
کہاں و و هرابا کہاں توپ بان

(۴۱۶) کہاں و و صلابت کہاں و و حکم
کہاں فوج لشکر کہاں و و حشم

(۴۱۷) کہاں ہے و و دولت کہاں ہے وہ سال
عجب قدرتاں ہیں تھری ذوالجلال

+ ج (۴۱۸) کہیے مل اپس سوں اپن اہل راز
سیادت کا ناحق ڈوبا یا جہاز

+ ج (۴۱۹) نبوت کی انگشتری کانگیں
جگر گوشۂ فاطمہ با لیقیں

+ ج (۴۲۰) پڑا گرد او ہو مئے لال ہو
گرا ایکلا رن سوں بے حال ہو

+ ج (۴۲۱) ننھی عمر سوں کیوں کھپایا اُسے
لے جاکر دیکھو دکھہ دکھایا اسے

+ ج (۴۲۲) نہ آرام دل کوں نہ خاطر قرار
جگر جل دھڑکتا ہے جیسے انگار

+ ج (۴۲۳) جئیے لگ نہ اب کس تیں یاریں کریں
یہ غم دل سوں رکھہ بردباری کریں

+ ج (۴۲۴) دنیا دغا باز فانی مقام
ہے دل باندھنا اس سوں بالکل حرام

(۴۲۵) جیسے پائندا ری سو نایاب هے
یو دنیا دیکھو سر بسر خواب هے
(۴۲۶) یو غم جگ منے (ن) آشکارا هوا — ن/ع: موں جب
جگر ٹوٹ عالم کا پارا هوا
(۴۲۷) هزار آه و افسوس هے دوستاں
چھپا حیف دنیا سوں وو نوجواں
(۴۲۸) عجب سیه عالی نسب خان تها
فراست کے دفتر میں سلطان تها
(۴۲۹) کہاں ڈھونڈنا اب کہو خان کوں
فراست کے موتی و مرجان کوں (ن) — ن/ع: رسالت کے موتی پریشان کوں
(۴۳۰) قاعدہ میں قلعدار عالی قدر
سیادت کے رکھہ نام اوپر نظر
(۴۳۱) گیا قلعہ میں اور کہا آشکار
میں مومن مسلماں هوں دین دار
(۴۳۲) تمہاری میری لاج سب ایک هے (ن) — ن/ع: تمہاری میری لاج اک لاج هے
میرا بول تمنا ستی نیک هے — مرا قول تمنا ستی اج هے
(۴۳۳) رفاقت تمہاری هے جیوکے سنگات
میں جاگیر سوں منصب سے دهویا هوں هات
بہ (۴۳۴) جو کچھہ هو تمہارا کرے کاسو هو
میں بیٹھا هوں سب بات سے هات دهو
(۴۳۵) رکھوں دل کوں صاحب تمہیں برقرار
لڑونگا جو چل آئے یک لکھہ سوار

(۴۳۶) جو کچھ هو تما را سو هو ٹھکا وزو
میں بیٹھا هوں سب سوں هات دهو

(۴۳۷) ملا سا دیا اور کہلا یا سلام
دیا خوب رهنے کوں عالی مقام

(۴۳۸) مہار ک تیرا تا ج (ن) تجھ پر اچھو — ن/ج زانوں
یو همت (ن) تیری تجکو رهبر اچھو — ن/۴ نیست

(۴۳۹) شجاعت کے زور (ن) میں توں فرد هے — ن/ج طورے
بہادر شجاع صاحب درد هے

(۴۴۰) مراتب میں مردوں کے توں بے نظیر
نبی نت اچھو تجھ اوپر دستگیر

(۴۴۱) جو بو لیا بچن سو رکھیا برقرار
اچھوشاہ مرداں کا تجکوں (ن) ادهار — ن/ج نس دن

(۴۴۲) ووجگ میں نتیجا برا پائیگا (ن) — ن/ج دو جگ سوں انتہا برا پاے کا
دنیا سہل هے نا توں رہ جا ئیگا — دنیا سہل هے نا توں رہ جاے کا

(۴۴۳) هوا بعد ازاں غل هندوستان میں
هوا جنگ بڑا مغل اور خان میں (ن) — ن/۴ هوا جنگ مغل اور میاں خاں میں

(۴۴۴) شہادت کئے خاں نے اختیار
کرے مغفرت خاں کوں پرور دگار

(۴۴۵) هوی جب خبر جاکے نواب کوں
سیادت کی مسند کے محراب کوں

(۴۴۶) که عالم علی سید با خبر
کیا عالم معنوی پر سفر

(۴۴۷) سنیا اور سٹیا غم کی جا آگ میں
یو عالم علی خاں کے ویتاگ (ن) میں
(۴۴۸) کہا کہود قاروں دکھن کی زمیں
یہ کیا بات ہملا پہ آوے کہیں
(۴۴۹) بحق خدا وند کون و مکاں
نہ مغلاں کوں چھوڑوں کا میں درا ماں
(۴۵۰) منگا توپخانہ بڑے تھاب (ن) کا
بنگالا پورب اور پنجاب کا
(۴۵۱) منگا ئے گو مک (ن) باں سب ہند کے
و لے جا بجا اور سرہند کے (ن)
(۴۵۲) جزائل شتر نال ہزاراں ہزار
رکھے صاف دھو دھو کر سب ایکبار
(۴۵۳) غلاماں کئے سرخ بانات کے (ن)
زرد اور سبز رنگ کئی ذات کے
(۴۵۴) ہزاراں جواں مرد شمشیر زن
(۴۵۵) ملے آ کر بارہ سے سب ہم وطن (ن)
(۴۵۶) لئے سات احشام چو سٹھ ہزار (ن)
یک یک کس شجاعت میں سب نامدار (ن)
(۴۵۷) بڑے خاں متھے خاں اوتھے بول کر (ن)
کہ یک یک کوں پکڑو ......
(۴۵۸) اوتھے شے اکھر لے لوں کر پکار
کہ یک یک کوں پکڑونگا در کار زار

ن — بیراگ
م

ن — قاب
م

ن — کہک

ن — دلی ج آگرا شہر ہور سہند کے
ب

ن — غلاماں کئے سب کوں بانات کے
ج سرخ ' سبز اور زرد کے بھانت کے

ن — ملے آ کے بارہ سوں ست دے وطن

ن — بست ہزار ' یہ تعداد صحیح نہیں
ج ب پچاس ہزار کی تعداد تاریخوں میں درج ہے

ن — اہس تہا شجاعت میں اس نامدار

ن — اوتھے بول اگرھے میری جاں میں جاں
ب بڑھکر چھڑ کہ کنگا کرونگا رواں

(۴۵۹) کہے اے خدا یا مجھے ایکبار
نظاماں ستی اُس لڑا ی کی بہار
(۴۶۰) اوتھے بول اگر ھے مرے تن میں جاں
کہ ایکبار سب ھم کوں کرنا او تھاں (ن)
(۴۶۱) بحق خدا وند پروردگار (ن)
نظام الملک سوں ملا ایکبار
(۴۶۲) اگر میں عدو اپنا پاؤنگا تو (ن)
نکل جاوں جو سامنے ھو
(۴۶۳) زمیں دندنا نے لگی خوف کہا
پڑا دھاک ملک میں ھوا جابجا (ن)
(۴۶۴) اسیراں و اُمراو لا کہاں کوں لے (ن)
چلا ھے دکن پور دور سے کوں دے
(۴۶۵) چلے ھیں دو منز دکھن کے رھے (ن ا
ھوا وو نچھ تقدیر ھک دک رھے
(۴۶۶) دغے سے لئے مار نواب کوں
لئے لوٹ ساماں و اسباب کوں
(۴۶۷) عزیزاں جو کچھ ھے سو تقدیر ھے
بغیراز رضا کچھ نہ تدبیر ھے
(۴۶۸) یو دنیا دغا باز و مکار ھے
ھوس اب جتانے میں ایار (عیار) ھے (ن)
(۴۶۹) فہم (ن) بے خبر عقل حیران ھے
دیکھو دوستاں ! کیا یو طوفان ھے

ن — لگا کر الگا لگ کروں کا اُدا ن
ن ج — کہا جذب سوں اے خداوند کار
ب ج — نظاماں سوں مجھکو ملا ایک بار
ن — اگر مجھکوں دشمن مہرا پاے تو
ب ج — نکل جاں یوں سامنے آے تو
(نکل جاویں جو سامنے آئے تو)
ن — پڑا دھاک ملکوں ملک جابجا
ب ن — چلے دو منزل دکھن کے کدھن
ن — اسیراں مرا فوج سب ساتھ لے
ن ج — ھوا اس میں تقدیر کا آگے لکھن
ب — چلے تھے دو منزل دکھن کے کدھن
ن ج — ھوا اس میں تقدیر کا ایک ذن
ن ب ج — و ھی یو جتا جو ہوشیار ھے
ن ج — و ھم

(۴۷۰) دنیا کی صحبت ہے بالکل خراب
یو دستا ہے پانی اوپر جیوں حباب
(۴۷۱) اگر مال دھن لاکھہ در لاکھہ ہے
سمجھہ دیکھہ آخر وطن خاک ہے (ن)
(۴۷۲) یو جیونا جنم ہے نہ دوات جلم (ن)
اوسے خاک سونا ہے کیا ہے وھم (ن)
(۴۷۳) جسے کچھہ سمجھہ بو جھہ ادراک ہے
دنیا کی آلائش سوں وہ پاک ہے
+ (۴۷۴) مرے!کا مرے کا رے مرجاے کا
جوکچھہ یہاں کیا ہے سو وھاں پاے کا
+ (۴۷۵) اگر باد شاہ ہے وگر ہے فقیر
اجل کے دنداں (ن) میں‌وہ‌دونوں اسیر
+ (۴۷۶) نہ گھر کام آوے نہ‌گھر (ن) چار آے
نہ ما باپ بھائی نہ کوئی یار آے
+ (۴۷۷) جو آیا ہے جگ میں سو مہماں ہے
یہ‌جیونا سو جیوں پھول ہور پان ہے
+ (۴۷۸) خبردار اچھہ نہیں تو اکملاے کا
جھاتی کے دم سوں نکل جاے کا
+ (۴۷۹) کہاں گئے کہاں گئے کہاں ھیں بتا
اتھا مال دھن جن کا لا انتہا
+ (۴۸۰) اتھے شیر شر زے جنو کے غلام
ہوا خاک میں دیکھہ ان کا مقام

ن/ب سمجھہ دیکھہ آخرکوں تن خاک ہے
ن ختم
ن/ب ارے ج خاک سوتا ہے کہا ہے وھم
ن/ج پلجوں
ن/ج ج

+ (۴۸۱) کسے دل میں اپنے ز و لیاتے نہ تھے
سنم مھں اپس کے وو ماتے * نہ تھے
* سانا بھملی سہا لی

+ (۴۸۲) سمجھ بوجھ بس گیا مل تیرا حساب
تیرے سار کے کئی پڑے ھیں خراب

+ (۴۸۳) نہ دفتر میں چھرا نہ گھر کوں تھکاں
کیا فلک کرے کا تو اب ویران

+ (۴۸۴) نہ گھر کام آوے نہ فرزند رہے
نہ ما باپ آوے نہ دلبند رہے

+ (۴۸۵) ہزار ہور سو تیس تھے ۱۱۳۳ اسند وا پر
محمد کی ھجرت کوں سن کان دھر

+ (۴۸۶) پر ایا چا ند ربیع الاول کا آیا نظر
ھوا آخرت کا یو حکایت خبر

+ (۴۸۷) اتھا دن عزیزاں جمرات کا
ھوا شہر وا ختم اس بات کا

+ (۴۸۸) اگر کوئی پوچھے یہ تجکوں حساب
سمجھ کر اسے بات کا دے جواب

+ (۴۸۹) محمد نبی پر درود ھور سلام
جتیے ان کے اصحاب پر نت مدام

(۴۹۰) نہ ھے دل کوں راحت نہ خاطر کوں چین
کہا ھے یو قصہ مظفر حسین
ن قصہ یو کہا ھے مظفر حسین
ب نہ راحت ھے دل کوں نہیں جیو کوں چین

+ (۴۹۱) یو دنیا مدت تک چلی جاے گی
سفیدی پو سیاھی سو رہ جاے گی

اردو کے اُن پڑھ شاعر

از

جناب مرزا فدا علی صاحب 'خنجر' لکھنوی

— * * * —

ضامن

ضامن حسین خاں ولد حسین خاں - لکھنؤ میں پیدا ہوئے - اُن دنوں حسین خاں ریاست بلرام پور میں ملازم تھے - کبھی کبھی رخصت لے کر وطن آتے اور بال بچوں کو دیکھ کر ملازمت پر واپس جاتے - ضامن کا بچپن لکھنؤ میں بسر ہوا - ہنوز خورد سال ہی تھے کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور ان کے حقیقی ماموؤں نے جایداد کے واسطے لڑنا جھگڑنا شروع کیا انہیں خاندانی مناقشوں کی وجہ سے ضامن کی تربیت اور تحصیل علم کا زمانہ غفلت میں گزرنے لگا -

حسین خاں کی دو بیویاں تھیں - اُن کی زندگی میں تو جو کچھ بھی جلن یا ڈاہ ہو لیکن حسین خاں کی آنکھ بند ہوتے ہی آپس میں میل جول قائم ہو گیا اور سوتا پے کی کوئی خلش باقی نہ رہی، مگر گھر میں کوئی مرد نہ ہونے کی وجہ سے ضامن کی علمی تعلیم نہ ہو سکی - اگرچہ رسم و رواج کے موافق پڑھنے بٹھائے گئے، درسیات کی کتابیں بستے میں باندھ

کر مکتب گئے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا —

. . . .

کوئی نگراں حال موجود نہ تھا ، گھر سے مکتب جانے کا بہانہ کرکے جاتے اور جناب رشید مرحوم کی بقیہ واقع دال منڈی میں ہم عمر بچوں کے ساتھ طفلانہ اشغال چھلی چھلیا ، اونچا نیچا تیلا ، پیر جی کی گدھیا ، اندھا بھینسہ وغیرہ میں مبتلا ہو کر دن کاٹ دیتے - کتابوں کا بستہ کسی درخت کی جڑ میں رکھا رہتا ، شام کو جو وقت مکتبوں میں چھٹی کا ہوتا ہے ، بستہ بغل میں داب کر مکان واپس آتے - محبت والی ماں سمجھتی کہ بچہ پڑھ کر آیا ہے - مامتا کے جوش میں چٹ چٹ بلائیں لیتی ، گلے لگا کر بھولا بھولا مصلحت سے تمتما یا ہوا منھ چومتی ناشتہ لا کر سامنے رکھتی پلکھا جھل جھل کر کھلاتی اور پیاری پیاری صورت دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کرتی - اُس غریب کو خبر تک نہ ہوتی کہ صاحبزادے نے سارا دن کس مکتب میں گزارا اور کیا سبق حاصل کیا ؟

ماموؤں کی جانب سے عدالتا عدالتی کا سلسلہ جاری تھا - اول تو کچھ زیادہ پونجی نہ تھی اور جو کچھ تھی بھی وہ اس مثل کے مطابق ، " تو کو نہ موکو لے چولہے میں جھونکو " باہمی نزاع کی نذر ہو گئی قصہ مختصر یہ کہ شاعر ایسے ہی ایسے وجوہ سے بے علم رہ گئے - البتہ یہ فائدہ ضرور ہوا کہ جناب رشید مرحوم کے بیٹھکے میں شعر و شاعری کے جو چرچے ہوا کرتے تھے وہ وقتاً فوقتاً گوش گزار ہوتے اور ان کی ذوق آشنا طبیعت اثر پذیر ہوتی رہتی - رفتہ رفتہ کم سنی ہی کے عالم میں طبع موزوں نے مضامین کو نظم کے قالب میں ڈھالنا شروع کر دیا لیکن طفلانہ حجاب شاعری کے اظہار سے مانع رہا —

ان کے پڑوس میں ایک ضعیف العمر بیوہ رہتی تھیں جن کی نیک

طبیعتی، رحیم المزاجی اور سن و سال کے لحاظ سے جاننے والے " بی اماں " کے لقب سے یاد کرتے اور پکارتے - چونکہ یہ محترمہ ضامن کے پڑوس میں رہتی تھیں کھیلتے ہوے ضامن اُن کے یہاں بھی نکل جاتے اور بی اماں کی فطرت انسانی بھی سے محبت کرنے پر مجبور کرتی اور وہ اکثر بچے کی بھولی بھالی باتوں سے لطف اندوز ہواکرتیں -پڑوس کا رشتہ تھا آناجانا ہوا ہی کرتا تھا دونوں گھروں میں نہایت محبت و خلوص تھا - جس کا انجام یہ ہوا کہ اُنھوں نے ضامن کی والدہ سے کہہ سن کر ضامن کو اپنے نام کا کرالیا اور حقیقی اولاد کی طرح محبت و دل جوئی کرنے لگیں —

ضامن کی ددھیال میں سب سنی المذہب تھے لیکن ننھیال والے مشرب امامیہ کے پیرو تھے -بی اماں بھی شیعہ تھیں - اُن کی تربیت نے بچپن ہی سے ضامن کے خیالات مذہبی کو شیعیت کے رنگ میں رنگنا شروع کیا - جب دس بارہ برس کا سن ہوا تو محلے کے لڑکوں میں کھیلنے کودنے لگے - یہ بچے بھی اکثر اثنا عشریہ تھے اس خلا ملا اور میل جول نے ضامن کے خیالات کی کایا پلٹ دی اور وہ آبائی مذہب کی قیود سے آزاد ہو کر امامیہ طریقت میں داخل ہوگئے چنانچہ اب نہایت راسخ العقیدہ شیعہ ہیں —

جب ان کے بزرگوں کو پڑھنے کی طرف سے قطعی مایوسی ہو گئی تو صنعت و حرفت کی جانب توجہ پھیری - اس زمانے میں ایک شخص میر کاظم حسین زر دوزی کا کام کرتے تھے اور مشہور کاریگر تھے اُن کا کارخانہ کامیابی کے ساتھہ جاری تھا - آدمی بھی بھی خواہ اور نیک خو تھے - ضامن اُن کے سپرد کئے گئے - اُنھوں نے بھی کام سکھانے میں بخل نہ کیا - کچھہ مدت میں اُنھیں اِس کام میں خاصی مہارت ہوگئی اس درمیان میں شوق شاعری بھی بڑھتا رہا اور مخفی طریقے پر مشق

سخن جاری رہی اس مزاولت سے نسبتاً کلام میں پختگی بھی پیدا ہوگئی انہیں ایام میں سید ببن صاحب زرز دوز سے راہ و رسم دوستانہ بڑھی موصوف الذکر جناب رشید کے متصل مکان میں سکونت پذیر تھے - ضامن اکثر ان کے یہاں جایا کرتے اور غایت بے تکلفی کی وجہ سے اپنے تصنیف کئے ہوئے اشعار دل کش لحن اور دل نشین لب و لہجہ سے پڑھ پڑھ کے سنایا کرتے انہوں نے ان کا بڑھتا ہوا شوق دیکھ کر جناب رشید کی شاگردی کا مشورہ دیا اور ان کا عندیہ پاکر ایک روز جناب رشید کی خدمت میں حاضر کردیا —

رشید مرحوم کے صدہا شاگرد تھے - صبح سے شام تک شعر و سخن کا مشغلہ رہتا - ان کے ان پڑھ شاگردوں میں جناب شفیق لکھنؤی نے خاص شہرت و امتیاز حاصل کیا ہے - ضامن بھی رشید کے فیضان سخن سے محروم نہ رہے - درخواست پیش ہوتے ہی شفیق استاد نے پشت پر دست شفقت رکھہ دیا اور ضامن حلقہ تلامذہ میں شامل ہونے کا افتخار حاصل کرکے ان کی شاگردگی کا دم بھرنے لگے - اب کیا تھا ؟ شعر گوئی کا شوق دونا بلکہ چوگنا ہو گیا - مولوی گنج میں ماہانہ مشاعروں کی بنا ڈالی گئی اور مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں بزم سخن سرائی آراستہ ہونے لگی - از بسکہ ضامن میں اتنی استطاعت نہ تھی کہ ماہ بماہ حضرات شعراء کی خدمت گذاری کا بار اٹھا سکتے اور ان کے ہم مشقوں نے بھی ایک ذات واحد کا زیر بار ہونا گوارا نہ کیا اس لئے ایک بے قاعدہ انجمن ترتیب دی گئی جس کے معجز ، ذاکر ، مفید ، ظفر ، قادر ، بعید ، و غیرہم رکن قرار پائے اور چندے کی رقم سے جملہ سامان فراہم کرکے مشاعرے کئے جانے لگے اور یہ سلسلہ کئی سال تک قائم رہا —

ضامن خود بھی شعرا کو دعوت دے کر بلاتے اور اُن کے مشاعروں میں بھی نہایت ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوتے - برسوں یہ سلسلۂ آمد و رفت بر قرار رہا - تقریباً ۱۱ - ۱۲ برس ہوئے ایک نا خوشگوار واقعہ پیش انے کی وجہ سے مشاعروں کی شرکت یک قلم موقوف ہوگئی اور ضامن کی دنیائے شاعری میں انقلاب عظیم رو نما ہوا - واقعہ یہ ہے کہ جناب جاوید مرحوم جو اساتذۂ فن اور مشہور شاعر تھے ' ان کے کسی شاگرد نے کترۂ ابو تراب خاں میں صحبت مشاعرہ منعقد کی - شعراء کی خدمت میں اطلاعی کارڈ اور رقعے ارسال کئے گئے اور مشاعرے کو کامیاب بنانے کی سعی شروع ہوی - مصرعہ طرح یہ تھا - ع —

ہم پر آتے ہیں اپنی زلف بکھراتے ہوئے

شعراء نے محنت سے غزلیں تصنیف کیں - ضامن نے بھی اپنی استعداد اور مشق کے موافق غزل کہی اور مشاعرے میں شریک ہوئے - جب شمع سامنے آئی تو کلام پڑھ کر سنایا - اتفاق سے ایک شعر کا مضمون جناب جاوید کے کسی شعر سے لڑگیا تھا - جاوید مرحوم کے بعض پرجوش شاگردوں نے اس اتفاقیہ توارد کو سرقے سے تعبیر کرتے ہوئے سرگوشیاں شروع کیں - ضامن کو یہ امر شاق گذرا اور جوش غضب میں معرکۂ شعری آراستہ کرنے پر آمادہ ہوگئے لیکن چند صلح جو حضرات نے درمیان میں پڑ کر قضیہ رفع دفع کردیا لیکن ضامن دل برداشتہ ہو کر محفل سے اٹھ آئے -- ان کے ساتھ ان کے مخصوص احباب بھی چلے آئے صبح سے یہ خبر حلقۂ شعراء میں مشہور ہونا شروع ہوئی - شدہ شدہ جناب رشید تک پہنچی ' انہوں نے اپنے خاص ملازم عزت دلی کو بھیج کر ضامن کو طلب کیا - یہ فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہوئے - انہوں نے واقعہ دریافت کیا - انہوں نے جو کیفیت گذری تھی بلا کم و بیش بیان کردی - سن کر

فرمایا ۔ " شکر کرو کہ تمہارے شعر کا مضمون کسی اور سے نہیں بلکہ جاوید سے لڑا لیکن اس واقعہ سے لوگوں کو تمہاری افتادہ طبیعت کا اندازہ ہوگیا ۔ اب میری صلاح یہ ہے کہ آئندہ مشاعروں کی شرکت سے احتراز کرو ۔ جتنی غزل گوئی کرنا تھی کرچکے اب مرثیہ ۔ نوحہ ۔ سلام کہا کرو کہ عاقبت میں ثواب حاصل ہو ۔ فرمان بردار شاگرد نے سر تسلیم خم کر دیا اور استاد کے احکام کی حرف بحرف تعمیل کی ۔ اس دن سے مشاعروں کی شرکت موقوف اور غزل گوئی کا سلسلہ قطع ہو گیا ۔ نوحہ و سلام کی مشق جاری ہوئی چنانچہ اب تک وہی سلسلہ قائم ہے —

غزلیں کہتے ہیں لیکن کلام کا اکثر حصہ نعتیہ ہوتا ہے ۔ عرصے سے مشق سخن جاری ہونے کی وجہ سے نوحہ وسلام تصنیف کرنے کی خوب مہارت ہے شہر کی متعدد انجمنوں میں ان کا کلام ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے " انجمن آل عبا کے رکن اور انجمن اکبریہ گولہ گنج کے سکریٹری ہیں کلام سبکی ہوتا ہے ۔ چالیس پیالیس برس کی عمر ہے اکہرے بدن کے کشیدہ قامت آدمی ہیں ۔ اکثر چشمہ لگائے رہتے ہیں ۔ گیہواں رنگت اور طبرقی چہرہ ہے زمانہ حال کے موافق لباس پہنتے ہیں ۔ مزاج میں سادگی اور بے تکلفی کا عنصر زیادہ ہے مولوی گنج میں زردوزی کا کارخانہ ہے نوجی وردیوں پر کلابتو کے نمبر بناتے اور متوسط حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں ۔ نوحوں اور سلاموں کا کافی ذخیرہ جمع ہے ۔ اگر ترتیب دیا جاے تو دو بیاضیں تیار ہو سکتی ہیں ۔ آئمہ طاہرین علیہم السلام کی مدح میں چند قصائد بھی تصنیف کئے ہیں جو ان کی بے علمی پر نگاہ کرتے ہوئے بہت خوب ہیں ۔ غزلوں میں عبرت آموز اور حسرت زا مضامین نظم کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ تصوف کی طرف بھی طبیعت کا میلان ہے لیکن مزاج کا فطری

لگاؤ عاشقانہ مضامین کی جانب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس رنگ میں بہت صاف و بر جستہ شعر نکال لیتے ہیں زبان میں لوچ اور شیرینی ہے جسے اُستاد کا نیض کہنا چاہئے - بعض بحور کے نام اور اوزان یاد کر لئے ہیں ان کے ذریعہ سے وزن کرلیتے شعر دریافت ہیں- جب تک جناب رشید حیات رہے اُن کو غزلیں سنا سنا کر اصلاح لیا کئے - اُن کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی سید باقر صاحب حمید مغفور سے مشورۂ سخن کرنے لگے اور اب جناب حمید کے برادر زادے جناب افضل کو کلام دکھاتے ہیں - غزلیں جمع کرنے کا شوق بالکل نہیں - خود کہتے ہیں " اگر میں اپنی غزلیں جمع کرنا چاہتا تو اب تک ضخیم دیوان جمع ہو جاتا لیکن میں نے کبھی کلام عاشقانہ محفوظ کرنے کا خیال نہیں کیا - ضرورت کے وقت غزل کہی اور اس کے بعد ضایع کردی محلے کے لڑکے یا بے تکلف احباب اسرار کرتے ہیں تو دس بارہ شعر کہہ دیتا ہوں چنانچہ وہی کلام راقم الحروف کو اندراج تذکرہ کے واسطے عنایت کیا ہے ملاحظہ ہو —

نہ زائل دل سے عشق مصطفےٰ بعد فنا ہوگا
اندھیرے میں لحد کے' ماہ جلوہ یہ نما ہوگا

نبی حامی' علی ساقی' بہشت آراستا ہوگا
یہ ساماں عاشقوں کے واسطے روز جزا ہوگا

خدا شاہد' ازل کے دن سے اُس گل کا ہوں شیدائی
نہ جس کا کوئی ہمسر خلق میں اب دوسرا ہوگا

مسیحا سے نہ ہوگی چارہ سازی حشر میں کچھ بھی
کرم تیرا ہمارے درد عصیاں کی دوا ہوگا

کسی اہل وفانے ظلم سے کر اس لئے جاں دی
گنہ گاراں اُست کا اسی صورت بھلا ہوگا

جدا ں میں جاؤں گا اس طرح میدان قیامت سے
مرے ہاتھوں میں داماں علی مرتضی ہوگا

رقم جو کچھ ہے پیشانی میں وہ پیش آئے گا ضامن
غلط اک حرف بھی ہرگز نہ قسمت کا لکھا ہوگا

اسیر زلف ہوں صورت ذرا دکھا دینا پھر اختیار ہے ' جو چاہے وہ سزا دینا
یہ کہہ کے سوئے لحد میں ترے فراق نصیب
صدائے صور ! ہمیں حشر میں جگا دینا

سکھائی آپ کو کس نے جفا کی یہ رفتار
کہ ٹھوکروں سے نشان لحد مٹا دینا

جفا ' وفا کا طریقہ اسی سے ثابت ہے
تمھارا کو سنا مجکو ' سرا دعا دینا

عبث ہے عشق میں ضامن کو سوز غم کا گلہ
وہ شعلہ رو جو ہے عادت ہے دل جلا دینا

پردۂ چشم جو مسکن ترا ایجاں ہوتا شعلۂ حسن چراغ تہ داماں ہوتا
حشر میں عفو گنہ کی کوئی صورت ہی نہ تھی
مجکو ضامن جو نہ عشق شہ مرداں ہوتا

سوئے مژگاں دیکھ کر سمجھا یہ رخساروں کے پاس
پھول ہیں دو بوستان حسن میں خاروں کے پاس

چشم پر نم بال بکھرائے ہوئے ' چہرہ اوداس
یوں نہیں آتے ہوں میری جان بیماروں کے پاس

یوں چھپایا ہم نے اُس پردہ نشیں کا سوز عشق
کب جگر واقف ہوا سینے میں گو تھا دل کے پاس
حرت دو آخر میں ساکن ہوں کھلا ضامن یہ راز
فکر کے ناخن جو پہنچے عقدۂ مشکل کے پاس

گھائل ہوے ہیں یار کی بانکی ادا سے ہم
تیغ نگاہ ناز تریں کیا قضا سے ہم
کیوں ہم کو دل دیا، اُنہیں کہوں دلربا کہا
ترک ادب نہ ہوتا تو کہتے خدا سے ہم
بستر لگا کے خوش نہ ہوں، کہوں کوئے یار میں
منزل پر آج پہنچے ہیں فضل خدا سے ہم
ضامن یہی وسیلۂ بخشش ہے روز حشر
لپٹے رہیں کے دامن خیرالورا سے ہم

میں اپنا دل ناتواں بیچتا ہوں
خریدو تو جان جہاں بیچتا ہوں
حسیں مول لے کر جو صدقہ اُتاریں
ابھی طائر دل میں ہاں بیچتا ہوں
یہ ہے نقد جاں کا مری جان سودا
میں بے سمجھے بوجھے کہاں بیچتا ہوں

تمنائیں ہیں ساتھہ اے یوسف دل
نہ گھبرا سچ کار رواں بیچتا ہوں

خوشی جو اُس بت کی ہو مجھہ سے خواہاں
سخن بیچتا ہوں، زباں بیچتا ہوں

ہے ضامن عجب چیز سچی محبت
نہیں میں یہ جنس گراں بیچتا ہوں

ترس کھاتے نہیں عاشق پہ جتنے حسن والے ہیں
وہ باطن میں ستمگر ہیں جو ظاہر بھولے بھالے ہیں

جو آہیں بے اثر میری ہیں، بے تاثیر نالے ہیں
بتائیں آپ پھر ہاتھوں سے کیوں دل کو سنبھالے ہیں

نہ آتا ہو یقیں تم کو اگر اے جاں قسم لے لو
تمہیں پر جاں دیتے ہیں تمہیں پر مرنے والے ہیں

ضیا اس درجہ بخشی ہے کسی کے سوز الفت نے
ستاروں سے سوا روشن ہمارے دل کے چھالے ہیں

ہر اک جا پردہ ظاہر ہے، نظر سے ہوکے پوشیدہ
کرشمے یار کی قدرت کے اے ضامن نرالے ہیں

یہ سرائے دھر ہے غافلو! کسی کو بھی جائے اماں نہیں
کوئی آج جاتا ہے کل کوی، کوئی رہنے والا یہاں نہیں

نہ سکندر اب ہے کہیں نہ جم، ملا خاک میں نہ رہا حشم
فقط اب ہے نام جہاں میں، کسی جا پہ اُن کا نشاں نہیں

تجھے ضامن اوروں سے کام کیا ، جو خدا سے مانگے وہ پائے گا
اُسے ذرہ ذرہ کی ہے خبر ، کوی راز اُس سے نہاں نہیں

ترے صدقہ جلوہ دکھا دینے والے
مری بگڑی قسمت بنا دینے والے

تمنا ہے ، ہو غش پہ غش یو نہیں طاری
او دامن سے مجھکو ہوا دینے والے

کہاں ایسی قسمت ،کبھی سن کے نالے
کدھر ہے ، ادھر آ صدا دینے والے

مریض محبت کی اپنی خبر لے
ارے درد دل کی دوا دینے والے

خدا جانے کیا ہو اگر تم کہے تو
اشارے سے مردے جلا دینے والے

ملیں گے تجھے جام کوثر کے ضامن
وہاں ہوں گے مشکل کشا دینے والے

اُنہیں ضد ہے کہ ہلکے رنگ کی کلیاں ہوں کنگن کی
تقاضا کمسنی کا ہے ابھی باتیں ہیں بچپن کی

تصور میں ہمیشہ سامنے رہتا تھا جو اے دل
قیامت ہے وہ بیٹھے آڑ میں اب آکے چلمن کی

کیا برباد بعد مرگ مجکو، ضد کوی دیکھے
اڑائی ٹھوکروں سے خاک آکر میرے مدفن کی

مجکو عادت نہیں پر بزم میں تیری ساقی تھوڑی پی لیتا ہوں جس وقت گھٹا ہوتی ہے
ہاتھ میں کیوں نہ ملے خون ہمارا قاتل تجھ میں ہوخی یہ کہاں رنگ حنا ہوتی ہے
دم میں ہشیار کو دیوانہ بنا دیتی ہے نگہ مست عجب ہوشربا ہوتی ہے
صدمۂ ہجر سے ضامن نہ ہو کیوں دل نالاں
ٹھیس جب شیشے سوں لگتی ہے صدا ہوتی ہے

برائے نمونہ ایک سلام بھی لکھا جاتا ہے ملاحظہ ہو —

سلام

ایسا تھا شوق وفا شہ کے عزاداروں کو صبح سے کھینچ لیا میاں سے تلواروں کو
رفقا شاہ کے باندھے تھے کمر مرنے پر صبح کب ہوتی ہے دیکھا کئے سیاروں کو
کہتے تھے عون ومحمد کہ نہ ہو کاٹ میں فرق دیکھ لو انگلیوں پر نیمچوں کے دھاروں کو
گل زہرا جو رواں دشت میں تھا برہنہ پا سوکھ کے کانٹا ہوئے غم یہ ہوا خاروں کو
اب مشرف کرے ضامن کو زیارت سے خدا
حج کا ملتا ہے شرف شاہ کے زواروں کو

طالب

اس کا نام شیخ سبحان علی تھا - سنی المذہب اور طریقہ حنفیہ کے پیرو تھے - بد نصیبی سے بالکل بے علم رہے - اگرچہ اپنی بے علمی کا کمال افسوس تھا مگر لکھنے پڑھنے کی جانب کبھی توجہ نہ ہوئی ! روز مرہ کے مصارف لکھنے کے بڑے شائق تھے - محض اس شوق کی تکمیل کے لئے ہر وقت پنسل اور نوٹ بک جیب میں رہتی - حساب لکھنے کا طریقہ بھی انوکھا تھا -

روپیہ کے لئے گول دائرہ (ہ) اس شکل کا بناتے ۔ 'آنہ' کے واسطے (+) یہ نشان تجویز کیا تھا اور پیسہ کے لئے اس صورت کی (—) پڑی لکیر اختیار کی تھی ۔ اسی عنوان سے بہی کھاتہ تیار کرلیا تھا اور حساب میں کبھی غلطی نہ کرتے ۔ شاید مبداء فیاض نے ریاضی داں قلب و دماغ عنایت کیا تھا ۔ مُشکل مُشکل ریاضی کے سوال اُنگلیوں کی پوروں پر شمار کرکے حل کردیتے شاعری کا بھی شوق تھا ۔ عاشقانہ غزلیں تصنیف کرتے تھے ۔ لیکن وارستہ مزاجی نے تدوین کلام کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا ۔ اشعار نظم کئے ، احباب کو سنائے ، اُن کو خوش کیا ، آپ مسرور ہوئے اور بس ! اگر کسی نے کوئی شعر نوٹ کر لیا توخیر ورنہ چند روز بعد حافظہ کا ورق سادہ اور کلام فنا ہو گیا ۔ یہی سبب ہے کہ آج دنیائے سخن میں طالب کی غزلیں عنقا کا حکم رکھتی ہیں ۔ ایک مشفق (شفیع صاحب) نے ان سے چند اشعار لکھوا دئے تھے جو ترتیب تذکرہ کے وقت کام آئے —

طالب کا وطن شاید بنارس یا مضافات بنارس ہے ۔ مختلف مقامات کا دورہ کرکے بنارسی اشیا کی تجارت ذریعۂ معاش تھی ۔ مغلوب الغضب اور محرورالمزاج آدمی تھے ۔ ذرا ذرا میں خفا ہونا ، روٹھ جانا جزو عادت تھا ۔ اپنے اشعار گا ، گا کر پڑھتے ۔ کبھی کبھی چشم و آبرو کی گردش اور ہاتھوں کی حرکت سے کام لے کر مفہوم شعر ذہن نشین کرنے کی سعی کرتے ۔ تلمذ کا حال دریافت نہ ہوسکا ۔ کلام یہ ہے —

لعد مٹے تو مٹے ، اس کا غم نہیں طالب کہ ہم تو یار کا زور شباب دیکھتے ہیں

چین لیتا نہیں پہلو میں یہ بجلی کی طرح   وہ چلے آئیں تو اس دل کو قرار آ جائے
باتیں اغیار کی سننا نہ سریجان ' دل سے   کہیں ایسا نہ ہو شیشہ پہ غبار آ جائے
باغ سے نکلے ہو ' پھولوں کی بنا کر ڈالی   اور رستے میں جو طالب کا مزار آ جائے

اف ! ان کے شباب کا عالم   ہر ادا قہر ہے ' قیامت ہے
سیکڑوں فکریں ' سیکڑوں آلام   زندگانی بڑی مصیبت ہے
آ چکا ہے قریب وقت سفر   بس! گھڑی دو گھڑی کی زحمت ہے

پھر کہاں طالب شکستہ جگر
اس کا جو دم ہے وہ غنیمت ہے

ظہیر

حافظ مولا بخش نام اور ظہیر تخلص تھا - قریب کور مادر زاد تھے - اندھے پن کی بدولت اکتساب علوم سے محروم رہے لیکن کلام پاک حفظ کرکے حافظ بن گئے تھے - میرٹھ ان کا سواد و مسکن ہے - عنفوان شباب سے شعر سخن کا شوق پیدا ہوا اور بطور خود کچھ کچھ نظم کرنے لگے - اُن دنوں دہلی کی سمت سے آنے والی ہواؤں نے اہل میرٹھ کو شاعری کے رنگ میں رنگ دیا تھا - ہفتہ وار اور ماہوار مشاعرے منعقد ہوا کرتے اور مقامی شعرا کامل انہماک کے ساتھ داد سخن دینے میں مصروف رہتے دہلی سے کچھ زیادہ فاصلہ بھی نہ تھا - وہاں کے خوش گو شعرا کو بھی دعوت شعر و سخن دی جاتی اور وہ بڑے ذوق و شوق سے شریک مشاعرہ ہو کر خوش کلامی و شیریں مقالی سے بیز بانوں کی ضیافت طبع کرتے -

یہی زمانہ ظہیر کی ابتدائی شاعری کا ہے - بعض مولویوں کے خیال سے اصلاح کلام امداد حسین ظہور کے سپرد کی - اُنہوں نے اس ادبی خدمت کو قبول کرتے ہوئے اپنے تخلص (ظہور) کی رعایت سے ظہیر تخلص تجویز کیا اور غزلوں پر اصلاح دینے لگے -

ظہیر گاہ بگاہ مقامی مشاعروں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے - نام ونمود اور شہرت کی مطلق طالب نہ تھی - گمنامی کی حالت میں زندگی گذار دی - ترتیب تذکرۂ سخن الشعرا کے وقت حیات تھے مولوی عبدالغفور خاں نساخ نے ان کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے - نمونہ کلام حاضر ہے —

کیا گلہ چرخ سفلہ پرور کا بخت واژوں ہے اہل جوہر کا
در دنداں کی آب کے آگے شرم سے زرد منھ ہے گوہر کا
مجکو دفنا کے قبر میں احباب ساتھ چھوڑیں کے زندگی بھر کا
کیا گزرتی ہے جان پر' دیکھوں سامنا ہے پھر اک ستمگر کا

دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں ظہیر
لطف ' معبود بندہ پرور کا

عابد

اس شاعر اُمی کا نام عابد حسین اور عابد تخلص تھا - لکھنؤ جائے ولادت و قیام ہے - فن سخن میں سید عباس حسین فصاحت سے استفادہ کرتے تھے - افلاس و تنگ دستی جو شاعروں کی میراث ہے نسبتاً اِن کے حصہ میں زیادہ آگئی تھی ابتدا سے انتہا تک فلاکت و نکہبت نے ساتھ نہ چھوڑا - انجام کار قبر میں جا سلایا —

اس غریب شاعر کا ذریعۂ معاش دست کاری تھا - تمام دن کلّی (کرنی) بسولی بناتے اور پھر نخاس میں لاکر دو تین آنے کو فروخت کرتے - لاگت ملنہا کرکے چار چھ پیسے بچتے جس میں بمشکل بسر کرتے اور اِسی گاڑھی کمائی میں سے پیسہ دھیلا پس انداز کرتے جاتے - جب کچھ جمع ہو جاتا تو مشاعرہ منعقد کرکے شعرا کی دعوت کردیتے —

مجھ سے جناب محشر فرماتے تھے کہ عابد کو شاعری سے بے حد اُنس تھا - خود فاقے کرنا اور پیٹ کاٹنا گوارا تھا لیکن مقدور بھر مشاعرہ ناغہ نہ ہونے پاتا - غربت و پریشانی کا حال تو بیان ہی ہوچکا ہے' اس حالت میں شاعروں کی خاطر و تواضع معلوم' اور مشاعروں کے انعقاد و انصرام میں خاطر خواہ صرف کرنے کی ضرورت! لیکن عابد کی حالت چھپی ہوئی نہ تھی - شعرائے لکھنؤ اُن کی مفلسی اور ذوق و شوق سے بخوبی واقف تھے - یہ ہی سبب ہے کہ عابد کی دعوت مشاعرہ کبھی رد نہ ہوتی - تمام شاعر خوشی خوشی آتے اور بزم سخن میں شریک ہوکر نادار شاعر کی عزت افزائی کرتے —

مشاعرے کا انتظام بھی عجیب تھا! کسی نہ کسی ذی استطاعت کی طرف سے فرش کا اہتمام ہو جاتا - اگر روپیہ پیسہ ہوا تو خود عابد مرحوم کرائے کی دری چاندنی لاکر بچھا دیتے - روشنی کے لئے مٹی کے چراغ کام آتے اور شعرائے نازک خیال و شیریں مقال ٹیمیوں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں غزلیں پڑھ پڑھ کر بزم مشاعرہ کو رشک گلزار بنا دیتے - اُن کے دل نشین نغموں پر ترانۂ بلبل کا دھوکا ہوتا! ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ شرکائے بزم کسی امر میں تکلف نہ فرماتے حقہ نہیں آیا تو شکایت نہیں' پانوں میں کمی ہوی تو ہو - حقیقت یہ ہے کہ خلوص سے ملنے والی پان کی ایک گلوری کو ع —

برگ سبز است تحفۂ درویش

کا مصداق تصور فرماتے تھے - اللہ اللہ ! یہ شوق تھا اور یہ لوگ جنھوں نے عالم عسرت کی منتہا میں رہ کر اپنی شاعری کی خدمات سے غفلت نہیں کی - جب تک زندہ رہے ترقی زبان کے کوشاں رہے - اب نہ وہ لوگ ہیں نہ وہ زمانہ - مجلس احباب میں ذکر ہی ذکر باقی ہے - عرصہ ہوا کہ عابد مرحوم نے اپنے مکان مسکونہ واقع مولوی گنج میں وفات پائی اور پس ماندوں میں اپنا ذکر خیر چھوڑ گئے —

ان کا کلام تلف ہوگیا - لاکھ تلاش کی سراغ نہ ملا - منتہائے کوشش سے جو چند اشعار دستیاب ہوے یادگار کی طور پر درج تذکرہ کئے جاتے ہیں —

ہجر کی رات ' کوی رہ رہ کر دونوں ہاتھوں سے دل مسلتا ہے
اپنے بیمار کی خبر لینا اب کوی دم میں دم نکلتا ہے
دل بے تاب کا خدا حافظ ناوک چشم یار چلتا ہے
شانہ کش لاکھ ہو دل صد چاک کہیں زلفوں کا خم نکلتا ہے
پیچ در پیچ ہے وہ کاکل اس کا بھٹکا بھی کم نکلتا ہے
پھروں قابو میں دل نہیں آتا یوں سنبھلتا ہے ' جب سنبھلتا ہے

ماہتابی پہ ہے وہ رشک قمر شرم سے چاند چھپتا پڑتا ہے
زلف پر خم کی یاد میں شب بھر آپ سے آپ دم الجھتا ہے

غریب

غریب داس نام غریب تخلص - یہ شاعر بھی ہندوستان کا مایۂ ناز اور کبیر داس سے دوسرے درجہ پر ہے - اس کی ولادت سنہ ۱۷۱۷ ع میں

چوڑانی نام ایک گاؤں میں ہوئی جو نواح دہلی میں واقع ہے - قوم کا جاٹ تھا - باپ کا نام بلرام ہے - اس کی نسبت اہل ہنود کا خیال ہے کہ کبیر داس نے دوسری دفعہ اس کے کالبد میں جنم لیا ہے اور تصدیق میں ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کرتے ہیں جو اُن کی خوش اعتقادی اور ارادت مندی کی روشن دلیل ہے —

غریب داس کو خزانۂ قدرت سے جو دل و دماغ عطا ہوا تھا ' اُس کی بدولت نہایت معزز و ممتاز تسلیم کیا گیا ' خصوصاً پنجاب میں تو پوجا جاتا ہے۔ اِس کی بانیوں اور دوھوں کی اُتنی ہی قدر و منزلت کی جاتی ہے جتنی گرو نانک جی کی کتاب کی —

گھر والے بچپن میں اُسے پیار سے غریبا کہا کرتے تھے - یہ نام اس درجہ مشہور ہوا کہ سارا گاؤں اسی لقب سے یاد کرنے لگا - اِس کی نسبت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ گاؤں کے چرواھوں کے ساتھ جنگل میں گیا ' چونکہ کبیر داس کے ارادت مندوں میں تھا اِس لئے اکثر اُن کا دھیان گیان کیا کرتا - اُس روز بھی وہ کبیر داس کے تصور میں غرق تھا - استغراق نے محویت کا درجہ حاصل کیا تھا - دفعتاً کبیر داس ظاہر ہوے - اُن کے جلوۂ ہوش ربا کے نظارے سے غریب داس پر بے خودی کی سی کیفیت طاری ہوئی اور اُسی خود رفتگی کے عالم میں اُس نے ادب و آداب سے گذارش کرتے ہوے ضیافت قبول کرنے کی استدعا پیش کی - چونکہ کبیر داس قیود جسم سے آزاد ہوکر ملائے اعلیٰ کے ساکن ہو چکے تھے اور وابستگان حیات و پیکر کی طرح خواہشات کے پتلے نہ تھے جنھیں کھانے پینے ' پہننے اوڑھنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے اس لئے اُنھوں نے انکار کیا لیکن غریب داس کا اصرار حد سے گذر گیا اور اِنھیں اُس کی تسلی کے واسطے کہنا پڑا کہ "بچھڑے کا دودھ پیونگا" جواب سنتے ہی غریب داس

بہت سے بچھڑے پکڑ لایا اور عرض کی جس بچھڑے کو آپ پسند کریں اُس کا دودھ دوھدوں ؟ کبیر داس نے ایک بچھڑے پر ھاتھہ رکھہ دیا جو غریب داس کی ملک تھا اِس ھاتھہ کی برکت سے بچھڑے کے تھنوں میں دودھ اُتر آیا اور غریب داس نے ایک ظرف میں تھوڑا دودھ دوہ کر کبیرداس کے سامنے پیش کیا - انھوں نے برائے نام وہ ظرف لبوں سے لگاکر واپس کرتے ہوئے غریب داس کو وہ جھوٹا دودھ پی جانے کا حکم دیا - اِس حکم کی تعمیل تو فوراً ہوئی لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ غریب داس غش کھاکر زمین پر گر پڑا اور کبیر داس غائب ہو گئے - ساتھیوں نے غریب داس کی یہ حالت دیکھہ کر ہو شیار کرنا چاہا - جب کسی طرح ہوش نہ آیا تو بہت گھبراے اور اُس کے مکان جا کر اُس کے مرنے کی اطلاع کی ! اس حادثہ جاں فرسا کو سن کر اُس کے گھر والے بیتاب ہو گئے - مضطرب و سرا سیمہ جنگل میں آے اور غریب داس کی حالت دیکھہ کر اُس کی موت کا یقین کر لیا - آن واحد میں یہ خبر عام ہوگئی - اہل برادری جمع ہوے - آرتھی تیار کی گئی - جملہ رسوم ادا ہوے میت اُٹھا کر مسان لائی گئی - چتا تیار ہوئی ' آرتھی چتا پر رکھہ کر آگ دینے کی تیاری ہوئی - ہنوز آگ نہیں دی گئی تھی کہ آپ سے آپ ارتھی کی تمام بندشیں ٹوٹ گئیں اور غریب داس " ست کبیر " اور " بندی چھوڑ ' کے نعرے لگاتا ہوا اُٹھہ بیٹھا —

یہ شاعر بھی علم سے نا آشنا تھا - لیکن ذہن رسا اور فکر بلند کی مدد سے ایسے ایسے نادر مضامین نظم کئے ہیں جو آسمان سخن پر آفتاب کی طرح روشن وضوفشاں ہیں کلام شایع ہو چکا ہے - اِس کی تصنیف کی ہوئی بانیاں چوبیس ہزار سے بھی متجاوز ہیں - اس نے سنہ ۱۷۸۲ ع میں وفات پائی - کلام کا نمونہ یہ ہے جو کبیر داس کی مدح میں کہا ہے —

پانی سے پیدا نہیں ' شواسا نہیں سریر
پانچ تتب جا کے نہیں تا کا نام کبیر
آننت کوٹ برھما نڈ میں ' بندی چھوڑ کہائیے
سو تو پورکھہ کبیر ہیں جننی جنا نہ مائیے

گگن منڈل سے اُترے، ست گرو پورکھہ کبیر
جل ماں ھی پوڑھن کئے ' سب پیرن کے پیر



اساتذہ کی اصلاحیں

از

(حضرت صفدر مرزا پوری مرحوم)

تتمۂ اصلاح حضرت وسیم

محمد یوسف نفیس بنگلوری۔ - قدم فلک ہی پہ پڑتا ہے اہل الفت کا
دیار عشق میں کوسوں زمیں نہیں ملتی

آقائے سخن نے اس شعر پر یہ نوٹ تحریر فرمایا جلیل القدر نے "پہ" کو ترک نہیں فرمایا۔ میں نے ترک کر دیا ہے۔ آپ اپنے اُستاد کے پیرو رہئے اور مصرع نہ بدلئے۔ میں بطور خود یہ مصرع لکھتا ہوں — ع

قدم فلک ہی پر اہل طلب کے پڑتے ہیں

یہ مصرع رکھئیے گا تو ہماری طرف سے دو صاد "وسیم"

جناب نفیس کے مصرع میں "پہ پڑتا" کانوں کو ناگوار ہے کیوں کہ دو (پ) کا یکجا ہونا مخل فصاحت ہے—

حضرت وسیم کے مصرع نے اس عیب کو بھی رفع کر دیا۔ گو میں بھی حضرت جلیل کا مقلد ہوں مگر اس موقع پر "پہ" ضرور مخل فصاحت ہے—

نفیس :- تری گلی میں لگے ہیں یہ ڈھیر کشتوں کے
میری لاش کو بھی دو گز زمیں نہیں ملتی

اصلاح :- تری گلی میں لگے ہیں یہ ڈھیر کشتوں کے
کہ میری قبر کو دو گز زمیں نہیں ملتی

" بھی " بھی زائد تھا اس مصرعۂ ثانی میں " کہ میری قبر کو " بنایا گیا —

نفیس :- یہ میں نے خاک اُڑائی ہے جوش وحشت میں
اب آسمان کے نیچے زمیں نہیں ملتی

نسخہ :- یہ وحشیوں نے اُڑائی ہے خاک مل جل کر
اب آسمان کے نیچے زمیں نہیں ملتی

اس پر آثیم خلف حضرت وسیم نے یہ نوٹ تحریر فرما " بھائی صاحب میرے خیال میں مل جل کا لفظ نگینہ ہے شعر بلیغ ہو گیا - صرف اس ٹکڑے کی وجہ سے اس مصرع کے ساتھ یقیناً یہ شعر صاد کے قابل ہے گو قبلہ و کعبہ نے نسخے کے طور پر لکھہ دیا ہے " آثیم "

نفیس :- یہ مانگ ارض حرم میں شرب ذنب کی ہے
کہ ڈھونڈھتے ہیں دوا کو کہیں نہیں ملتی

اصلاح :- یہ ڈر سے زاہدوں کے ہے شراب کا توڑا
کہ ڈھونڈھتے ہیں دوا کو کہیں نہیں ملتی

یہ نوٹ تحریر فرمایا کہ " ارض حرم کو پاک رہنے دیجئے " —

نفیس :- یہ حسن و عشق کی خلوت کا اک کرشمہ ہے
جو دامن اُن کا میری آستیں نہیں ملتی

اصلاح :- شب وصال کا اُن کی یہ اک کرشمہ ہے
جو دامن اُن کا میری آستیں نہیں ملتی

یہ نوٹ تحریر فرمایا - حسن و عشق صاف معنی نہیں دیتا تھا الجھاؤ تھا —

نفیس :- جہاں آنسو گرا اک چشمۂ زمزم وہاں اُبلا
پڑی بنیاد کعبہ کی جہاں میں نے جبیں رکھ دی

اصلاح :- جہاں آنسو گرے اک چشمۂ زمزم وہاں اُبلا
پڑی بنیاد کعبہ کی جہاں میں نے جبیں رکھدی

" گرا " اور " گرے " میں جو فرق ہے ظاہر ہے " گرا " بحالت واحد اور " گرے " بحالت " جمع "

نفیس :- مرے دل میں جمایا نقشہ اس نے بت پرستی کا
مصور کھینچ کر تونے جو تصویر حسیں رکھدی

اصلاح :- مرے دل میں جمایا نقشہ اپنے حسن کا اُس نے
مصور کھینچ کر تونے جو تصویر حسیں رکھدی

" اُس نے بت پرستی کا " بجائے اس کے " اپنے حسن کا اُس نے " بنایا - " بت پرستی کا " یہ ٹکڑا بے کار سمجھا گیا - کیوں کہ بت پرستی کو تصویر سے کیا تعلق حسن سے البتہ لگاؤ ہے —

نفیس :- یہ بت منہ سے نہ بولیں اور میں سجدے کروں اِن کو
وہ خوبی کون سی اِن میں ہے صورت آفریں رکھدی

اصلاح :- یہ بت منہ سے نہ بولیں اور میں سجدے کروں اِن کو
وہ خوبی کون سی اِن میں الہٰ العالمین رکھدی

مصرعۂ ثانی میں " ہے " زائد تھا اس لئے بجائے " صورت آفریں " کے " الہٰ العالمین " بنا دیا مگر ہیچمدان مؤلف کی رائے میں مصرعۂ ثانی سے " صورت آفریں " کا ٹکڑا نکالنا نہ چاہئے - مصرع یوں بڑی سہل تھا - اس سے بہتر تو یہی تھا - ع - عجب خوبی یہ اِن میں تونے صورت آفریں رکھدی - اب پہلے

مصرع کو ملاکر پڑھئے —

یہ بت منہ سے نہ بولیں اور میں سجدے کروں اِن کو
✓ عجب خوبی یہ اِن میں تو نے صورت آفریں رکھدی

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصرع اسی مصرع کا محتاج تھا —

نفیس :- جلے کا مجھہ پہ کیا جادو زمانے کی دورنگی کا
نظر میں میں نے رکھا ہے تمہاری چشم پرفن کو

اصلاح :- جلے کا مجھہ پہ کیا جادو زمانے کی دورنگی کا
کہ برسوں میں نے دیکھا ہے کسی کی چشم پرفن کو

اصلاح دیکر یہ نوٹ حضرت وسیم نے تحریر فرمایا - نظر میں رکھنا " تکلف سے خالی نہ تھا - اس لئے تصرف کرنا پڑا " سبحان اللہ کیا اُستادانہ اصلاح دی ہے—

نفیس :- ستم ہے پھوٹ پڑی ہے یہ کیسی آپس میں
نگاہ لطف سے چین جبیں نہیں ملتی

اصلاح :- ادا کی تیغ سے شمشیر کیں نہیں ملتی
✓ نگاہ لطف سے چین جبیں نہیں ملتی

پہلے شعر تھا - اصلاح سے یہ شعر مطلع ہو گیا اور مصرعے برابر کے کس قدر لطف دے رہے ہیں —

نفیس :- آنے کا جوش پر جو مرا بحر انفعال
بہتی پھریں گی حشر میں فردیں حساب کی

اصلاح : دریا ترے کرم کا جو آنے کا جوش پر
بہتی پھریں گی حشر میں فردیں حساب کی

بحر انفعال مہمل سا ٹکڑا تھا - عرق انفعال - اشک انفعال - تو ہے مگر

بحر الفعال نہیں اِس پر اُستاد نے کتنا چبھتا ہوا مصرع لگا دیا ہے کہ جس کی جس قدر داد دی جائے کم ہے - اے سبحان اللہ "دریا ترے کرم کا جو آئے گا جوش پر" مصرعۂ ثانی گویا اِسی مصرع کا محتاج تھا —

نفیس :— مستانہ وار آتے ہیں وہ جھومتے ہوئے
مستی شراب کی ہے کہ مستی شباب کی

اصلاح :— مستوں کی طرح آتے ہیں وہ جھومتے ہوئے
مستی شراب کی ہے کہ مستی شباب کی

" مستانہ اور پھر رار کو کہا گیا ہے مگر احتیاط اولیٰ ہے یہ نوٹ جناب وسیم نے لکھہ کر بجائے "مستانہ وار" "مستوں کی طرح" بنایا گو مستانہ وار بھی صحیح ہے مگر اس اصلاح سے شعر اور صاف ہوگیا —

اسی غزل کا ایک مطلع ہم ناظرین مشاطۂ سخن کی ضیافت طبع کے لئے پیش کرتے ہیں جو لسان الملک حضرت ریاض کے رنگ میں ہے - سنئے

ارض حرم میں سنتے ہیں قلت ہے آب کی
ساقی وہاں بھی نہر بہا دے شراب کی

نفیس :— ہزاروں تیغ ہیں چیں جبیں کے قبضے میں
چھری نہیں ہے کہ شمشیر آب دار نہیں

اصلاح :— ہزاروں تیغیں ہیں چین جبیں کے قبضے میں
چھری نہیں ہے کہ شمشیر آب دار نہیں

بجائے تیغ " کے تیغیں " بنا دیا - نفیس نے ہزاروں کے بعد " تیغ " کو واحد کہا تھا اُستاد نے جمع کردیا —

نفیس :— اُڑائی موسم گل کی غلط خبر کس نے
مرا لباس سلامت ہے تار تار نہیں

نفیس :- نہیں ہیں پھول مری قبر پر یہ ساغر ہیں
خم شراب ہے ' ساقی مرا مزار نہیں

ان دونوں شعروں پر حضرت وسیم نے اگرچہ کوئی اصلاح نہیں فرمائی مگر جناب حکیم اثیم خاں جناب وسیم نے اِن الفاظ میں داد دی - " پر کیف لطیف تشبیہوں میں شعر پورا اُتر گیا جواب نہیں ہو سکتا - ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ " (اثیم)

(مرسلہ حضرت نفیس بنگلوری)

خواجہ عبدالروف عشرت لکھنوی

نواب محمد داور خاں قلندر نواب آت کرنول ;—

نہ ناز چاہئے قاروں کی طرح سے زر پر
کہ بعد بوجھ اُٹھانا پڑے وہی سر پر

اصلاح :- لگا نہ جان کو قاروں کی طرح تو زر پر
یہ بوجھ تجکو اُٹھانا ہے ایک دن سر پر

خواجہ صاحب نے " جان " کے ایک لفظ سے مطلع میں جان ڈال دی اور دوسرے مصرع سے تو فصاحت کے دریا بہا دئیے - اور لطف یہ کہ مفہوم وہی رہا —

قلندر :- لکھا جو نامہ میں احوال درد فرقت کا
تو راستے ہی میں بجلی گری کبوتر پر

اصلاح :- لکھا جو نامہ میں احوال بے قراری کا
تو راستے ہی میں بجلی گری کبوتر پر

بجلی کی مناسبت سے " بے قراری " کا لفظ بنایا گیا جس سے شعر میں ایک خوبی پیدا ہو گئی —

قلندر:- جو شوق قتل کا قاتل نے مجھہ میں دیکھہ لیا
کہا پکار کے رکھہ دو گلے کو خنجر پر

اصلاح :- یہہ شوق قتل ہے قاتل کو میں نے جب دیکھا
وہیں پکاریں کہ رکھہ دو گلے کو خنجر پر

جناب قلندر کا شعر مذاق شاعری سے گرا ہوا تھا یعنی معشوق کا یہہ کہنا کہ تم خنجر پر گلا رکھدو اس سے عاشق کے شوق قتل کا ارمان ثابت نہیں ہوتا اصلاح سے یہہ عیب رفع ہو گیا - اور شعر مزے کا ہو گیا - نازک اصلاح دی

قلندر :- ہم نشیں رفتہ رفتہ دور ہوئے
ہو گئی ساری انجمن خالی

اصلاح :- ہم نشیں رفتہ رفتہ اُٹھہ گئے سب
رہ گئی آہ انجمن خالی

" دور ہوئے " یہہ ٹکڑا سہمل تھا بجائے اُس کے " اُٹھہ گئے سب " کیا خوب بنا یا جس سے شعر میں ترقی کے علاوہ معنوی خوبیاں بھی پڑہ گئیں - دوسرے مصرع میں " رہ گئی آہ " یہہ ٹکڑا قابل داد ہے -

پھر شیر محمد عاجز فیروز آبادی :-

میرے آزار کو نہیں سمجھا کرتا تشخیص ہے طبیب غلط

اصلاح :- میرے آزار کو نہ سمجھا تو تیری تشخیص ہے طبیب غلط

نہیں کا لفظ ماضی کے ساتھہ نہیں بولتے - اس لئے اُستاد نے " نہ سمجھا تو " بنا کر اس نقص کو دور کردیا - دوسرے مصرع میں تعقید لفظی تھی - اس لئے اُسے بھی بدل دیا - اِس اصلاح سے شعر میں بہت سی خوبیاں پیدا ہوگئیں - اور جو عیوب تھے رفع ہو گئے —

عاجز :- قامت ہے کہ شمشاد ہے غارت گر دیں کا
پھولوں سے رنگ میں عارض ہے حسیں کا

اصلاح :- قامت ہے کہ شمشاد ہے غارت گر دیں کا
گلدستہ ہے پھولوں کا کہ عارض ہے حسیں کا

عارض کو پھولوں کا گلدستہ بنا کر مطلع کو رنگیں بنا دیا —

عاجز :- دنیا جسے کہتے ہیں وہ ہے خواب کا عالم
دو روز میں ہو جاتا ہے گم نام مکیں کا

اصلاح :- دنیا جسے کہتے ہیں وہ ہے خواب کا عالم
اٹھوارے میں ہو جاتا ہے گم نام مکیں کا

اٹھوارے کے لفظ نے معنی میں ترقی پیدا کردی - مطلب یہہ ہے کہ انسان آٹھ دن میں مر جاتا ہے

عاجز :- غیر حالت رات سے ہے عاشق دلگیر کی
انتہا اب ہو چکی ہے گردش تقدیر کی

اصلاح :- غیر حالت رات سے ہے عاشق دلگیر کی
منہہ چھپایا تمنے یہہ بھی بات ہے تقدیر کی

اصل مطلع میں باہم دونوں مصرعوں میں ربط نہ تھا - اس اصلاح نے مطلع میں چار چاند لگا دئیے -

عاجز :- قسمت نے شہر شہر کیا در بدر مجھے
آرام کا ملا نہ کہیں ایک گھر مجھے

اصلاح :- غربت نے شہر شہر کیا در بدر مجھے
آرام کا ملا نہ کہیں ایک گھر مجھے

بجائے "قسمت" کے "غربت" کا لفظ بنادیا - اس ایک لفظ نے مطلع میں ایک نئی روح پھونک دی اسی کا نام استادی ہے۔

عاجز:- اے تپ نہ جلانا استخواں کو کھائے گا ھما انہیں میرے بعد

اصلاح:- اے تپ نہ جلانا استخواں کو مایوس نہ ہو ھما میرے بعد

"مایوس نہ ھو" اس ٹکڑے نے معنی میں ایسی نزاکت پیدا کردی جو احاطۂ تعریف سے باھر ھے -

(نوٹ)

یہ اصلاحیں بھی حضرت عشرت لکھنوی نے خود اپنے قلم معجز رقم سے لکھ کر مرحمت فرمائیں - گو ان شعروں میں وھی پرانا رنگ ھے - مگر ھمیں صرف اصلاح دکھانا مقصود ھے -

——(✱)——

تبصرے

ادب

مذہب

تاریخ

متفرق

اردو کے جدید رسالے

—*—

تبصرے

ادب

روس میں اردو کی تعلیم

قواعد اردو ، پہلا حصہ (۱۹۲۹)

منتخبات اردو ، حصہ اول و دوم (۱۹۲۷ اور ۱۹۳۰)

اردو - روسی - انگریزی لغت (۱۹۳۰)

مرتبہ جناب الک سے ئی برانلی کوف صاحب ، دارالاشاعت "مدرسۂ علوم مشرقی" لینن گراڈ

حامیان اردو کو یہ سن کر بہت خوشی ہوگی کہ روس میں لوگوں کو اردو سیکھنے کا شوق ہوگیا ہے اور وہاں اردو زبان کی تعلیم دی جانے لگی ہے - اسی سلسلے میں لینن گراڈ کے مدرسۂ علوم مشرقی نے چارکتابیں شایع کی ہیں جو روس کے شایقین اردو کے لئے بہت کار آمد ہوسکتی ہیں - اس مدرسے کے نصاب میں اردو ۱۹۲۳ میں داخل ہوگئی تھی ، لیکن ان کتابوں کے مرتب ہونے تک روسی طالب علموں کے پاس اردو سیکھنے کا کوئی ذریعہ سوا ان کتابوں کے نہیں تھا جو انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں شایع ہوئی ہیں - اب برانلی کوف صاحب اور ان کے چند ساتھیوں اور شاگردوں کی محنت سے چارکتابیں مرتب ہوگئی ہیں جو طالب علموں کی تقریباً کل ابتدائی ضروریات پوری کرسکتی

ہیں - ان میں سے "قواعد اردو" ۱۹۲۹ میں شایع ہوئی یہ لسانیات کے جدید اصولوں کے مطابق لکھی گئی ہے اور ان لوگوں کے لئے جو اردو کی لسانی خصوصیات سے واقف ہونا چاہیں بہت کافی ہے - لیکن اس میں مشق کے لئے سوالات نہیں ہیں اور مشق کے بغیر قواعد کا ذہن نشین ہونا دشوار ہے - روسی طالب علموں کو اردو کا ہر قاعدہ انوکھا اور ہر ترکیب نرالی معلوم ہوتی ہوگی ' اس لئے ان کو مشق کی اور بھی حاجت ہوتی ہوگی ' اور اس لحاظ سے یہ کتاب کی ایک بہت بڑی خامی ہے - دوسری کتاب ' منتخبات اردو " حصہ اول اس کمی کو ایک حد تک پورا کرتی ہے - یہ عزیزالدین احمد صاحب کی تصنیف " گنگو تری کا افسانہ ہے " جس کی سادہ اور سلجھی ہوئی زبان حواشی اور فرہنگ کے ذریعہ سے اور بھی آسان کر دی گئی ہے - لیکن پھر بھی اس کا مطالعہ کرنے کی اسی کو ہمت ہو سکتی ہے جس نے مشق کرتے کرتے اردو الفاظ اور جملوں کی ساخت سے خاصی واقفیت حاصل کر لی ہو ' اور اردو عبارت کسی قدر بے تکلفی سے پڑھ سکتا ہو" - منتخبات کا دوسرا حصہ ۱۹۳۰ میں شایع ہوا - اس میں مولوی نذیر احمد کی " مراۃالعروس " مولانا شبلی نعمانی کی " سفر نامہ روم و شام " اور مولانا حالی کی " حیات جاوید " سے اقتباس دئے گئے ہیں ' اور تمہید میں اردو زبان کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے - اس حصے کے ساتھ فرہنگ دینا ضروری نہیں سمجھا گیا ' کیونکہ اس کے ساتھ ہی ایک خاصی مکمل لغت الگ شایع ہو گئی ہے -

قواعد اردو" میں زبان سیکھنے والوں سے زیادہ ان لوگوں کا خیال رکھا گیا ہے - جنہیں لسانیات سے دلچسپی ہے ' اور گو قواعد صحیح اور مکمل ہیں پھر بھی اس میں خوبی یہ ہے کہ وہ زبان سیکھنے والوں کے لئے ایک پختہ بنیاد کا کام دے سکتے ہیں - مشق کے واسطے سوالات نہ ہونے سے کتاب کی علمی وقعت کم نہیں ہوتی ' مگر عملاً وہ اتنی مفید نہیں ثابت ہو سکتی جتنی مشقوں کے ساتھ ہوتی منتخبات میں بعض جگہوں پر الفاظ کے معنی غلط دیئے گئے ہیں ' صفحہ ۱۵ پر " بعد " کے معنی ظاہری " بدوس ' دئے گئے ہیں ' حالانکہ " بعد " یا تو " بات " کا مخفف ہوتا ہے یا ایک قسم کی مرغابی (بط) کا نام ہے ؟ صفحہ ۸۹ پر "گرم دلی " کے بجائے " دل گرمی " لکھا ہے ' صفحہ ۹۰ پر "یار" کا مونث " یارنی " بتایا گیا ہے جو صریحاً غلط ہے - مگر اصول سمجھانے میں مصنف سے کوئی

ایسی غلطی نہیں ہوئی ہے - "گنگوتری کے افسانے" کے ساتھ جو فرہنگ دی گئی ہے اس میں ایسی غلطیاں نہیں ہیں، اور حاشئے میں جو محاورے سمجھائے گئے ہیں ان کا مطلب بھی روسی میں صحیح ادا ہوا ہے - "منتخبات" کے دوسرے حصے میں حاشئے نہیں ہیں، اور گو لغت کے مرتب کرنے میں "منتخبات" کا مطالعہ کرنے والوں کی مشکلیں آسان کرنا مد نظر رکھا گیا ہے، لیکن مولوی نذیر احمد اور مولانا شبلی کی زبان روسی طالب علم محض لغت کی مدد سے نہیں سمجھ سکتے کیونکہ لغت میں محاورے وغیرہ بہت کم دئے گئے ہیں - لغت میں کہیں کہیں غلطیاں بھی ہیں - سرسری مطالعے میں جن پر نظر پڑی وہ مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہیں :-

غمی	بمعنی	درد اور تکلیف
غمی	بمعنی	غمگین
منتا	--	مشورہ کرنا راضی ہونا - یہ لفظ کسی اردو لغت میں نہیں ملتا
متوالپن	بجائے	متوالاپن
متیلا	--	مٹیالا
نچنا	بمعنی	ناچنا
بڑھا	بجائے	بوڑھا
بہو	بمعنی	بیوی
بوو	بجائے	بھوں
کوائی	بمعنی	کڑاپن، کڑا ہونا، سخت ہونا
کوڑھی	بمعنی	قبیر، گھر، خاندان
لکھنوانہ	بجائے	لکھنوی یا لکھنو کا
لمبانا	بمعنی	لمبا کرنا
مٹھا	بجائے	میٹھا
مٹھا	بجائے	مٹّھی
مچھویلی	بمعنی	مچھلی والے کی بیوی یا مچھلی بیچنے والی
محکمہ الکبیر	بمعنی	عدالت عالیہ
مدرستہ	بمعنی	اکاڈمی، مدرسہ یا تعلیمی ادارہ
نھا	بجائے	نہہ

نفسی	بمعنی	شہوانی
نقشبندی	بمعنی	ایک قسم کے فقیر جو رات کو سڑکوں پر گھومتے ہیں
ہاریل	بمعنی	سبز بجائے ہریالی یا ہریالا (سبزی)
ہاضم	بمعنی	نرم ، خوشگوار
ہٹھ	بجائے	ہٹ
ہٹھیلے پن	بجائے	ہٹیلا پن
ہلکلا	بمعنی	ہلکا
ہنسا	بمعنی	ہنسی
یکجہت	بمعنی	وفادار ، قابل اعتبار ، دوست

ایسی غلطیوں کا سبب صرف یہ ہے کہ کسی واقف کار اہل زبان سے مدد نہیں لی گئی ، انہیں زیادہ اہمیت نہ دینا چاہئے - روسی مدرسے اور بروانیکوف صاحب کی کوشش بہت قابل قدر ہے اور ہمیں امید ہے کہ بہت سے روسی اس سے فائدہ اٹھائیں گے - اعتراض کا حق ہمیں اسی وقت ہو گا جب ہم اردو میں روسی زبان کے قواعد اور فرہنگ شایع کریں اور ان میں ایسی غلطیوں سے بچے رہیں -

اردو ادب کی جو تاریخ " منتخبات " کے ساتھ دیباچے کے طور پر دی گئی ہے اسے مرتب کرنے میں گارساں دتاسی اور رام بابو سکسینا کی تصانیف سے مدد لی گئی ہے - ہندوستان میں مختلف نسلوں کی آمیزش ، اردو کا آغاز اور تدریجی نشو و نما تفصیل سے بیان کیا گیا اور اردو کے دکنی سر پرستوں اور قدردانوں کا پورا حق ادا کیا گیا ہے - اردو شاعری پر چند اعتراض بھی کئے ہیں مثلاً یہ کہ اس کا میدان بہت تنگ ہے اور اسے روزمرہ زندگی اور ہندوستان کے مناظر فطرت سے بہت کم تعلق رہا ہے - لیکن ان کا اعتراض مخالفانہ نہیں محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے قسم کا مذاق رکھنے کی وجہ سے وہ ہماری شاعری کا پورا لطف اٹھانے سے معذور ہیں - مضمون میں ایک جگہ رجب علی بیگ سرور کا نام سرر چھپ گیا ہے ، علامہ راشدالخیری کی تصانیف " صبح زندگی " وغیرہ حکیم محمد علی کی طرف منسوب کردی گئی ہیں ، میر انیس کو ان شاعروں کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے جنہوں نے سپہ گری چھوڑ کر شاعری کا پیشہ اختیار کیا تھا ، اس لئے کہ سپہ گری میں نفع یا شہرت حاصل کرنے کا امکان نہیں رہا تھا - لیکن یہ بھی معمولی غلطیاں ہیں ، اور ہمیں ان کا خیال بھی نہیں

رہتا جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ ہندوستان میں اردو کی وہی حیثیت ہے جو روس کی متحدہ ریاستوں میں روسی زبان کی آج کل جب اردو کے مقابلے میں متعدد زبانیں میدان میں آگئی ہیں ہمیں ایسی بات سن کر صرف خوشی نہیں ہوتی بلکہ ہمارے حوصلے بھی بڑھتے ہیں -

(م م)

کھیتی

مصنفہ محمد مجیب صاحب ' بی اے (اکسن) پروفیسر جامعہ ملیہ دہلی - مطبوعہ جامعہ پریس - دہلی ۸۰ صفحے - قیمت چھ آنے)

اس ڈرامے کے اشخاص فرضی یا خیالی نہیں ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہی لوگ ہیں جن سے ہمیں آے دن سابقہ پڑتا ہے - اور جن کے اثر سے ہماری قومی زندگی کی بری یا بھلی جیسی بھی ہو ' تشکیل ہو رہی ہے - مصنف اس خیال کے حامی معلوم ہوتے ہیں کہ زندگی اور آرٹ دو علحدہ علحدہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ لازم ملزوم ہیں اور ایک دوسرے پر اپنا اثر رکھتی ہیں اگرچہ اس ڈرامے میں مصنف نے زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے مگر وہ اشاروں اشاروں اور باتوں باتوں میں بڑی صفائی سے وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جو شاید کوئی واعظ کہتا اور بھونڈے طریقے سے کہتا - اور یہی بات ڈراما کا اصل مقصد ہے - ڈراما لوگوں کے سامنے انھیں کی روزمرہ کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے - اور ان ہی کے سامنے ان کے دلوں کے چور اور ان کی نیتوں اور منصوبوں کے اصلی محرکات کو اس طرح کھول کر بیان کرتا ہے کہ وہ خود تعجب کرنے لگتے ہیں —

محمد مجیب صاحب نے اپنے ڈرامے میں عبدالغفور کی زبانی وہ سب کچھ بیان کر دیا ہے جس سے ہمارے آج کل کے نام نہاد لیڈروں کی ذہنیت کا پورا اندازہ ہوسکتا ہے یہ لیڈر سید ہے سادے لوگوں کو کس ہشیاری سے اپنے قبضے میں لاتے ہیں اور اقتدار کو برقرار رکھنے کے واسطے کیا کیا تدبیریں کرتے ہیں اور اسی ضمن میں قابل مصنف نے نہایت لطف کے ساتھ ہندو مسلم مناقشوں کی اصلیت بیان کی ہے اور ان حضرات کی گرفت کی ہے جو واقعی

ان ساری بد مزگیوں کے حقیقی ذمہ دار ہوتے ہیں — عبدالغفور کے پہلو بہ پہلو ایک اور دوسرا کیریکٹر حسام الدین کا ہے - یہ ایک تعلیم یافتہ خوشحال نوجوان ہیں — دل میں قوم کا درد ہے اور عقل سلیم رکھتے ہیں - حسام الدین بخلاف مولوی عبدالغفور کے اپنے ملنے جلنے والوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے جانی دشمن نہیں ہیں اور اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کریں اور اپنی خدمت اور ایثار سے ان کی نظروں میں عزت حاصل کریں - ایک جگہہ حسام الدین کی زبانی نہایت دلنشین فقرہ کہا گیا ہے — مسلمانوں کو سمجھاتے سمجھاتے وہ ان سے یوں مخاطب ہوتا ہے " خدا نے جس زمین پر تمہیں بسادیا ہے ' جس ملک کو تمہارا دیس بنادیا ہے ' جن لوگوں کے ساتھہ تمہیں رکھاہے ' اس میں اس کی کوئی مصلحت ہوگی " —

اس ڈرامے میں ادبی اور فنی دونوں خوبیاں موجود ہیں اور اگرچہ غالباً اسے ایکٹ کرنے کے لئے لکھا گیا ہے لیکن اسے پڑھنے میں بھی لطف آتا ہے —

(ی)

گناہ کی دیوار - ہمزاد

(مصنفۂ اشتیاق حسین قریشی - مطبوعات مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ "گناہ کی دیوار"-قیمت ۱۲ آنے - صفحات ۷۱ "ہمزاد"-قیمت ۶ آنے - صفحات ۴۷)

یہ ڈرامے اسی غرض سے لکھے گئے ہیں کہ اسٹیج پر لائے جائیں - ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہیں بے وجہ چھوٹے چھوٹے سینوں میں تقسیم نہیں کیا گیا — ہندوستانی اسٹیج کی جو حالت ہے وہ ظاہر ہے — یورپ میں بھی جہاں اسٹیج پر سائنس کی کرشمہ سازیوں کی بدولت بڑی سہولتیں حاصل ہیں بالعموم ایسے وقت بار بار سین بدلے جاتے ہیں جب واقعی کوئی نیا ماحول پیش کرنا مقصود ہو اور اسکے لئے کافی ساز و سامان موجود ہو مصنف نے بھی ان ڈراموں میں اسی اصول پر عمل کیا ہے —

"گناہ کی دیوار" کا قصہ یہ ہے کہ نرمل ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے اور کملی اس کی بیوی ہے جو نوجوان ہونے کے ساتھہ حسین بھی ہے - نرمل کا ایک دوست ہے جس کا

نام گلشن ہے ۔ یہ ایک نہایت بے اصول اور دغا باز آدمی ہے ۔ وہ میاں بیوی کی معمولی ناموافقت سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے میں اپنی عیارانہ چال بازیوں کی بدولت کامیاب ہو جاتا ہے ۔ پھر کامنی کا اعتماد حاصل کرکے اسے ایک قحبہ خانے میں بیچ آتا ہے جہاں اسے گناہ کی زندگی پر مجبور کیا گیا ۔ کامنی کی زندگی کے یہ تجربے ظاہر ہے جیسے کچھ جان گسل ہوں گے ان کا اندازہ ناظرین خود کرسکتے ہیں ۔ نرمل نے جوگ اختیار کرلیا تھا ۔ اتفاق سے وہ کامنی کے حالات سے آگاہ ہوا ۔ ادھر کامنی کو رنبیر کی بدولت جو انجمن اصلاح افتادگان کا سکریٹری تھا قحبہ خانہ سے نجات ملی ۔ نرمل اور کامنی پھر ایک دوسرے سے ملے اور باوجود ان تمام واقعات کے دونوں میں اتحاد و خلوص قائم ہو گیا ۔ اور گناہ دیوار" جو دونوں کے درمیان حائل تھی خلوص کی بدولت ڈھے گئی ۔ اس ڈرامے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات افراد کی گناہ کی زندگی اختیاری نہیں ہوتی بلکہ حالات کی مجبوری کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ سوسائٹی اس بات میں جو تشدد اختیار کرتی ہے وہ بے جا ہے ۔اس ڈرامے کی زبان سلیس ہے

" ہمزاد " کا قصہ یوں ہے ۔ شاہ رخ ایک دولتمند سن رسیدہ شخص ہیں ۔ ان کی ایک بیوی ہے جس کا نام شگیلہ ہے ۔ دولت کی لالچ میں اس نے ان بڑے میاں کے ساتھ نکاح کر لیا ہے ۔ ایک اور شخص ہے صہیم ، اس سے شگیلہ کی آشنائی ہے ۔ شاہ رخ کا نوکر وزیر ان سب باتوں سے واقف ہے ۔ چنانچہ اس نے بڑی ہشیاری سے ایسی صورت حالات پیدا کی کہ شگیلہ نے مہر سے دست برداری لکھ دی اور صہیم کے ساتھ نکاح کر لیا ۔ دونوں نفع میں رہے ۔ شاہ رخ بھی اور شگیلہ بھی ۔ یہ اپنے گھر خوش وہ اپنے گھر خوش ۔ یہ چھوٹاسا ڈراما مزادیہ اور برمحل ہے ۔

(ی)

گڑیا

(مصنفہ لفٹننٹ کرنل ایم اے قریشی ۔ آئی ۔ ایم ۔
ایس مطبوعہ خواجہ برقی پریس ۔۔ دہلی)

یہ ایک تفریحی ڈراما ہے ۔ اسکے اشخاص یہ ہیں : کلیم ، پروفیسر علم نسواں اور " بزم تحقیق عادات و اطوار نسواں " کا صدر ۔ حسینہ ، کوہوں کے تاجر

یوسف کی بیٹی ہے - شوکۃ کلثوم کا دوست ہے -

اپنے دوست شوکۃ کے کہنے پر کلثوم اس بات پر آمادہ ہوتا ہے کہ ایک گڑیا اپنے ہاں رکھے تا کہ عورت کی شخصیت سے وہ مانوس ہو اور اس صنف کے ساتھ جو اسے بیزاری ہے وہ کم ہو - وہ یوسف کی دکان پر جاتا ہے - ایک گڑیا خریدتا ہے جو اس تاجر کی بیٹی حسینہ کی ہو بہو نقل ہے دکان میں حسینہ اور کلثوم کی گفتگو ہوتی ہے اور حسینہ تہیہ کرتی ہے کہ اگر اس شخص کو رام نہ کیا تو کچھ نہ کیا - گڑیا کا روپ بھر کے وہ خود کلثوم کے گھر جاتی ہے - کلثوم اسے ایک الماری میں قفل لگا کر رکھ دیتا ہے - آہستہ آہستہ کلثوم کو اس گڑیا سے محبت پیدا ہوئی - دفتر جاتا ہے تو اس کا دھیان رہتا ہے - جب گھر واپس آتا ہے تو کچھ گنگناتا ہوا - بالآخر جب حسینہ نے دیکھا کہ کلثوم کا دل اب پسیجنا شروع ہو گیا ہے تو ایک دن اس نے سارا راز افشا کر دیا قصہ میں حقیقت نگاری کو پیش نظر نہیں رکھا گیا - ہم نے بعض سائنٹفک لوگوں کے متعلق یہ تو سنا ہے کہ ٹہل کر گھر واپس آتے ہیں تو خود کونے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے ڈنڈے کو چارپائی پر لٹا دیتے ہیں لیکن اس میں غالباً مبالغہ ہے کہ کوئی سائنٹفک آدمی مصنوعی گڑیا اور ایک ۱۸ سال کے پیکر نسوانی میں فرق نہ کر سکے - ہاں، اس کے امکان سے انکار نہیں - محض دل لگی کی چیز ہے -

(ی)

کلام جوہر

(رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کے کلام کا
مجموعہ - مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ - قرول باغ - دہلی)

مولانا محمد علی مرحوم کے کلام کا مجموعہ اس سے پہلے اردو پبلک کے سامنے آ چکا ہے - اور اس پر تقریظیں بھی لکھی جا چکی ہیں - اس کے پچھلے ایڈیشن کا ختم ہو جانا اور پھر اس کا شائع ہونا پبلک کی خوش مذاقی پر دلالت کرتا ہے - مولانا مرحوم کا کلام بہت کم ہے - زمانہ نے انہیں اتنی

فرصت ھی نہ دی کہ وہ اطمینان سے بیٹھکر شاعری کرتے - لیکن اس تھوڑے سے کلام سے بھی یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی کہ مولانا کی طبیعت اور جبلت میں شاعری کوٹ کوٹ کر بھری تھی - ان کا شعر ان کے جذبات و احساسات کا ترجمان ہوتا ہے - بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی سیاست میں بھی ایک لحاظ سے شاعری کا رنگ پایا جاتا تھا رومانیت ان کی طبیعت پر ایسی حاوی تھی کہ وہ معمولی ماہرین سیاست کی طرح نام نہاد اعتدال و حکمت عملی کو خیر باد کہنے میں مطلق پاس نہ کرتے تھے - خود ایک جگہ فرماتے ہیں —

سنتے ہیں یہ بھی ایک بزرگوں کی رسم تھی

اس دور اعتدال میں دارورسن کہاں

اور یہ واقعہ ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے تک ہندوستان میں "دارورسن" کا ذکر ' خصوصاً سیاست میں ' شاید سیاسی رومانیت سے زیادہ وقیع نہ سمجھا جاتا ہو -

لیکن بعد میں لوگوں کے خیالات بدلے ' ان کی ذہنیتیں بدلیں اور ان کے نصب العینوں میں بڑے بڑے تغیرات پیدا ہوئے - کوئی منصف مزاج آدمی اس سے انکار نہیں کریگا کہ مولانا مرحوم کی " سیاسی رومانیت " کا ان تغیرات کے پیدا کرنے میں بڑا ہاتھ رہا - در اصل انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی حیات اجتماعی کی رفتار کے رخ کو بدل دیا —

شاعر مختلف قسم کے ہوتے ہیں - ایک وہ جو لفظوں کے گورکھ دھندے سے آگے نہیں بڑھتے ' ایک وہ جو اپنے لفظوں سے ہمارے واسطے تصورات حسن پیدا کرتے ہیں ' ایک وہ جو جن کے پاس بعض خیال ہوتے ہیں جنہیں وہ شاعری کی زبان کے توسط سے دوسروں تک پہونچانا چاہتے ہیں اور ایک وہ ہوتے ہیں جو اپنے دلی جذبات کی تصویر دوسرے کے آگے کھینچ دیتے ہیں تاکہ دوسرے بھی ان کی طرح محسوس کریں - مولانا مرحوم کی شاعری اسی قسم کی تھی - ان کے دل پر جو گزرتی تھی اسے لفظوں اور وزن کا جامہ پہنا کر ظاہر کر دیتے تھے - یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر ہر مصرع ولولۂ عشق سے مملو ہے مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں :—

ہو کچھ بھی مگر شور سلاسل تو نہیں یہ

جوہر کا تڑپنا دم بسمل تو نہیں یہ

ہے بات تو جب نزع میں تمکین رہے قایم
مقتل ہے ولا ! رقص کی محفل تو نہیں یہ
کچھ ترک محبت تو نہیں ' ضبط فغاں ہے
ہم کرنے پہ آجائیں تو مشکل تو نہیں یہ

خوگر جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی
خوف غماز ' عدالت کا خطر ' دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوف خدا اور سہی
ہم وفا کیشوں کا ایماں بھی ہے پروانہ صفت
شمع محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

دور حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد
قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

کیا عشق ناتمام کی بتلاؤں سر گذشت دار و رسن کا اور ابھی انتظار دیکھ

اس مجموعہ کے ساتھ مولوی عبد الماجد صاحب دریا بادی کا مقدمہ ہے جو انھوں نے جوہر اوران کی شاعری کے عنوان سے لکھا ہے - یہ مقدمہ موصوف نے اپنے خاص انداز میں لکھا ہے اور دلچسپ ہے —

(ی)

آفتاب وطن

(مصنفہ لالہ انوپ چند صاحب آفتاب پانی پتی یاد گار حضرت سلیم مرحوم پانی پتی - بڑی تقطیع ' لکھائی چھپائی اوسط درجے کی ' کاغذ اچھا صفحات ۱۱۲ - قیمت ۱۲ آنے علاوہ محصول ڈاک - ملنے کا پتہ بلونت سنگھ ولد لالہ چھجو کوار سنگھ پانی پت)

یہ جناب آفتاب پانی پتی کی مختلف نظموں کا مجموعہ ہے - اس میں ۶۹ نظمیں ہیں اور اخیر میں چار صفحوں پر متفرق اشعار ہیں - اکثر نظمیں

قومی ہیں اور بعض مذہبی اور اخلاقی - معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا دل قومی درد سے بھرا ہوا ہے وہ طرح طرح سے ہند و اہل ہند کی حالت زار پر آنسو بہاتا ہے کبھی ان کو ہمت و غیرت دلاتا ہے اور کبھی ان کے عیوب کی پردہ دری کرتا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اس موضوع کے لئے جس شاعرانہ کمال اور استادانہ مہارت کی ضرورت ہے وہ حضرت آفتاب میں ابھی پیدا نہیں ہوئی تاہم نظموں کی زبان صاف سادہ اور طرز بیان بھی بڑی حد تک سلیس و عام فہم ہے اور سب سے بڑی بات یہہ ہے کہ وہ درد مند دل رکھتے ہیں ان کا قومی احساس اور جذبہ حب وطن بہت زبردست معلوم ہوتا ہے یہی وجہہ ہے کہ جب وہ اپنے " بد نصیب وطن " کی بپتا بیان کرنے پر اتر آتے ہیں تو ہندیوں کے دماغی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی امراض کے ساتھہ انتہائی سادگی سے امراض خبیثہ کا بھی ذکر کر دیتے ہیں - اس خیال کا ماخذ غالباً مس میو کی کتاب مدر انڈیا ہے —

کتاب کے شروع میں بلونت سنگھہ صاحب پریمی پانی پتی کا ۱۲ صفحوں کا ایک مضمون ہے جس میں انہوں نے مصنف کے حالات اور شاعری کا حال لکھا ہے اور اس کا فخریہ اعتراف کیا ہے کہ آفتاب صاحب کی شاعرانہ زندگی کے بنانے اور سنوار نے میں حضرت سلیم مرحوم کا بڑا ہاتھہ ہے - اس ضمن میں سلیم مرحوم کی قابلیت پر بھی بڑی دلچسپ بحث کی ہے جن حضرات کے دلوں میں حب وطن کی گرمی ہے وہ ضرور اس کتاب سے لطف اٹھائیں گے — (ج)

انتخاب حسرت

(مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کا منتخب کلام مرتبہ جلیل احمد قدوائی صاحب بی - اے - مکتبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی صفحات ۱۳۲ قیمت ایک روپیہ)

حسرت غزل کے استاد ہیں - ان کے کلام میں پختگی، متانت، صفائی اور سوز پایا جاتا ہے - زندہ غزل گو شعرا میں ان کا درجہ بہت بلند

کتابوں کو نصیب ہو سکی ۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے آسانی سے ہو سکتا ہے کہ اس کے لکھے جانے کے بعد ہی سے اس کی شہرت ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئی اور ایسے زمانے میں جب طباعت اور ذرائع آمدو رفت کی یہ سہولتیں میسر نہ تھیں اس کے سینکڑوں مطبوع و مخطوط نسخے بہت جلد تمام ہندوستان میں شائع ہو گئے تھے ۔ چنانچہ دکن جیسے دور افتادہ حصہ ملک کے بعض شہروں میں اس کے ایسے قلمی نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں جو اصل تصنیف کے ایک آدھ سال بعد کے لکھے ہوئے ہیں —

اس کی مقبولیت کا راز اس کی فصاحت و سلاست ہے ، اس کی زبان اور بیان اس قدر سلیس ، پاکیزہ اور دلکش ہے کہ پڑھنے والا بے تکلف اور بے تکان پڑھتا چلا جاتا ہے ، اس میں رو پداد (پلاٹ) کی کوئی خاص خوبی نہیں لیکن اسلوب بیان کی سادہ اور فطری لطافتوں نے اس میں جو حسن پیدا کر دیا ہے وہ افسانہ نویسی کے اصول و ضوابط مشکل سے کر سکتے ہیں — میرامن کا یہ بڑا کمال ہے کہ وہ موقع محل کے اعتبار سے نہایت موزوں اور ٹھیٹ زبان استعمال کرتا ہے ، اس کو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے وہ اپنے مافی الضمیر کو بے تکلف ، موثر اور دلکش پیرائے میں پیش کرتا ہے باغ و بہار کی تصنیف نے سلجھی ہوئی نثر کا بنیادی پتھر رکھا اس کے بعد لوگوں کو نثر میں لکھنے کا شوق پیدا ہوا ، اس لحاظ سے تاریخ ادب میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے کتاب بارہا چھپ چکی ہے اور اب بھی چھپتی جاتی ہے ، اس کا انگریزی میں بہت پہلے ترجمہ ہوچکا ہے ۔

اس کے مختلف اڈیشنوں میں اختلاف پیدا ہوتا جا رہا تھا اور اکثر غلط بھی چھپ رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی حیثیت ہی نہ بدل جائے ، اس لئے بڑی ضرورت تھی کہ خاص اہتمام سے اسے شائع کیا جاتا ، انجمن ترقی اردو کی یہ حق شناسی ہے کہ اس نے اسے کمال صحت ونفاست کے ساتھ چھپوا کر شائع کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے ۔

مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو نے اس کو مرتب کیا ہے ، اور اس پر بڑی تحقیق سے ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے ۔ مقدمہ میں کتاب کے ماخذ کے متعلق جو غلط فہمی اب تک چلی آرہی تھی اور جس کا

شکار خود میراسن بھی تھا اس کا ازالہ کیا ہے ، داخلی اور خارجی شہادتوں سے فاضل مرتب نے اس پر بحث کی ہے اور خاص انداز میں تنقید بھی کی ہے - باغ و بہار پر بیسیوں مضامین لکھے گئے ہیں لیکن اس کو کسی نے اس کی اصل حیثیت میں اب تک پیش نہیں کیا تھا - مولوی صاحب کا مقدمہ تنقید و تحقیق کے اعتبار سے نہایت گراں قدر ہے -

اس کتاب میں کئی ایسے الفاظ و محاورات ہیں جن کے معنی و مفہوم بتانے سے ہمارے بڑے سے بڑے لغت بھی قاصر ہیں ، اس لئے مولوی صاحب نے اخیر میں مشکل و متروک الفاظ و محاورات کی فرہنگ بھی دیدی ہے جو بڑی تحقیق و محنت سے مرتب ہوئی ہے -

امید ہے کہ اردو داں حضرات ضرور اس کی قدر کریں گے اور طلبہ خصوصاً اس سے ضرور مستفید ہوں گے --

(چ)

حسن فطرت

(مصنفہ منشی گورکھ پرشاد صاحب عبرت مرحوم
گورکھپوری مطبوعہ اشاعت گورکھپور - چھوٹی تقطیع)

عبرت اچھے شاعر تھے اور ان کی شاعری عام شاعروں کی طرح غزل ہی تک محدود نہ تھی - مسدس عبرت مشہور نظم ہے جو اپنے وقت میں بڑے شوق سے پڑھی جاتی تھی ، اس میں انہوں نے مسدس حالی کی بڑی خوبی سے تقلید کی تھی - اب تو لوگ بھول بھال گئے - اس مثنوی میں انہوں نے حسن و دل کے معاملات کو نظم کیا ہے - یہ وہ واردات ہے جس کا جلوہ ہر زمانے میں اور ہر مقام میں نظر آتا ہے - متقدمین نے نظم و نثر میں اس پر بڑی بڑی گلفشانیاں کی ہیں - حضرت عبرت نے بھی اس مثنوی میں کمی نہیں کی اور شاعرانہ انداز میں حسن و دل کے معرکوں کی خوب بیان کیا ہے - ان کے بیان میں سادگی ، بے تکلفی اور حسن پایا جاتا ہے —

غنچۂ تبسم

(مجموعہ مضامین سید تمکین کاظمی صاحب - چھوٹی تقطیع - صفحات ۱۶۹ قیمت دو روپے ' مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن وغیرہ)

ظرافت ایک لطیف شے ہے اور اس کے لئے بڑی ذہانت کی ضرورت ہے - تمسخر ' پھکڑ اور چیزیں ہیں اور ظرافت بالکل دوسری چیز - بہت کم ایسے ادیب ہیں جو اسے خوبی سے نبھا سکتے ہیں -- بعض لوگ طبعاً ظریف ہوتے ہیں ان کی ظرافت میں ایک حسن ہوتا ہے گو بعض اوقات وہ حد سے تجاوز ہی کیوں نہ کر جائیں - اُن کی نظر میں خاص بات ہوتی ہے وہ وہیں پڑتی ہے ' جہاں پانی مرتا ہے - بعض طبعاً ظریف نہیں ہوتے مگر ظریف بننے کی کوشش کرتے ہیں اور ظریفانہ مضمون لکھتے ہیں - اس میں کچھہ تو نقل اور تقلید سے کام لیتے ہیں اور کچھہ لفاظی سے ' مگر ان کی کوشش اکثر رائگاں جاتی ہے - اصل ظریف بعض وقت ایک فقرے بلکہ ایک آدھ لفظ میں ایسی کہہ جاتا ہے کہ دوسرا آدمی صفحے کے صفحے لکھہ جائے تو وہ بات پیدا نہیں کر سکتا - یا کبھی وہ ظرافت کے پردے میں ایسی نکتے کی باتیں لکھہ جاتا ہے کہ جن کی ذرا سی ٹھیس سے قدیم روایات اور توہمات کی بڑی بڑی عمارتیں ہل جاتی ہیں - اس مجموعے میں ایسے فقرے یا ایسی باتیں کہیں نظر نہیں آتیں البتہ بعض مضامین جن میں خاص خاص اشخاص اور مواقع کو بیان کیا ہے ایسے ہیں کہ اُسے پڑھنے والا دلچسپی سے پڑھے گا ' خصوصاً ایسے مضامین جن کا تعلق دکن سے ہے - عید کا بیان لکھا ہے خاصا ہے ' لیکن حیدر آباد کی عید میں ظریف کو ایسی پتے کی باتیں نظر آئیں گی کہ وہ لکھنے بیٹھے تو لطف پیدا کر دے - قابل مصنف اس میں کامیاب نہیں ہوے - اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی ظرافت کی تحریروں کا بڑا مقصد ہنسنا ہنسانا اور لطف پیدا کرنا ہے لیکن ان کی تہ میں کچھہ اور بھی ہوتا ہے - غرض ان مضامین میں اصل سے نقل اور سادگی سے تصنع زیادہ پایا جاتا ہے --

مذہب

مولود ہمایوں

(مرتبہ مولوی حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس
دتاولی ضلع علی گڑہ - مطبوعہ مطبع عہد آفرین حیدر آباد دکن ،
اوسط درجہ کی تقطیع - صفحات ۱۶۲ قیمت سوا روپیہ)

مولوی حاجی موسیٰ خاں صاحب اسلامی خلافت کے کارناموں پر ایک مستقل کتاب لکھ رہے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ خلافت کے کارناموں کی جھلک دکھائی جائے - پہلا حصہ چھپ چکا ہے جس میں اسلام سے پہلے دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت پر مورخانہ نظر ڈالی گئی ہے دوسرے حصہ کی پہلی جلد بھی چھپ چکی ہے جو ہمارے پاس تبصرے کی غرض سے وصول ہوئی ہے اس میں پیغمبر اسلام کی حیات پاک کے حالات (ولادت سے ہجرت تک کے) درج ہیں - فاضل مرتب نے محنت سے کام لیا ہے مستند اور وسیع مواد فراہم کرکے اس کو عالمانہ انداز میں لکھا ہے واقعات کی ترتیب بھی اصولی ہے نتائج اخذ و استنباط میں سلیقے سے کام لیا گیا ہے واقعات کی ترتیب میں اپنے مقصد تصنیف کو ہر جگہ پیش نظر رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اصل مضمون سے ہٹنے نہیں پائے —

کتاب کی زبان اور بیان زیادہ سلیس اور عام فہم نہیں کم پڑھے لکھے لوگ اس سے سہولت سے مستفید نہیں ہو سکتے - بعض بعض موجودہ کہا بلحاظ فصاحت اور کہا بلحاظ انداز تحریر اوسط درجے کے پڑھے لکھے لوگ کم وقت میں کسی قدر سہولت سے آں حضرت صلعم کی سیرت کا مطالعہ کر سکتے ہیں —

(ج)

میلادالنبی پروجکٹ

(مرتبہ محمد عبدالغفار صاحب ، جامعۂ ملیہ اسلامیہ قرول باغ - دھلی
چھوٹی تقطیع ' صفحات ۶۴ - قیمت آتھہ آنے)

اس سے قبل پانچ نبی پروجکٹ کا ذکر ان صفحات میں ھو چکا ھے - جامعہ ملیہ کا یہ سلسلہ بہت کار آمد اور مفید ھے بچوں کی صحیح تعلیم کا یہہ نہایت عمدہ طریقہ ھے - اس سے اُن میں کام کرنے کا شوق ھی نہیں پیدا ھوتا بلکہ بصیرت بھی پیدا ھو تی ھے - ھندوستان میں میلاد کہاں نہیں ھوتے لیکن اکثر مقامات پر جو طریقے اس مبارک کام کے لئے اختیار کئے جاتے ھیں اُن سے کوئی معتد بہ فائدہ نہیں ھو تا اور بچے تو اسے بالکل نہیں سمجھتے اس کتاب میں جو منصوبہ تیار کیا گیا ھے اور اس پر جس طریقے سے بچوں نے عمل کیا ھے وہ بجائے خود ایک تعلیم ھے - میلاد کے لئے ابتدا سے لیکر آخر تک جن جن باتوں کی ضرورت ھے وہ سب اس میں آگئی ھیں - بچے ھی سب اس کا انتظام کر تے ھیں اور سب کچھہ انہیں کے ھاتھوں انجام پاتا ھے استاد انہیں صرف رستہ سمجھا دیتا ھے جن صاحبوں کو بچوں کی تعلیم سے تعلق ھے نیز بچوں کے والدین کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاھئے —

اریخ

مرقع دھلی

(از نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالارجنگ خاندوراں -
مرتبہ حکیم سید مظفر حسین صاحب)

" مرقع دھلی " جس کا دوسرا نام حکیم مظفر حسین صاحب نے "دھلی بارھویں صدی میں " رکھا ھے ایک مختصر اور دلچسپ تذکرہ ھے - درگاہ قلی خاں بہادر

سالار جنگ موتمن الدولہ کے آبا و اجداد شاہجہاں کے عہد میں ایران سے ہندوستان آئے اور مناسب عالیہ پر مامور رہے - نواب درگاہ قلی بہادر نے ابتدائے عمر سے نواب مغفرت مآب - نظام الملک آصفجاہ کی نگرانی میں پرورش پائی اور عمر بھر ان کی مصاحبت میں رہے اور کار نمایاں کئے - نواب مغفرت مآب کے بعد نواب ناصر جنگ شہید نواب صلابت جنگ اور نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں مختلف عہدوں پر سرفراز رہے - اور آخر میں جب وہ صوبہ اورنگ آباد خجستہ بنیاد کی صوبیداری پر تھے سنہ ۱۱۸۰ ھ میں وفات پائی - یہ تذکرہ انہوں نے اس وقت لکھا جبکہ وہ نواب نظام الملک آصف جاہ کے ہمراہ سنہ ۱۱۵۱ ھ میں دہلی گئے تھے —

اس تذکرے میں وہاں کے مزارات اور اس وقت کے مشائخ شعرا مرثیہ خوانوں اور ارباب طرب کا مختصر سا ذکر ہے - ضمناً بعض حالات - معاشرت بھی آگئے ہیں جو صرف عیش و عشرت سے متعلق ہیں - بیاں صاف ہے اور اس سے نواب مرحوم کا ذوق ادب ظاہر ہوتا ہے - وہ شاعر بھی تھے - بہر حال اس کے مطالعہ سے عہد محمد شاہی کی ایک جھلک نظر آجاتی ہے -

اصل تذکرہ ۸۲ صفحے پر ہے - قابل مرتب نے ۶۶ صفحے کا مقدمہ لکھا ہے جسمیں مصنف کے خاندان اور خود مصنف کی زندگی کے حالات اور کتاب کا خلاصہ ہے - اور اس کے بعد ۱۶ صفحے پر اسناد وغیرہ کی نقول ہیں -

کلیات عزیز

(مجموعہ کلام خواجہ عزیز الدین مرحوم -
مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ - قیمت
مجلد چھ روپے ' غیر مجلد پانچ روپے)

ایران کے بعد فارسی ادب و زبان کو فروغ ہوا تو ہندوستان میں ہوا - یہ زبان اب تک ہمارے اخلاق و عادات ' طرز خیال معاشرت اور ہماری زبان اور ادب پر چھائی ہوئی ہے - اس سر زمین میں ایسے ایسے فصیح و بلیغ اور بلند پایہ شاعر پیدا ہوے کہ اہل زبان بھی ان کا لوہا مان گئے - مرزا غالب کے بعد خواجہ عزیز نے ایرانی تخیل اور شستہ ایرانی زبان کو بڑی شان

اور آب و تاب کے ساتھہ زندہ رکھا۔ اس دور کا اب خاتمہ ہو چکا ہے' زمانے کی روش بدل گئی ہے' فارسی ہمارے لئے غیر زبان ہو گئی ہے لیکن بزرگوں کے کمال اب بھی دلوں کو گرمانے کے لئے کافی ہیں —

خواجہ صاحب بڑے قادرالکلام اور باکمال شاعر تھے اور ہر صنف سخن پر پوری قدرت رکھتے تھے اور یہ کلیات ان کے کمال کا شاہد ہے۔ علاوہ غزلوں کے چار مثنویاں ہیں۔ ظفرنامہ جس میں جنگ روم و روس کی داستاں ہے سکندر نامے کی طرز پر اور نظامی کے رنگ میں کہی ہے۔ دوسری مثنوی گلگشت کشمیر' تیسری مثنوی ید بیضا' چوتھی ہدیۃ الثقلین' متعدد قصیدے اور بہت سے قطعات اور رباعیاں بھی ہیں۔ تاریخ بے تکلف کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ کلام استادانہ اور بلند ہے۔ زبان نہایت پختہ اور شیریں اور ہر قسم کی صنائع اور خوبیوں سے مملو ہے — غرض کہ خواجہ صاحب کا کلام بڑے بڑے اساتذہ کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم کے فرزند خواجہ وصی الدین صاحب مستحق شکریہ ہیں کہ ان کی وجہ سے یہ کلام محفوظ ہو گیا۔

نبیوں کے قصے

(مصنفہ مولانا خواجہ محمد عبدالحی صاحب فاروقی — مطبوعہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ — قرول باغ دہلی — صفحات ۸۰ — قیمت ۲ آنے —)

اس کتاب میں مسلمان بچوں اور بچیوں کے لئے رسولوں کی زندگی کے حالات سادہ زبان میں بیان کئے گئے ہیں — ان حالات میں بالخصوص ان محاسن کو اجاگر کر کے پیش کیا گیا ہے جن کے جانے بغیر ہمارے بچوں اور بچیوں کی سیرت کی تشکیل ناقص رہتی ہے — انسانیت کے ان محسنوں کے حالات نہ صرف بچوں بلکہ بڑوں کو بھی جاننا چاہئیں — اس چھوٹی سی کتاب میں ہمت نہ ہارنے' ثابت قدم رہنے' صبر سے کام لینے' صداقت کی رسی کو مضبوط پکڑنے اور زندگی کو ایک امانت سمجھنے کے سبق ہر صفحہ

پر ملیں گے -

زبان سادہ ہے اور بچوں کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی

(ی)

متفرق

مظاہر ذہنیات

(از ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب ' ال ' ام ' بی ' آئی ' ام ' ڈی دھولپور صفحات ۱۸۴ قیمت دو روپے)

اگرچہ تمہید میں فاضل مصنف نے یہہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہہ کتاب نفسیات کی تمام مستند کتابوں سے مدد لیکر لکھی گئی ہے ' لیکن اصل میں اس میں نفسیات کا حصہ بہت کم ہے ' بلکہ جا بجا عملی زندگی میں کامیابی کے متعلق ہدایت و مشورہ دیا گیا ہے - اگرچہ اس کتاب میں ترکیب دماغی ' حافظہ اور تخیل سے بحث کی گئی ہے ' لیکن چونکہ کسی قسم کی ترتیب اور باہمی ربط ان مباحث میں نہیں ہیں ' اس لئے بحیثیت نفسیات کے ایک رسالے کے ' اس کی اہمیت بہت کم ہو گئی ہے ' تحت الشعور کی اصطلاح فاضل مصنف نے جا بجا بیان کی ہیں ' لیکن انہیں تحت الشعور (سب کانشس) اور لاشعور (آن کانشس) میں التباس ہوا ہے - اسی طرح یہہ تحت الشعور کی بحث کرتے کرتے وہ شعور کائنات کی حد تک جا پہنچے ہیں اور اسی طرح اس رسالہ کے ڈانڈے ما بعد الطبیعات سے ملادئے ہیں -

کتاب میں ابواب نہیں ہیں - اگرچہ سبا حث جلی قلم سے ظاہر کئے گئے ہیں - لیکن خود ان میں کوئی ربط نہیں ' حافظہ ' تخیل ' اور توجہ کی بحیثیت الہیئت تفصیلی ہے ' لیکن ان کے ضمن میں بھی عملی فوائد مثلاً اشتہار بازی کی کامیابی کا راز ' مطالعہ کرنے کا طریقہ ' اعتقادات کے حیرت انگیز کرشمے

وغیرہ بیان کئے گئے ہیں۔ مسمریزم اور عمل تنویم کرنے کے طریقے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ جن کے متعلق ہماری صدق دل سے دعا ہے کہ خدا کرے کوئی ناتجربہ کار نو جوان ان کی مشق نہ شروع کرے۔ آخر میں کچھ صفحات غذا اور لباس کے متعلق ہیں یہ گویا اس تصنیف کا طبی حصہ ہے۔ اور مفید ہے، "کامیابی کے زریں اصول" پر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

اگرچہ ہم اس کتاب کو نہ نفسیات کا رسالہ کہہ سکتے ہیں، اور نہ طب کا، لیکن چونکہ عملی زندگی کی کامیابی برابر فاضل مصنف کے ذہن میں رہی ہے۔ اس لئے امید ہے کہ اس کے مطالعہ سے ناظرین کو نفسیاتی معلومات کا شوق پیدا ہو جائے، اور یہ بہت غنیمت ہے، لکھائی چھپائی اچھی ہے، قیمت دو روپے جو بہت زیادہ ہے — (و)

———

اعادۂ شباب و درازیٔ عمر

از

(ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب ایم۔ بی، سی۔ ایچ۔ بی

(اڈنبرا) ایم۔ ڈی، ایل۔ ایس۔ آر (برلین) سول سرجن میڈیکل

افسر فوج باقاعدہ سرکار عالی گولکنڈہ حیدر آباد دکن

——

کھوئی ہوئی جوانی اور درازیٔ عمر کا شوق آج سے نہیں بلکہ قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے اور اپنے اپنے وقت میں حکما اور اطبا نے طرح طرح کی کوششیں کی ہیں۔ آج کل ڈاکٹر ڈارونوف اور ڈاکٹر جاوورسکی نے اس باب میں خاص شہرت حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر اشرف الحق صاحب نے اس خاص علاج کی تحقیق اور سیکھنے کی غرض سے یورپ کا سفر کیا اور پیرس اور برلین وغیرہ میں وہاں کے اساتذہ سے اسے سیکھا ہے۔ اس مختصر رسالے میں انہوں نے اپنے تجربات کو بڑی خوبی اور صفائی سے بیان کیا ہے اور جو ڈاکٹر کے طریقے کا جنہوں نے اس علاج میں کمال حاصل کیا ہے صاف اور سلیس زبان میں ذکر

ہے اور جو کتابیں ان ڈاکٹروں نے اس مبحث پر لکھی ہیں اُن کے نام بھی درج کر دئے ہیں۔ ان ڈاکٹروں کے عملوں میں جو فرق ہے اُسے مختصر طور پر لکھ دیا ہے —

ڈاکٹر صاحب نے اس کی تحقیق اور حصول ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود بھی عمل کو شروع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اشرف الحق صاحب نہایت ذہین شخص ہیں اور اگر وہ استقلال سے اس کام کو کرتے رہے تو یقین ہے کہ وہ بہت نام پیدا کریں گے۔

اردو کے جدید رسالے

ندیم

(مدیر سید ندیم الحسن صاحب رضوی - شریک، سید بشارت احمد صاحب رضوی - جاگیردار کالج، بیگم پیٹ - حیدرآباد دکن)

یہ ماہانہ رسالہ جاگیردار کالج حیدرآباد دکن سے سید ندیم الحسن صاحب مدرس کالج مذکور کی سعی کا نتیجہ ہے۔ اُس کے دلچسپ اور خوبصورت بنانے میں انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مضامین بھی نظم و نثر دونوں کے خوب جمع کئے ہیں۔ ایک حصہ صرف طلبہ کے مضامین کا ہے وہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ ہزایکسلنسی مہا راجہ بہادر صدر اعظم، سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ، کرنل سر رچرڈ ٹرنچ، نواب مسعود جنگ، نواب اکبر یار جنگ، نواب ذوالقدر جنگ بہادر نواب ولی الدولہ بہادر، نواب نظامت جنگ بہادر، خان فضل محمد خاں، نواب جیون یار جنگ بہادر، سر امین جنگ بہادر، نواب مہدی یار جنگ بہادر اور دیگر صاحبوں کی تصویروں سے آسے اور زینت ہو گئی ہے۔ کاغذ اعلیٰ درجہ کا ہے اور چھپائی

بجاے خود اس سے بہتر حیدرآباد میں نہیں ہو سکتی - ہم قابل مدیر کو اس عمدہ رسالے پر مبارک باد دیتے ہیں - خدا کرے یہ قائم رہے —

اردو ایسوسی ایشن میگزین الہ آباد

(اڈیٹر محمد حبیب الرحمن صاحب الہ آباد -)

یہ رسالہ الہ آباد یونیورسٹی کی اردو ایسوسی ایشن کی طرف سے شایع ہوا ہے اور اس کے اڈیٹر ایسوسی ایشن کے جوائنٹ سکرٹری محمد حبیب الرحمن خاں ہیں - تمام مضامین یونیورسٹی طلبہ کے ہیں اور ہر مضمون اچھا ہے جس سے طلبہ کا علمی شوق ظاہر ہوتا ہے ظاہری شان بھی قابل تعریف ہے - اگر ایسوسی ایشن نے اس معیار کو قائم رکھا تو بلا شبہہ وہ اردو کی خدمت انجام دے گی —



اعلان

هندستانی ایکیڈیمی کی جانب سے دو انعام هندی میں اور دو انعام اردو میں قیمتی ۵۰۰ روپیه فی انعام ' حسب ذیل مضامین پر دیے جائیں گے :—

(۱) دماغی اور اخلاقی سائنس (Mental and Moral Science) (هندی و اردو)

(۲) نظم (هندی و اردو)

نوٹ :—

کتاب خود مصنف کی تصنیف کردہ هو —

نظم کی کتاب میں ایک هی مصنف کی نظموں کا مجموعه هو سکتا هے یا ایک هی طویل نظم هو سکتی هے —

انعام کے واسطے کتابیں ۳۱ اگست سنه ۱۹۳۲ ع تک بهیجی جانی چاهئیں —

تاریخ مقررہ سے قبل دفتر هذا میں انعام کے لئے پیش کردہ هر کتاب کی سات جلدیں روانه کی جانی چاهئیں —

(دستخط) تارا چند

جنرل سکرٹری

هندستانی ایکیڈیمی صوبه متحدہ الهآباد

یہ کتابیں بھی انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں

(تصانیف مرزا سجاد بیگ صاحب)

الفہرست	۱۰ روپے
الانسان	۲ روپے ۸ آنے
الاستدلال	۳ روپے
تمنائے دید (ناول)	۱۰ آنے
تسہیل البلاغت	۳ روپے

(مطبوعات ہندستانی اکاڈیمی)

عرب و ہند کے تعلقات	۴ روپے
کبیر صاحب	۲ روپے
اردو زبان و ادب	۱ روپیہ
ہندوستان کے معاشرتی حالات	۱ روپیہ ۴ آنے
ناتس	۲ روپے ۸ آنے
فریب عمل	۲ روپے

(کتابستان الہ آباد)

مثنوی ناسخ	۱۲ آنے
بس کا روکھہ	۱ روپیہ
تاریخ اسلامی حصہ اول	۸ آنے
... ... دوم	۹ آنے
... ... سوم	۱۰ آنے
... ... چہارم	۱ روپیہ

موحدین	۲ روپے ۸ آنے
اخبار الاندلس جلد اول	۱۰ روپے
... . دوم	۸ روپے
... ... سوم	۷ روپے
تاریخ مغرب	۲ روپے ۸ آنے
خلافت موحدین	۴ روپے
عبادت اور اس کی غایت	۸ آنے
اساس عربی	۲ روپے
غریب القرآن	۲ روپے ۸ آنے

(تصانیف سید سجاد حیدر صاحب بی اے)

زہرا (ناول)	۸ آنے
خیالستان	۳ روپے
حکایات احتساسات	۱ روپیہ ۴ آنے
جلال الدین خوارزم شاہ	۱ روپیہ ۲ آنے
پرانا خواب (مع ۲ افسانے)	۱ روپیہ ۸ آنے
مطلوب حسینان	۸ آنے
آسیب الفت	۱۲ آنے
پرانا خواب	۱۰ آنے

(مصنفہ برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب)

نہتا وانا عرف رواداری	۱ روپیہ ۸ آنے

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری ، اپریل ، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم ایک سو اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑہ سو صفحے ہوگا —

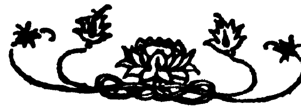
۳ - بنظر احتیاط رسالہ ذریعۂ رجسٹری بھیجا جاتا ہے —

۴ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملاکر سات روپیہ سکہ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپیہ سکہ عثمانیہ) —

۵ - تمام خط و کتابت آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئے —

———()‡※‡()———

(باھتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن اردو پریس ، اُردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)




اُردو
انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

بیشتر تصانیف جو مسیحی مذهب کی نشر و اشاعت کے لئے شائع هوتی هیں
اسی طرز کی زبان میں هوتی هیں —

آگرہ کے ایک معزز مسلمان محمد مردان علی خاں نے هندوستانی اخباروں کے اس طرز تحریر پر سخت افسوس ظاهر کیا هے * اور لکھتے هیں که اهل یورپ کی نظر میں هندوستانی زبان کی کوئی وقعت نهیں هے - وہ اسے محض ایک دفتری زبان سمجھتے هیں - چنانچه بنگال میں انگریزی اثر زیادہ هونے کے سبب سے وهاں کی اردو پهچان نهیں پڑتی - اکثر دیکھنے میں آیا هے که نهایت معزز انگریز هندوستانی کے ایسے لفظ اور فقرے بلا تکلف استعمال کرتے هیں جنهیں سن کر شرم آتی هے - عربی مثل هے که " الناس علی دین ملوکهم " - اور لوگ دیکھا دیکھی انگریزوں کی ریس میں وهی الفاظ اور فقرے استعمال کرنا شروع کردیتے هیں جو وہ ان کی زبان سے سنتے هیں - اور بعض لوگ عربی کی ایک اور دوسری مثل کو اپنی تائید میں پیش کرتے هیں - وہ مثل یه هے - " کلام الملک ملک الکلام " —

بهرحال اب اس امر کا تو قطعی فیصله هوچکا هے که هندوستانی زبان کو هندوستان بھر میں فوجی اغراض اور خط و کتابت کے لئے استعمال کیا جائے گا اس سے کوئی بھی انکار نهیں کرتا که هندوستانی (اردو) هی همارے ملک کی زبان هے ' فوجی چھاؤنیوں میں بازاروں میں' غرضکه هر کهیں یه بولی اور سمجھی جاتی هے - دکن میں بھی اور بالخصوص حیدرآباد اور میسور میں اس زبان کا خوب چرچا هے - ان علاقوں میں یه زبان مسلمان سپاهیوں کے ذریعه سے پهنچی اور آج بھی انگریزی افواج میں جو ان علاقوں میں رهتی هیں ' یهی زبان بولی جاتی هے - چنانچه انگریز حکام اگر سپاهیوں کے عام مجمع کو خطاب کرنا چاهیں تو وہ هندوستانی هی میں ان کے آگے تقریر کرتے هیں -

---

* اودہ اخبار ۰ ۷ جون سنه ۱۸۶۴ ع

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ گزشتہ فروری کے مہینے میں جب سرھنری مانٹگمری لفٹنٹ گورنر پنجاب دھلی سے لاھور واپس جاتے ھوے ریاست کپورتھلہ تشریف لے گئے تو اس موقع پر موصوف نے مشن اسکول کے طلباء کے سامنے ھندوستانی میں تقریر کی اور اس تقریر کے دوران میں اس اسکول کی تعلیمی حالت کے متعلق اطمینان کا اظہار کیا - اس کی دوسری قابل ذکر مثال یہ ہے کہ چند ماہ قبل وائسرائے ھند سر جان لارنس نے شملہ میں دربار منعقد کیا - یہ دربار اسی نوعیت کا تھا جیسا کہ لارڈ امہرسٹ کے زمانے میں سنہ ۱۸۲۷ ع میں منعقد ھوا تھا - اس دربار میں سب پہاڑی راجاؤں نے شرکت کی اور نذرانے پیش کئے - یہ رسم اطاعت گزاری کے اظہار کی غرض سے ھوا کرتی ہے - راجاؤں کے ساتھہ ان کے درباری، اور مشیران کار بھی اس دربار میں آئے اور ان کے بھڑک دار لباس پر سب کی نظریں اٹھتی تھیں - اس موقعہ پر سر جان لارنس نے ان سب معزز حاضرین کے رو برو ھندوستانی (اردو) زبان میں تقریر کی - ھندوستان کے اخبارات نے اس کے متعلق ذکر کرتے ھوئے لکھا ہے کہ سر جان شور کے سوا اور کسی وائسرائے نے اس سے قبل ھندوستانی زبان میں تقریر نہیں کی تھی - اس کے بعد ۱۸ اکتوبر کو لاھور میں وائسرائے نے ایک دوسرا دربار منعقد کیا - اس کا افتتاح بھی سر جان لارنس نے ھندوستانی زبان میں کیا - اس دربار میں چھہ سو راجاؤں اور جاگیرداروں نے شرکت کی تھی - ھندوستان کے اخبارات کا خیال ہے کہ پنجاب کی تاریخ میں سر جان لارنس کی یہ تقریر یادگار رہے گی - بعض اخباروں نے پوری تقریر نقل کردی ہے اور بعض نے اس کا ترجمہ درج کیا ہے —

ایک مشہور ھندو فاضل شیو پرشاد نے اپنی کتاب * "Itihas timirnacak"

* نام صاف طور پر سمجھہ میں نہیں آیا - مترجم -

کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ہندوستانی سب اهل ہند کی مادری زبان ہے۔ ہندوستان کے ہر حصے میں یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ فرانسیسی مقبوضات چندر نگر ' ینانوں ' پانڈی چری ' کاریکل ' ماهی ہر کہیں یہ زبان سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح پرتگیزی مقبوضات میں بھی اس زبان کے ذریعہ سے کام نکالا جاسکتا ہے۔ آج کل پرتگیزی مقبوضات کے گورنر جنرل کے سکریٹری ایک فاضل مستشرق ہیں جن کا نام مرسیو و اکھناریورا ہے —

میرے ایک پرانے شاگرد مسٹر ای سیسے ' نے جو آج کل کاریکل میں جہاز کے ایک افسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں ' میرے استفسار کا اپنے خط میں جواب دیا ہے۔ پانڈی چری کے ایک باشندہ نے مجھے لکھا تھا کہ لوگ تاملی علاقے میں ہندوستانی مطلق نہیں سمجھتے۔ اس پر میں نے مسٹر ای سیسے سے اس باب میں پوری کیفیت دریافت کی۔ وہ جواب میں یوں لکھتے ہیں : " آپ کو پانڈی چری سے جس کسی نے یہ لکھا ہے کہ تاملی علاقے میں ہندوستانی بالکل نہیں سمجھی جاتی اس نے غلط بیانی کی ہے۔ میں نے ابھی حال میں کرو منڈل سے لیکر ملا بار تک کوئی بارہ سو میل کا سفر کیا اثنائے سفر میں میں نے ' باوجود اس کے کہ تامل میری مادری زبان ہے ' جان بوجھکر لوگوں سے ہندوستانی میں گفتگو کی اور ہر جگہہ میری بات سمجھی گئی۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستانی زبان ہندوستان کے گوشے گوشے میں سمجھی جاتی ہے۔ اور دوسری زبانیں جیسے تامل ' گجراتی ' تلنگی ' کرناٹکی ' ملیالم اور بنگالی وغیرہ محض مقامی حیثیت رکھتی ہیں اور اپنے اپنے مخصوص صوبوں کے علاوہ اور کہیں نہ بولی جاتی ہیں اور نہ سمجھی جاتی ہیں "۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ کشمیر کی ریاست میں زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی ہے۔ ان پر ایک ہندو راجہ حکومت کرتا ہے۔ اس کا دارالسلطنت

سرینگر میں هے - اس کے زیادہ تر اعلی حکام بھی هندو هي هیں - کشمیر کے هندو مسلمان سب کشمیری زبان بولتے هیں لیکن اس کے ساتھہ هندوستانی زبان ریاست میں هر جگه بولی اور سمجھی جاتی هے - هندوستانی کے علاوہ وهاں فارسی زبان کا بھی اچھا خاصا چرچا هے —

جن انگریزوں کو هندوستان میں رهکر حکومت کے اعلی فرائض انجام دینے هیں ان کے لئے از بس ضروری هے که هندوستانی زبان پر پوری طرح حاوی هوں اور انھیں بخوبی سمجھه سکیں - دیسی زبانوں کے امتحانات کے جو نئے قواعد و ضوابط ۳ ستمبر کو شائع هوئے هیں ان کے رو سے هندوستانی زبان کے امتحان کے دو نصاب بنائے جائیں گے - ایک ان کے لئے هوگا جو فوج میں یا میڈیکل (طبی) شعبه میں جانا چاهتے هیں اور دوسرا ان کے لئے هوگا جو ترجمان کی خدمت کے لئے کوشش کرنا چاهتے هیں - ان قواعد کا نفاذ آئنده ماه فروری سے هوگا - پہلے نصاب کے مطابق امتحان میں شرکت کرنے والوں کے لئے فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں هندوستانی زبان کے چند اقتباسات پیش کئے جائیں گے جن کا انھیں سلیس زبان میں مطلب بیان کرنا هوگا - دوسرے امتحان میں باغ‌وبہار اور پریم ساگر کے اقتباسات کو پڑھوایا جائیگا اور ترجمه کرایا جائیگا - اس کے علاوہ انگریزی سے هندوستانی میں ترجمه کرنا هوگا - امیدواروں کو فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں لکھے هوئے خطوط کا مطلب بھي بتانا هوگا - اور ان دونوں رسوم الخط میں املا بھی لکھنا هوگا - اسی طرح اور دوسری دیسی زبانوں کے امتحانات هوں گے جن کی نسبت مجھے اس موقع پر کچھه کہنے کی ضرورت نہیں هے —

وہ امیدوار جو فوج کے محکمۂ رسد رسانی (کمسریٹ) میں خدمت حاصل

کرنا چاہتے ہیں انہیں امتحان میں ، سرچارلس وڈ کے مقرر کردہ قواعد کے مطابق ، ہندوستانی کی سرکاری تحریروں کا ترجمہ کرنا ہوگا ، ترجمہ میں صرف و نحو کی پوری پابندی لازمی ہے اور انہیں میں سے املا بھی لکھایا جائیگا - اس کے علاوہ انگریزی کا کوئی خط انہیں دیا جائیگا جس کا انہیں فوراً ہندوستانی زبان میں ترجمہ کرنا ہوگا - مختلف طبقوں کے دو تین ہندوستانی اس موقع پر موجود رہیں گے - امیدوار کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ ان سب کو اپنا مطلب اچھی طرح سمجھا سکے —

اسٹاف کور (Staff Korps) کے امتحانات اب بجائے سالانہ ہونے کے ہر شش ماہی کو ہوا کریں گے - پنجاب کے صوبے کے امتحانات بھی فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام ہوں گے - اب دہلی بھی پنجاب کے صوبے میں شامل کردیا گیا ہے - اس کا صوبۂ شمالی و مشرقی سے اب کوئی تعلق باقی نہیں رہا - صوبۂ شمالی و مشرقی کا دارالحکومت الہ آباد ہے اور اودھ کا صوبہ بھی اب اس صوبے میں ضم کردیا گیا ہے - ان امتحانات میں آج کل بڑی سختی کی جارہی ہے - چنانچہ ابھی حال میں گورنمنٹ ہند نے صرف اس بنا پر ایک اعلیٰ انگریز فوجی افسر کو بھوٹان نہیں جانے دیا اس لئے کہ وہ اس علاقے کی زبان کے امتحان میں ناکام رہا تھا * —

پچھلے سال جتنے اخبارات ہندوستانی زبان میں شائع ہورہے تھے وہ بدستور شائع ہورہے ہیں - ہندوستانیوں میں روز بروز اخبار بینی کا چسکا بڑھتا جارہا ہے - ان اخبارات میں بالعموم خبروں کے علاوہ عام معلومات بڑھانے کے لئے مضامین بھی ہوتے ہیں - ان میں نئی نئی ایجادات اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے متعلق مضامین ہوتے ہیں جنھیں لوگ بڑی دلچسپی سے

* انڈین میل - ۱۶ نومبر سنہ ۱۸۶۴ ع

پڑھتے ھیں - لکھنؤ کا " اودھ اخبار " اسی قسم کا ایک اخبار ھے * اس اخبار کی چند اشاعتیں میرے پیش نظر ھیں - اس میں خبروں کے علاوہ ادبی مضامین بھی ھیں - بعض مضامین دیوناگری رسم خط میں ھیں - یہ غالباً خاصکر ھندوؤں کے لئے لکھے گئے ھیں - ۲۱ مئی کی اشاعت میں " شفیلڈ " کی طغیانی کا حال لکھا ھے - یہ مضمون مسٹر ایڈورڈ ھنری پامر نے لکھا ھے - موصوف کیمبرج کے سینٹ جان کالج کے طالب علم رہ چکے ھیں - آپ نے ۲۴ سال کی عمر میں ھندوستانی زبان کی ایسی مہارت حاصل کر لی ھے کہ باید و شاید - یہ " سید عبداللہ " پروفیسر ھندوستانی لندن یونیورسٹی کے فیض صحبت کا اثر ھے - موصوف نہایت بے تکلفی سے ھندوستانی بول سکتے اور لکھ سکتے ھیں - اگر ان کا رنگ اس قدر گورا نہ ھوتا اور انگریزوں کا سا نام نہ ھوتا تو انھیں ھندوستانی مسلمان کہنے میں کوئی شخص مطلق تامل نہ کرتا - ھندوستانی کے علاوہ عربی اور فارسی کے قدیم ادب کی بھی موصوف نے تحصیل کی ھے - آگرہ کے ایک فاضل " سید سردان علی خان " نے " مسٹر ایڈورڈ ھنری پامر " کی فضیلت کا اعتراف اپنے اخبار کی ۷ جون والی اشاعت میں کیا ھے - وہ کہتے ھیں - میں نے کسی یورپین کو آج تک ھندوستانی زبان میں ایسا کمال حاصل کرتے نہیں دیکھا جو ' مسٹر پامر ' نے حاصل کیا ھے - موصوف کا طرز تحریر بھی نہایت شگفتہ ھے - جب سے میں سرکاری ملازمت میں ھوں ' میں نے صرف دو چار یورپین ایسے دیکھے ھیں جو بلا تکلف ھندوستانی میں تقریر کر سکتے ھیں اور خود ھندوستانیوں

---

* یہ ھفتہ وار اخبار چھوٹی تقطیع پر ۱۶ صفحوں کا ھوتا ھے - اس کی ادارت منشی ھرپرشاد کرتے ھیں - میں موصوف کا پہلے ذکر کر آیا ھوں - وہ ھر موضوع پر لکھنے کی صلاحیت رکھتے ھیں —

کے لب و لہجہ میں گفتگو کر سکتے ہیں - لیکن " مسٹر پامر " اس لئے اور بھی زیادہ قابل تعریف و مبارکباد ہیں کہ انگلستان کے اندر رہ کر انھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں ہندوستانی زبان پر ایسی قدرت حاصل کر لی جو ان کے ہزارہا اہل وطن باوجود پوری کوشش کے حاصل نہ کر سکے۔ اگر موصوف کی طرح اور دوسرے انگریز بھی ہندوستانی زبان سیکھیں تو اس میں ہندوستان اور انگلستان دونوں ملکوں کا نفع ہے۔ ہماری دعا ہے کہ " مسٹر پامر " بہت دنوں زندہ رہیں - موصوف ان چند انگریزوں میں سے ہیں جو ہندوستانی زبان کی اہمیت کو سمجھتے ہیں - موصوف کے مضمون کو دیکھہ کر میں تو دنگ رہ گیا " - اس اخبار کی دوسری اشاعت میں پروفیسر عبداللہ ' میر اولاد علی اور محمد وجاہت علی مدیر " اخبار عالم " میرٹھہ * نے بھی " مسٹر پامر " کی زبان دانی کی تعریف کی ہے —

میں اب ہندوستانی کے جدید اخبارات کے نام گناتا ہوں - میرٹھہ سے ایک اخبار نکلنا شروع ہوا ہے جس کا نام " نجم الاخبار " ہے - میرے پیش نظر اس اخبار کی چند اشاعتیں ہیں صوبہ شمالی و مشرقی کے ناظم تعلیمات مسٹر ایم کیمپسن نے ازراہ عنایت یہ اخبار میرے پاس بھیجا ہے - میرے خیال میں صوبہ شمالی و مشرقی کا یہ بہترین اخبار ہے - یہ اخبار ہفتہوار ہے اور چھوٹی تقطیع پر ۱۲ صفحوں میں چھپتا ہے -ہر صفحہ پر دو خانے (کالم) ہوتے ہیں —

آگرہ سے ایک اخبار نکلنا شروع ہوا ہے جس کا نام " بھارت کھنڈامرت "

* میں نے اپنے سنہ ۱۸۶۱ ع کے خطبہ میں اس اخبار کا ذکر کیا تھا میں نے کہا تھا کہ اخبار " دارالسلام " نامی طبع میں مطبع ہوتا ہے یہ غلط ہے۔ در اصل یہ اخبار مطبع نورالابصار میں چھپتا ہے —

ہے - اس اخبار کی مالک ہندوؤں کی معاشرتی و مذہبی اصلاح کی ایک انجمن ہے - اس اخبار کے بانیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وید مقدس کی الہامی تعلیمات زندگی کے چلن میں بہترین رہنما ہیں - اس مقدس کتاب کی تعلیم پر تمام ہندوؤں کو چلنا چاہئیے اور اس کے اصول کو دل و جان سے ماننا چاہئیے - اس اخبار کے بانیوں کے پیش نظر یہ نظر یہ نصب‌العین ہے کہ وہ اپنے ہم مذہب بھائیوں کو قدماء کے عقاید و اعمال کی سچائی اور ان کے رسوم اطوار کی سادگی کی جانب راغب کریں - اسی انجمن کی طرف سے ایک رسالہ شائع ہوا ہے جس میں شادی " بیاہ کی لایعنی رسوم اور اسراف کے خلاف تحریک کی گئی ہے - اس کا نام " امتناع اسراف شادی " ہے- سنہ ۱۸۶۳ ع میں دہلی میں اس کے جواب میں ایک اور دوسرا رسالہ نکلا تھا جس کا نام " مفیدالانام " تھا —

اخبار " مدراس ٹائمز " کے مالک مسٹر ونزا کیہنو نے اس سال ماہ جنوری میں یہ اعلان کیا تھا کہ وہ " ٹائمز آف‌ایشیا " کے نام سے اس اخبار کو پھر سے نکالنا شروع کریں گے - انہیں اس کا انتظار تھا کہ ٹائپ بنکر آجائے تو انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو' تامل' تلنگی' اور کنڑی کے اخبارات بھی جاری کردیں ہمیں پوری امید ہے کہ انہیں اس ارادہ میں کامیابی ہوئی ہوگی اور ان کے زیر اہتمام ایک اور ہندوستانی اخبار کا اضافہ ہوا ہوگا - مدراس میں پہلے سے بھی ایک ہندوستانی اخبار نکلتا ہے جس کا نام " جامع‌الاخبار " ہے - اس کے مدیر رحمت‌اللہ ہیں - یہ اخبار ہفتہ وار ہے اور ہر دوشنبہ کو شائع ہوتا ہے - یہ ۱۶ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے - ہر صفحے میں دو خانے ہوتے ہیں —

باوجود ہندوستانی لوگوں کی عدم توجہی کے وہ دن قریب آرہا ہے جب کہ تعلیم کے عام ہونے سے ہندوستان میں " رائے عامہ " پیدا ہوگی اور

اس کی کسوٹی پر لوگ ہر چیز کو پرکھیں گے ۔ ۲۷ فروری سنہ ۱۸۶۴ ع کے ٹائمز میں لکھا ہے کہ " ہندوستان کے گوشے گوشے سے اخبارات نکل رہے ہیں ان میں سے بیشتر کی ادارت کے فرائض اچھے طریقے سے ادا کئے جاتے ہیں ان میں سے بعض اخبارات کے مضامین دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مضمون نگاروں کی نظر وسیع ہے اور وہ انگریزی ادبیات اور انگریزی فن صحافت سے واقفیت رکھتے ہیں ۔ حکومت ان اخباروں کی کوئی مدد نہیں کرتی لیکن پھر بھی وہ سب اس کی حمایت میں مضامین شائع کرتے ہیں ' معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی لوگوں کے دلوں میں اہل یورپ کا احترام جاگزین ہوگیا ہے ۔ بقول گولڈسمتھ :

" ان کی چال میں غرور و تمکنت ہے ۔ ان کی نظروں سے رعب ٹپکتا ہے ۔ وہ دیکھو ' نوع انسانی کے سردار آرہے ہیں "۔

میں اپنے سالانہ خطبوں کا زیادہ تر مسالا مسٹر آرکست سے جو لاہور میں رہتے تھے ' حاصل کیا کرتا تھا ۔ موصوف اب کچھ عرصے کے لئے یورپ آئے ہوئے ہیں ۔ لیکن اور دوسرے احباب ہندوستان میں ایسے موجود ہیں جو ہندوستانی زبان کی دن دونی ترقی کے راز کو سمجھتے ہیں اور اس کی ترقی کے لئے خود بھی کوشاں ہیں ۔ انہیں احباب کے ذریعہ سے مجھے نئی کتابوں کے متعلق معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں ۔ میں نے بعض صاحبوں کو یہ شکایت کرتے سنا ہے کہ ہندوستانی زبان کا سارا ادب تراجم سے زیادہ نہیں اس میں انگریزی کی نقالی کے سوا رکھا ہی کیا ہے ۔ ہندوستانی لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ " انسانی طبیعت چور ہے " ۔ انسان کو یہ صلاحیت حاصل ہے کہ وہ دوسروں کے خیالات کو لیکر اپنا جامعہ پہنادے ۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ دوسروں کے خیال کو لے کر اپنے طرز ادا کے رنگ میں رنگ دیا جائے ۔

لیکن میرے خیال میں یہ دعوی قطعی طور پر بے بنیاد ہے کہ ہندوستانی میں سرقہ کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں - مجھ سے پہلے ولسن جیسا عالم فاضل شخص بھی یہی خیال ظاہر کرچکا ہے - سنسکرت کے مشہور عالم مسٹر ایڈورڈ کاول نے ابھی حال ہي میں "کشامنجلی" کا نیا ایڈیشن نکالا ہے جو میرے پاس بھی آیا ہے - اس کتاب میں زمانہ حال کے سب مشہور مصنفوں کے فلسفیانہ دلائل کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے - ایک دوسری کتاب "دفتر بے مثل" مجھے بھیجی گئی ہے - اگرچہ اس کتاب کا نام ایسا ہے کہ اس سے پہلے پہل آدمی دھوکے میں پڑ جاتا ہے لیکن یہ در اصل کلکتہ کے ایک معزز مسلمان کے اشعار کا انتخاب ہے - شاعر کا نام مولوي عبدالغفور ہے اور وہ "نساخ" تخلص کرتے ہیں - واقعہ یہ ہے کہ تخلص بھی انکسار کے خیال سے اسي قدر دور ہے جتنا کہ خود کتاب کا نام - یہ کتاب اسی سال طبع ہوئی ہے اور ۱۸۲ صفحات پر مشتمل ہے - یہ کتاب ٹائپ میں چھپي ہے - "نساخ" کلکتہ کے مشہور و معروف عبداللطیف خاں بہادر کے قریبی رشتہ دار ہیں - انہوں نے فریدالدین عطار کے پند نامہ کا اردو نظم میں ترجمہ بھی کیا ہے - اس بیاض میں بعض بعض اچھے خاصے شعر ملتے ہیں - یہ عجب بات ہے کہ اہل مشرق میں نظم کا بمقابلہ نثر کے بہت زیادہ چرچا ہے - میں بعض ہندوستانیوں کو جانتا ہوں جو انگلستان میں رہتے ہیں ' وہ بھی اپنی زبان میں برابر شعر و شاعری کیا کرتے ہیں - کسی دوسرے موقع پر میں نے سید عبد اللہ کے اشعار کا ذکر کیا ہے - اس وقت میرے پیش نظر ایک دوسرے ہندوستانی فاضل میر اولاد علی کي غزلیات ہیں - ان کا تخلص بھی میر ہے - میر تقی کا بھی یہی تخلص تھا - "نساخ" نے بعض بعض جگہ "ذوق" کا جواب لکھا ہے - "ذوق" اس وقت ہندوستان کے بہترین شاعر سمجھے جاتے ہیں - اسی لئے انہیں "خاقاني ہند" کا خطاب ملا ہے -

بابو شیوپرشاد کی محنت کی داد دینی چاھئے کہ انھوں نے ھندی میں ھندوستان کی مختصر تاریخ لکھی ھے - یہ تاریخ مدرسہ کے طلباء کے لئے لکھی گئی ھے- اس کا نام " Itihas timir nacak " ھے- ان کا ارادہ ھے کہ اس کتاب کو اردو رسم الخط میں بھی شائع کریں - تاریخ تین حصوں پر منقسم ھے - پہلے حصے میں ھندو اور مسلم عملداری کا حال ھے - اب تک یہی حصہ شائع ھوا ھے جو خود مصنف نے از راہ کرم مجھے بھیجا ھے - دوسرے حصے میں انگریزی عملداری کی ابتدا اور اس کی ترقی و عروج کا احوال ھوگا اور تیسرے حصے میں اُن تبدیلیوں کا ذکر کیا جاے گا جو انگریزی اثر سے ھندوستانیوں کے رسوم و رواج اور ان کے قوانین پر مترتب ھوئی ھیں- اسی تاریخ میں 'شیو پرشاد' نے یہ دعویٰ کیا ھے کہ 'الفنسٹن' اور 'ماریشمین' کی تاریخیں غلطیوں سے خالی نہیں ھیں —

کپتان 'اےآر فلر' ناظم شرشتۂ تعلیمات' پنجاب نے از راہ کرم مجھے اُردو کی ایک تاریخ ھند بھیجی ھے جو ان کے حکم سے لکھی گئی ھے- اس کتاب کا نام " واقعات ھند " ھے- مولف کا نام 'کریم الدین' ھے- اس تاریخ کا زیادہ تر سواد انگریزی اور ھندوستانی دستاویزوں سے حاصل کیا گیا ھے- چند ماہ کا عرصہ ھوا یہ کتاب لاھور میں طبع ھوئی- مولف موصوف نے ایک جغرافیہ بھی مدرسوں کے لئے لکھا ھے- اس کا نام " مفتاح الارض " رکھا ھے- محمد فاضل لاھوری نے اس کتاب کی کتابت کی اور پھر لاھور میں لیتھو پر چھپی —

مولوی 'کریم الدین' کی یہ دونوں کتابیں اور ان کے علاوہ ان کی اور دوسری تصانیف در اصل تراجم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ھیں- مولوی کریم الدین اپنے اور دوسرے اہل وطن کی طرح اس بات کو کوئی

عیب نہیں سمجھتے که کسی دوسرے مصنف کے خیالات کو بلا تکلف اپنی کتاب میں درج کردیں۔ هندوستان میں یه آزادی عام طور پر علمی دنیا میں برتی جاتی هے۔ مترجمین کو ان بین الاقوامی معاهدوں کی مطلق کوئی پروا نہیں هوتی جن کے مطابق ان کا فرض هے که وہ جب کسی مصنف کی کتاب سے کوئی مضمون لیں تو اس کا اعتراف کریں۔ ممکن هے یه شعار هندوستان کے مولفین و مصنفین کے لئے عارضی نفع کا باعث هوتا هو لیکن ذهنی ترقی کے لئے اس سے بڑھکر اور کوئی مضر بات نہیں هوسکتی۔ میں سمجھتا هوں مولوی کریم‌الدین آج کل جس نئی کتاب کو تالیف کر رهے هیں جس کا نام خدساصفا هے اس میں ضرور اس کا اعتراف کریں گے که انہوں نے دوسروں سے استفادہ کیا هے۔ یه کتاب حکومت پنجاب کے صرف سے طبع هوگی جیسا که انہوں نے مجھے اپنے ایک خط میں لکھا هے۔ نام سے معلوم هوتا هے که اس کتاب میں مختلف مصنفین کے خیالات کو یک جا جمع کر دیا گیا هے —

پنجاب کے ناظم سرشته تعلیمات نے مجھے ان هندوستانی کتابوں کی ایک فہرست بھیجی هے جو ابھی حال میں شائع هوئی هیں۔ چنانچه اس فہرست کی بعض کتابوں کی جانب میں آپ صاحبوں کی توجه مبذول کرانا چاهتا هوں ان کتابوں میں سے لاهور میں حسب ذیل طبع هوئی هیں —

(۱) فلسفه کے اصول پر ایک کتاب " اصول علم طبعی " هے۔ اس کی دوسری جلد کا نام " مخزن طبیعی " هے جس میں فطرت کے اصول بیان کئے گئے هیں —

(۲) گردهاری لال کی بهگوت گیتا کا هندی ترجمه۔ یه کتاب ۵۸۴ صفحات پر مشتمل هے —

(۳) آشوب نامہ - یہ افسانہ ہے - اس میں بھگوان داس اور گوپال رام دو
بھائیوں کا احوال درج ہے —

(۴) ھما - میر حسن کی فارسی صرف و نحو ہے - اس عجیب و غریب پرندے
کے نام کا موضوع کتاب سے بظاھر کوئی تعلق نہیں معلوم ھوتا —

(۵) مفتاح النعیم - اس میں اصول انشا درج ھیں اور ساتھ ھی خطوں کی
مثالیں بھی ھیں - خطوں کا طرز عام مشرقی خطوط سے ذرا مختلف
معلوم ھوتا ہے —

لدھیانہ میں مندرجہ ذیل کتابیں چھپی ھیں :

متعدد کتابیں سنی اور شیعہ فرقہ کے عقاید اور مباحثوں سے متعلق
ھیں - ان میں سے ایک کتاب کی ضخامت ۱۱۲۲ صفحے ہے —

" اشراقات عرشیہ " میں قصیدے اور نظمیں ھیں - یہ کتاب ۱۰۴
صفحات پر مشتمل ہے - قصیدے اور نظموں کا انتخاب سید فرزند علی نے
کیا ہے " باغ آدم " میں انبیا علیہم السلام کے حالات زندگی ھیں - " عجائب
ربع مسکوں " میں میر خوند کی تاریخ حبیب السیر کا خلاصہ ہے —

دھلی میں مندرجہ ذیل کتابیں چھپی ھیں —

(۱) " فغان دھلی " - اس میں سنہ ۵۷ ع کی شورش عظیم کے حالات درج
ھیں اور یہ بتایا ہے کہ مغلوں کے دارالسلطنت کو اس پرشور زمانے
میں کن کن مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا - یہ کتاب " اکمل المطابع "
میں چھپی ہے —

(۲) " دافع ھذیان " - اس میں فارسی کی لغت " برھان قاطع " کی
بعض غلطیوں پر تنقید ہے —

(۳) " درفش کاویانی " - اس کتاب میں قدیم فارسی پر تحقیقی نظر

ڈالی گئی ہے —

(۴) " مہتاب معرفت " - اس میں بدھمت اور ویدانت کے اصول کے مطابق عقل اور جذبات کی باہمی جنگ کی کیفیت درج ہے - یہ کتاب اخلاق کی تعلیم دیتی ہے - اصل سنسکرت سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے - نند داس نے اس کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے جامعہ کیمبرج کے کتبخانے میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے —

آگرہ کے مسٹر شکل نے ' جو ایک پادري ہیں ' مجھے لکھا ہے کہ مکندلال کي کتاب " بغاوت ہند " کے باقی چھہ اجزا بھی شائع ہوچکے ہیں - اس کتاب کے شروع کے اجزا کی نسبت میں پہلے ذکر کر آیا ہوں — (*)

مرزا پور کے اخبار " خیرخواہ ہند " کی ماہ فروری کی اشاعت میں سرجان لارنس وائسرائے ہند کی زندگی کے حالات درج ہیں اور اس کے ساتھہ ان کی تصویر بھی ہے - یہ پرچہ مجھے سرچارلس ٹریولین کی عنایت سے حاصل ہوسکا - اس اشاعت میں متعدد ایسی کتابوں پر تقریظیں بھی ہیں جو مشنری ' دیسی لوگوں میں دین مسیح کی نشرواشاعت کی غرض سے طبع کراتے ہیں - ان میں بعض کتابیں ایسی ہیں جن کا منشا یہ ہے کہ دیسی لوگوں میں مغربي علوم و تمدن کا چرچا بڑہ رہا ہے - مرزا پور سے ایسی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں جو ہندوستانیوں کے لئے بہت دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں جیسے تلسی داس کی رامائن - یہ کتاب دیوناگری رسم الخط میں ہے - ہندی کی کتابوں میں اس کو جو عام مقبولیت حاصل ہوئی وہ آج تک کسی اور کتاب کو نصیب نہیں ہوئی - ہندی میں سنسکرت کی صرف

* دیکھو خطبہ سنہ ۱۸۶۱ ع

و نحو پر ایک کتاب شائع ہوئی ہے - پنڈت بہاری لال نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا موضوع " قدیم ہند میں تعلیم نسواں " ہے - ان کے علاوہ ایک اور قابل ذکر کتاب " چراغ کلام " ہے - یہ کتاب بارہ اجزا پر مشتمل ہے —

اب آج کل خود یورپین لوگوں نے ہندوستانی ادبیات پر نئی نئی کتابیں لکھنا شروع کی ہیں - ان میں مشرقی طرز کی جھلک پائی جاتی ہے اور بعض وقت تو یہاں تک دھوکا ہوتا ہے کہ کہیں یہ کتاب کسی ہندوستانی کی لکھی ہوئی تو نہیں - اس وقت میرا روئے سخن ان مشنریوں کی طرف نہیں ہے جو لا تعداد کتابیں تبلیغی سلسلے میں ہر سال شائع کرتے رہتے ہیں بلکہ میری مراد اُن ادبی اور علمی کتب سے ہے جو ان انگریزوں کی تصانیف ہیں جنھیں مشرقی السنہ سے دلچسپی ہے - اس قسم کی ایک کتاب " داستان جمیلہ خاتون " ہے - مصنف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا لیکن دراصل یہ افسانہ خود مسٹر ایم کیمپسن کی تصنیف ہے - موصوف صوبہ شمالی مشرقی کے ناظم تعلیمات ہیں - ان سے قبل اس صوبہ کے ناظم تعلیمات مسٹر ایڈ تھے جن سے مجھے خصوصیت حاصل تھی - اگر کسی کو اصلی مصنف کا علم نہ ہو تو مشکل ہی سے کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کتاب کسی ہندوستانی مسلمان کے قلم سے نہیں نکلی - اس میں ایسی ایسی تشبیہیں اور استعارے بلا تکلف استعمال کئے گئے ہیں جنھیں صرف ٹھیٹ ہندوستانی ہی برت سکتا ہے - اس کے علاوہ اس کتاب میں عربی فارسی کے فقرے بھی جا بجا آتے ہیں - میرا تو خیال ہے کہ غالباً خود ہندوستانیوں کو اصل مصنف کا پتہ لگانے میں ذرا تامل ہوگا - ممکن ہے شبہ ہو تو اس سے ہو کہ اس کتاب کے شروع میں " بسم اللہ " نہیں ہے اور اس کا خاتمہ انجیل مقدس کے ایک

فقرہ پر ہوتا ہے —

یہ کتاب ہندوستانی مدارس کے طلباء کے لئے لکھی گئی ہے - اس کے دیباچے میں مصنف نے یہ بتایا ہے کہ ہندوستانی نوجوانوں کو جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں اخلاقی تعلیم نام کو نہیں ہوتی - اس کے بر خلاف عشق و نفس پرستی کے قصے انہیں پڑھائے جاتے ہیں - اس کمی کو پورا کرنے کی غرض سے انگریزی مدارس کی کتابوں کے طرز پر یہ کتاب لکھی گئی ہے - اس میں ایسے مضمون سے بحث کی ہے جسے پڑھ کر طلباء میں نیکی اور فرض شناسی کا شوق پیدا ہو اور بری باتوں سے وہ احتراز کرنا سیکھیں - اس کتاب کا مقصد طلباء کی اخلاقی اور مذہبی زندگی کو ابھارنا ہے - قصہ یہ ہے کہ کاشغر کے تخت کا وارث ایک نوعمر شہزادہ نوشہ ہوا - نوعمری کی وجہ سے سلطنت کا انتظام اس کے چچا انور کو تفویض ہوا - چچا کی نیت بدلی اور اس نے چاہا کہ نوشہ کو قتل کراکے خود سلطنت غصب کرلے - اس کام کے لئے اس نے ایک غلام کو جس کا نام حلبی تھا آمادہ کرلیا - حلبی نے اس کام کو انجام دینے کا وعدہ تو کرلیا لیکن خدا نے کچھ ایسی نیکی اس کے دل میں ڈالی کہ بجائے قتل کرنے کے وہ نوشہ کو اپنے ہمراہ لے کر شیراز میں پناہ گزیں ہوا - شیراز کے وزیر کی لڑکی جمیلہ خاتون پر نوشہ کی نظر پڑی اور وہ اس پر دل و جان سے عاشق ہوگیا - اس کے بعد نوشہ اور حلبی کو عجیب و غریب مہمات پیش آئیں لیکن بالآخر اس کو اپنے مقصد میں کامیابی نصیب ہوئی - اس نے انور کو شاہی محل کے ایک غار میں بند کردیا اور نوشہ کو تخت پر بٹھایا - پھر جمیلہ خاتون کی نوشہ سے شادی ہوئی اور وہ شیراز سے کاشغر آگئی —

سید احمد خاں کی تحریک پر ابھی حال میں بمقام کلکتہ مسلمانوں

کی ایک انجمن قایم ہوئی ہے جس کا نام " مجلس مذاکرۂ علمیہ اہل اسلام " رکھا گیا ہے - موصوف کا میں اپنے کسی پچھلے خطبہ میں تعارف کراچکا ہوں - آپ نے جو انجیل مقدس کی شرح لکھی ہے اس کا بھی میں ذکر کرچکا ہوں - آپ کی دوسری مشہور تصنیف " آثارالصنادید " ہے - سید احمد خاں نے ۶ اکتوبر سنہ ۱۸۶۳ ع میں اس انجمن کے جلسے میں ایک خطبہ دیا جو میرے پیش نظر ہے - جلسہ عبداللطیف خان بہادر کے زیر صدارت منعقد ہوا - سید احمد خاں نے اپنی تقریر میں یہ خیال پیش کیا کہ جن اقوام نے علوم و فنون میں ترقی کی یا کر رہی ہیں' اس کا سب سے بڑا محرک خارجی اثر ہوتا ہے - ہوتا یہ ہے کہ اقوام دوسروں کے علوم و فنون سے استفادہ کرکے انھیں پایۂ تکمیل کو پہنچاتی ہیں - مسلمانوں نے شروع میں علم و فلسفہ کے مبادیات یونانیوں سے سیکھے اور پھر اپنی محنت اور صبر سے علم و فلسفہ کو اوج کمال پر پہنچایا - جسے اس میں شبہ ہو وہ ان کی تصانیف دیکھے - ہندوؤں کی تصانیف قدیم زمانہ سے مشہور چلی آتی ہیں لیکن انھیں بھی جو علم و بصیرت ملی وہ ہندوستان کے شمال و مغرب کی آریا قوم سے ملی - چنانچہ خود ان کی کتابیں اس کی شاہد ہیں - خود انگریزوں نے جو آج دنیا میں تہذیب و تمدن کے علمبردار ہیں' دوسری اقوام سے بہت کچھ حاصل کیا ہے - بعد میں خود انھوں نے صبر اور محنت سے حاصل کردہ علم کو بڑھایا اور اسے ترقی دی - موصوف اپنی تقریر سے مسلمانوں کو ان کے عہد ماضی کی ترقی یاد دلانا چاہتے تھے اور یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ صدیوں تک علم و فن اور حکمت و دانش کے مالک تھے اور اب حال یہ ہے کہ وہ انتہائی اخلاقی پستی میں پڑے ہوئے ہیں - اسی طرح موصوف نے ہندوؤں کی طرف خطاب کرکے کہا کہ

ان کے بزرگوں نے بھی نئے نئے علم ایجاد کئے تھے اور آج یه عالم هے که ان پر بھی هر طرف یاس و حرمان طاری نظر آتے هیں - موصوف نے هندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے یه درخواست کی که اب وقت آ گیا هے که وه خواب غفلت سے بیدار هوں اور اپنے بزرگوں کی طرح علم و حکمت میں اپنا نام روشن کریں - موصوف نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یه طریقه تجویز کیا که هندوؤں اور مسلمانوں کی ایک کمیٹی بنائی جاے جس میں مذهب و ملت کی مطلق کوئی تفریق نه هو' اور اس کمیٹی کے سپرد یه کام هو که وه مغربی علوم و فنون کی کار آمد کتابوں کے ترجمے شائع کیا کرے - جہاں تک ممکن هو مذهبی کتابوں کے ترجمے نه کئے جائیں - ترجمے هندی اور اردو دونوں میں هونے ضروری هیں تا که هندو اور مسلمان ان سے استفاده کرسکیں - اس کے علاوه اگر ممکن هو هندوستان کی اور دوسری علمی زبانوں میں بھی ان ترجموں کو شائع کیا جاے —

اس تقریر کا خطاب چونکه زیاده تر مسلمانوں هی کی طرف تھا اس لئے سید احمد خاں نے خاص کر کے ان سے استدعا کی که وه اپنے دل میں حب وطن کا جذبه پیدا کریں اور ان پرجو یه الزام عاید کیا جاتا هے که انهیں اپنے وطن سے محبت نهیں اسے غلط ثابت کردیں - اس کے علاوه موصوف نے اس پر زور دیا که مسلمانوں کو چاهئے که اپنے هم مذهبوں کو تحصیل علم کی طرف مائل کریں اس واسطے که قعر مذلت سے نکلنے کا بس یهی ایک ذریعه هے - مسلمانوں پر جو اب تک مصیبتیں آئی هیں اور آج کل جن میں وه مبتلا هیں اس کی ذمه داری خود ان پر عاید هوتی هے - ان مصائب و آلام سے نجات پانے کی بس یهی ایک صورت هے که اب تک یورپ میں

جو ترقیاں ہوئی ہیں انہیں حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اہل یورپ کی زندگی کی سطح کے برابر آ جائیں - اس کا طریقہ یہ ہے کہ اہل یورپ کی علمی تصانیف کو پڑھنا چاہئے - اس سے کچھ غرض نہیں کہ یہ کتابیں مسلمانوں کی لکھی ہوئی نہیں ہیں اور ان میں بعض ایسی باتیں ہوتی ہیں جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہیں - مسلمانوں کے نزدیک قرآن میں بقول موسیو بار تھلمی سینٹ ہلیر "نظم ' مناجات ' دعا ' قانون ' وعظ ' رزمیہ ' مناظرہ اور تاریخ سب ہی کچھ موجود ہے" - * سید احمد خاں نے مسلمانوں کو ان کی تاریخ کی طرف توجہ دلائی کہ عرب لوگ باوجود اپنے دین و مذہب کے پابند ہونے کے فیثا غورث کی فلکیات کی تحقیقات میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے - اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ لوگ اس کے بے دینی کے فلسفہ کے قائل ہو گئے تھے - فلسفہ کے غلط دلائل کے متعلق ایک فارسی شاعر نے ٹھیک کہا ہے : —

پائے استدلالیاں چوبین بود -

ہندوؤں نے بھی اپنی ایک انجمن مدراس میں قایم کی ہے - اس انجمن کے ارکان پر مسیحی اثر غالب معلوم ہوتا ہے - اس انجمن کا نام " ستھیا وید سماجم " ہے - اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ہندوؤں کو مذہبی اخلاقی اور معاشرتی ترقی کی جانب توجہ دلائی جائے - اس مقصد کے حاصل کرنے کی غرض سے عام جلسوں میں تقریریں کرائی جائیں ' مباحثے منعقد ہوں اور مذہبی مسائل پر رسالے شایع کئے جائیں —

* Journal des Savants دسمبر سنہ ۱۸۶۳ ع

کلکتہ کی ایشیا ٹک سوسائٹي کی صدارت سر جان لارنس وائسرائے ہند نے قبول کر لی ہے۔ اس انجمن کے ذریعہ سے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو یورپ کے علما و فضلا سے ملنے کا موقع حاصل ہو گیا ہے۔ میری دانست میں اس سے ہندوستاني بہت کچھہ استفادہ کر سکتے ہیں —

سر جان لارنس وائسرائے ہند کو اپنی رعایا کی تعلیم سے خاص شغف ہے۔ اس وجہ سے روز بروز نئے نئے مدارس قایم ہو رہے ہیں۔ موصوف کو اس کی خاص فکر ہے کہ ہندوستان میں تہذیب و تمدن کو فروغ نصیب ہو۔ لکھنو میں کیننگ کالج قایم ہوا ہے۔ اس کے قایم کرنے میں اودہ کے تعلقہ داروں اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا خاص حصہ ہے۔ اس کالج میں مغربی اور مشرقی دونوں قسم کے علوم پڑھائے جاتے ہیں - سرکاری کالجوں کی طرح کیننگ کالج مین بھی انگریزی زبان کی بہترین تعلیم ہوتی ہے۔ یہاں انگریزی زبان کے شہ کار اور بالخصوص "شیکسپیر" کے المیہ ناٹک پڑھائے جاتے ہیں اور ہندوستانی لوگ ان ناٹکوں کی خوبیوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان کی داد دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ 'شیکسپیر' ہر زمانہ اور ہر ملک کا شاعر ہے۔ اس نے جو کچھہ لکھا ہے اس میں ایسی سادگی اور صداقت ہے کہ ہر ملک کے لوگ اس کے مطالب کو سمجھہ سکتے ہیں۔ خود "شیکسپیر" کا یہ قول ہے کہ ; —

" فطرت کے ذرا سے اشارہ پر نوع انسانی میں رشتہ اورقرابت پیدا ہو سکتی ہے " * —

---

* "One touch of natre makes the whole world kin" Trolius and cressida

سورابجی جمشید جی جی جی بھائی نے سورت میں ایک کالج قایم کرنے کی غرض سے ۶۵ ہزار روپیہ بطور عطیہ دیا ہے —

لاہور کا گورنمنت کالج با قاعدہ قایم ہوگیا - مسٹر جی لائٹنر اس کے صدر مقرر ہوئے ہیں - موصوف اچھے مستشرق ہیں * —

برہام پور میں کئی سال سے گورنمنٹ کالج موجود ہے اب اس کی نئی عمارت تیار ہو رہی ہے یہ عمارت گو تھک طرز کی ہے - درسوں کے لئے چودہ کمرے رکھے گئےہیں - ان کے علاوہ ایک کمرہ بحث و مباحثہ کے لئے علحدہ رکھا گیا ہے اور ایک دوسرے کمرے میں کتب خانہ رکھا جائے گا اس میں ۵۰ طالب علم بہ یک وقت بیٹھ کر کام کرسکیں گے —

ایک دولتمند پارسی نے ۵۰ ہزار روپیہ کا عطیہ اس لئے دیا ہے کہ اس سے ۵ ہندوستانی طلبا انگلستان کی جامعات میں جاکر تعلیم حاصل کریں اور وہاں سے ڈگریاں لائیں - ان میں سے بعض بیرسٹری پڑھیں گے اور اپنے وطن واپس آکر وکالت کا پیشہ اختیار کریں گے - بمبئی یونیورسٹی کو ایک مشہور و معروف ہندو پریم چند رائے چند نے دولاکھ روپے کی رقم بطور عطیہ دی ہے تاکہ اس رقم سے کتب خانہ قایم کیا جا ئے - بمبئی میں ابھی حال میں محمد حبیب بھائی کا انتقال ہوا ہے آپ نے بمبئی میں ایک کالج قایم کرنے کے لئے دولاکھ روپے کی رقم چھوڑی ہے - ۱۵ اکتوبر کو سربارٹل فریر گورنر صوبہ بمبئی نے اس کالج کا سنگ بنیاد رکھا اور اس کا نام " دکن کالج" تجویز کیا شہر بمبئی کے لئے جو ادارہ نہایت قابل

* انڈین میل فروری سنہ ۱۸۶۴ ع

قدر ہے وہ وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم اور وکٹوریہ گارڈن ہے جس کا افتتاح مسٹر جارج برڈوڈ کے زیر اهتمام هوا ہے - موصوف بمبئی کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی شاخ کے معتمد هیں - گورنمنٹ هند کی طرف سے اس ادارے کے ناظم کی تنخواہ گیارہ سو روپے ماهوار مقرر هوئی ہے - جب مسٹر برڈوڈ میوزیم اور باغ عامه دونوں کو اپنی پیش نظر اسکیم کے مطابق تنظیم دے چکیں گے تو غالباً وہ اس خدمت سے سبکدوشی حاصل کرلیں گے اس صورت میں کسی جو شیلے نوجوان ماهر سائنس کے لئے موقع هوگا که وہ ان کی جگه پر کام کرے اور میوزیم اور باغ عامه کو اور زیادہ ترقی دے —

الهآباد میں جو سرکاری میوزیم اور کتب خانه قایم هوا ہے اس سے یقین ہے که هندوستانیوں کو پورا فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا اور اس کی بدولت علم کی ترقی هوگی - اس عجائب خانے کے حسب ذیل حصے هوں گے (۱) قدیم هندوستان کی تاریخ کے متعلق اشیاء (۲) ریشے، لکڑی اور دھاتیں (۳) زرعی پیداوار (۴) مصنوعات (۵) تاریخ طبیعی کے نمونے (۶) مشینوں کے نمونے —

خیال یه ہے که لوگوں سے درخواست کی جائے گی که وہ اپنے کتب خانے بطور عطیات دیں - اس کے علاوہ دوسرے چھوٹے چھوٹے سرکاری اداروں میں جو کتابیں هیں انهیں بھی یهیں یکجا کردیا جائے گا - جو یورپین هندوستان چھوڑ کر وطن واپس هونے کا قصد کریں گے ان سے بھی درخواست کی جائےگی که وہ بھی اپنی کتابیں اس کتب خانے کو عنایت فرمائیں —

بنگال کے گورنر آنریبل سیسل بیڈن کو ابھی حال میں اردو میں ایک ایڈریس پیش کیا گیا جس میں یه درخواست کی گئی ہے که علی‌پور نیز دیگر مقامات میں جو زرعی نمایش سرکاری حکام کے زیر انتظام کی

گئی ہے وہ ہر سال ہوا کرے *۔ ان نمائشوں کے سلسلے میں ایک بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ ایک دن ہر جگہ صرف خواتین کے لئے مخصوص طور پر رکھا گیا اور انھوں نے اس میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا —

لاہور میں تعلیم نسواں کو خوب ترقی ہو رہی ہے۔ یہ تعلیمی تحریک بڑی حد تک 'بابو خان سنگھہ' کی جد و جہد اور شغف کا نتیجہ ہے۔ آپ بابا نانک کی اولاد میں ہیں جنھوں نے سکھہ مذہب قایم کیا تھا اور گرنتھہ کا مذہبی قانون انھیں کا بنایا ہوا ہے۔ پنڈت رام دیال نے لڑکیوں کے لئے "پہلا قاعدہ" لکھا ہے اور ایک اور کتاب گرمکھی رسم الخط میں پنجابی لڑکیوں کے لئے لکھی ہے۔ اس کتاب کا نام "بال اپدیش" ہے —

کلکتہ میں بیتھم اسکول لڑکیوں کی تعلیم کے لئے پہلے سے موجود ہی ہے۔ یہ اسکول اپنے بانی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کی بدولت بنگالی لڑکیوں کی تعلیم اور اخلاق پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ کلکتہ میں نیز دوسرے مقامات پر ایسی یورپین خواتین موجود ہیں جو بطور خدمت یا کچھہ تنخواہ لے کر زنانے میں جاکر ہندوستانی عورتوں کو تعلیم دیتی ہیں۔ میرے خیال میں ہندوستانی عورتوں کی تعلیم کے لئے یہ طریقہ بہترین ہے۔ ہندوستان کے شرفا کا یہ دستور ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو مدرسوں میں بھیجنا پسند نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ لڑکیوں کی بعض اوقات چار پانچ سال کی عمر میں شادی ہو جاتی ہے اور وہ تیرہ چودہ برس کی عمر میں مائیں بن جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں

* انڈین میل ۱۴ مارچ سنہ ۱۸۶۴ ع —

ان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ مدرسہ میں جاکر تعلیم حاصل کریں۔ اس لئے ان کی تعلیم کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ گھر پر اس کا انتظام کیا جائے۔ اس میں ایک نقصان یہ ضرور ہے کہ مدرسہ میں ایک دوسرے کو دیکھہ کر جو شوق پیدا ہوتا ہے وہ گھر کی تعلیم سے کبھی پیدا نہیں ہوسکتا ــ

انگریزی مشنریوں کو ہندوستانی مسلمانوں میں اتنی کامیابی نہیں حاصل ہوئی جتنی کہ ان کو ترکی میں حاصل ہوئی ہے۔ بہر حال ان کے اثر سے ہندوستانی مسلمانوں میں مذہبی اصلاح کا خیال پیدا ہوگیا ہے۔ چنانچہ ایک "مسلم مشنری سوسائٹی" قایم ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں اصلاحی کام کرے۔ دراصل خود اس انجمن کا رجحان بہت کچھہ مسیحی مذہب کی طرف ہے۔ عموماً مسلمان دراصل مسیحی تعلیم سے اس قدر دور نہیں ہوتے ہیں جیسا کہ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے۔ کلکتہ کے مہا پادری 'کاٹن' بھی میرے اس خیال کے موئد ہیں جیسا کہ ان کی ہدایات سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے ماتحتوں کو ابھی حال میں دی ہیں — *

ہندوستانی مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہے جو مسیحی مذہب کی خوبیوں کو اپنے مذہب میں سمو رہی ہے۔ اس جماعت کے اصلی لیڈر سید احمد خاں ہیں جو غازی پور کے رہنے والے ہیں †۔ میں موصوف

---

* " A Charge to the clergy of the Diocese and Province of Calcutta.

† سر سید احمد خاں مرحوم غازی پور میں بہ سلسلہ ملازمت سرکاری کچھہ عرصہ رہے تھے۔

مترجم

کی نسبت پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں - آپ ہی ہیں جنھوں نے انجیل کی تفسیر لکھی ہے اور ڈاکٹر کولینسو نے جو توارت پر اعتراضات کئے ہیں ان کا جواب دیا ہے - کلکتہ کے مہا پادری کاٹن کو یہ شکایت ہے کہ ان کا ضلع اسقف (Diocese) بہت وسیع ہے - لیکن اس کي وسعت مارس تک نہیں پہنچتی جہاں ایک علحدہ پادری رہتا ہے - پورٹ اویز میں " انجمن کلیسا " (Church Association) نے هندوستانی تارکین وطن کے لئے ایک کلیسا تعمیر کروایا ہے - یہاں ۲۷ اگست کو جو عبادت کی گئی اس کا ایک حصہ هندوستانی زبان میں تھا - اس کے علاوہ متعدد گیت اور مناجاتیں بھی هندوستانی زبان میں پڑھی گئیں —

مدراس کی انجمن ضلع اسقف نے هندوستانی' تامل اور تلگو زبانوں میں چھہ ہزار سے زائد رسائل چھپوائے ہیں تاکہ مسیحی مذہب کي نشر و اشاعت عوام الناس میں کی جائے - کلکتہ کے ضلع اسقف کی " ورناکلر کمیٹی " نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ' رڑکی ' کے پادری ' ایچ شل ' کی " صبح کی مناجات " اور " شام کی مناجات " کا هندی میں ترجمہ کریں - اس انجمن نے ' دهلی ' کے پادری ' ونٹر ' کو اُردو کے دو سو باتصویر اشتہارات چھپوا کر بھیجے ہیں تاکہ وہ انھیں تقسیم کریں - ان اشتہارات کا ریورنڈایم سلیٹر نے انگریزي سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے * —

' پیشاور ' کی " چرچ مشنری سوسائٹی " نے رنجیت سنگھہ کے زمانے کے ایک شاہی قلعہ کو اپنے مشن کا مرکز بنایا ہے —

مہا راجہ دلیپ سنگھہ جب حال ہی میں بمبئی سے گذرے تو انھوں نے ۱۰ اپریل کو ڈاکٹر ولسن کے گرجا میں هندی زبان میں لکچر دیا اس

* The Colonial Church Chronicle — جنوری سنہ ۱۸۶۴ ع

لئے که حاضرین جلسه میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت نہیں تھی جو انگریزی سمجھه سکتے - مہاراجه اپنی والدہ کی آخری وصیت پوری کرنے کی غرض سے هندوستان تشریف لے گئے تھے - وہ آخری وصیت یه تھی که مرنے کے بعد ان کی لاش دریائے گوداوری کے کنارہ نذر آتش کی جائے - (*) مہاراجه نے ۱۲ اپریل کو سب هندوستانیوں کو Free general assembly institution میں مدعو کیا جنھوں نے مسیحی مذهب کو قبول کیا ھے - اس دعوت میں تقریباً ساڑھے چارسو آدمی شریک هوئے جن میں مشنری اور ان کے خاندان کے لوگ بھی شامل تھے - اس موقع پر متعدد تقریریں هوئیں - ڈاکٹر ولسن نے مہاراجه کے مسیحی مذهب قبول کرنے کی اهمیت بتلائی اور یه کہا که اس کا اور دوسرے هندوستانیوں پر بھی بہت اچھا اثر پڑے گا - ایک دیسی مشنری نے دکن میں مسیحی مذهب کی تبلیغ و اشاعت کے متعلق تفصیلات بیان کیں - اور کئی دیسیوں نے تقریریں کیں اسکول کی لڑکیوں نے هندی میں گیت اور مناجاتیں گائیں اور آخر میں ,, گاڈ سیو دی کنگ ،، (خدا همارے بادشاہ کو سلامت رکھے) گایا یه آخری گیت بھی بجائے گجراتی یا مرهٹی کے هندی زبان میں تھا † —

---

* مہارانی کی وصیت کے مطابق ان کی لاش هندوستان لائی گئی اور دریائے گوداوری کے کنارہ پر نذرآتش کی گئی - چونکه مہارانی صاحبه سمندر پار جاچکی تھیں اس لئے کسی برهمن نے اس آخری رسم میں شرکت نہیں کی - صرف ان لوگوں نے جو ذات باهر سمجھے جاتے هیں شرکت کی —

† هندوستان سے واپسی پر قاهرہ میں امریکی مشنری اسکول کی ایک لڑکی پر مہاراجه فریفته هوگئے اور اسکندریه میں ان کی شادی هوگئی مہاراجه کی بیوی کی عمر صرف سوله سال هے اس کی ماں قبطی هے اور باپ جرمن ، جس کا نام ملر هے —

آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ مشنریوں کی جد و جہد ہندوستان میں بالکل بے کار نہیں گئی - گزشتہ سالوں میں ڈاکٹر رتن کو خاص کرکے کامیابی حاصل ہوئی - موصوف پچھلے سال ہندوستان میں ۳۴ سال رہنے کے بعد انگلستان واپس آگئے ہیں - آپ کی مساعی کی بدولت ہندوستان کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں انقلاب پیدا ہوگیا - آپ نے اپنا پورا وقت ہندوستان میں مسیحی مذہب کی تبلیغ و اشاعت پر صرف کیا - الوداعی جلسوں میں ہندوستانیوں نے موصوف کے ساتھ اظہار خلوص کیا موصوف نے ایک جلسہ میں کہا کہ انھوں نے ھگلی کے ضلع میں چھ اینگلوورنکلر اسکول اپنے زمانے قیام میں قایم کئے - بقول گولڈ سمتھ : —

جب وہ کلیسا میں آتا تو اس کی شیریں کلامی اور خوش ادائی سے کلیسا پر رونق آجاتی - اس کی زبان سے جو صداقت کے الفاظ نکلتے ان کا دھرا اثر ہوتا تھا - وہ لوگ جو اس کا مذاق اڑانے آتے اس کو دیکھکر چپ چاپ عبادت میں مشغول ہوجا تے * —

اس سال متعدد لوگوں کے انتقال پر ملال سے ہندوستانی ادب کو نا قابل تلافی نقصان برداشت کرنا پڑا - ڈاکٹر جیمس آر بلانٹین مدت سے جدید ہندوستانی زبانوں کو چھوڑ کر مقدس سنسکرت زبان کی تحقیق میں مصروف تھے - آپ نے ۱۶ فروری کو اس جہان فانی سے رحلت فرمائی - آپ جیمس میکل کے بھتیجے تھے - آپ نے ہندی اور بھاشا کی صرف ونحو پر ایک کتاب لکھی اور دوسری کتاب ہندوستانی صرف ونحو پر لکھی جس کے دو اڈیشن شائع ہوچکے

* Deserted Village

* ان کے علاوہ ایک کتاب " منتخبات ہندوستانی " (Hindustani Selections) کے نام سے اور ایک اور دوسری کتاب ہندوستانی انشاء پر لکھی جس کا نام "Hindustani, letters lithographed in the Nustaleck and shikustaamez Character" ہے - آپ کی ایک کتاب " Practical Oriental Inter preter " ہے - اس میں انگریزی سے ہندوستانی اور فارسی میں ترجمے کے طریقے اور مثالیں ہیں —

مسٹر بلانتین بالکل نوجوانی کے زمانہ میں اڈنبرا کی Military and Naval academy میں ہندوستانی زبان کے پروفیسر مقرر ہوئے - کئی سال تک ہندوستان میں بنارس کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے کام کیا - پھر East India House کے کتبخانے کے ناظم مقرر ہوگئے - موصوف سے پہلے ایچ ایچ ولسن اس خدمت پر تھے - ان سے پہلے Wilkins تھے ' اور ان سے قبل Fitz - Edward Hall تھے جو King's College میں ہندوستانی کے پروفیسر تھے - مسٹر بلانتین اپنی موت سے قبل سنسکرت کی ایک کتاب " مہابھاشیا " کی اشاعت میں مشغول تھے - یہ کتاب پنینی کی صرف ونحو کی شرح ہے - ان کا ارادہ تھا کہ اسے چار جلدوں میں شائع کریں گے لیکن اپنی زندگی میں صرف ایک شائع کرسکے - پہلی جلد ۸۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور قدیم ہندوؤں کی کتابوں کی طرح لمبی تقطیع پر ہے - اس کتاب کی طباعت کے اخراجات حکومت ہند کی جانب سے دئے گئے —

گزشتہ مئی کے مہینے میں انجیر کے مقام پر موسیو فلکس بوتر و

* Elements of Hindi and Bhaka Grammar اور Hindustani Grammar and Exercises —

کا انتقال ہوگیا - آپ کو علمی دنیا میں زیادہ شہرت اس لئے نہیں حاصل ہوئی کہ آپ نہایت ہی منکسرالمزاج شخص تھے - وہ لوگ جنھیں آپ کے ساتھہ سابقہ رہا ان کے دل میں آپ کی ہمیشہ قدر اور عزت رہی - آپ کا شمار ان چند نفوس میں ہونا چاہئے جنھوں نے فارسی کی جگہ ہندوستانی کو رواج دینے میں کوشش کی اور خود ہندوستانیوں کو نثر لکھنے کا شوق دلایا - ورنہ عام طور پر اب تک دستور یہ تھا کہ صرف نظمیں روز مرہ کی زبان میں لکھی جاتی تھیں اور نثر فارسی میں لکھی جاتی تھی - جس طرح اٹلی ، فرانس انگلستان ، اور جرمنی میں لاطینی کی جگہ ملکی زبانوں کو فروغ ہوا اسی طرح ہندوستان میں بھی ہندوستانی کی اہمیت فارسی کے مقابلے میں زیادہ بڑھنے لگی - یورپ میں جب کہ علمی دنیا میں محض لاطینی استعمال ہوتی تھی ، شعر کی زبان ہمیشہ قومی زبان رہی —

موسیو بوترو فرانسیسی نژاد تھے - وہ مقام ' مین ' میں پیدا ہوئے - سنہ ۱۸۲۴ م میں وہ اپنے کسی قریبی عزیز کے پاس ہندوستان چلے گئے - اس طرح انھیں اس کا موقع ملا کہ ہندوستانی زبان کی تحصیل کریں - بچپن کی عمر میں وہ ہندوستان آئے اس لئے زبان سیکھنے میں انھیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی - انھیں تحریر اور تقریر میں کوئی تکلف باقی نہ رہا تھا - سنہ ۱۸۳۴ ع میں انھوں نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا - سنہ ۱۸۴۰ م میں حکومت کی طرف سے انھیں دھلی کے دیسی کالج کی صدارت تفویض ہوئی اور انھیں شہر دہلی کی " مجلس تعلیمی " کی معتمدی پر سرفراز کیا گیا - " مجلس تعلیمی " کے ماتحت جس قدر بھی مدارس تھے ان کی نظارت کا کام بھی انھیں کے سپرد تھا - سنہ ۱۸۴۱ ع

میں وہ ایک کمیشن کے سکریٹری بنائے گئے جس کے پیش نظر یہ کام تھا کہ ہندوستانی طلبا کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک ایسا نصاب تیار کیا جائے جس کے ذریعہ مادری زبان میں (بالخصوص ہندوستانی زبان میں) تعلیم دی جا سکے - اس لئے کہ اس زمانے تک اعلیٰ تعلیم فارسی میں دیجاتی تھی اور بعض مدارس میں عربی یا سنسکرت کی وساطت سے - سنہ ۱۸۴۱ م سے ۱۸۴۵ ع تک اس کمیشن نے بس یہ کام کیا کہ ہندوستانی میں تیس اعلیٰ پایہ کی کتابیں لکھوائیں - یہ کتابیں مختلف موضوعوں پر تھیں - طبعیات ' کیمیا ' ریاضی ' فلکیات ' آئین سازی ' معاشیات ' اور قانون کے موضوعوں کے علاوہ شعر و شاعری پر بھی کتابیں تیار کروائی گئیں - ورنہ اس سے پہلے یہ دستور تھا کہ اشعار زیادہ تر قلمی نسخوں تک محدود رہتے تھے - موسیو بوترو نے خود تین کتابیں لکھیں - یہ کتابیں در اصل ان درسوں پر مشتمل تھیں جو وہ پروفیسر کی حیثیت سے پہلے اپنے طلباء کے سامنے بیان کرچکے تھے - پہلی کتاب " اصول قانون سازی " سے متعلق تھی دوسری " ہندوستان کی مالیات" پر تھی اور تیسری " حقوق شخصی " پر تھی * —

سنہ ۱۸۴۵ ع کے اواخر میں موسیو بوترو کی صحت بہت خراب ہوگئی

---

* ان تینوں کتابوں کا ایک ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے - انھیں میں بڑی دشواری سے حاصل کر سکا - یہ تینوں کتابیں دھلی میں لیتھو پر چھپی ہیں - پہلی کتاب میں ۳۵۰ صفحے ہیں' دوسری میں ۱۶۶ صفحے ہیں اور تیسری کتاب ۲۱۰ صفحات پر مشتمل ہے —

تھی چنانچه انھیں یھی مشورہ دیا گیا که وہ اپنے وطن فرانس چلے جائیں کیا عجب ھے که وھاں کی آب و ھوا ان کے لئے اکسیر ثابت ھو - موصوف کی ھندوستان سے روانگی پر جو الوداعی جلسے ھوئے ان میں گورنمنٹ ھند کے سب اعلیٰ حکام نے ھمدردی اور افسوس کا اظہار کیا اور ساتھه ھی اس خواھش کا بھی اظہار کیا که جب ان کی صحت بہتر ھو جاے تو وہ اپنی خدمت پر واپس آ جائیں - لیکن موسیو بوترو کی صحت کی حالت ایسی تھی که ان کے لئے ھندوستان واپس جانا دشوار تھا - وہ مقام انجیر میں جاکر رھے - یہاں کی آب و ھوا ان کے موافق آئی اور کچھه عرصه بعد ان کی صحت اچھی ھوگئی - انجیر کے مجسٹریٹ کی لڑکی سے انھوں نے شادی کی اور اس کے بطن سے ان کے ایک صاحبزادہ تولد ھوا - مجھے پوری توقع ھے که ان کا صاحبزادہ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرے گا اور اپنی والدہ کی مرضی کو اپنا رھنما بنائے گا —

۱۷ جون کو انگلستان کے ایک مشہور و معروف مستشرق ریورنڈ ڈبلو کیورٹن کا انتقال ھوگیا - آپ کی عمر انتقال کے وقت ۵۶ سال کی تھی - آپ نے خاص کر سامی زبانوں کی تحقیق میں اپنی عمر گذار دی - ان زبانوں کے مطالعه کے سلسلے میں آپ نے ھندوستانی زبان بھی سیکھی تھی - آپ نے عربی اور عبرانی زبان میں بہت مہارت پیدا کرلی تھی چنانچه آپ نے ان دونوں زبانوں کی بعض مشہور کتابوں کے ترجمے کئے ھیں اور کئی تصانیف چھوڑی ھیں - آپ ھی کی کوشش کی بدولت ' متی ' کی انجیل کا سب سے قدیم متن دریافت ھوا اور St. Ignace کے خطوط کا اصل اور ترجمه سب سے پہلے آپ ھی نے معلوم کیا - میڈم ' کیورٹن نے ان قدیم

قلمی نسخوں کے چربے خود اتارے ھیں —

گزشتہ ۷ اپریل کو بمقام ' جنیوا ' موسیو آندرے ژانان کا انتقال ہوا - آپ میرے بہت قدیم شاگردوں میں سے تھے - آپ نے علم لسانیات پر متعدد تصانیف چھوڑی ھیں - آپ برابر نو مہینے فریش رہے لیکن کبھی ایک حرف بھی اپنی تکلیف اور بیماری کے متعلق کسی دوست کے سامنے زبان سے نہیں نکالا - مرنے سے چند روز قبل جب آپ کو اس امر کا احساس ہوگیا تھا کہ اب وہ تھوڑے دنوں کے دنیا میں اور مہمان ھیں' آپ نے اپنی ایک نظم احباب کے لئے چھپوائی جس کا عنوان " قاصد کا چل چلاؤ " تھا - یہ نظم وہ اپنے احباب کے لئے اپنی آخری یادگار چھوڑ گئے ھیں - اس نظم سے ان کے دل کی حالت کا پتہ چلتا ھے - اس نظم کا آخری بند یہ ھے :—

" موت سر پر کھڑی ھے لیکن پھر بھی تو خوش ھے ' مصائب کا ھجوم ھے لیکن تیری زبان سے اُف تک نہیں نکلتی - تو باوجود رنج و الم کے مگن ھے - روح القدس نے تجھے قوت اور صبر عطا کیا ھے - عقیدے کے بل پر تو سب کچھ جھیل سکتا ھے - صلیب کا اپنے دل میں خیال کر اور یوں کہہ : اے میری پیاری روح ' ابھی ذرا اور انتظار کر اور یقین کو ھاتھ سے جانے نہ دے * " —

---

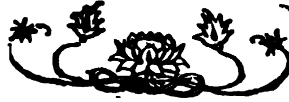
* عجب اتفاق ھے کہ موسیو آندرے ژانان کے انتقال کے چند ھفتے کے اندر ان کا فرزند اور بھتیجہ ' جنیوا ' کی جھیل میں ڈوب کر مرے - وہ سیر کو کشتی میں جارہے تھے کہ ہوا کی شدت سے ان کی کشتی اُلٹ گئی اور وہ دونوں ڈوب گئے —

گزشتہ اکتوبر کی ۱۰ تاریخ کو بمقام ایبٹ آباد میجر ' ایچ آر ' جیمس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ پنجاب کے کمشنر تھے اور ہندوستانی زبان پر آپ کی نظر بہت وسیع تھی۔ آپ جنگ بہادر والیء ' نیپال ' کے ہمراہ ' پیرس ' تشریف لائے تھے اس وقت مجھے آپ سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ آپ کے انتقال پر ملال سے سارے ہندوستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ لوگوں کے دل میں آپ کی بڑی عزت تھی اور بالکل بجا تھی۔ آپ کی بدولت ہزارہا مخلوق کو فائدہ پہنچا اور ان کی مرفہ الحالی میں اضافہ ہوا۔ جس طرح فرانسیسی حکومت کے ماتحت ' الجیریا ' کی مرفہ الحالی دن دونی بڑھ رہی ہے بالکل اسی طرح برطانوی اقتدار کی بدولت ہندوستانیوں کی عام خوش حالی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نوعِ انسانی کا فائدہ اسی میں ہے کہ ہماری حکومت ' الجیریا ' میں قایم رہے اور برطانیہ کا جھنڈا ہندوستان میں لہلہاتا رہے۔ شیکسپیر نے تین صدی قبل جو اشعار لکھے ہیں وہ ہمارے حسب حال ہیں اور ان اشعار سے اس شاعر کے مسیحی عقیدے اور ہمدردی کا پتہ چلتا ہے —

" خدا کرے کہ انگلستان اور فرانس کی مملکتوں میں ایک دوسرے سے بغض و نفرت باقی نہ رہے۔ ان دونوں ملکوں کے ساحل باہمی رشک و حسد کے باعث زرد رنگ کے ہو گئے ہیں کیا اچھا ہو اگر ان دونوں ملکوں کے درمیان مسیحی دین کے سچے ماننے والوں کی طرح لطف و اتحاد پیدا

ہو جاے اور دونوں پڑوسیوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگیں۔ خدا کرے کہ ان دونوں کے دلوں میں یہ بات جم جاے۔ اور وہ کبھی ایک دوسرے کے خون میں اپنی تلوار کو رنگین نہ کریں" * —

* Henry V th, act V. Sc. 4.



ادبی مضامین ٹیگور

(۳)

ادبیات کے نقاد

(مترجمہ پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار

لکچرار انٹر میڈیٹ کالج ' اورنگ آباد دکن)

گھر میں بیٹھ کر جب ہم خوشی کے وقت ہنستے ہیں یا دکھ میں روتے ہیں تو کبھی دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ ہمیں اس سے زیادہ ہنسنا چاہئیے تھا یا ہمارے رونے کی مقدار کچھ کم ہوئی ہے - لیکن جب دوسرے کو اپنی خوشی یا دکھ کا دکھانا ضروری ہو جاتا ہے تو دل کے جذبات حقیقی ہونے پر بھی اُن کی بیرونی نمائش پورے طور پر اُن جذبات کے اظہار کا حق ادا نہیں کر سکتی —

اتنا ہی کیوں ' جس وقت ماں دھاڑیں مار مار کر روتی ہوئی گاؤں والوں کی نیند حرام کر دیتی ہے اُس وقت وہ صرف اپنے بیٹے کے سوگ میں روتی ہے یہ بات نہیں ہے بلکہ وہ بیٹے کے سوگ کی اہمیت بھی دکھانا چاہتی ہے - اپنے کو سکھ یا دکھ کے دکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی اسے دوسروں کو دکھانا پڑتا ہے اس وجہ سے غم کے لئے جس قدر رونا لازمی ہے اظہار غم کے لئے اُس سے زیادہ آہ و زاری کے بغیر کام نہیں چل سکتا —

اس کو بناوٹی کہہ کر نظر انداز کر دینا بے انصافی ہو گی۔ سوگ کو دکھانا، سوگ کو نمایاں کرنے کا ایک قدرتی جز ہے۔ میرے بیٹے کی قدر و قیمت میری نظروں میں کتنی بڑی ہے، اُس کا فراق کس قدر روح فرسا ہے اسے دنیا میں دوسرا اور کوئی نہیں سمجھے گا اُس کے نہ رہنے پر بھی دنیا کے سب لوگ نہایت اطمینان سے کھاتے، پیتے، سوتے اور دفتروں میں آتے جاتے رہیں گے۔ اُس کے بیٹے کی طرف سے یہ لاپروائی سوگ زدہ ماں کو بہت صدمہ پہنچاتی ہے تب وہ اپنے سوگ کے زور پر اپنے اس نقصان کی زیادتی کو دنیا کے سامنے اعلان کرکے گویا اپنے بیٹے کو عظمت دینا چاہتی ہے —

جہاں تک سوگ اپنے لئے ہوتا ہے وہاں تک اس پر ایک قدرتی قابو ہوتا ہے لیکن جب وہ دوسروں کے سامنے اعلان کرنے کے لئے ہوتا ہے تو وہ بہت کچھ واجبی حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ دوسرے کے غیر حساس دل کو اپنے سوگ کے ذریعے سے پگلا دینے کی قدرتی خواہش اس میں بناوٹ پیدا کر دیتی ہے —

صرف سوگ ہی میں نہیں ہمارے اکثر دلی جذبات کے یہی دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک اپنے لئے اور دوسرا دوسروں کے لئے۔ اگر ہم اپنے دل کے جذبے کو عام لوگوں کا جذبہ بنا سکیں تو اس میں ایک طرح کا اطمینان ہے، ایک قسم کی عظمت ہے۔ جو چیز مجھے ہلا دیتی ہے تم اُس کی طرف سے بے حس رہتے ہو یہ مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا —

اس کا سبب یہ ہے کہ سچائی کا قیام اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ بہت سے لوگ اُسے تسلیم نہ کر لیں۔ اگر میں ہی آسمان کو پیلا دیکھوں اور دس آدمی نہ دیکھیں تو اس سے یہی ہوتا ہے کہ مجھے کوئی بیماری

ہے - یہ میری کمزوری ہے —

ہمارے دل کے درد کے ساتھ دنیا کے جتنے زیادہ لوگ ہمدردی کا اظہار کریں گے اتنی ہی اس کی سچائی زیادہ قائم ہوگی - میں جسے بہت ہی زیادہ محسوس کر رہا ہوں وہ میری کمزوری' بیماری یا پاگل پن نہیں ہے بلکہ سچائی ہے - جب عام لوگ اسے تسلیم کرنے لگ جاتے ہیں تو مجھے خاص طور پر تسلی اور اطمینان حاصل ہوتا ہے —

جو چیز نیلی ہے اسے دس آدمیوں کے سامنے نیلی کہہ کر شائع کردینا مشکل نہیں ہے لیکن ہمارا سکھ یا دکھ' اور ہماری پسند یا ناپسندیدگی کو دوسروں کے نزدیک اسی طرح محسوس کرادینا جیسا کہ ہم محسوس کرتے ہیں' مشکل ہے - اس حالت میں صرف اپنے جذبے کو ظاہر کردینا کافی نہیں ہے اُسے اس طرح اظہار کرنا پڑتا ہے جس سے دوسرے بھی اُسے ٹھیک ٹھیک محسوس کرلیں —

اسی لئے ایسے موقع پر مبالغے کی ضرورت پڑتی ہے - جو چیز دور سے دکھائی پڑتی ہے اُسے کچھ بڑا کرکے ہی دکھانا پڑتا ہے - اُسے سچائی ہی کی وجہ سے اتنا بڑا کرنا پڑتا ہے ورنہ جس پیمانے پر جو چیز چھوٹی نظر آتی ہے اسی قدر وہ اصلیت سے دور ہوجاتی ہے اُسے بڑا کرکے ہی سچا کرنا پڑتا ہے —

میرا سکھ دکھ میرے لئے بے پردہ ہے' تمہارے لئے نہیں - مجھ سے تم دور ہو' اُسی دوری کا حساب کرکے اپنی بات کو تمہارے سامنے کچھ بڑھا کر کہنا پڑتا ہے —

حقیقت کی حفاظت کرتے ہوے اسے بڑا بنانے کی قوت میں ادیب کے

کہاں کا پتہ چلتا ہے - جو چیز جیسی ہے اُسے ویسی ہی لکھہ دینا ادبیات نہیں ہے —

سبب یہ ہے کہ میں قدرت میں جو کچھہ دیکھتا ہوں ' وہ میری نظر کے سامنے ہے - میرے حواس اس کی گواہی دیتے ہیں لیکن ادبیات میں جو کچھہ دیکھا جاتا ہے وہ قدرتی ہونے پر بھی نظر کے سامنے نہیں ہوتا اس لئے ادبیات میں پیش نظار نہ ہونے کی کمی کو پورا کرنا پڑتا ہے —

قدرت کی حقیقت اور ادبیات کی حقیقت میں یہیں سے فرق شروع ہوتا ہے - ادبیات میں ماں جس طرح روتی ہے حقیقی ماں ویسے نہیں روتی - لیکن اس وجہ سے ادبیات کی ماں کا رونا جھوٹا نہیں ہوتا - پہلے تو حقیقی رونا ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے اور اس کا درد شکلوں' اشاروں' گلے کی آوازوں' چہار سمت کے نظاروں اور سوگ کے سانحہ کی حقیقی مقدار کی بدولت ہمارے دلوں میں فوراً یقین اور ہمدردی پیدا کردیتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ قدرت کی ماں اپنے سوگ کو بالکل پورے طور پر ظاہر نہیں کرسکتی - یہ طاقت اس میں نہیں ہے اور اس کی ویسی حالت بھی نہیں ہے —

اسی وجہ سے ادبیات قدرت کا صحیح آئینہ نہیں ہے - صرف ادبیات ہی کیوں ' کوئی آرٹ بھی قدرت کی جوں کی توں نقل نہیں ہے - قدرت میں ہم صاف سامنے دیکھتے ہیں ' ادبیات اور فن لطیف میں سامنے نہیں دیکھتے - اس لئے اس جگہہ پر یہ دونوں ایک دوسرے کا آئینہ بن کر کام نہیں کرسکتے —

اسی سامنے نہ ہونے کی کمی کی وجہ سے ادبیات میں موزوں اور مقفیٰ زبان کی مختلف نزاکتوں اور ہم آہنگیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے - اس طرح کلام کا مضمون باہر سے مصنوعی ہوتا ہے لیکن اندر سے قدرت کے مقابلہ میں زیادہ حقیقی ہوجاتا ہے —

یہاں " مقابلہ میں زیادہ حقیقی " کے الفاظ کو استعمال کرنے کا خاص مطلب ہے - انسان کے جذبات کا خیال کرتے ہوے قدرت کی حقیقت مخلوط ٹوٹی پھوٹی اور عارضی ہوتی ہے - دنیا کی لہریں ہمیشہ اترتی چڑھتی رہتی ہیں ' دیکھتے دیکھتے ایک لہر دوسری پر آپڑتی ہے ' اس میں بڑی اور چھوٹی کا کوئی خیال نہیں ہوتا - معمولی اور غیر معمولی چھوٹی اور بڑی آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں - قدرت کے اس عظیم‌الشان تھیٹر (تماشاگاہ) میں جب ہم انسان کے جذبات کی تمثیل کو دیکھتے ہیں تو ہم قدرتی طور پر اس میں سے کچھ گھٹاتے ہیں ' اور قیاس سے کچھ اضافہ کردیتے ہیں اور تخیل سے بہت کچھ گھڑ لیتے ہیں ہمارا کوئی گہرا دوست بھی اپنی بالکل اصلی شکل میں ہمارے سامنے نہیں آتا - ہمارا حافظہ ایک ہشیار ادیب کے مانند اس کے بہت سے اجزا کو حذف کردیتا ہے - اس کے چھوٹے بڑے تمام اجزا اگر بالکل ٹھیک بے کم و کاست ہمارے حافظے میں محفوظ ہوجائیں تو اس ہجوم میں اس کی اصلی صورت مٹ جائے گی اور اگر ہم اس کے تمام اجزا کی حفاظت کریں گے تو اسے ہم صحیح طور پر نہیں دیکھ سکیں گے - جاننے کے معنی ہی یہی ہیں کہ جو چیز چھوڑنے کے قابل ہو وہ چھوڑدی جائے اور جو چیز لینے کے قابل ہو وہ لے لی جائے —

کچھہ بڑھانا بھی پڑتا ہے - ہم اپنے بہت گہرے دوست کو بھی اوسط درجے سے کم ہی دیکھتے ہیں - اُس کی زندگی کا بڑا حصہ ہماری نظر سے پوشیدہ رہتا ہے - ہم نہ تو اُس کا سایہ ہیں اور نہ اُس کے دل کی تہ تک پہنچنے والے ہیں ' اس کی زندگی کے بڑے حصہ کو ہم نہیں دیکھہ سکتے اور یہ چیز جو ہم نہیں دیکھہ سکتے اسی پر ہمارا تخیل کام کرتا ہے خالی مقامات کو پر کرکے دل کے اندر ایک پوری تصویر بنالیتے ہیں - جن لوگوں کے بارے میں ہمارا تخیل کام نہیں کرتا ' جن کا مخفی حصہ ہمارے نزدیک خلا ہی کی شکل میں رہتا ہے ' جن کا پیش نظر رہنے والا حصہ ہی ہمارے سامنے ہوتا ہے اور نظر سے پوشیدہ حصہ غیر واضح اور احساس کی رسائی سے بالا تر ہے ان کو ہم نہیں جانتے یا بہت کم جانتے ہیں - دنیا کے بہت سے لوگ اسی طرح ہمارے نزدیک سایہ ہیں اور اکثر ہمارے سامنے حقیقی شکل میں نہیں آتے - ان میں سے بہتوں کو وکیل ' ڈاکٹر یا دوکان دار کی شکل میں جانتے ہیں انسان کی شکل میں نہیں جانتے یعنی ہمارے ساتھہ اُن کا تعلق جن بیرونی مشاغل کی وجہ سے ہے وہی ہماری نظروں میں اُن کی بڑائی ہے لیکن اُن کی ذات میں اُن کے مشاغل سے بڑھ کر جو اور بڑائیاں ہیں وہ ہم پر کسی طرح اثر نہیں ڈال سکتیں —

ادبیات جو چیز ہمیں بتانی چاہتی ہے اسے پورے طور پر بتاتی ہے —— —— یعنی قائم رہنے والی چیز کی حفاظت کرکے غیر ضروری جز کو نکال کر ' چھوٹے کو چھوٹا کر کے اور بڑے کو بڑا کر کے خلا کو پر کر کے اور منتشر شدہ اجزا کو یک جا کر کے ہمارے سامنے پیش کرتی ہے - قدرت کی وسیع اور غیر جانب دار دنیا میں دل جو کچھہ کرنا چاہتا ہے ادبیات اُسے ظاہر کرتی ہے - دل قدرت کا آئینہ نہیں ہے اور نہ ادبیات قدرت

کی آرسی ہے - دل قدرتی چیز کو دل کی چیز بنا لیتا ہے ——— ادبیات اُسی دل کی چیز کو ادبیات کی چیز بنالیتی ہے — ۔

دونوں کے کام کرنے کا طریقہ اکثر یکساں ہوتا ہے - ان دونوں میں کئی خاص وجوہ سے فرق ہوگیا ہے - دل جو کچھہ گھڑ کر بناتا ہے اسے اپنی ضرورت کے لئے ہی بناتا ہے اور ادبیات جو کچھہ گڑھ کر بناتی ہے اُسے سب کی مسرت کے لئے بناتی ہے - اپنے لئے معمولی نوٹ کر کے رکھہ لینے سے بھی کام چل سکتا ہے لیکن جسے سب کے لئے بنانا ہے اُسے شروع سے آخر تک اچھی طرح مربوط کر کے ہی بنانا پڑتا ہے اور اُس کو ایسی جگہ پر ' اس طرح کی روشنی میں اور اس ترکیب سے رکھنا پڑتا ہے کہ وہ سب کو پوری طرح نظر آجائے - عام طور پر دل قدرت کے (خوان) سے چن چن کر سامان اکٹھا کرتا ہے اور ادبیات دل میں سے اکٹھا کرتی ہے دل کی چیز کو باہر نمایاں کرنے کے لئے قوت تخلیق کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے - اس طرح قدرت سے دل میں اور دل سے ادبیات میں جو کچھہ منعکس ہوتا ہے وہ نقل سے بہت دور ہوتا ہے —

حقیقی ادبیات میں ہم اپنے تخیل کو ' اپنے سکھہ دکھہ کو صرف زمانہ حال کے لئے نہیں بلکہ دوام کے لئے قائم کرنا چاہتے ہیں - اس لئے اُس کے پیمانے کو اُسی وسیع زمانہ دوام کے ساتھہ مطابق کرنا پڑتا ہے - قلیل وقت میں سے سامان اکٹھا کر کے جب اُسے دوام کے لئے تیار کرنا پڑتا ہے تو قلیل وقت کے ناپنے کے گز سے کام نہیں چل سکتا - اسی طرح مروجہ اور تنگ نظر دنیا کے ساتھہ اعلیٰ ادبیات کے پیمانے میں فرق کرنا پڑتا ہے —

اندر کی چیز کو باہر کی ' جذبات کی چیز کو زبان کی ' اپنی چیز کو عالم انسانی کی اور پل بھر رہنے والی چیز کو دوامی بنا دینا ادبیات کا کام ہے —

دنیا کے ساتھ دل کا جو تعلق ہوتا ہے دل کے ساتھ ادیب کی فطری ذہانت کا بھی وہی تعلق ہوتا ہے۔ اس فطری ذہانت کو عالم انسانی کا دل کہنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ دنیا میں سے دل اپنے مطلب کی چیزوں کو اکٹھا کرتا ہے اور اسی دل میں سے عالم انسانی کا دل پھر اپنی چیزوں کو اپنے لئے کھڑ لیتا ہے —

معلوم ہوتا ہے کہ بات بہت پیچیدہ ہو گئی ہے کچھ اور سلجھانے کی کوشش کروں گا۔ میں نہیں جانتا کہ میں اس کوشش میں کامیاب ہوں گا یا نہیں —

ہم اپنے اندر دو اجزا کی موجودگی محسوس کر سکتے ہیں۔ پہلا جز ہمارا اپنا پن ہے اور دوسرا جز ہماری انسانیت ہے۔ اگر ہمارا گھر ذی روح ہوتا تو وہ اپنے اندر کی محدود فضا اور اس کے ساتھ چاروں طرف پھیلی ہوئی وسیع فضا دونوں کو غور و فکر سے محسوس کرسکتا۔ ہمارے اندر کے اپنا پن اور انسانیت کا بھی یہی حال ہے۔ اگر دونوں کے بیچ میں ایک ایسی دیوار کھڑی ہو جو کسی طرح نہ ٹوٹ سکے تو روح اندھیرے کنوئے میں رہ جائے گی —

حقیقی ادیب کے دل میں اگر اس کے اپنے پن اور انسانیت کے اندر کسی چیز کی آڑ رہے تو وہ ایسی نہیں ہوتی کہ ہمارے تخیل کے شیشے میں صاف نظر نہ آتی ہو۔ اس کے بیچ میں سے ایک دوسرے کو پہچاننے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ یہی نہیں بلکہ یہی شیشہ دور دیکھنے اور نزدیک دیکھنے کا کام کرتا رہتا ہے۔ اور یہی غیر مرئی کو مرئی اور دور کی چیز کو نزدیک کی چیز بنا دیتا ہے —

ادیب کی وہی انسانیت ہی خالق ہے' مصنفین کے اپنے پن کو وہ اپنا بنالیتی ہے۔

پل بھر رہنے والی چیز کو وہ زندۂ جاوید کردیتی ہے اور جز کو کل بنا دیتی ہے۔

دنیا کے اوپر دل کا کارخانہ قائم ہے اور دل کے اُوپر عالم انسانی کے دل کا کارخانہ —— اسی اوپر کی منزل سے ادبیات کی پیدائش ہوتی ہے —

پہلے کہا جا چکا ہے کہ فن کی سلطنت میں حقیقت کا فیصلہ مشکل ہوجاتا ہے ۔ کالے کو کالا ثابت کرنا آسان ہے کیوں کہ اکثر کے نزدیک وہ بلاشبہ کالا ہے لیکن اچھے کو اچھا ثابت کرنا اتنا آسان نہیں ہے کیوں کہ اس بارے میں عالم انسانی کے ایک بڑے حصے کے اتفاق رائے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے شہادتوں کا فراہم کرنا مشکل ہے —

یہاں پر بہت سی مشکلیں آپڑتی ہیں ۔ انسانوں کا زیادہ حصہ جسے اچھا سمجھتا ہے کیا وہی حقیقت میں اچھا ہے یا خاص جماعت جسے اچھا سمجھتی ہے وہی در اصل اچھا ہے —

اگر سائنس کے حقائق چھوڑ دئے جائیں تو قدرتی چیزوں کے بارے میں بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کے انسانوں کا زیادہ حصہ جسے کالا سمجھتا ہے وہ حقیقت میں کالا ہے ۔ تجربے سے دیکھا گیا ہے کہ اس بارے میں اختلاف رائے کا اتنا کم امکان ہے کہ زیادہ شہادتوں کے فراہم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی —

لیکن اچھا اچھا ہی ہے ، اور کتنا اچھا ہے اس بارے میں اختلاف آرا کی وجہ سے اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے کس طرح شہادتیں فراہم کی جائیں —

اس میں خاص دقت اسی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے کہ ادیبوں کی اعلیٰ کوشش صرف زمانہ حال کے لئے ہی نہیں ہوتی اُن کا خطاب دوامی

سوسائٹی کی طرف ہوتا ہے - جس چیز کو زمانۂ حال اور زمانۂ مستقبل کے لئے لکھا جاتا ہے اس کے لئے شاہدوں اور نقادوں کا بہت بڑا حصہ زمانۂ حال میں سے کس طرح مل سکے گا —

یہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جو چیز کسی خاص وقت یا خاص جگہ سے متعلق ہوتی ہے وہی انسانوں کے زیادہ حصے کے نزدیک رتبہ عظیم حاصل کرلیتی ہے - کسی ایک خاص وقت کے شاہدوں کو لے کر اگر ہم ادبیات کے بارے میں فیصلہ کریں تو نا انصافی کا پورا پورا امکان ہے - اسی لئے ادبیات زمانۂ حال کی نسبت تمام زمانوں کی طرف متوجہ رہتی ہے —

وقتاً فوقتاً انسان کی مختلف تعلیم ' جذبات اور حالتوں کے بدل جانے پر بھی جو تصنیفات اپنی خصوصیات کی حفاظت کرتی ہوئی آگے قدم بڑھائے ہوے چلتی ہیں وہی آتشیں امتحان میں سے گزر چکی ہیں - نفس انسانی ہمارے لئے آسانی سے سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے اور اگر ہم اُسے تھوڑے سے وقت کے بیچ میں مقید کرکے دیکھیں تو اس کا غیر منقطع تسلسل میں سے دوامی اور غیر دوامی چیز کا چننا ہمارے لئے بہت زیادہ مشکل ہوگا - اسی وجہ سے ابد کے دارالتجربہ میں انسان کے نفس کی اشیا کو پرکھا جاتا ہے - اس کے سوا یقینی طور پر فیصلہ کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے —

لیکن کار اجرائی طریقہ نہ ہونے سے ادبیات میں انتشار پھیل جاتا ہے - ایسا نہیں ہے کہ عدالت ماتحت کے تمام فیصلے ہائیکورٹ کی عدالت مرافعہ میں کامیاب نہیں ہوتے - یہی ادبیات کی عدالت ماتحت کا حال ہے مرافعہ کے آخری فیصلے کے لئے بہت مدت درکار ہے - اس درمیانی مدت کے لئے ایک طرح کا سرسری فیصلہ حاصل ہوتا ہے اور اگر اس دوران میں

بے انصافی بھی ہو جائے تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے —

جس طرح ادبیات کی ذاتی تخلیق میں کسی انسان کی فطری ذہانت تمام زمانوں کی نمائندگی حاصل کرتی ہے۔ اور تمام زمانوں کی صداقت پر حق قائم کرلیتی ہے اُسی طرح تنقید کرنے یا انصاف کرنے والی بھی فطری ذہانت ہوتی ہے - بعض لوگوں کی پرکھنے کی قوت بھی قدرتی طور پر غیر معمولی ہوا کرتی ہے - جو چیز عارضی اور محدود ہوتی ہے وہ انہیں دھوکا نہیں دے سکتی اور جو چیز مستقل اور دوامی ہوتی ہے وہ اُسے فوراً پہچان لیتے ہیں اُن میں ادبیات کے ہمیشہ قائم رہنے والے اجزا کی تمیز کا خاص ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اور ان کی ساری رکانیں نا معلوم طریقہ سے ان کے دماغ میں جاگزیں ہو جاتی ہیں وہ فطرتاً اور تربیتاً تمام زمانوں کے نقاد کہلانے کے قابل ہوتے ہیں —

ان کے علاوہ پیشہ ور نقاد بھی ہوتے ہیں - اُن کا علم کتابی ہوتا ہے - وہ سر سوتی (علم کی دیوی) کے محل کی ڈیوڑھی پر بیٹھ کر شور غل ' ڈانٹ ڈپٹ اور دھینگا مشتی کا کام کرتے رہتے ہیں - محل سرا کے اندرونی حالات سے وہ بالکل لا علم رہتے ہیں - وہ اکثر شان و شوکت اور آرائش کو دیکھ کر ہی مبہوت ہو جاتے ہیں لیکن سر سوتی کی محل سرا میں جانے والے خاص لوگ پھٹے لباس میں غریبوں کی طرح ماں کے پاس جاتے ہیں اور وہ اُنہیں گود میں بٹھا کر اُن کی پیشانی کو بوسہ دیتی ہے - کبھی کبھی اُس کے سفید آنچل میں تھوڑی سی دھول بھی ڈالدیتے ہیں وہ اُسے ہنستے ہوے جھاڑ کر پھینک دیتی ہے - اس دھول اور مٹی کے ہوتے ہوے بھی سر سوتی جن کو اپنا کہہ کر گود میں بٹھاتی ہے انہیں ڈیوڑھی کے دربان کن خصوصیات سے پہچانیں گے ؟ - وہ لباس

کو پہچانتے ہیں انسان کو نہیں پہچانتے ۔ وہ دنگا فساد کر سکتے ہیں لیکن اُن پر غور کرنے یا اقتباس کرنے کی تمیز دلوں میں پیدا نہیں ہوتی ۔ سرسوتی کے خدمت گزاروں کی آڑ بھگت کرنے کی ذمہ داری جن پر ہے وہ خود بھی سرسوتی کی اولاد ہیں ۔ وہ گھر کے آدمی ہیں اس لئے گھر کے آدمی کے ساتھہ برتاؤ کرنے کے آداب جانتے ہیں —

اردو کے اَن پڑھ شاعر

از

[جناب مرزا فدا علی صاحب ' خنجر ' لکھنوی]

لال

لال محمد ولد فضل محمد باشندۂ گورکھ پور - اہل حرفہ سے تھا اور شاید فن سخن میں جناب عاشق سے فیض پایا تھا - شاعری کا بہت شوق تھا - بسا اوقات فکر سخن میں غرق رہتا اور بساط بھر اپنے کلام کو دل پذیر بنانے کی کوشش کرتا - لیکن کچھ بے علمی اور کچھ طبیعت کی نامناسبت سے مجبور تھا - لاکھ لاکھ زور لگایا مگر اُس کی شاعری نے معمولی تک بندی سے زیادہ مرتبہ نہ پایا - البتہ کبھی کبھی اتفاقیہ کوئی شعر ایسا بھی نظم کے سانچے میں ڈھل جاتا جس پر شعر کا اطلاق ہو سکتا - وہی کلام اُس کا مایۂ ناز اور اندراج تذکرہ کے قابل ٹھیرا - عرصہ سے کچھ حال معلوم نہیں - خدا جانے زندہ ہے یا رحمت حق سے پیوست ہوا - اُس کے دو شعر نمونۂ کلام کے طور پر لکھے جاتے ہیں - ملاحظہ ہوں —

ساقیا ابر ہے ' گلشن پہ گھٹا چھائی ہے   آج اک جام پلادے کہ بہار آئی ہے

سیکڑوں دیکھنے والے ہیں ترے جلوہ کے
" لال " سے بڑہ کے مگر کون تماشائی ہے

مجیب

" مجیب " تخلص - غلام حیدر نام - لکھنؤ کے رہنے والے اور ناسخ و آتش کے ہم عہد تھے - خوش فکر و صاحب ذہن رسا تھے - شاعری کے واسطے دل و دماغ بہتر پایا تھا - ہر ردیف اور ہر بحر میں طبیعت اپنی شگفتگی و روانی دکھاتی - فن سخن میں اُستاد وقت خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے - علم سے مطلق بہرا نہ تھا - ان کی نسبت مولوی عبدالغفور خاں " نساخ " نے سخن شعرا میں لکھا ہے —

" غلام حیدر اپنے کو آتش کا شاگرد بتلاتا ہے - جاہل "
" محض ہے - بہت دنوں تک کلکتے میں تھا " —

جب باغ لکھنؤ خزاں ہوا - شاہ اودہ مٹیا برج (کلکتہ) کو جا بسایا اور بیس ہزار سے زیادہ متوسلین دامن دولت وطن کو ترک کر کے کلکتہ پہنچے تو مجیب کو بھی فکر معاش نے شہر سے نکالا - اور یہ صحرا صحرا کی خاک چھانتے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہوے کلکتے پہنچے اور سرکار شاہی سے متوسل ہوگئے - اُنھیں دنوں میں مولوی عبدالغفور خاں نساخ سے ملاقات ہوئی جس کی نسبت اُنھوں نے اپنی تحریر میں اشارا کیا ہے -

مجیب کلکتے کے مشاعروں میں شریک ہوتے - " برق " " قلق " " اسیر " بحر ، " یاور " اور دیگر شعرائے سرکار شاہی کے ساتھ مشق سخن کرتے

اور داد کلام لیتے - ترتیب سخن شعرا کے وقت سنہ ۱۲۹۱ ھ میں زندہ و سلامت موجود تھے - کلام یہ ہے —

آپ آزاد کس کو کرتے ہیں　　بندہ پرور ؟ میں کچھہ غلام نہیں
اس کے پینے میں کیا تکلف ہے　　بادۂ عشق تو حرام نہیں
بے وفائی و کج روی کے سوا　　خوبیوں میں تری کلام نہیں
ہو لطف کی نگاہ کہ جور و جفا کریں　　ممکن نہیں کہ چاہنے والے گلا کریں

جب بعد فنا ظلم ترے یاد کریں گے　　ہم قبر میں بھی نالہ و فریاد کریں گے
مرغان چمن چھٹ کے بھی فریاد کریں گے　　جب جب وہ اسیرئی قفس یاد کریں گے
ہم باغ میں خوش قامتئی یار کے آگے
سو راستئی سرو پہ ایزاد کریں گے

محبت

عنایت اللہ نام " محبت " تخلص باشندۂ دھلی ' پیشۂ رنگریزی کرتا تھا - علم سے بہرہ ور نہ ہونے پر بھی شعر اچھا کہتا تھا - مقامی مشاعروں میں شریک ہوکر بیبا کی اور بے خوفی سے غزل پڑھتا اور داد کلام لیتا - ذہن رسا پایا تھا - فکر سخن کے وقت اچھے اچھے مضمون پیدا کرتا اور تا مقدور صاف ستھرے اور شائستہ علوان سے رشتۂ نظم میں در الفاظ منسلک کرنے کی کوشش کرتا - طبیعت میں عجز و انکسار تھا کس و نا کس سے میٹھی بولی بولتا ' گفتگو کرتے وقت سلیس و فصیح الفاظ استعمال کرتا

بقدر مناسب مزاج میں ظرافت و خوش طبعی بھی تھی —

ایک مرتبہ کسی شوخ طبع ظریف نے محبت کو جاہل محض تصور کرکے از راہ تمسخر اصلاح کلام کی دعوت دی - محبت نے بہ نرمی جواب دیا - " بابا ! رنگریز بریش خود در ماندہ " اکثر اپنے پیشہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے شعر کہتا - سنہ ۱۲۷۴ ھ کے قریب وفات پائی کلام یہ ہے —

کپڑے تو ہزار طرح رنگیے ' لیکن افسوس ! کہ جامہ دل کا رنگیں نہ کیا

——

رہتا ہے سدا وہی تصور کیا جانئے جی کو بھاگیا کیا

——

! رونا موقوف کر " محبت " بادل بھی تو کھل گیا برس کر

——

لائی تھی آرزوئے سیر چمن سیکڑوں داغ لے چلے دل پر

محبوب

محبوب خاں نام محبوب تخلص ' دہلی میں بود و باش کرتا تھا - قوالی کا پیشہ اختیار کیا تھا - اکثر حال و قال کی صحبتوں میں حقانی غزلیں گا کر رنگ جماتا - خوش گلوئی میں مشہور تھا ' جب گانے بیٹھتا تو محفلوں کو دنگ کر دیتا - بہ اصطلاح عوام نور کا گلا پایا تھا - وقت سماع الفاظ کو نہایت دل کش اور خاطر نشین عنوان سے ادا کرتا کہ زبان سے نکلتے ہی قلب میں اُتر جاتے - کبھی کبھی شعر بھی موزوں کرتا تھا - از بسکہ

پڑھا لکھا نہ تھا اس لئے قواعد موسیقی (لے) کے ذریعہ سے شعر کا وزن دریافت کرتا - جب کسی کو اپنا کلام سناتا تو گاکر اشعار پڑھتا - موسیقی کی آمیزش لطف شعر دو بالا کر دیتی اور اُس میں خاص کیف و مزہ پیدا ہو جاتا جس سے سامعین متاثر ہو کر واہ واہ کرنے لگتے - اُمرا کی محفلوں میں "محبوب" کی شرکت ضروری خیال کی جاتی جہاں وہ اپنا تصنیف کیا ہوا کلام اور اساتذہ کی غزلیں دلفریب دھن میں گاکر اہل محفل کو محفوظ و مسرور کرتا - اس کی طراوش طبع کا انداز یہ ہے —

بیاں کیوں کر کروں درد نہاں کو　　نہیں پاتا ہوں قابو میں زباں کو

خنجر بھی نہ سنبھلے جو دم قتل تو کہیے　　تقصیر ہماری ہے کہ تقصیر تمہاری

قاصد آیا تو واں سے پر " محبوب "
دیکھئے کیا جواب لایا ہے

مشقت

اس شاعر کا نام دریافت نہ ہوسکا لیکن ذہین آدمی تھا - نوحہ و سلام کہنے کا زیادہ اتفاق ہوتا - عاشقانہ غزلیں بھی کہیں مگر کم کم اور اُنہیں رواج دینا پسند نہ کیا - ہمیشہ تنگ دستی اور افلاس کا شکار رہا ' کبھی فراغت نصیب نہ ہوئی - پہلے میر "مونس" یا "تعشق" مرحوم کے یہاں خدمت گاری کرتا تھا لیکن ان دونوں بزرگوں کے انتقال کے بعد

تر تری (وہ گاڑی جس میں تاشہ لگا ہوتا ہے اور جب چلائی جاتی ہے تو بانس کی پتلی کھپچیوں کے ذریعہ سے تاشہ بجنے لگتا ہے) بیچ بیچ کر زندگی بسر کرتا رہا —

مولد و مسکن لکھنؤ تھا حسن اتفاق سے ہمیشہ خوش فکر و خوش گو شعرا کی صحبت نصیب رہی - لکھنؤ میں میر انیس اور اُنس کا گھرانا زبان اور شاعری کے لئے ممتاز ہے اِنہیں گھروں میں مشقت کی زندگی کٹی ' شاعرانہ گفتگوئیں سن سن کر ذوق سخن پیدا ہوا - طبیعت صلاحیت پذیر تھی - موزونئی طبع کے بل پر نظم کرنے لگا - اس کے ابتدائی حالات پر پردا پڑا ہے ' کہا نہیں جا سکتا کہ " تعشق " مرحوم کی اصلاح سے فیض پایا یا " مونس " مغفور کو کلام دکھایا - آخر عمر میں حضرت " رشید " سے اصلاح لینے لگا تھا - دس بارہ برس ہوے اسّی برس کی عمر میں ایک لڑکی چھوڑ کر وفات پائی - جناب " ضامن " نے اس کے ایک سلام کا مطلع سنایا تھا وہ یہ ہے —

غیظ سے میداں کی جانب صف شکن دیکھا کئے
حر کا رستہ مجرئی شاہ زمن دیکھا کئے

مقتول

سید جان نام' مقتول تخلص' ڈھاکہ کے رہنے والے' مرشد آباد میں بسلسلۂ ملازمت سکونت رکھتے تھے - علم سے بے نصیب ہونے پر بھی شاعری سے بہت ذوق تھا - فن سخن کو ابو علی برق سے حاصل کیا تھا - اور بزم مشاعرہ

میں کمال بیباکی سے غزل پڑھتے تھے - 'نساخ' کے ملاقاتیوں میں تھے - ان کی نسبت بھی اُنھوں نے اپنے خاص لب و لہجہ میں تحریر کیا ھے کہ " جاھل محض ھے " اکثر کلکتے میں قیام رہا ھے - طبیعت اچھی پائی تھی ' کلام میں فارسی ترکیبوں سے کام لینے کا بہت شوق تھا - ان کے شعروں میں جا بجا فارسی لفظوں کا پایا جانا ان کے پڑھے لکھے ھونے کا شبہہ پیدا کرتا ھے ' لیکن یہ محض شک ھی شک ھے - اور ان پڑہ شاعروں کی طرح ان کا کلام مغلق الفاظ سے محفوظ نہیں - آدمی مرنجاں مرنج اور علم صحبت سے واقف تھے - ان کے کلام کا مناسب حصہ فراھم نہ ھوسکا ادائے فرض کے طور پر جو کچھہ ملا ھدیہ ناظرین ھوتا ھے —

اس جلے دل کا ھمارے وہ طلب گار نہیں
جنس آتش زدہ کا کوئی خریدار نہیں
چارہ گر تیر نکالے گا کہاں تک دل سے
کونسا زخم ھے جس میں کوئی سوفار نہیں
پھر بھلا لطف ھی کیا بادیہ پیمائی کا
پائے افگار میں پیوست اگر خار نہیں
قتل کیوں کر کیا قاتل نے تمھیں اے " مقتول "
اُس کے ھاتھوں میں بظاہر کوئی تلوار نہیں

منور

منور علی نام ' " منور " تخلص ھے - اس کے بزرگوں کا اصلی وطن گورکھہ پور ھے لیکن منور علی کی ولادت مرزا پور میں واقع ھوئی ' اس کا باپ غریب آدمی اور ملازمت پیشہ تھا ' خدمت گاری کر کے بسر

اوقات کرتا - افلاس اور ناداری کی وجہ سے منور علی کی تعلیم و تربیت کا انتظام نہ کرسکا اور یہ طبیعت دار بچہ بے علم و ہنر رہ گیا - نو عمری ہی سے فکر معیشت لاحق ہوئی اور یہ بھی اپنے باپ کی طرح ملازمت کرنے لگا - مبداء فیاض نے طبع سلیم عطا کی تھی ' موزونی طبیعت نے شعر گوئی کی طرف متوجہ کیا اور وہ شعر کہنے لگا - معلوم نہیں فن شاعری میں کس اُستاد کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا اور کب سے سلک نظم میں مضامین کے موتی پرونا شروع کئے کیوں کہ اس کے حالات و واقعات پردۂ خفا میں ہیں - حضرت " صفدر " مرزا پوری کی زبانی صرف اتنا دریافت ہوا ہے کہ یہ اُمی اور طباع شاعر مرزا پور میں مولوی عبدالرحمن صاحب کورٹ انسپکٹر کے یہاں ملازم تھا - انسپکٹر صاحب موصوف خود بھی خوش فکر و خوش گو شاعر اور شعرا کے قدردان تھے فروغ تخلص تھا - مقامی مشاعروں میں کمال ذوق و شوق سے شریک ہوتے - اپنے یہاں مشاعرے منعقد کرتے ' داد سخن دیتے اور تحسین کلام حاصل کرتے —

اب سے تیس برس پہلے کا ذکر ہے کہ مرزا پور میں کسی شیدائی سخن نے بڑی دھوم دھام سے محفل مشاعرہ کی بنا کی ' شعرائے نغز گفتار کو طرح کا مصرع دیا گیا ' مقامی اور قریب و جوار کے شعرا مدعو ہوئے ' شاعروں نے قوت شاعری صرف کرکے غزلیں کہیں - جناب فروغ نے بھی سعی بلیغ سے کام لیا - اُن دنوں حضرت " صفدر " اپنے وطن یعنی مرزا پور میں مقیم تھے ' جناب نیر بنارسی بھی وہیں تشریف رکھتے تھے - ان دونوں حضرات کو مولوی عبدالرحمن صاحب " فروغ " سے نہایت ارادت و محبت تھی ' وہ بھی منتہائے خلوص سے پیش آتے ' روزانہ صحبت گرم رہتی ' شعر و سخن کا چرچا ہوا کرتا - مشاعرے کے ایک روز قبل یہی

حضرات "نیر" و "صفدر" جناب "فروغ" کے مکان پر موجو[illegible]

معمول شعر و شاعری کا ذکر ہو رہا تھا، اشعار پڑھے [illegible] -
جناب "فروغ" نے مشاعرے کے لئے جو غزل تصنیف کی تھی، پڑھی -
جناب "نیر" و حضرت "صفدر" نے تعریف کی اور بہت تعریف کی، کیوں
کہ وہ غزل فی الواقع اُتنی ہی تعریف کی مستحق تھی - منور علی بھی
ایک کنارے ساکت و صامت کھڑا ہوا غزل سن رہا تھا، اچھے شعر کی
کیفیت اُس کے چہرے سے ظاہر ہو جاتی جب کوئی چُٹپٹا مضمون سنتا
تو پھڑک پھڑک جاتا، لیکن داب ولی نعمت زبان ہلانے کی اجازت نہ دیتا۔
مولوی صاحب کے بعد اُن دونوں صاحبوں نے یکے بعد دیگرے اپنی اپنی غزل
پڑھی اور داد پائی - آخر میں منور علی کو تاب نہ رہی ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا
اور نہایت ادب سے دست بستہ التماس کی - حضور؟ خادم نے بھی اس زمین
میں ابھی ایک شعر عرض کیا ہے اگر سرکار کی اجازت ہو تو پڑھ دوں؟
چونکہ اس واقعہ سے پہلے اُن لوگوں کو اِس کی شاعری کا بالکل علم نہ تھا،
اُس کی گفتگو سن کر نہایت متحیر ہوئے مولوی عبدالرحمن صاحب نے حیرت
سے اُس کا منھہ تکتے ہوئے شعر سنانے کی اجازت دی - منور نے دل کش
مگر سادہ انداز سے شعر پڑھا جو حسن صوری و معنوی سے آراستہ تھا -
اُس شعر کے سننے سے ان حضرات کو سخت حیرت ہوئی اور اُنھوں نے متفق اللفظ
ہو کر کچھہ اور سنانے کی فرمائش کی - منور نے اس حکم کی تعمیل کی
اور کئی غزلیں پڑھ کر سنائیں جن کے مضامین نفیس، خیالات پاکیزہ، طرز ادا
دل کش اور بندش چست تھی سب حضرات بہت محظوظ ہوئے—

اس واقعہ کو تیس برس گذر گئے - اب نہیں کہا جا سکتا کہ منور علی
بقید حیات ہے یا جوار حق میں مقیم؟ اُس کے حالات معلوم کرنے کا بھی

کوئی ذریعہ نہیں - حضرت " صفدر " مرزا پوری بھی اُس کے اشعار فراموش کر چکے ہیں ، لیکن مذکورہ مشاعرے کی طرح کا وہ شعر جو اُن کی موجودگی اور حضرات " نیر " و " فروغ " کے سامنے پڑھا گیا تھا ، حافظہ کی بیاض میں مرقوم ہے - یہی ایک شعر انہوں نے واقعہ بیان کرنے کے بعد سنایا تھا - اب ، جب کہ " منور " کے اشعار دستیاب ہونے کی کوئی سبیل نہیں تو اُس کی یاد تازہ رکھنے کو وہی ایک شعر درج تذکرہ کیا جاتا ہے - ناظرین اس ایک شعر سے معلوم کرسکیں گے کہ اس اُمی شاعر کو کس حد کی قوت نظم ودیعت ہوئی تھی —

اُفتاد سے مجبور ہوں ، رتبے میں نہیں کم
ٹپکا ہوں زمیں پر ، میں پسینہ ہوں جبیں کا

منیر

ان کا نام میر آفتاب اور منیر تخلص تھا صیقل گری کا پیشہ کرکے اپنی روزی کماتے اور زندگی بسر کرتے تھے - قدما کا زمانہ پایا تھا - گاہ گاہ فکر شعر بھی کرتے تھے - جو کچھ تصنیف کرتے تھے شاہ حاتم کی حضور میں پیش کرتے اور اصلاح کے بعد حلقہ احباب میں سنا کر داد سخن حاصل کرتے تھے -

ان کی زبان وہی ہے جو قدما کی زبان تھی - کلام نظر سے نہیں گذرا جو کچھ رائے قائم کی جائے - تذکرۂ مولوی عبدالغفور خاں " نساخ " میں ان کے نام سے صرف ایک شعر لکھا ہے - حضرت " شیفتہ " نے بھی

ایک منیر کا ذکر کیا ہے لیکن اُن کا نام خواجہ آفتاب بتایا ہے ۔ کیا عجب ہے وہ یہی " منیر " ہوں - سخن شعرا میں جو شعر درج ہے وہ یہ ہے —

آبلے پڑتے ہیں جس جاگہ گرے ہے قطرہ
ہے مرے اشک کے پانی میں اثر آتش کا



تحقیق الفاظ

از

(جناب فخری صاحب - ٹونک روڈ، سندھ)

آج کل اکثر رسائل و جرائد کے اوراق و صفحات اس بحث سے رنگین نظر آتے ہیں کہ لفظ سچائی (بہ تخفیف چ) ہے یا سچّائی) (بہ تشدید چیم) —

یہ بحث اس قدر اہم اور دلچسپ ہے کہ اگر وہ تمام لٹریچر ایک جگہ جمع کردیا جائے جو اس نازک اور معرکۃالآرا مسئلے کے متعلق ہمارے شاعروں اور انشا پردازوں کی کاوشوں اور کوششوں سے عالم وجود میں آگیا ہے - تو ہمارے علم ادب میں ایک معتدبہ اور بصیرت آموز اضافہ ہوجائے، اس لئے کہ دنیائے ادب کے بہترین دل و دماغ اس طرف متوجہ ہیں اور کوئی باکمال شاعر اور نامور ادیب ایسا نہیں ہے جو بالواسطہ اس بحث میں شریک نہ ہو اور کسی نہ کسی حیثیت سے اپنی گراں قدر رائے ادبی دنیا کے سامنے پیش نہ کر چکا ہو —

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس وقت اس امر کی بہت کم گنجائش ہے کہ کوئی شخص اس موضوع پر قلم اٹھائے اور ان حدود کو وسیع کرنے میں کامیاب ہوجائے جو اب سے پہلے معین ہوچکی ہیں - مگر اس کے باوجود بھی ایک جذبہ ہے کہ مجھ جیسے بے ننگ و نام انسان کو قلم اٹھانے اور منظر عام

پر آنے کے لئے مجبور کرتا ہے لہذا میں ان تمام خیالات کو حوالۂ قرطاس کرنے کی جرات کرتا ہوں جو اس مسئلے کے متعلق میرے دماغ میں موجزن ہیں —

ی اور ئی

زبان کے استقراء سے اور اس کے الفاظ و لغات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب کسی لفظ کے اخیر میں ی آتی ہے تو مندرجہ ذیل کام دیتی ہے : —

(۱) جب کسی اسم کے ساتھ آتی ہے تو صفت بنا دیتی ہے - مثالیں ملاحظہ ہوں :

(الف) دل سے دلی - گل سے گلی - (ب) آب سے آبی - ذات سے ذاتی - حال سے حالی - (ج) روگ سے روگی - سوگ سے سوگی - روم سے رومی - روس سے روسی - اون سے اونی - سوت سے سوتی - (د) دین سے دینی - چین سے چینی - ذیل سے ذیلی - (ہ) ارض سے ارضی - زخم سے زخمی - شمس سے شمسی قمر سے قمری وغیرہ بے شمار اسم ہیں کہ یاے معروف کے اضافے سے صفت بن جاتے ہیں

اسی طرح چہار حرفی اور پنج حرفی الفاظ میں بھی اصول قائم رہتا ہے - مثلاً دریا سے دریائی - صحرا سے صحرائی - عیسیٰ سے عیسائی - اور موسیٰ سے موسائی - (ب) فریاد سے فریادی - پنجاب سے پنجابی - بنگال سے بنگالی اور گجرات سے گجراتی وغیرہ - سیکڑوں الفاظ ہیں کہ اس کے تحت میں آسکتے ہیں —

(نوٹ) : اس جگہ یہ کہنا غالبا بے موقع نہ ہوگا کہ ان میں سے اکثر صفات اسما کا کام دیتی ہیں —

(و) کثیرالحروف الفاظ میں بھی یہ اصول نظر آتا ہے - مثلاً ہندوستان سے ہندوستانی - ماوراالنہر سے ماوراالنہری وغیرہ اکثر لفظ ہیں کہ اس ذیل میں جگہ پاسکتے ہیں —

(۲) یہی "ی" جب کسی صفت کے بعد آتی ہے تو اس کو اسم بنا دیتی ہے -
مثالیں حسب ذیل ہیں :

(ا) بد سے بدی - صد سے صدی - کج سے کجی -

(ب) لال سے لالی - (ج) شوخ سے شوخی (د) نیک سے نیکی (ہ) سرخ سے سرخی زرد سے زردی - اسی طرح سیاہ سے سیاہی ' سفید سے سفیدی - بلند سے بلندی - آزاد سے آزادی وہ لاتعداد صفات ہیں کہ یائے معروف کے اضافے سے اسمائے ذهنی بن جاتے ہیں —

نوٹ :- جب کسی لفظ کے اخیر میں کوئی حرف علّت ہوتا ہے تو صرف "ی" نہیں لگتی بلکہ "ئی" لگتی ہے - مثالیں ملاحظہ ہوں :-

(۱) بھلا سے بھلائی برا سے برائی - بڑا سے بڑائی —

(۲) رعنا سے رعنائی - لمبا سے لمبائی - گہرا سے گہرائی - اور چوڑا سے چوڑائی وغیرہ کثرت سے الفاظ ہیں جن میں یہ اصول نظر آتا ہے یہی "ئی" جب اسما پر آتی ہے تو انھیں صفات بنا دیتی ہے - مثلاً دریا سے دریائی - صحرا سے صحرائی وغیرہ - اس کی اکثر مثالیں اوپر گذر چکی ہیں —

نکتہ :- اس قبیل کے الفاظ میں یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ جہاں کہیں ہندی الفاظ میں حرف ثانی حرف علّت ہوتا ہے ' ساقط ہوجاتا ہے - مثلاً نیچا سے نچائی - میٹھا سے مٹھائی - دیکھا سے دکھائی اونچا سے اُنچائی - روکھا سے رکھائی اور موٹا سے مُٹائی وغیرہ —

مگر دوصوتی الفاظ (یعنی وہ الفاظ) اس سے مستثنیٰ ہیں جن میں اجتماع علّتین ہوتا ہے - مثلاً چوڑا سے چوڑائی - سودا سے سودائی - تیرا سے تیرائی وغیرہ —

یہی حالت اُس وقت ہوتی ہے جب کوئی اور لاحقۂ نسبت لگایا جاتا ہے ' مثلاً اونچا ' سے اُنچان - نیچا سے نچان - میٹھا سے مٹھاس - کھٹّا سے کھٹاس - اودا سے اُداہٹ - نیلا سے نیلاہٹ - اسی طرح چوڑا سے چوڑان —

یہی نکتہ ہے کہ مشدد الفاظ میں مضمر نظر آتا ہے - یعنی ہماری زبان میں بعض الفاظ ایسے ہیں جن کے درمیانی دو حروف مکرر بولے جاتے ہیں - مگر مکرر لکھے نہیں جاتے ان پر ایک تشدید ہوتی ہے جو دونوں کو ملا کر ایک کردیتی ہے - جیسے کھٹّا - کچّا - اچّھا - سچّا وغیرہ —

اس قسم کے (ہندی) الفاظ کی یہ خصوصیت قابل لحاظ ہے کہ جب ان کے اخیر میں کوئی لاحقۂ نسبت آتا ہے تو ان میں سے ایک (کی آواز) کو ساقط کردیتا ہے - مثلاً کھٹّا سے کھٹائی - (اور کھٹاس) وغیرہ —

اس اصول کی رو سے سچّا سے سچائی اور اچّھا سے اچھائی ہیں - سچّائی اور اچّھائی نہیں ہیں —

اس کے علاوہ جب تعدیہ افعال پر غور کیا جاتا ہے تو اس خیال کو اور بھی تقویت ہوجاتی ہے کہ جب حرف ثانی حرف علّت ہوتا ہے تو یقیناً کرجاتا ہے - مثلاً دیکھنا سے دکھانا - بیٹھنا سے بٹھانا - سیکھنا سے سکھانا اور سوکھنا سے سکھانا - آتے ہیں - دیکھانا ' بیٹھانا اور سوکھانا وغیرہ کبھی نہیں آتے - اسی طرح روکنا سے رکوانا - نوچنا سے نچوانا - موڑنا سے مڑوانا - نہ کہ روکوانا ' موڑوانا وغیرہ —

یہی اصول اُن چند الفاظ میں بھی نظر آتا ہے جن میں - " انا " کی جگہ " لانا " لگاتے اور لازم سے متعدی بناتے ہیں مثلاً رونا سے رلانا - سونا سے سلانا - کھانا سے کھلانا - اور پینا سے پلانا وغیرہ -

یہ اصول اس وقت بھی قائم رہتا ہے جب کسی مصدر سے متعدی بہ دو مفعول بنانا مقصود ہوتا ہے - مثلاً کھانے سے کھلوانا - اور پینا سے پلوانا - اسی طرح سینا سے سلوانا - اور سوتا سے سلواتا - وغیرہ —

جب اصل مصدر متعدی ہوتا ہے - اور لازم بنانا ہوتا ہے اس وقت بھی اس اصول سے کام لیا جاتا ہے - مثلاً چیرنا سے چرنا - چھلنا سے چھلنا - کاٹنا سے کٹنا - مارنا سے مرنا - تھامنا سے تھمنا - نکالنا سے نکلنا - گرانا سے گرنا - سنبھالنا سے سنبھلنا - موڑنا سے مڑنا - اور تولنا سے تلنا - وغیرہ -

ان مثالوں پر غور کرنے سے دماغ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جہاں کہیں حرف ثانی حرف علت ہوتا ہے' ساقط ہوجاتا ہے - اور جہاں کہیں کوئی حرف مشدد ہوتا ہے تو لاحقہ نسبت کے اثر سے ایک رہ جا تا ہے - ان کے علاوہ اور بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں مثلاً ساکن کو متحرک کرنا' متحرک کا ساکن ہو جا نا وغیرہ —

اسی صنف میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ پنج حرفی مصادر کا تیسرا حرف بھی ساقط ہو جاتا ہے مثلاً ابالنا سے ابلنا - اچھالنا سے اچھلنا - ابھارنا سے ابھرنا - اکھاڑنا سے اکھڑنا - وغیرہ —

مصادر شش حرفی میں بھی یہی اصول دیکھا جا تا ہے - مثلاً نچوڑنا سے نچڑنا - نکالنا سے نکلنا - سنبھالنا سے سنبھلنا - وغیرہ —

غرض جہاں تک زبان کا استقراء کرکے دیکھا جاتا ہے یہ بات شک و شبہ کی حد سے بالا تر پائی جاتی ہے کہ ہماری زبان میں ایسے الفاظ کی تعداد بہت کم ہے جو کسی اضافے کے بعد اپنی اصلی صورت پر قائم رہتے ہوں - تعداد کثیر ایسے لفظوں کی ہے جن میں اضافے کے ساتھ کوئی اور تبدیلی بھی ہوتی ہے —

یہی صورت اس وقت بھی نظر آتی ہے جب اس قسم کے مصادر سے اسماے کیفیت بنائے جاتے ہیں - مثلاً پیسنا متعدی ہے - اس سے لازم اور متعدی بالواسطہ پسنا اور پسوانا بنتے ہیں - اور ان سے اسماے کیفیت پسائی اور پسوائی آتے ہیں - اسی طرح لکھنا سے لکھانا - اور لکھوانا اور ان سے لکھائی اور لکھوائی رائج ہیں —

اس مقام پر یہ نکتہ بھی خالی از بصیرت نہ ہوگا کہ جب حرف ثانی " ن " ہوتا ہے تو لاحقہ نسبت کے اضافے کے وقت نون غنّہ رہ جاتا ہے مثلاً بندھنا سے بندھائی - اور گندھنا سے گندھائی - وغیرہ —

اگر اس تمام استقراء و استدلال سے چشم پوشی کرلی جاے اور صرف لفظ کھٹّا تک اپنی توجہ کو محدود کرلیا جاے تو بھی اس امر میں سرمو شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی ہے کہ سچّا سے سچّائی اور اچھّا سے اچّھائی لازم ہیں - اس لئے کہ یہ امر مسلم‌الثبوت ہے کہ کھٹّا سے کھٹّائی اور کھٹّاس ہیں کھٹّائی اور کھٹّاس نہیں ہیں اور ہماری زبان میں کم از کم ایک لفظ ایسا ضرور موجود ہے جس میں وہ تمام خصوصیتیں موجود ہیں جو لفظ سچّا میں پائی جاتی ہیں یعنی سچّا کی طرح کھٹّا بھی مشدد ہے‘ اُس کے درمیانی حروف پر بھی تشدید ہے اور اس کے بھی - وہ بھی صفت ہے‘ یہ بھی صفت ہے - وہ بھی ہندی ہے یہ بھی ہندی ہے - اس سے اسم کیفیت یقینی طور پرکھٹّائی آتا ہے‘ کھٹّائی نہیں آتا - تو کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس سے سچّائی کیوں نہ آے - غالباً یہی وجہ ہے کہ بزرگان ادب اس کو ہمیشہ سچّائی کہتے چلے آئے ہیں خاکسار کو کم سے کم دو بزرگوں کی زبان سے یہ لفظ سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ دونوں سچّائی کے قائل تھے *—

* مولانا حالی اور مولانا سلیم مرحوم —

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں ان بزرگوں کے نام مُلک کے سامنے پیش نہ کروں اور اپنے ساتھہ ان کو بھی مورد الزام نہ ٹھیراؤں اور اس مضمون پر جو کچھہ تنقید اور نکتہ چینی ہو اس کو فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے برداشت کروں اور اس کے جواب میں موافق اور مخالف حضرات جو کچھہ فرمائیں اُسے سننے کے لئے تیار رہوں —

اگرچہ میرے نزدیک اس وقت اس امر میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ سچائی بہ تخفیف چیم ہے ' بہ تشدید چیم نہیں ہے لیکن اس کے باوجود بھی ضرورت اس امر کی ہے کہ دونوں کو درست مان لیا جائے اور ضرورت کے وقت دونوں سے بے تکلف کام لے لیا جائے - اس مسالمت اور رواداری کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ زبان وسیع ہو جائے گی اور اُس میں ادائے مطالب کی قابلیت بڑھ جائے گی اور وہ لغو لا یعنی پابندیاں دور ہو جائیں گی جو ہم نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں ' بشرطیکہ ہم تعصب کے دائرے سے باہر قدم رکھیں ' اور اکثر متنازعہ فیہ الفاظ میں اسی مسالمت اور روا داری سے کام لیں —



ابسن اور اُس کی تصانیف*

از

[جناب عبدالشکور صاحب ' ایم - اے ' بی ٹی ' (علیگ)

لکچرار شاستری کالج - ڈربن- جنوبی افریقہ]

ھنرک ابسن ۲۰- مارچ سنہ ۱۸۲۸ ع کو بمقام اسکین پیدا ھوا - اس کا باپ کنڈ ابسن (Knud Ibsen) اچھا خاصا با رسوخ اور دولت مند سوداگر تھا - اس کے آبا و اجداد بحری کپتان تھے - سب متوسط درجے کے کھاتے پیتے لوگ تھے ' ایک سوانح نگار کا یہ خیال ھے کہ ھنرک ابسن کے جسم میں ذرا

---

* اِن صفحات کی طیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ھے—

(1) Bernard Shaw's the Quintessence of Ibsenism.

(2) Ibsen on his Merits by Sir E.R. Russel.

(3) Life of H. Ibsen by Jaeger,

(4) Ibsen, Henrik (in Makers of 19th Century) Armstrong. R. A.

(5) Ibsen, Henrik (in Interpreters of life) Henderson A.

(6) Ibsen the Master Builder by A. E. Facker

(7) Four Lectures on Henrik Ibsen (Wicksteed)

میں چونکہ ابسن کی زبان سے واقف نہیں ھوں اس لئے مجھے ھمیشہ انگریزی تراجم' حواشی' و بیانات پر اکتفا کرنا پڑا ' انگریزی ادب کو ابسن سے

[بقیہ بر صفحۂ آیندہ]

بھی ناروے کا خون نہ تھا - مگر موجودہ تحقیقات کی رو سے یہ خیال باطل ثابت ہوچکا ہے، اس میں شک نہیں کہ ابسن کی رگوں میں جرمن اور اسکاچ خون موجزن تھا، لیکن یہ خیال کرلینا کہ وہ ناروے میں سرا سر اجنبی تھا انصاف کا خون کرنا ہے - البتہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ابسن کے چند بزرگ باہر سے آکر ناروے میں آباد ہوے —

ہنرک کے پیدا ہوتے ہی اُس کا ایک بھائی اس دنیا سے چل بسا، مگر ہنرک کے بعد ایک بہن اور تین بھائی اور پیدا ہوے، اُس زمانے میں یہ خاندان بہت فارغ‌البال تھا، اور اُس کے افراد کی زندگی زیادہ تر عیش

[بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ]

روشناس ہوے کچھہ زیادہ مدت نہیں گزری اس لئے انگریزی کے کتابی ذخیرے میں ابسن کے متعلق سواد کم پایا جاتا ہے، پھر بھی میری ضروریات کے لئے کچھہ سعی و کوشش کرنے کے بعد کافی ذخیرہ مل گیا جو میں ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں مندرجۂ بالا کتابیں، اور اس کے ڈراموں کے مختلف نسخوں اور اُن کے دیباچوں سے میں نے آزادی کے ساتھہ اپنے مضمون میں جا بجا کام لیا ہے مگر موضوعات کی ترتیب اور مضامین کے اسلوب بیان میں میں نے Fucker کا تتبع کیا ہے۔ میرے خیال میں مروجہ کتابوں میں ابسن کے حیات پر اس سے اچھی کوئی کتاب نہیں، ضرورت اس امر کی ہے کہ ابسن سے اُردو داں پبلک رو شناس ہو اور اس کے سارے ڈراموں کے تراجم ہوجائیں جب تک یہ نہ ہوگا ہم ابسن سے سے کما حقہ واقف نہیں ہو سکتے، اس کے ڈراما "ڈالس ہاؤس" کا ترجمہ "گڑیا کاگھر" کے نام سے میں نے انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈہ کی جانب سے شایع کرایا ہے اس پر مسٹر بشیر احمد ہاشمی ایم اے نے ایک مفید مقدمہ لکھا ہے - اس کے علاوہ علی گڈہ میگزین میں (Wild Duck) "جنگلی بط" کے نام سے ترجمہ ہوکر شایع ہوچکا ہے چھوٹے ڈراموں کے تراجم کا ذکر فٹ نوٹس میں موجود ہے، مگر اب تک اُردو داں پبلک نے ابسن سے سرد مہری برتی ہے —

و عشرت اور سیر تفریح میں بسر هوتی تهی ' اغلباً یه عشرت پسندی اتهارویں صدی کی باقیات الصالحات تهی ' مگر جب سنه ۱۸۴۰ کے بعد یورپ میں مذهب پرستی کا زور زیادہ هوا تو عام طور سے شہریوں کی زندگی میں ایک بڑا انقلاب پیدا هونے لگا ' اور غیر معمولی سنجیدگی نے زندگی پر ایک گہرا اثر پیدا کردیا - لیکن هنرک کے بچپن کا زمانه پہلے هی دور میں ختم هوچکا تها - آگے چل کر جب هنرک ایک نامور ڈرامه نویس هوگیا تو اُس نے پیر گنت (Peer Gynt) کے قصے میں اپنی بچپن کی زندگی ' اور اپنے باپ کی بے دریغ اور ناعاقبت اندیشانه مہمان نوازی اور اسراف کا ایک هلکا سا خاکه پیش کیا هے - کہتا هے :—

" اپنے آبا و اجداد کے زمانے کی شان و شوکت
اب کتنی باقی هے ؟
سکون کے سامان اب کہاں هیں
جو ریسمس گنت نے چهوڑے تهے ؟
افسوس ! تمهارے باپ نے اُن کے پر لگا دئیے
اور ریت کی طرح برباد کردئیے '
هر گرجا کے قریب زمین خریدی '
اور مرصع گاڑیوں میں گشت لگائے '
وہ دولت کہاں هے جو اُس نے ضائع کی
موسم سرما کی مشہور دعوت میں '
جب هر مہمان نے گلاس اور بوتل
اپنے پیچهے دیوار سے پٹک کر چور چور کردی "

هنرک کے باپ کی ساری ' ثروت سٹے بٹے (Speculation) سے حاصل هوئی

تھی ' لیکن جب سنہ ۱۸۳۶ ع میں انگریزی منڈی (مارکٹ) یک دم متغیر ہوئی تو کُنُڈ ابسن ہی وہ پہلا سوداگر تھا جس کو دیوالیہ ہونا پڑا ؛ اس کی ساری جائداد نکل گئی ' سوائے ایک کھیت کے جو شہر سے تخمیناً پانچ چھ میل کے فاصلے پر واقع تھا - اس فاصلے کی وجہ سے نیز حالات کے زیر و زبر ہونے سے دوستوں کا پہلا حلقہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا ' اس کی طرف ھنرک نے اسی ڈرامے میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ھے :-

" کوتوال ' کپتان اور سب
جو روز آتے تھے ' اور کھاتے پیتے تھے '
یہاں تک کہ ان کا پیٹ پھٹنے لگتا تھا
لیکن احتیاج وہ شے ھے جو دوستوں کو پرکھتی ھے
"

ابسن کے باپ نے اب دوسرا پیشہ اختیار کیا ' اب اُس کا کام یہ تھا کہ ایک دلال کی حیثیت سے وہ اسکین کے بندر گاہ میں جو تجارتی مال آتا اس کے لئے خریدار بہم پہنچاتا ' اور اس طریقہ سے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالتا اپنے دل کو بہلانے کے لئے اُس نے دو طریقے اختیار کئے ' ایک تو یہ کہ خوب ڈٹ کر شراب پیتا ' اور دوسرے یہ کہ شہر کے باشندوں پر نہایت درشت اور جلی کٹی پھبتیاں کستا ' جس کی وجہ سے عام طور سے لوگ اس سے خائف رہنے لگے تھے ' لیکن حالات کی بے پناہ تبدیلی نے ھنرک کی روح میں جو اُس وقت آٹھ برس کا بچہ تھا ایسے کاری زخم ڈال دئے تھے کہ ان کا مندمل ہونا محال ہوگیا - ان کا پتہ ھنرک کی غزلوں سے چلتا ھے ' جن میں اُس نے اپنے دلی جذبات نہایت آزادی کے ساتھ بیان کئے ھیں :-

" اسکول سے لڑکے جوق جوق نکل رہے ہیں'
" وہ دوڑتے ہیں' کھیلتے ہیں' ہنستے ہیں اور چلاتے ہیں'
" اور خوشی میں سلج گاڑیوں * کو پکڑتے ہیں'
" غم آلود پیشانی کے ساتھہ جو (گاڑی کے) شیشے سے لگی ہوتی ہے۔
" میں ان کی چہل اور تفریح کو دیکھتا رہتا ہوں ۔
" میرے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگتے ہیں'
" یہ کرسمس کی شام ہے' چاندنی
" برف پر پھیلی ہوئی ہے' افسوس !
" میرے جوتے اس قدر پھٹے ہوئے ہیں کہ میں نہیں کھیل سکتا'
" اس لئے مجھے گھر ہی میں رہنا ہوگا ۔ "

غربت کے علاوہ ابسن کو اس امر کا سخت قلق ہوا کہ اس کا خاندان اس شہر کے امرا کے طبقہ سے خارج کر دیا گیا' جس میں اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام بسر کئے تھے' اغلباً یہ صدمہ ایسا شدید تھا کہ مدت تک ابسن اس کے اثر سے متاثر رہا۔ اسکین میں چار ہزار نفوس کی آبادی تھی' اس میں امرا کا طبقہ اپنے آپ کو ادنی طبقہ سے بہت اونچا اور بالکل جدا تصور کرتا تھا' اس لئے اس کی ابتدائی تعلیم کسی اچھے مدرسے میں نہ ہوسکی' چار و ناچار اسے اسی حقیر متوسط درجے کی درسگاہ میں جانا پڑا' جس میں دیہات کے دو طالب علم مدرسی کے فرائض انجام دیتے تھے ۔ اس جگہ لاطینی زبان کا درس نہیں دیا جاتا تھا' اور اس زبان کو حاصل کئے بغیر کسی پیشے یا دارالعلوم میں جگہ پانا ناممکن تھا' اس لئے ابسن اپنی

* یہ پہیوں کی گاڑی جو برف پر چلاتے ہیں —

مفلسی پر مدتوں آنسو بہاتا رہا - صرف یہ خیال کہ وہ غربا کے بچوں کے مدرسے میں تعلیم پا رہا ہے اس کو بے چین کر دیتا تھا ' پھر صبح صبح دو میل گرد آلود سڑک پر چل کر آنا ' اور شام کو واپس جانا ذمہ دار ہے اس ابدی حقارت کا جو اس کے دل میں اسکین کی طرف سے جا گزیں ہوگئی تھی' اور جو آخر وقت تک دور نہ ہوئی '—

خاندانی غربت نے هنرک کو نہایت خاموش بنادیا - اکثر وہ اپنے آپ کو اپنے چھوٹے سے تکلیف دہ کمرے میں بند کرلیتا ' جس کا دروازہ اس راستے پر کھلتا تھا جو باورچی خانہ کی جانب تھا - یہاں جو کتاب بھی اسے هاتھہ لگ جاتی ' پڑھنے لگتا تھا ' دوسرے لڑکوں کے ساتھہ کھیلنے میں اسے ذرا لطف نہ آتا ' اس لئے اس کے وقت کا زیادہ حصہ اسی مطالعہ میں بسر هوتا - اس کے علاوہ وہ ایک اور شغل میں مصروف رهتا تھا ' جو اس لئے دلچسپ ہے کہ آگے چل کر اسی کارگزاری کے نام سے اس کا ایک ڈرامہ ایسا مشہور هوا کہ جس کی شہرت اور خوبصورتی مدت دراز تک دنیا میں قائم رہے گی - اس کی بہن ایک خط میں لکھتی ہے —

" علاوہ اور چیزوں کے جو هنرک تعمیر کیا کرتا تھا مجھے ایک
" قلعہ یاد ہے' میرے خیال میں یہ عمارت آرٹ کا عمدہ نمونہ تھی'
" هنرک اور اس کا چھوٹا بھائی عرصے تک محنت کرتے رہے' لیکن
" اس قلعہ کی قسمت میں یہ نہ تھا کہ وہ قائم رهتا - مکمل هوتے هی
" اس پر گولہ باری شروع هوئی اور وہ مسمار کردیا گیا "—

یہ حیرت انگیز بات ہے کہ اسی ننھے سے معمار کا ڈراما آگے چل کر " ماهر معمار " یعنی "Master Builder" کے نام سے شایع هوا جس کی نقادان فن نے بہت تعریف و تحسین کی —

اس کی بہن سے اس کے بچپن کے کچھہ اور دلچسپ حالات معلوم ہوتے ہیں، جو بہت کچھہ معنی خیز ہیں، وہ "جادو" کے کرتب دکھا کر اکثر اپنے ہمسایوں کو پریشان اور از خود رفتہ کرتا رہتا تھا، علاوہ ازیں اپنے چھوٹے بھائی کی مدد سے وہ گڑیاں بناتا، اور ناٹک کی مدد سے ان میں روح پیدا کرنے کی کوشش کرتا - شاید انھیں خیالات نے تشکیل پاکر "گڑیا کا گھر" کی صورت اختیار کی، اور دنیا میں ایک ایسا دلکش ڈراما چھوڑ گیا جس کا حسن و دلفریبی ہر جگہ ضرب المثل ہوچکا ہے —

ایک مرتبہ ابسن کے استاد نے طلبا کو مضمون نگاری کی ہدایت کی، کوئی خاص موضوع تجویز نہ کیا، بلکہ یہ کہہ دیا کہ جس موضوع پر چاہو مضمون لکھہ لاؤ، ابسن نے اپنا مضمون تیار کیا اور کل طلبا کے روبرو استاد کو سنایا - طلبا محو حیرت بنے ہوے غیر معمولی سکوت کے ساتھہ سنتے رہے، اور استاد خود متعجب تھا کہ ابسن نے یہ شاہکار کہاں سے چرایا - اس مضمون کی ایک نقل ابسن کے ایک ہم جماعت کے پاس محفوظ تھی، جس کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے - آپ خود اندازہ فرمائیے کہ یہ شاعر کی آئندہ زندگی کا کیسا صحیح مرقع ہے - اغلباً ابسن اس وقت ایک پیغمبر کی حیثیت سے اپنی کاپی سے نہیں بلکہ لوح محفوظ سے پڑھ رہا تھا —

"پہاڑوں میں سفر کرتے ہوے ہم اپنا راستہ بھول گئے، اور یکایک شب کی تاریکی نے ہمیں آ گھیرا - یعقوب کی طرح ایک پتھر سرھانے رکھہ کر ہم آرام کرنے لیٹ گئے، میرے ساتھی جلد نیند میں محو ہوگئے، مگر میں نہ سو سکا - آخر کار میں بالکل تھک کر چور ہوگیا، اسی اثنا میں ایک فرشتہ میرے سامنے آیا اور کہنے لگا "اُٹھو،

اور میرے پیچھے پیچھے چلو' میں نے پوچھا کہ مجھے اس تاریکی میں کہاں لے جانا چاہتے ہو' اس نے جواب دیا "میرے ساتھہ آؤ' میں تمہیں ایک مرقع دکھاؤں گا ' یعنی حیات انسانی کی حقیقت چنانچہ میں کانپتے ہوے دل سے اس کے ساتھہ ہولیا' بڑی عظیم‌الشان سیڑھیوں سے سے اتر کر ہم ایسے مقام پر پہنچے جہاں بلند پہاڑوں نے ایک محراب کی سی صورت اختیار کرلی تھی' وہاں ایک بڑا شہرتھا' جس میں مردے پڑے تھے' اور جن کے ہاتھوں پر موت اور مردنی کی علامات نظر آتی تھیں' یہ کل دنیا اپنی مردہ' زرد اور ضائع شدہ شان و شوکت کے ساتھہ ایک بڑے مردے کی طرح موت کے ہاتھوں سے گزر رہی تھی' فضا پر صبح کا دھندلکا طاری تھا' بے رونق' جس طرح قبرستانوں کی دیواریں یا سپید صلیبیں فضا پر طاری کرتی ہیں - اور ایک ایسی روشنی سی جو غیر فطری معلوم ہوتی تھی مردوں کے ڈھانچے بے شمار قطاروں میں اس غار کو لبریز کر رہے تھے' فرشتے کی ہمرکابی میں اس مرقع سے میرے دل پر خوف چھاگیا اس نے کہا - 'دیکھا' یہ سب بے بنیاد غرور ہے'' - اس کے بعد ہوا کے جھکڑ اس طرح چلے جیسے ایک طوفان کی آمد کے وقت چلا کرتے ہیں' اس کے علاوہ آہ و بکا کی آواز پیدا ہوئی جو بڑھتے بڑھتے ایک طوفان کی حدتک پہنچ گئی یہاں تک کہ مردوں میں جنبش پیدا ہونے لگی اور انھوں نے اپنے ہاتھہ میری جانب

بڑھا دیے' میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھا' رات کی
شبنم سے میں بھیگ چکا تھا" —

ھنرک جب پندرہ سال کا ھوا تو اس کا خاندان پھر اسکین میں واپس آیا' مگر اس محلے میں آباد نہ ھوا جس میں پہلے بود و باش تھی' ھنرک کی ماں شدت سے مذھب پرست واقع ھوئی تھی' اور گرجے کی رسومات کو مذھب کا جز لاینفک سمجھتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد جب اس کے لڑکے کے خیالات وسیع ھونے لگے تو ماں کو سخت تشویش پیدا ھوئی' اور اسے یہ خیال ھونے لگا کہ اس کا لڑکا گمراہ ھوگیا ھے رفتہ رفتہ یہ خلیج وسیع تر ھونے لگی یہاں تک کہ آگے چل کر خط و کتابت کا سلسلہ تک مسدود ھوگیا' ابسن نے اپنے ایک خط مورخہ ۹ دسمبر سنہ ۱۸۹۷ع میں جو اس نے اپنے محب ڈیرینہ بجورنسن (Bjornson) کو لکھا تھا اس کی جانب ان الفاظ میں اشارہ کیا ھے :-

"میں نے اب زندگی نہایت سنجیدگی سے شروع
کردی ھے تمھیں معلوم ھے کہ میں نے اپنے والدین سے قطعاً
کنارہ کشی اختیار کرلی ھے' اور اپنے کل خاندان کو چھوڑ
چکا ھوں' کیونکہ میں باھمی غلط فہمی کو زیادہ عرصے تک
برداشت نہ کرسکتا تھا" —

البتہ ابسن کی بہن ھیڈوگ کچھ کچھ اس کی شاعرانہ فطرت سے آگاہ معلوم ھوتی تھی' اس کی شادی اسکین میں ایک بحری کپتان مسمی اسٹوس لینڈ سے ھوئی تھی' وہ آخر وقت تک مذھب کی سخت پابند رھی' اور اس نے بار ھا اپنے بھائی کو دعوت مذھب دی' مگر سن رسیدہ ھوکر اس کے خیالات میں بڑا تغیر پیدا ھوا اور وہ ابسن کے شاعرانہ کمالات کی پوری طرح داد دینے لگی' ابسن کو اس سے بڑی محبت تھی' کیونکہ

اس کے خاندان میں لے دے کے یہی تھی ' جو اسے سمجھ سکتی تھی ' سنه ۱۸۶۹ ع میں اس نے اپنی بہن کے پاس اپنا ایک فوٹو بھیجا ' اور اس پر یه لکھا :—

" میرا خیال ھے که ھم دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب رھے
" ھیں ' اور ایسے ھی رھیں گے "

بچپن میں ابسن کو کچھ مصوری سے بھی لگاؤ تھا ' اس فن میں اس نے مصور میاندت (Mandt) سے استفادہ کیا تھا ' اس کی مصوری کے چند نمونے برگن (Bergen) اور اسکین (Skien) کے عجائب خانوں میں اب تک موجود ھیں ' لیکن خاندان چونکه افلاس کی حالت میں زندگی گذارتا تھا اس لئے اس فن کو پیشه بنانا ابسن کے لئے نا ممکن تھا - چنانچه یه تجویز ھوئی که ابسن طبابت کا پیشه اختیار کرے ' مگر طب کی تعلیم کے لئے روپیه نه تھا ' اس لئے چار و نا چار ابسن کو ایک دوا خانے میں ملازم ھوجانا پڑا - اور وہ گرمستد (Grimstad) جاکر اس کام میں لگ گیا - قبل اس کے که ابسن سوله برس کا ھو اس نے اسکین کو خیر باد کہا' اور سوائے ایک مرتبے کے وہ پھر کبھی وھاں واپس نه گیا - اس نے اپنے والدین کو کبھی کوئی خط نه لکھا ' گو اس کی ماں اس سے بہت محبت کرتی تھی لیکن مذھب کی ایک ایسی چٹان دونوں کے درمیان حائل ھوگئی تھی که حقیقی قرب ناممکن ھوگیا - اس کے باپ نے غیر ذمه دارانه طور سے اسے دنیا کے اکھاڑے میں اور اجنبیوں کے جھگڑے میں دھکیل دیا' اس لئے فطرتاً ابسن اپنے والدین سے ذرا بھی مانوس نه تھا ' —

اُس زمانے میں ناروے کا مشہور و معروف مصور ڈھل تریستن میں رھتا تھا' ابسن کی وھاں تک رسائی نه ھوئی' پھر بھلا اڈلی تک وہ کیا جا سکتا تھا'

جہاں بڑے بڑے بلند پایہ مصور' اور مصوری کے عظیم‌الشان شاہکار موجود تھے - ابسن نے لاکھہ کوششیں کیں لیکن اس زمانہ میں ناروے سے باہر جانا نصیب نہ ہوا - سنہ ۱۸۴۴ ع کے قریب ناروے یورپ کی خیالی رو سے بالکل جدا تھا' یہاں تک کہ اس ملک کا دارالسلطنت بھی ادبی اور معاشرتی حیثیت سے ایک وسیع گاؤں سے زیادہ اہم نہ تھا' چنانچہ اپنے ادبی اور فنی رجحانات کو لے کر ابسن کو گرمستید میں داخل ہونا پڑا جو اغلباً اور شہروں سے سب سے کمتر حوصلہ افزا تھا' اس قصبے میں مکانات کے سوا اور کچھہ نہ تھا' مکانات کے درمیان جہاں - سڑکیں ہونی چاہئے تھیں افتادہ زمین تھی جہاں گائیں' بکریاں چرتی تھیں' سارے قصبے میں شب میں کوئی چراغ نظر نہ آتا' اور رات کی تاریکی آبادی کی علمی کم مائگی پر نوحہ خواں ہوتی تھی' —

جس وقت ابسن اس قصبہ میں داخل ہوا اس وقت اس کی ہئیت کذائی کچھہ عجیب تھی' وہ چھوٹے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا' اس کے بڑے بڑے سیاہ بال پیشانی پر پڑے رہتے تھے' اس کا رنگ گندمی تھا' اور آنکھیں منتشر معلوم ہوتی تھیں' چہرہ پر غور و فکر کا رنگ چھایا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ حقیقت سے زیادہ معمر معلوم ہوتا تھا - وہ نہایت ہی خاموش طبع اور تنہائی پسند واقع ہوا تھا' گو وہ اس قصبے میں تین سال مقیم رہا لیکن اس کو وہاں ایک دوست یا شناسا بھی ایسا نہ ملا جس سے وہ اپنا کچھہ درد دل بیان کرتا' دواخانہ سے ملحق اسے ایک چھوٹا سا کمرہ دیدیا گیا تھا جس میں ایک کھڑکی تھی' اور جس میں دوکان کے مالک کے چھوٹے بچے بھی رہتے تھے' اس کی تنخواہ اس قدر قلیل تھی کہ موسم سرما میں بھی وہ ناروے کی سردی کو اوورکوٹ یا موزوں کے بغیر گذارتا تھا لیکن چونکہ اس کے قوی بہت مضبوط تھے اس لئے اس نے یہ ساري تکالیف برداشت کیں اور صحت پر کوئي برا اثر

نہ ہونے دیا، اسے اس بات کا سخت ملال تھا کہ تنخواہ کی قلت کی وجہ سے وہ اپنی حیثیت معمولی ملازمین سے بھی زیادہ با وقعت نہ بنا سکتا تھا، اس کی جانب اس نے اپنی ایک اچھوتی نظم میں اشارہ کیا ہے —

" یا تو ہم مدعو شدہ مہمان ہیں
" دعوت حیات میں جو اس درجہ درخشندہ ہے،
" یا ہم پھاٹک کے باہر ہی کھڑے رہتے ہیں
" اور سرد راتوں کی تیز ہواؤں میں کھڑے کانپتے رہتے ہیں
" تنہا سڑک پر، اور منتظر رہتے ہیں
" منور کھڑکیوں کو دیکھتے ہوئے "

ابسن کے دل میں بچپن ہی سے ایک بڑے آدمی ہونے کا ولولہ تھا، جس کی اس نے اس حالت میں بھی سیوا کی، اس لئے کو وہ ادھر اُدھر پیغام لے جاتا، نسخے طیار کرتا، بچوں کے ہاتھ مٹھائی فروخت کرتا، یا کلسٹر میں سے شراب اُنڈیل کر ماہی گیروں کو دیتا، جو اپنے بھاری بوٹ لئے ہوے دوا خانے میں گھس آتے تھے، پھر بھی وہ اس حالات کے باوجود ایک دوسری دنیا میں ہوتا تھا، جس کا حسین تخیل اغلباً اس زمانے میں اس کی حیات کا باعث تھا، چنانچہ وہ اپنی فرصت کے ایام میں شعرا اور مصنفین کی کتابی صحبت میں گذارتا، اور اسی کو زندگی کا ماحصل شمار کرتا تھا۔ اس زمانے میں ناروے کے مشہور شاعر ولہیون (Welhaven) نے سنہ ۱۸۴۵ ع میں اپنی نئی طرز کی نظمیں شائع کیں، اور جنگلوں، چراگاہوں، چشموں کو پریوں کی عنبر بیزی سے مالا مال کر دیا، اسی دوران میں اس نے غالباً گیٹے، شلر اور ہائنی نے کی تصنیفات خود ان کی زبان میں مطالعہ کیں، اور مقامی شعرا کا کلام

بھی بغور پڑھا۔ لیکن اس کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی، اور بعض اوقات وہ نہایت مایوس ہوکر بدحواس ہوجاتا تھا۔ ان حالات میں وہ زیادہ سے زیادہ یہ امید کرسکتا تھا کہ شاید کسی زمانہ میں وہ خود ایک دوا خانے کا مالک ہوجاے، وہ ایک نغز گو شاعر ایک زبردست ڈراما نویس، ایک بلند پایہ مذہبی ریفارمر، یا آرٹسٹ بننے کے خواب دیکھتا تھا مگر یہ اس کے نزدیک خواب پریشاں سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے کبھی کبھی وہ تن تنہا نکل کھڑا ہوتا اور جنگلوں کے وحشت زا تنہائی میں اپنے ائیڈیل کے اجزاے پریشاں کو از سر نو ترتیب دیتا، وہ ہر قربانی کرنے کے لئے طیار تھا لیکن وہ اس کے لئے آمادہ نہ تھا کہ اپنے آئیڈیل کو برباد ہونے دے، اس کو اپنی خواہشات بے معنی، کوششیں بیکار، اور منصوبے پارہ پارہ ہوتے نظر آتے تھے، اس کی روح کے بال و پر شکستہ، اور اس کی شاعری کی چمک دمک دھندلی معلوم ہوتی تھی، اسی لئے وہ کہتا ہے —

"گمنام اژدحام میں گم ہوکر

"مجھے زندہ رہنے اور آخر فنا ہوجانے دو"

اس کے دل و دماغ پر اکثر قبر، اور موت کے خیالات طاری رہتے تھے، ایک مرتبہ چاندنی رات میں سطح آب پر اس کا گذر ہوا، چمکتے ہوے ستاروں کا عکس پانی پر پڑ رہا تھا، جن کو اس نے مردوں کی نم آلود آنکھوں سے تشبیہ دی، اور شہر خموشاں کے میکدۂ بے خروش میں داخل ہونے کی دعائیں مانگیں —

" وہ اذیتیں جو میرے دل پر مستولی ہیں،

یہ اذیتیں وہاں قصۂ ماضی ہو جائیں گی

وہاں میں اپنا گھر پا سکتا ہوں
وہاں ہر شے پر شکوہ ہے ' میں وہاں سب کچھ بھول سکتا ہوں "

زمانے نے ایک خوشگوار پلٹا کھایا ' اور اس کے ساتھ اِبسن کی حالت بھی سدھرنے لگی' دوا خانے کو ایک ہوشمند سوداگر نے خرید لیا ' اور ایک اچھی عمارت میں منتقل کر دیا جہاں ابسن کی رہائش کے لئے ایک اچھا کمرہ مہیا کر دیا گیا ' اس دوران میں اس نے دو تین اچھے دوست پیدا کرلئے جو اکثر اس کے پاس آتے اور ادبی بات چیت ' اور جرح و تنقید میں وقت گذارتے پھر بھی ابسن کی طرز معاشرت اور مشاغل کی کثرت بہت زیادہ قابل اطمینان نہ تھی ' دن بھر وہ دوا خانے ہی میں نسخے تیار کرتا رہتا ۔ نیلسن (مالک دوا خانہ) جہازوں کی تعمیر میں لگا رہتا ' اور دوا خانے کا کل کاروبار خود ابسن ہی کو کرنا ہوتا ۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اسے ادبی مشاغل کے جاری رکھنے کا موقعہ نہ ملا ' لیکن وہ دھن کا پکا تھا ' اس نے اپنے آئیڈیل کو کبھی اپنی نظر سے پوشیدہ نہ ہونے دیا ۔ اب تک اسے یہ آرزو تھی کہ اس قصبے سے نکل بھاگے ' اور دارالسلطنت میں پہنچ کر یونیورسٹی میں داخل ہو جاے ۔ اپنا پیٹ کاٹ کر اس نے ایک معلم مقرر کیا جو اسے لاطینی کا درس دیتا تھا " کیوں کہ اس کے بغیر یونیورسٹی میں داخل ہونا محال تھا ۔ کچھ وقت تو وہ مطالعہ میں صرف کرتا ' اور کچھ شاعرانہ بلند پروازی میں ' اس نے بچپن ہی سے اس امر کی کوشش کی تھی کہ وہ اپنی قوت ارادی کو اپنا تابع بناے ' چنانچہ اسی کی بدولت وہ اُس قابل ہوا کہ ان حالات میں رہ کر ابھی اپنے حوصلے اور آرزو کی سیوا کرسکا ' ورنہ ابسن کے اولین دوست یہ تھے :—

(۱) کرسٹو فرتیو جو کسٹم کے محکمے میں ایک ادنی افسر تھا ' ابسن کے

آقا نیلسن کا دوست تھا ' اور اسی سلسلے سے وہ ابسن سے روشناس ہوکر اس کا دیوانہ ہوگیا —

(۲) اُول شولرت ' یہ قانون کا ایک طالب علم تھا ' یہ بھی ابسن کے حلقے میں شامل ہوکر شب کی روزانہ نشست میں شریک ہوتا تھا —

رفتہ رفتہ ابسن کی نشست گاہ میں ایک مستقل مجلس کی بنیاد پڑگئی جس میں ابسن معاشرتی رسومات پر اکثر سختی سے نکتہ چینی کرتا' اور اپنے خیالات نہایت استحکام اور زور کے ساتھ بیان کرتا - مثلاً وہ شادی کے مسئلے کو لے لیتا اور یہ بتاتا کہ شوہر اور بیوی کو کیسے تعلقات رکھنا چاھئیں اور آپس میں کس طرح ایک دوسرے سے برتاؤ کرنا چاھئے' مگر ابسن کے سیاسی خیالات ان سے کہیں زیادہ باغیانہ تھے' اس کے دل و دماغ پر اب تک فرانسیسی* انقلاب سنہ ۱۸۴۸ ع کے بنیادی اصول چھائے ہوے تھے ' ابسن نے انقلاب کے واقعات سے متاثر ہوکرایک اصلاحی دعوت † (Reformed Banquet) دی اور اس میں ایک نہایت شعلہ فشاں تقریر کرتے ہوئے دنیا کے سارے شاھنشاھوں اور سلاطین کے وجود پر سخت حملہ کیا' اور یہ بتایا کہ دنیا کی عافیت کا راز جمہوریت میں سربستہ ھے' ان معاملات پر' اور مقامی سیاست پر ابسن اس قدر گرم جوشی اور سختی کے ساتھ تقریر کرتا تھا کہ بعض اوقات خود اس کے احباب اس کی سنجیدگی میں شبہ کرنے لگتے تھے اب

---

* French Revolution 1848.

† ایک ایسی دعوت جس کی ذریعے سے اصلاحات کی تبلیغ منظور ھو - ھندو مسلمانوں کی مشترکہ دعوتیں (Inter Communal Dinners) جو وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ھیں اس زمرۃ میں آسکتی ھیں —

رہے اس قصبے کے دیگر سن رسیدہ ' اور پختہ کار لوگ ' ان کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ دوا خانے کا ایک نا تجربہ کار ملازم ملکی اور بین الا قوامی سیاست پر حرف زن ہوتا ہے ' جس پر خود ان کو رائے زنی کی جراءت نہ ہوتی تھی ' ان کا خیال تھا کہ یہ بادشاہ وقت اور وزرا کا کام ہے اور ہر کس و ناکس کے لئے یہ سخت معیوب ہے کہ وہ ان امور پر گفتگو کر کے خود اپنا اور سامعین کا وقت ضائع اور دماغ پراگندہ کرے ' " مگر ابسن وہ نامور ابسن نہ ہوتا اگر اس کی ابتدائی اور درمیانی زندگی جو بہ حالات مفلسی دیہات میں بسر ہوئی ایک ایسے آئیڈیل سے منور نہ ہوتی جس کی تابناک روشنی ابسن کی رگ رگ میں پیوست ہوگئی تھی ' اور جس کی برکت سے وہ گمراہ اور غافل نہ ہونے پایا "۔

کرسٹوفرتیو کبھی کبھی ذکر سخن کرتا تھا ' ایک روز اُس نے ایک نظم لکھی ' اور ابسن کے پاس لے گیا ' تیو نے اپنی نظم کچھ رک رک کر اپنے دوست کو سنائی ' اس کے بعد ابسن نے اپنی ایک نظم سنائی جس کا مضمون اس سے ملتا جلتا تھا ' تیو اس نظم سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے اشاعت کے لئے اخبار میں بھیجدی - چند روز کے بعد وہ اخبار کے پہلے صفحہ پر شائع ہوگئی - اس نظم میں شاعر غمگین انداز میں موسم خزاں کی آمد کا ذکر کرتا ہے ' پرندے اپنا گانا بند کر دیتے ہیں ' اُجڑے ہوئے درختوں میں ہوا آہیں بھرتی پھرتی ہے ' چرا گاہوں میں نالۂ درد کی صدائیں گوش زد ہوتی ہیں ' گلاب اور کنول کی بس یاد ہی باقی رہ جاتی ہے ' نوجوان شاعر ان خیالات اور یاد سے تسکین حاصل کرتا ہے ' ابسن اخبار کو دیکھہ کر جذبات کی شدت سے پیلا پڑگیا ' وہ اس خیال سے دبا جاتا

تھا کہ اس کے کمال کا اعتراف کیا جا رہا ہے ' اُس کے دل میں آئندہ کے متعلق اُمید و بیم کے جذبات موجزن ہونے لگے بیس سال بعد ابسن نے ان جذبات کا اپنی ایک نظم میں یوں ذکر کیا —

" مجھے یاد ہے ' اس قدر صاف طور سے کہ گویا کل
رات کی بات ہے وہ شام جب میری پہلی نظم صفحہ
قرطاس پر طبع ہوئی ' میں اپنی کُٹی میں بیٹھا
تھا ' اور دھوئیں کے بادل آرادی سے اُڑ رہے تھے '
میں اطمینان سے بیٹھا کچھہ سوچ رہا تھا ' اور سگرٹ
پیتا جاتا تھا " —

سوچ کیا رہا تھا ؟ اصل میں وہ خیالی قصر تعمیر کر رہا تھا ' اس نے عالم خیال میں دیکھا کہ دارالسلطنت میں لوگ میری نظم پڑھ رہے ہیں ' وہ سوچنے لگا ' اگر مجھے ایک بڑے مجمع کے سامنے اسٹیج پر وہ باتیں کہنے کا موقع مل جائے جو میرے دل میں ہیں تو اُس مجمع کو میرے ترانے بلند تر ' پاکیزہ تر ' اور شریف تر بناکر چھوڑ دیں گے بلکہ ساری قوم کو اُس خواب غفلت سے بیدار کر دیں گے جس میں وہ مدت سے آسودہ ہے ' اُس نے وہ باطنی آواز سنی جو اُسے ناروے کو بیدار کرنے اور بڑے بڑے کام کرنے کی ترغیب دے رہی تھی ' صرف ترغیب ہی نہیں للکار کر جوش دلا رہی تھی —

" مجھے ضرور کام کرنا چاہئے ' ضرور ' بالضرور ' میری روح کی
گہرائی میں ایک بلند آواز
مجھے پڑھنے پر مائل کر رہی ہے ' میں اس کی آواز پر لبیک کہونگا

بہتر کام ' کے لئے مجھ میں ' جرأت اور قوت دونوں ہیں
موجودہ زندگی سے کہیں بہتر
(جو) بے لگام تعیش اور نفس پرستی کا ایک سلسلہ (ہے)
نہیں ' نہیں ' ان سے روح کے مطالبے پورے نہیں ہوتے ! "

ابسن نے محض اس الہام ہی پر قناعت نہ کی ' بلکہ وہ اپنے کام میں نہایت محنت و جفاکشی کے ساتھ منہمک ہوگیا ' وہ اپنے کردار - (Character) کا اس طرح موقع کھینچنا چاہتا تھا کہ اس کی روح کی گہرائیاں تک نظر آ جائیں ' وہ شدید محنت اور کمال عرق ریزی کے لئے طیار تھا ' وہ خود کہتا ہے :-

اونچے اونچے چٹان دھوئیں سے اٹے اور گرج سے بھرے
میرے ہتوڑے کے آگے ٹکرے ٹکرے ہو جاتے ہیں
مجھے اور نیچے اور زیادہ گہرائی میں کھودنا چاہئے
حتی کہ میں کچی دھات کی جھنکار سن سکوں -
اور نیچے ' گہرائی ہی سب سے بہتر ہے '
وہ ابدی سکون سے ہم آغوش ہے
بھاری ہتوڑا کھود نکالے گا
مخفی خزانہ کے دل کو
ہتوڑا مارے جاؤ ' مارے جاؤ
جب تک کہ چراغ حیات گل نہ ہو
چاہے اُمید کی کرن نمودار نہ ہو '
چاہے سحر پیدا نہ ہو

ابسن محنت تو ضرور کرتا تھا' لیکن نو آموز تھا' ناتجربہ کار تھا' اور ایسے دوستوں میں گھرا ہوا تھا کہ جو مناسب اور ضروری تنقید و نکتہ چینی نہ کرسکتے تھے' اس لئے اس کے اولین ڈراما (Catiline) میں وہ تمام عیوب موجود ہیں جو مبتدیوں کے ڈراموں میں اکثر ہوا کرتے ہیں - پہلے ایکٹ کو پانچ سین میں تقسیم کیا گیا ہے' جن میں واقعات وقت اور محل کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں آخر کے سین میں پلاٹ نہایت گنجلک ہوجاتا ہے' شروع میں ہیرو کی زبان سے ایک Monologue ادا کہا جاتا ہے جس میں وہ اپنے افعال کے محرکات اور اپنی فطری اور جبلی خصوصیات مفصل بیان کرتا ہے' *Catiline کو سنجیدگی اور متانت سے پڑھنے' متاثر ہونے' اور باور کرنے کے لئے غیر معمولی زود اعتقادی کی ضرورت ہے' ایک جگہ وہ بدکاری' اور زنا بالجبر کا مرتکب ہوتا ہے' دوسری جگہ وہ ایک با وفا شوہر کا روپ بدل لیتا ہے - ایک جگہ وہ خود کشی کی قسم کھاتا ہے' اور دوسری جگہ اپنے آپ کو ملک کی سیاسی منفعت کے لئے ناگزیر تصور کرتا ہے' دو عورتوں سے بہ یک وقت محبت کا دم بھرتا

---

* Catiline کے آخری حصے کو میں نے ایک ڈرامہ کی صورت میں منتقل کرکے علی گڑھ میگزین میں شائع کرایا تھا —

Catiline کی روئداد سوشیل نہیں بلکہ سیاسی ہے' کیونکہ اس زمانے میں ابسن کے دل و دماغ پر باغیانہ سیاسی خیالات کا غلبہ تھا - Catiline کے زمانے میں روم کی حالت بہت ابتر تھی' یہ ضرور ہے کہ وہ ایک جمہوریت کی شان رکھتی تھی لیکن اس کی بنیادیں کھوکھلی ہوچکی تھیں' اس لئے ابسن اس سیاسی عمارت کی از سر نو تعمیر شروع کرتا ہے' اب تک ابسن نے سوشیل ریفارم کے میدان میں قدم نہ رکھا تھا' بلکہ وہ اپنے ملک کی سیاسی فضا میں سانس لیتا ہوا پایا جاتا تھا - گو ڈراما میں ایسے عناصر موجود ہیں جو اس کا پتہ دیتے ہیں کہ وہ آگے چل کر سیاسی میدان کو خیر باد کہہ دے گا اور سوشیل ریفارم کو اپنی زندگی کا مقصد بنالے گا—

ہے، اور جس سے ملتا ہے اسی کی پیروی شروع کردیتا ہے۔ آخری سین میں Catiline کا حشر ایک اچھے عیسائی کی طرح ہوتا ہے۔ شاید گذشتہ تلخ تجربوں کے باوجود ابسن کے دل میں اب تک عیسائیت کا اثر موجود تھا، سنہ ۱۸۴۸ ع کے موسم سرما کی ایک طوفانی شب میں اس نے "امید و بیم" (In Doubt & Hope) پر ایک نظم لکھی جس میں وہ اس امر کا افسوس کرتا ہے کہ جس شب میں قیامت خیز طوفان رو نما ہوتا ہے وہ سکون کے ساتھ دعائیں نہیں مانگ سکتا جس طرح کہ وہ اپنے بچپن میں مانگتا تھا —

"میں نے عالم گمراہی میں کس طرح قہقہے لگاے ہیں
روز حشر پر
لیکن تاریک اور حواس برہم کن نا امیدی اور مایوسی
حقارت سے ہنسی اڑانے والے کا صلہ ہے"

ابسن نے اس ڈراما کو عوام الناس سے مخفی رکھا، شاید اس راز کا انکشاف اس کی ملازمت کے تعلق کے لئے مضر ثابت ہوتا۔ لیکن اس نے اپنے دونوں دوستوں کو اس ڈراما سے روشناس کرایا، اور دونوں اس کو سن کر سخت بے چین اور مشتعل ہوگئے اور جوش میں آکر ارادہ کر بیٹھے کہ اسے جلد سے جلد شائع کردینا چاہئے، انھیں یقین تھا کہ اس کے شائع ہوتے ہی ملک میں کھلبلی مچ جائے گی، اور دنیا پر روشن ہوجاے گا کہ ایک نہایت زبردست ادیب منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوا ہے لیکن جب اس ارادے پر عمل کرنے کی نوبت آگی، تو انھیں پتہ چلا کہ دنیا، اور خصوصاً تجارتی اور کارو باری دنیا کس درجہ سرد مہر اور سخت ہے۔ ایک دوست اس ڈرامہ کو لے کر کرسٹیانا (Christiana) پہنچا، لیکن اُسے کوئی تھیٹر کا منیجر ایسا نہ ملا جو اس کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوتا،

اور نه کوئی ایسا ناشر هاتهه آیا جو اس کو خرید نے اور طبع کرنے کے لئے آمادہ هوسکتا - اس ناکامی نے ابسن کو نہایت درجه ملول اور غمگین کردیا' ممکن هے که اس کا اثر دیر پا هوتا ' لیکن اسی اثناء میں ابسن ایک نوخیز حسینه کے دام الفت میں پهنس گیا اور تهوڑے عرصه کے لئے سب کچهه بهول گیا - اس لڑکی کا نام کلارا ایبل (Clara Ebbell) تها ' اس کے حسن و جمال کی تعریف میں ابسن نے نظموں کی بهر مار شروع کردی ' ناروے کی تابندہ شب میں اُسے ایک خوبصورت ستارہ نظر آیا جو بے حد دل کش تها مگر نہایت دور ' اور اسی بعد کی وجه سے وہ شاید مظہر بن گیا اُس حسن ابدی کا جس کا جلوہ ابسن کے دل و دماغ پر بجلی گرا چکا تها کلارا کو ادب اور شاعری سے خاص لگاؤ تها ' لیکن یه زرد رنگ کا بزدل نوجوان اُسے مطلق پسند نه آیا جس کا چہرہ ایک نہایت خوفناک ڈاڑهی میں چهپا هوا تها ' جس قدر ابسن کو اُس سے محبت تهی اسی قدر وہ اسے ناپسند کرتی تهی ' چنانچه اس نے ابسن کو ٹکاسا جواب دے دیا ' بغیر یه سوچے که اس غریب پر کیا گذرے گی چنانچه مارچ سنه ۱۸۵۰ ع میں اس نے ارادہ کیا که اب اس مقام سے نکلنا چاهئے ' اس لئے اس نے اسکین کا ایک چکر لگایا ' اپنی بہن سے ملکر کرسٹیانا (Christiana) جا پہنچا ' اپنے خاندان میں اسے صرف اپنی بہن هی سے اُنس تها ' اسکین پہنچ کر دونوں بهائی بہن ایک نہایت خوش منظر مقام پر ٹہلتے ٹہلتے بات چیت کرتے هوئے پہنچے بہن نے پوچها که تمهارا مقصد حیات * کیا هے ؟ ابسن نے جواب دیا

* ابسن کا مقصد حیات یه تها که وہ ایک غیر فانی انسان بن جائے' لیکن اس خواب کی تعبیر بعید از قیاس معلوم هوتی تهی - وہ خود کہتا هے -

بقیه صفحه آئندہ

که نظر میں صفائی پیدا کرنا اور قوتوں کی تکمیل کرنا ' بہن نے دریافت کیا که اس کے بعد ' ابسن نے کہا که موت ' مگر اس کی بہن بھی اس وقت نه اس کے فلسفے کو پوری طرح سمجھ سکی اور نه اس کے حوصلوں اور ارادوں کی داد دے سکی —

ابسن دارالسلطنت میں ایک گدائے بے نوا کی حیثیت سے داخل ہوا ' نه صرف یه که اس کی جیب خالی تھی ' بلکه وہ یونیورسٹی کے داخلے کے لئے بھی پوری طرح تیار نه تھا ' اس لئے اس نے ایک پرانے آزمودہ کار معلم ہیلٹبرگ * (Heltberg) سے درس لینا شروع کیا جو یونیورسٹی میں داخل ہونے والے طلبا کی خامی کو اچھی طرح دور کردیتا تھا یه معلم اس قدر کامیاب تھا که یه گرامر جیسے خشک مضمون کو پانی کردیتا تھا ' اس درسگاہ میں ابسن تین ایسے طلبا سے روشناس ہوا جنھوں آگے چل کر اعلیٰ درجے کی ادبی شہرت حاصل کی ان میں ایک بجورنسن † تھا ' دوسرا اسمنڈونجی ' ‡ اور تیسرا

" کاش ! میں ایک لمحے کے لئے ہی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک سکوں
جس طرح ایک شہاب ثاقب رات کی تاریکی میں کرتا ہے .
کاش ! میں ایک ہی عظیم الشان کام کر گذروں " (Catiline.)

* "Old Heltberg" had a method of teaching grammar by a System of Short cuts, to Cram Latin & Greek in the Shortest possible time."

† "Bjorn son an Enthusiast for the ideas of 1848, and for the poets of romantic movement.

‡ Vinje

جونسن لی * - اولنڈکر نے ایک نظم میں ابسن کا ذکر کیا ہے :—

" پتلا ' سخت متفکر' زرد رنگ کا

سیاہ' بالکل سیاہ اور خوفناک ڈاڑھی والا ابسن "

ابسن داخلے کے امتحان میں نا کام رہا ' لیکن اس نا کامی نے اسے بہت زیادہ بد دل نہ کیا ' کیونکہ اس کے بعد ہی وہ ادبی سر گرمیوں میں انہماک کے ساتھہ مصروف ہوگیا —

سنہ ۱۸۵۱ ع میں اس نے شاعر ولہیوں کے وہ کامیاب لکچر سنے جو اس نے ہولبرگ ڈراما نویس پر دئے تھے ' پھر وہ اپنے دو دوستوں کے ساتھہ ایک ہفتہ وار اخبار نکالنے میں مشغول ہو گیا ' جو نو ماہ بعد بند کر دینا پڑا - رفتہ رفتہ اس کی ساری توقعات اور منصوبے خاک میں ملے جاتے تھے' نوجوان ادیب دارالسلطنت میں اس غرض سے آیا تھا کہ آزادی کی نسیم جانفزا سے فیض یاب ہو ' اس لئے جب گورنمنٹ نے ہیرو ہیرنگ کو جلا وطن کیا تو اس نے طلبا کا ایک جم غفیر جمع کرکے شہر میں باجہ بجاتے ہوے وزیر سلطنت کے مکان کی راہ لی - پولس نے دو سرغنہ لڑکوں کو گرفتار کر لیا جن کو اس جرم کی پاداش میں سخت سزائیں ملیں ' ابسن بال بال بچ گیا اور غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ قوم کو اپنے ڈراموں کے ذریعہ سے بیدار کرکے اس بلندی کی جانب لے جانا چاہئیے جہاں یہ سیاسی زبان بندی اور اسیری نا ممکن ہو جائے —

ابسن کے دوست شوارڈ نے جس ہمت اور حوصلے سے اپنے دوست کی

---

* Jensen Lie.

دامے، درمے، سخنے مدد کی وہ شاید حق دوستی ادا کرنے کی نہایت نادر مثال ہے۔اس نے فاقے کئے، روپیہ قرض لیا اور (Gatiline) کے ڈھائی سو نسخے طبع کرائے، لیکن ڈراما کے طبع ہونے پر بھی دنیا بے حس رہی، اس سرد مہری نے دونوں کے دل پاش پاش کردئے، نہ صرف یہ بلکہ جب نقادان سخن نے اسے سخت ناپسند کیا اور اس پر نکتہ چینی کی بھر مار شروع کردی، تو ابسن کا رہا سہا اعتقاد بھی جاتا رہا - یہ ایک ایسا کڑوا گھونٹ تھا جس کو پیتے ہی ابسن کی رگ رگ میں ناکامی کی تلخی دوڑ گئی، صرف ایک تنقید ایسی تھی جو صحیح اور ہمدردانہ معلوم ہوتی تھی - پروفیسر مونرت نے لکھا تھا کہ :—

"ڈراما کا خیال صاف اور خوبصورت ہے، لیکن نظم ناقص نظر آتی ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ مصنف مشاق نہیں ہے، اس لئے اس سے بڑی توقعات وابستہ کرنا غیر مناسب نہ ہوگا - یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مغز کی تکمیل کی جائے یعنی خیالات کی، جب یہ ہوگیا تو یہ سب یعنی ظاہری آرٹ بھی درست ہو جائے گا "—

مگر یہ بات نہایت درجہ حیرت انگیز ہے کہ ابسن کا دوسرا ڈراما سردار کا مزار (Warrior's Barrow) * جو اُس نے کریسٹنڈ میں لکھا تھا تھیٹر میں مقبول ہوا اور ستمبر و اکتوبر سنہ ۱۸۵۰ ع میں تین مرتبہ کھیلا گیا، بوڑھا وائکنگ (ViKing) نارمنڈی کے ساحل پر راستہ بھول جاتا ہے اور اُسے ایک نوجوان

---

* اس ڈرامہ کا ترجمہ میں نے "نوشابہ" کے نام سے علیگڑھ میگزین میں شائع کرایا تھا - ڈرامہ بہت خوبصورت ہے، اور مشرقی طبیعت کی پسندکی شے ہے —

شہزادی مدد دیتی ہے ' اس کی تیمارداری کرتی ہے ' اور اُسے عیسائی بناتی ہے ' اُس کے بعد اس شہزادی سے ایک نوجوان عشق بازی شروع کرتا ہے جو اُس بوڑھے کا فرزند ہے ' وہ اس کے ساتھہ دلھن بن کر ناروے جاتی ہے اور بوڑھا تارک‌الدنیا ہو کر وہیں رہ جاتا ہے اور اپنی تلوار و زرہ بکتر کو دفن کردیتا ہے ' یہ گویا عیسائیت کے قبول کرنے کا ایک ظاہری اور عملی مظاہرہ تھا —

ابسن کی ملاقات دوبارہ کلارہ ایبل سے ہوئی ' لیکن اس دفعہ بھی وہ ابسن کے فلسفہ کو نہ سمجھ سکی " ابسن کہتا تھا کہ صداقت عرق ریزی اور محنت شاقہ کے بعد حاصل ہوتی ہے ' کلارا کا ایمان تھا کہ صداقت کی ضو آسمان سے پرتو فگن ہوتی ہے * —

سنه ۱۳۹۷ ع سے سنه ۱۸۱۴ ع تک ناروے ڈینی قوم کے اثر میں رہا ۔ گویا ملک پر چار سو سال ایسے تاریکی کے گذرے جس میں بیرونی اثرات برابر ملک میں داخل ہوتے رہے ' ڈینس کے سیاسی اقتدار کا یہ اثر ہوا کہ ملک کے باشندوں نے بیرونی اثرات کو قبول کرنا شروع کردیا ' اور تہذیب نے ملک کو کلیتاً زیر نگین کرلیا ' ناروے کی پرانی تہذیب ' اور دیرینہ روایات پس پشت ڈالدی گئیں ' اور ملک کے دارالسلطنت کے تھیٹر گاہوں میں جتنے ڈرامے ہوتے تھے وہ سب ڈینی زبان میں ہوتے تھے ' مگر ابسن کی جوانی کے زمانے میں ناروے نے بیرونی تہذیب کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ' اور خود ملکی روایات کو از سرنو

* ابسن عقلیاتی Rationalist نقطہ نظر سے گفتگو کرتا ہے ' کلارا فلسفہ کو مذہب سے ٹکرا دیتی ہے ۔ ابسن جس قدر مذہب سے دور اور عقلیات کے قریب ہے کلارا اُسی قدر مذہب سے قریب اور عقلیات سے دور ہے ' مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ نکتہ نہایت پیچیدہ ہے ' یہ ایسا دوراہا ہے کہ اس پر بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں —

زندہ کرنا شروع کردیا ' نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ناروے یورپ کی اس ادبی تحریک * میں شریک ہوگیا جو اس امر کی کوشش کرتی تھی کہ قرون وسطیٰ کی روایات قدیمہ کو پھر جگا یا جائے ' اس وجہ سے ناروے میں دیسی ادب پیدا ہونے لگا ' اور طلبا و علما' ناروے کی تاریخ اور قدیم کہانیاں اور پرانی بھولی ہوئی نظمیں پڑھنے لگے ' اب تک کسانوں اور گاؤں کے باشندوں کو لوگ حقارت اور نفرت سے دیکھتے تھے ' لیکن رفتہ رفتہ ان کی عزت اس وجہ سے ہونے لگی کہ پرانی تہذیب کے وہی حامل تھے ' ان اثرات سے ابسن محفوظ نہ رہ سکا ' —

سنہ ۱۸۵۰ ع میں برگن میں ایک قومی تھیٹر کی بنیاد پڑی ' اس کام کے لئے یہ شہر اپنی تاریخی عمارات کے اعتبار سے نہایت موزوں تھا ' اس میں قرون وسطیٰ کے گرجے موجود تھے ' تیرھویں صدی کا بنا ہوا ضیافت خانہ تھا ' اور یہاں دینی اثر اس حد تک کارفرما نہ ہوا تھا جیسا کہ دارالسلطنت میں ' اس لئے اس دیسی ادبی جد و جہد کے لئے اس سے بہتر مرکز ملنا محال تھا ' اس واقع نے طلبا میں بڑا جوش پیدا کیا ' کیونکہ اُول بُل اس کا بانی تھا ' بل کی شخصیت مقناطیسی تھی ' سنہ ۱۸۸۰ ع میں بیورنسن نے اس کی قبر پر یہ تقریر کی تھی :—

" ایک نئی نسل نمودار ہوئی ' جس نے آزادی کی
" ہوا میں نشو و نما پا یا تھا ' جو اپنے بزرگوں کے
" خوف اور عاقبت اندیشی سے نامانوس تھے ' جن میں
" غصہ اور بیباکی بہت زیادہ تھی ' وہ عزت اور
آزادی کی صبح کی فضا میں سانس لیتے تھے ' اور

---

* اس تحریک کو Romantic Movement کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔

اس کی روشنی میں اُول بل کی دل کش آواز آفتاب
کی ان اولیں شعاعوں کی طرح معلوم ہوتی تھی جو
پہاڑ پر اُترتی ہیں "

بل کو گو گورنمنٹ سے مدد نہ ملی، لیکن طلبا اس کی مدد کے لئے طیار ہوگئے اور یہ طے پایا کہ برگن تھیٹر میں شب موسیقی منائی جائے، جس میں ہر کس و نا کس شریک ہو، اور جس کا کل منافع برگن تھیٹر کی توسیع میں میں صرف کیا جائے، اس کھیل کے لئے ابسن نے تمہیدی نظم (Prologue) لکھی پردہ اٹھا، اور ایک ایکٹرس قدیم لباس میں نمودار ہوئی، اس نے تمہیدی نظم پڑھنی شروع کی، -

" ناروے کی قدیم شان و شوکت کا قصہ بیان کیا جب قوم توانا تھی، اور شعرا کی شہزادے اور کسان عزت کرتے تھے، قوم کے بہادر میدان جنگ میں شجاعت کے جوہر دکھاتے تھے، اور گویوں کے دلکش راگ دشمنی کے جذبات دور کردیتے تھے، یہ شاندار زمانہ بھی ختم ہوگیا اور غلامی کا دور بادل کی طرح ملک پر چھا گیا، اب پھر عوام الناس نے اپنی زنجیریں توڑ ڈالیں، اب ملک کی کون رہنمائی کرے، آرٹ - جو ایک ستار کی مانند ایسی مرصع تانوں سے لبریز ہوتا ہے جو روح کی گہرائی تک سرائت کر جاتی ہیں، اگر آرٹ لوگوں کے دلوں میں پیوست ہوجائے تو وہ قوت پیدا ہوگی جو ناروے کو قدیم بلندی پر پہنچا دے گی - آرٹسٹ کو گذشتہ عظمت کے

راگ گا کر لوگوں کو ان کے آبا و اجداد کے بلند کارنامے
یاد دلانا چاہئیں تاکہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ان
کی پیروی کرسکیں - "

اس تمہیدی نظم نے سامعین کو دیوانہ بنادیا - یہاں تک کہ اُول بل نے ابسن سے ملاقات کرنے کا اشتیاق ظاہر کیا ' اس کو یہ سنکر بہت تعجب ہوا کہ یہ ۲۳ سالہ نوجوان کئی ڈراموں کا مصنف ہے ' پہلی ہی ملاقات میں دونوں میں اچھی خاصی دوستی ہوگئی ' اور ابسن کو اسی دوران میں اسٹیج منیجر اور تھیٹر کے شاعر کا عہدہ مل گیا ' جس کو اس نے بڑا غنیمت جان کر بخوشی قبول کیا ' علاوہ اسٹیج منیجر کے اس کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ سال میں ایک مرتبہ اس ادارے کی سالگرہ پر ایک طبعزاد ڈرامہ لکھے اور اُسے اسٹیج کرائے —

یہاں برگن میں ابسن پھر ایک سولہ سالہ مجسمۂ حسن سے دو چار ہوا۔ علی الصباح شاعر سونتم ہوٹل کے برآمدے میں بیٹھا ہوا قہوہ اور حقہ پی رہا تھا کہ ہنرک ہولست (Henrikke Holst) ا پنا سرخ چہرہ سیاہ آنکھیں دلربا قہقہے لئے آ موجود ہوئی ' اور ابسن کو ایک گلدستہ کا نشانہ بنا کر کہنے لگی —

" ابسن ! آج دو شلنگ کا کیک نہیں کھلاتے ؟ "

صبح بہت دلکش اور سہانی تھی ' اس پر لڑکی کی بے تکلفی نے

* اس فطری لڑکی کی دلکشی کا ذکر ابسن نے Lady Inger of Oestraat میں کیا ہے —

اور چار چاند لگا دئے، شاعر کا دل اس لڑکی کے آگے دھک دھک کرنے لگا، اس کی جوانی اور پھرتی قرون وسطیٰ کے اس حسن کی تصویر تھی جس کے جلوے ابسن کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے، گیتھے کی طرح ابسن نے بھی اس لڑکی کو ایک ہرے بھرے پودے سے تعبیر کیا، 'رکی' یک خود رو پھول تھی تازگی اور توانائی سے سرشار، اور دلکشی سے معمور اس کا مقابلہ سرد، بے مزہ گرم خانے کے پھولوں سے کیجئے جو اہل ذوق کی توجہات کو اپنی جانب منعطف کرتے ہیں۔ وقت گذرتا گیا، اور عشق کی آگ تیز تر ہونے لگی، ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، راز و نیاز کی باتیں ہوا کیں یہاں تک کہ ابسن اور 'رکی' دونوں ایک دوسرے کو دیوانہ وار چاہنے لگے، مگر ان کی توقعات کے خوبصورت افق پر ایک ایسا سیاہ اور تاریک بادل چھایا ہوا تھا کہ جس نے دونوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا 'رکی' کے والد کو یہ رشتہ کسی عنوان سے منظور نہ تھا، اور اس نے اپنی لڑکی کو سخت تنبیہ کر دی کہ وہ ابسن سے کہیں نہ ملے، اسی اثنا میں دونوں ایک تنہا مقام پر یک جا پائے گئے، 'رکی' کی والد کے آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا، اور نفرت اور غصے کے جذبات فراوانی کے ساتھہ اس کے چہرے بشرے سے عیاں تھے، ابسن اپنی جان بچا کر وہاں سے چمپت ہو گیا، اور رکی کو مشتعل باپ کے غصہ کا شکار بننے کے لئے چھوڑ گیا۔ اس واقعہ نے رکی کے دل پر بہت گہرا اثر کیا یہاں تک کہ ابسن کے اس رویہ نے اسے اپنے عاشق سے ہمیشہ کے لئے بددل کر دیا، اور حسن و عشق کی اس کرشمہ سازی نے بہت جلد ایک خواب پریشان کی صورت اختیار کرلی —

اسی زمانہ میں ان اثرات کے ماتحت ابسن نے ایک ڈراما تصنیف

کیا جس کا نام Lady Inger of Oestraat تھا ' جو بڑے اہتمام کے ساتھ برگن کے تھیٹر کاہ میں استیج ہوا ' تماشائیوں اسے بہت پسند کیا ' اور مصنف کو استیج پر بلانے کے لئے بار بار تالیاں بجائیں ' اور ۱۲ جولائی سنہ ۱۸۵۵ ع کو اخبار میں اس پر ریویو ان الفاظ میں شائع ہوا:—

" ہم اسے نہایت قابل تحسین سمجھتے ہیں کہ کوئی ڈراما نویس خود ہماری ہی تاریخ سے وہ باتیں یاد دلائے جو عہد ماضی کو ہمارے سامنے پیش کرسکیں اور ان کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ وہ اس سے فیضان حاصل کرسکیں ' لیکن اگر وہ محض شرم کے تودے ہی سامنے لا سکتا ہے ' تو بہتر ہے کہ وہ تاریکی ہی میں پڑے رہنے دیے جائیں ' جب ہم انہیں فراموش کر دیتے ہیں اس وقت وہ مضر نہیں ہوتے ' لیکن ان کو بار بار یاد دلانا خطرہ سے خالی نہیں ' ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہمیں مصنف کا احسان مند ہونا چاہئے گو ہم اس کی نکتہ چینی کریں ...... " —

سنہ ۱۸۵۶ ع ابسن کی زندگی میں سب سے زیادہ کامیاب سال تھا - اس کے ڈرامے کی ہر حلقہ میں کثرت کے ساتھ تعریفیں ہوتی تھیں - اور قوم کے بڑے بڑے اکابر ' حتیٰ کہ خود شاہی خاندان کے نمایاں افراد ابسن کا ڈراما دیکھنے برگن تھیٹر میں قدم رنجہ فرماتے تھے ' پہلے پہل ولی عہد سلطنت جو بعد میں شاہ چارلس کے نام سے بادشاہ ہوا ' رونق افروز ہوا ' اس کے بعد پرنس نیپولین تشریف فرما ہوکر رونق دہ تھیٹر ہوا ' جس کے سامنے " سلہوگ کی دعوت " (The feast at Solhoug) کا تماشا کیا گیا -

اس کے بعد یہ تماشا اس قدر مقبول ہوا کہ پبلک کے بارہا اور شدید اصرار پر یہ ڈراما چھہ مرتبہ اسٹیج کیا گیا۔ لیکن تین نقاد جن کی کرستانا (Christiana) میں اچھی خاصی تعداد تھی اور جن کا کافی اثر بھی تھا سخت بر افروختہ ہوے، اور ابسن کی ایک ممتاز تصنیف پر سخت گیری اور بیدردانہ نکتہ چینی کرنے لگے۔ یہ ڈرامہ قدیم قصص (Sagas) سے ماخوذ کیا گیا ہے، اس سلسلے میں ابسن کہتا ہے :—

" بادشاہوں کے قدیم قصص اور عہد دیرینہ کی تاریخی کہانیاں - میرے لئے دلکش نہیں ہیں، میں بادشاہوں اور سرداروں کی جنگوں، اور متوسلوں شاہی کے جھگڑوں سے استفادہ نہیں کرسکتا، یہ میرے شاعرانہ مقصد کے لئے مدت تک بیکار رہے " —

اس کے بعد Perter Sens کے تاریخی افسانے ہاتھہ آگئے، ان کے متعلق وہ لکھتا ہے :—

" ان خاندانی کہانیوں نے جن میں مردوں کے باہمی تعلقات تبدیل ہوتے ہیں، اور عورتوں کے رشتوں میں انقلاب پیدا ہوتا ہے، ان سے بھی زیادہ ان تغیرات نے جو قبیلوں کے تعلقات میں رو نما ہوتے ہیں میرے دماغ میں ایک ذاتی پر شعور اور وسیع زندگی کی وسعت کا احساس پیدا کردیا "

" سلہوگ کی دعوت - انہیں کہانیوں کا ماحصل ہے، اور انہیں گیتوں اور کہانیوں کے متعلق ابسن ایک جگہہ کہتا ہے :—

" میں تمہارے مذاق نہیں سمجھہ سکتا،

" نہ اُس شے کو جو تمھاری آنکھہ کو تکلیف دے رھی ھے
" دوست ! میری بات مانو اُس میں نہ حسن ھے ' اور نہ
غیر معمولی ذکاوت "

اس میں شک نہیں کہ ابسن نے یہ ڈراما ' رکی ' کے تاثرات کے تحت میں لکھا تھا ' چنانچہ خود کہتا ھے :—

" میں نے شاعرانہ تصویریں کھینچی ھیں '
" اُن رنگوں میں جو چمکتے ھیں '
" کہ چمکیلی بھوری آنکھیں '
" ھنستی اور ھنستی رھیں !

اس ڈراما کی وھی فضا ھے جو شکسپیر کے (As you Like It) کی ھے ' اسی لئے اس کو ابسن کا شگفتہ ترین ڈراما کہا جاتا ھے ' آخرالذکر میں حسین وادیوں ' دلکش عورتوں ' محبت کے راگوں ' دلفریب مرغ زاروں کا ذکر ھے - وادیوں کی ھوا خوشبوؤں سے لبریز ھے ' عورتوں میں رعنائی ھے' راگوں میں رس ' اور مرغ زاروں میں سورج کی روشنی اور پھولوں کی عنبربیزی ھے ' یہی حال ابسن کے اس ڈراما کا ھے ' اس میں آسمان پر ابر تو ضرور محیط ھوتا ھے ' لیکن نہ کہیں بجلی گرتی ھے ' اور نہ طوفان نوح آتا ھے ' کشیدگی پیدا ھوتی ھے لیکن ایسی نہیں کہ سب کا خاتمہ کردے ' اس ڈراما کا انجام موسیقی کی اونچی تانوں سے لبریز ھے ' ابسن نے دیباچے میں خود کہا ھے کہ ڈرامے میں ھواؤں کی دلکش سرسراھٹ پیدا ھوتی ھے —

اس ڈرامے نے ابسن کی شہرت مستقلاً قایم کردی ' تماشا بار بار کیا جاتا تھا اور لوگ جوق جوق اُمنڈتے چلے آتے تھے ' برگن سے اُڑ کر ابسن

کی شہرت نہ صرف دارالسلطنت پہنچی بلکہ کوپن ہیگن Copenhagen ستاک ہولم Stockholm میں بھی لوگ اسے دیکھنے کے لئے بے تاب تھے —

۷ جنوری سنہ ۱۸۵۶ ع کو ابسن کی ایک نو عمر خاتون سوزانا Susannah سے ملاقات ہوئی' وہ ابسن کے ڈراموں سے بہت متاثر معلوم ہوتی تھی۔ اس کا مزاج نہایت والہانہ اور تیز تھا' آرٹ اور لٹریچر پر نہایت آزادی اور صحت کے ساتھہ رائے زنی کرتی تھی۔ بلا کی چنچل اور شوخ تھی۔ لگاوٹ اور دلکشی میں مہارت تامہ رکھتی تھی' اس کی دلفریب طراری نے ابسن پر ایسا جادو کیا کہ اس کے ہوش و حواس جاتے رہے گھر واپس آتے ہی ایک نظم لکھی اور اس بلائے جان کے پاس بھیجدی —

ہاں ایک ہی ہے' ایک ہی'
ان میں ایک ہی ہے'
اس کی آنکھوں میں ایک مخفی غم کا رنگ جھلکتا ہے'
غم کا آغاز معلوم ہوتا ہے'
میں اُن میں وہ خواب آفریں خیالات پاتا ہوں
جو کبھی بلند ہوتے ہیں' اور کبھی پست ہوجاتے ہیں
ایک دل جو آرزو مند ہے' اور بلیوں اُچھلتا ہے'
اور دنیا میں کہیں سکون نہیں پاتا'
کیا میں تیرا مطالعہ کرنے کی ہمت کرسکتا ہوں'
تو جوانی' اور گہرے خوابوں کا مجموعہ ہے'
میں نے ہمت کرکے تجھے منتخب کرکے
اپنے خیالات کی دلہن بنانے کے لئے چن لیا ہے'
کیا میں اپنی روح

تیری روح کی موجوں میں غرق کرنے کی ہمت کرسکتا ہوں ؟
کیا میں اُن تصورات پر نگاہ جما سکتا ہوں
جو تیری معصوم روح میں پوشیدہ ہیں ؟
آہ ! پھر کیسے حسین گیت
میرے سینہ سے بلند ہوں گے !
اور میں کس آزادی سے مائل پرواز ہوں ،
ایک پرند کی طرح ، آسمان کے کنارے تک !
اس کے بعد ، چاہے میرے تصورات پریشاں
ایک ہی راگ میں مجتمع ہوجائیں ،
کیونکہ پھر تو زندگی کے سارے دلکش نقشے
ایک ہی راگ میں عکس ریز ہوں گے
کیا میں تجھے پڑھ لینے کی جرأت کرسکتا ہوں ،
اے شباب اور گہرے خوابوں کے مجموعے !
کیا میں جرات کرسکتا ہوں
کہ تجھے اپنے خیالات کی دلہن بنالوں ،

حالات نے مساعدت کی ، دونوں کی شادی ہوگئی ، اور اس نئی شریک حیات کے ساتھہ ابسن نے ایک تریجڈی المیہ پر پھر عرق ریزی شروع کردی ، ابتک اُس کا آئڈیل ایک روشن شمع کی طرح اس کی نگاہ کے سامنے تھا ، وہ محسوس کرتا تھا کہ فطرت کا ایک پیام ہے جو اُسے عوام الناس تک پہنچاتا ہے ، جو وہ اب تک نہ پہنچا سکا تھا ، دراصل فطرتِ اپنے پیام بلند ترین آرٹسٹ کے ذریعہ سے عوام الناس تک پہنچاتی ہے ، اور اس رتبے پر پہنچنے کے لئے آرٹسٹ کو شدید محنت اور ریاضت کرکے اپنے

آرٹ کی تکمیل کرنا ہوتی ہے —

برگن کے تھیٹر کی روز افزوں کامیابی کو دیکھکر Christiania کے قومی شعرا کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہاں بھی ایک قومی تھیٹر تعمیر کیا جائے ' چنانچہ یہ کام شروع کیا گیا مگر اس کی سر سبزی ہمیشہ معرض خطر میں رہتی تھی ' سنہ ۱۸۵۷ ع میں اس خطرے نے خوفناک صورت اختیار کرلی ' یہاں تک کہ اس کا وجود ڈانوا ڈول ہونے لگا ' اور بہت بحثا بحثی کے بعد یہ رائے منظور ہوئی کہ اس کی کامیابی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ابسن سا اسٹیج منیجر نہ حاصل ہو ' چنانچہ ابسن کو یہاں آنے کی دعوت دی گئی ' اس کی تنخواہ دونی کی گئی ' اور یہ طے پایا کہ تھیٹر کی آمدنی میں سے اُسے ۷ $\frac{1}{2}$ فی صدی منافع دیا جائے گا ' جو کسی حالت میں ایک سو بیس پونڈ سالانہ سے کم نہ ہوگا ' ابسن برگن کی ملازمت کی میعاد ختم کرچکا تھا اس لئے اس نے بہ کمال رضا و رغبت یہ جگہہ قبول کرلی ' اور سنہ ۱۸۵۷ ع میں وہ برگن سے چلکر Christiania میں مقیم ہوا - ۲۴ سال سے ۳۰ سال کی عمر تک ابسن برگن کے تھیٹر کا منیجر تھا ' اور سال میں ایک مرتبہ وہ خود اپنا ایک ڈراما پبلک کی خدمت میں پیش کرتا تھا - مگر اس کی روانگی اسقدر چپ چاپ عمل میں آئی کہ نہ کوئی دعوت ہوئی ' نہ جلوس نکلا ' اور نہ اخبار میں کوئی مضمون شائع ہوا ' وہ برگن میں نہایت خاموشی سے داخل ہوا ' نہایت خاموش زندگی بسر کی ' اور اسی خاموشی کے ساتھہ وہاں سے چلدیا -
ابسن کی زندگی کا یہ دوسرا باب ختم ہورہا تھا ' ایک نئی دنیا اس کی نگاہ کے سامنے تھی ' نئی نئی امیدیں اور نئے نئے خطرات اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے ' —

برگن کا قیام ابسن کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا ' اور جو تجربہ اسنے وہاں رہکر حاصل کیا وہ اس کی تصانیف کی زینت کا باعث ہے۔ اسٹیج کے اساسی اصول ' اور اہم ترین نکات جس سے پہلے پہل وہ ناواقف معلوم ہوتا تھا اب وہ اِن کا ماہر ہو گیا ' اس کے پہلے ڈراما Warrior's Barrow کو اُٹھا کر دیکھئے ' یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسے مصنف کی تصنیف ہے جو اسٹیج کے کام سے سراسر نا آشنا ہے - اس کے مقابل میں وہ ڈراما رکھئے جو برگن سے جا نے کے بعد لکھے گئے ' صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مصنف اسٹیج کے نکات اور قواعد میں ید طولیٰ رکھتا ہے ' جب تک ابسن - برگن میں رہا اُس کے دل پر ایک عجیب قسم کی بے چینی طاری تھی ' نگاہ صاف نہ تھی ' خیالات اُلجھے ہوئے تھے ' بانگ جرس کان میں آتی تھی لیکن منزل گہ مقصود کا کہیں پتہ نہ تھا ' رگ رگ میں جوش و خروش تھا ' دل میں توانائی تھی ' اُمنگیں تھیں لیکن روح کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی ' اس انتقال مکانی سے رفتہ رفتہ جوش و خروش کم ہونے لگا ' اور روح کی دیرینہ بے چینی ایک ایسے سکوت سے مبدل ہوگئی جو پھر کبھی پراگندہ نہ ہوا ' اس کی وجہ یہ تھی کہ ابسن کی نگاہوں سے تاریکی دور ہوتی جاتی تھی ' اور اُسے منزل گہ مقصود کا دھندلا سا خاکہ نظر آرہا تھا ' اس کے علاوہ اس کی شریک حیات کے دل سے یہ صدا آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی ' —

" میں ہمیشہ تیرے ساتھہ ہوں ' میں تجھے جنگ
اور مردانہ فتوحات کے لئے طیار کرتی رہونگی ' یہاں
تک کہ تیرا نام ہر ملک میں پکارا جائے گا ' تلوار
کے کھیل میں میں تیرے دوش بدوش رہونگی ' میں

تیرے بہادروں کے ساتھہ طوفان میں ' اور لٹیروں کے
حملوں میں ساتھہ رھونگی ' اور جب تیری موت
کا نوحہ پڑھا جائے گا تب یہ معلوم ھوگا کہ Sigurd
اور Hjoerdis ایک ھی ھیں " —

" یہ فارن کی وصیت ہے کہ ہم ساتھہ ھی رھیں
یہ تبدیل نہیں ھوسکتی ' اب مجھے اپنی زندگی
کا کام صاف نظر آرھا ہے ' وہ یہ ہے کہ میں تجھے اقصائے
عالم میں مشہور کروں " —

مگر شادی * کے بعد ھی ابسن مالی مشکلات میں پھنس گیا ' اس نئے تھیٹر کا کاروبار اسقدر سر سبز نہ ھوسکا جتنی اُمید تھی ' چنانچہ ابسن کی ماھانہ آمدنی بجائے بڑھنے کے گھٹنے لگی ' اُدھر کچھہ عرصے بعد اس کے یہاں پہلا لڑکا پیدا ھوا † اخراجات بڑھنے لگے - اور اس کے ساتھہ ساتھہ ابسن کی مشکلات میں اضافہ ھوتا گیا ' مگر ابسن

---

* دلہن کے والد کے انتقال کی وجہ سے ابسن کی شادی ۸ جون سنہ ۱۸۵۸ ع میں بہت چپ چپاتے ھوئی ' ابسن کی عمر ۳۰ سال کی تھی ' اس کی بیوی کی عمر ۲۲ سال کی ' —

† ان کی تاریخ پیدائش ۲۳ دسمبر سنہ ۱۸۵۹ ع ھے ' ان کا نام سیگرڈ (Sigurd) رکھا گیا ' یہ اُس ڈرامے کے ھیرو کا نام ھے جو ابسن نے اپنی منگنی کے دوران میں تحریر کیا تھا ' ابسن کا عزیز دوست اور میدان شاعری کا رقیب بیورنسن (Bjornson) اس بچے کا (Godfather) بنا - مگر اس کے بعد ھی ابسن کی مالی حالت روز بروز ابتر ھونے لگی ' اور اس کی پریشانیاں آئے دن بڑھنے لگیں —

کی بیوی بہت پختہ، صابر، اور بلند نظر خاتون تھی، اس کی زبان سے شکایت کا ایک حرف بھی نہ نکلا، اور اُس نے اپنی تکالیف کو بڑے شکر، اور تحمل کے ساتھہ برداشت کیا، یہ اُس کا اثر تھا کہ ابسن نے مصوری کے جھمیلے کو خیر باد کہا، اور ڈرامے کی جانب پوری طرح متوجہ ہوا، وہ ابسن کے پنہاں کمال کو تاڑ چکی تھی، اور اُسے یقین کامل تھا کہ کچھہ عرصہ بعد ابسن آسمان ادب پر آفتاب بن کر چمکے گا، شاید یہی وہ عقیدہ تھا جس کی مدد سے وہ اپنی مصیبتیں بھول جاتی تھی، اور ہمہ وقت شاعر کی دلداری اور حوصلہ افزائی کرتی تھی، نہ صرف یہ بلکہ وہ خوب آزادی کے ساتھہ شاعر کے اشعار کی حسن و قبح پر نکتہ چینی بھی کرتی تھی، اور اُن کے نقائص و معائب سے اُسے کمال خندہ پیشانی کے ساتھہ آگاہ کرتی رہتی تھی —

ابتدا میں ابسن پر شادی کا اثر کچھہ اچھا نہ ہوا، پہلے وہ نہایت جفا کش اور فرض شناس اسٹیج منیجر تھا، لیکن اب وہ کام چور، غفلت شعار اور بے پروا نظر آنے لگا، ایک مخصوص قہوہ خانے میں بیٹھا سگرٹ پیتا رہتا اور دوسروں کو گھور گھور کر دیکھتا رہتا تھا، اسٹیج کے معاونین اُس کی تلاش میں چکر لگاتے ہوئے اُسی قہوہ خانے میں آ موجود ہوتے، سنہ ۱۸۵۷ ع سے سنہ ۱۸۶۲ ع تک اُس نے سوائے وقتی اور ہنگامی چیزوں کے اور کچھہ نہ لکھا، اخبارات میں چرچے ہونے لگے کہ ابسن ڈرامہ نگار ختم ہو گیا، اُس کے ہمعصر شعرا (بیورنسن اور ونجی) کو گورنمنٹ کی جانب سے وظیفے ملے، اور وہ بیرونی ممالک کو علوم و فنون جدیدہ کی تلاش میں روانہ ہوگئے، ابسن کو کسی نے نہ پوچھا، اور ایک وزیر نے یہاں تک کہا کہ " Love's Comedy " کے مصنف کو وظیفہ کی بجائے سزا ملنا چاہئے، تھیٹر کا کارو بار بد سے بدتر ہونے لگا،

اور ابسن کی حالت اور ابتر ہو چلی - اُس کے احباب نے مجبوراً یہ تجویز کی کہ اُسے کسٹم Custom کے محکمے میں کوئی جگہ دلا دی جائے تا کہ اس کا افلاس دور ہو سکے ' پہلے ابسن لباس پرتکلف اور شاندار زیب تن کرتا تھا - اب ناداری نے ایسا مجبور کیا کہ پھٹے پرانے کپڑے پہننا پڑے ' حالت یہاں تک زبوں ہوئی کہ بعض وقت رات کی تاریکی میں پڑا ہوا ملتا تھا ' شراب کے نشے میں چور ' بد حال ' بد حواس —

اسی دوران میں ' اُس نے ایک نہایت معرکۃ الآرا نظم لکھی ' جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس پستی سے اُٹھنے کی صلاحیت رکھتا ہے - یہ نظم بہت دلچسپ ہے خاص طور پر اس وجہ سے کہ اس سے ابسن کے ایک اہم نظریہ کا پتہ چلتا ہے ' اس لئے ہم اس پر ایک خاص نوٹ کا ترجمہ ذیل میں دیتے ہیں : —

" ابسن کی روح ایک شکاری کے بھیس میں نمودار ہوتی ہے ' جو بلندی پر چڑھنا شروع کرتی ہے وہ اپنی ماں اور اپنی محبوبہ کو چھوڑ جاتا ہے اس خیال سے کہ جلد واپس ہوں گا - پہاڑ پر ایک اور شکاری سے مدبھیڑ ہوتی ہے ' یہ ایک نہایت خوفناک اور لاأبالی شخص ہے ' جو اُسے یہ سکھاتا ہے کہ اپنے دل سے ماں ' محبوبہ ' اور وطن کی محبت نکال ڈال ' اسی اثناء میں کرسمس کی گھنٹیاں سنائی دیتی ہیں ' اور وطن و اعزہ کی یاد دل میں چٹکیاں لیتی ہے ' وہ بلندی پر رہ کر انسانی خواہشات اور لطیف جذبات سے اس قدر عاری ہو جاتا ہے کہ وہ

اپنی ماں کے مکان کا جلنا ' اور اپنی دلھن کے جلوس
عروسی کا نذر آتش ہونا ' ایک دلفریب منظر کی
حیثیت اور ایک آرٹسٹ کی نگاہوں سے دیکھتا ھے " —

اس نظم کا مفہوم یہ ھے کہ جو شخص اپنی زندگی آرٹ کی نذر کرنا چاھتا ھے اُسے دنیاوی علائق و خواھشات و جذبات سے بالکل جدا ہو جانا چاھئے' بہ الفاظ دیگر یہ ناممکن ھے کہ آپ آرٹ کی پرستش بھی کریں' اور دنیا کے بکھیڑوں میں بھی الجھے رھیں' در اصل آرٹ کا رتبہ اتنا بلند ھے کہ وھاں دنیا کا شور و غل نہیں پہنچتا ' اس کی عمارت شہر کی فضا میں قائم ہوتی ھے جو نفسانی لوث سے سرا سر پاک ہوتی ھے' اس عمارت کا بلند ترین زریں کلس وھاں ھے جہاں ھماری آپ کی پاک آرزوئیں آباد ھیں' اور جہاں بقول ٹینیسن (Tennyson) کے :-

" نہ برف گرتی ھے' نہ بارش ہوتی ھے' اور نہ اولے برستے ھیں'
نہ تند ہوائیں چلتی ھیں ' مگر جو واقع ھے '
خوش منظر کھلے مرغزاروں میں'
جہاں باغات کا سبزہ حسن و دلکشی میں اضافہ کرتا ھے'
اور جس کے کنج موسم گرما کے سمندر سے مرصع ہوتے ھیں' ... ..."

ابسن اپنے ملک میں قبل از وقت پیدا ہوا تھا اسی لئے اس کو زندگی کا ایک معتدبہ حصہ مایوسی میں گذارنا پڑا - ایک مدت دراز تک اُس کا ماحول نہایت ھی ھمت شکن رھا —

اور اُسے وہ تمام دقتیں اُٹھانا پڑیں جو ایک مجتہد کو نئے خیالات کی ترویج میں اُٹھانا پڑتی ھیں ' ۷ مارچ سنہ ۱۸۶۳ ع کو ایک ھفتہ وار اخبار میں ابسن کا ایک کارٹون شائع ہوا ' اسکی ھئیت کذائی کا خوب خاکہ اڑایا گیا تھا ' آنکھیں نہایت غمگین تھیں ' سر پر لمبے بال تھے ' داڑھی کی طوالت شیطان کی آنت سے گوے سبقت لے جارھی تھی ' شام کا لباس زیب تن تھا - ھاتھ پشت سے پیوست تھے ' اور چاروں طرف سے

تیروں کی بوچھاڑ ہورہی تھی - اس مایوسی اور کس مپرسی کی حالت میں اُس نے بادشاہ کو ایک درد ناک عریضہ لکھا ' جس کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا :—

" میں نے سنہ ۱۸۵۷ ع میں برگن تھیٹر کی ملازمت سے استعفیٰ دیدیا اور (Christiania) کے نارویجین تھیٹر میں (Artistic Director) سے ملازم ہوگیا جہاں میں گذشتہ موسم گرما تک کام کرتا رہا ' اس کے بعد یہ کمپنی دیوالیہ ہوگئی ' اور اس کا کاروبار ختم ہوگیا - یکم جنوری سے میں عارضی طور سے (Christiania Theatre) میں پھر نوکر ہوگیا ہوں اس جگہ میری تنخواہ پانچ پونڈ ماہوار ہے ' لیکن اس شرط کے ساتھہ کہ کمپنی کو گذشتہ سال سے زیادہ مالی فائدہ ہو - اس ملک میں محض ادب کے مادی منافع پر زندگی گزارنا محال ہے ' میرے ڈرامہ (The Viking) سے مجھے سب سے زائد نفع ہوا ... مگر میں سو پونڈ کا مقروض ہوگیا ہوں - اور چونکہ اس ملک میں مجھے نفع کی صورت نظر نہیں آتی اس لئے اب ڈنمارک جانے کا ارادہ کرچکا ہوں ...... "

ابسن کی کوشش رائگاں نہ گئی ' اور ۲۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۳ ع کو اُسے بیرونی ممالک میں دورہ کرنے کے لئے وظیفہ ملا ' کہ یورپ کے متمدن ممالک کے خیالات جدیدہ کا اُن ہی ممالک میں رہ کر مطالعہ کرسکے ' اسی اثنا میں اُس کا تازہ ترین ڈرامہ " The Pretenders " نہایت کامیابی کے ساتھہ

استیج هوا - یہاں تک که خود دارالسلطنت میں ایک هي موسم میں سات مرتبه دکھایا گیا ' ابسن نے یه ڈراما اپنی قوم کو بیدار * کرنے کی غرض سے تحریر کیا تھا ' اس میں وہ روایات ' مقامات اور نام موجود تھے جو سامعین کے دلوں پر جادو کا کام کرتے تھے ' مصنف نے بڑی شد ومد کے ساتھ اپنے ملک کے تفرقه پردازوں کا خاکه اُڑایا اور یه بتایا که اگر ملک اسی خواب راحت میں سوتا رهے گا تو جلد سے جلد نابود هو جائے گا - اس ڈرامے کی کامیابی نے ابسن کے شکسته دل کو بہت مسرور کیا ' خوش خوش وہ ناروے سے چل کھڑا هوا اور جرمنی کے شہروں میں گذرتا هوا روم جا پہنچا - لیکن جرمنی میں اُسے ایک نہایت تلخ اور صبر آزما منظر دیکھنا پڑا ' جرمنی کے باشندے اپنی اُس فتح پر خوشیاں منا رهے تھے جو اُنھیں ڈنمارک پر حاصل هوئی تھی ' جرمنی کے جوشیلے لڑکے غرور سے مست هوکر ڈنمارک کی حاصل کردہ توپوں میں تھوکتے جاتے اور گاتے جاتے تھے ' ابسن اس منظر کو دیکھتا رها لیکن اُس کا خون اس کی رگوں میں کھول رها تھا - اُسے یه معلوم هورها تھا که یه چھوکرے ناروے کے باشندوں کے منه پر تھوک رهے هیں - وہ ناروے جس کو اپنی عزت کا مطلق احساس نہیں ' لیکن وہ اس قدر وسیع النظر ضرور تھا که خود اپنی کوتاهی تسلیم کرلے - چنانچه وہ محسوس کررها تھا که یه میری هی ذمه داری هے که میرا ملک اب تک آسودۂ راحت هے !

---

* " As a result he decided that there had been enough such romantic dramas from his pen ...... what his nation now needed was a satire of the present, and the venom for such a book was steadily accumulating in him."

یورپ * کا شمالی حصہ بالخصوص ناروے بے حد سرد ' تاریک ' اور خاموش ھے ' موسم گرمابہت ھی مختصر ھوتا ھے ' جاڑے کے موسم میں اتنی سردی پڑتی ' اور برفباری ھوتی ھے کہ خدا کی پناہ ' اول تو سورج نظر ھی کم آتا ھے ' اور اگر نظر بھی آتا ھے تو کانپتا ھوا ' ھر طرف سکوت اور جمود طاری ھوتا ھے ' اس کے برخلاف جنوبی یورپ جو ساحل بحیرۂ روم پر واقع ھے خوبصورتی اور حسن میں اگر دنیا کا لاجواب حصہ ھے تو آب و ھوا کی تر و تازگی میں بھی سب سے بہتر اور دلکش ھے —

جب ابسن شمال سے سفر کرتا ھوا روم پہنچا تو وھاں کی قدیم عمارتیں ' اور آرٹ کے اعلیٰ ترین نمونے دیکھہ کر مبہوت ھوگیا ' لوگ کہتے ھیں کہ شمال کا آسمان جنوب کے آسمان سے بہت بہتر ھے ' زیادہ بلند ' زیادہ گہرا نیلا ' اور زیادہ روشن ھے ' چاندنی رات کی تابناک دلکشی تو یقیناً ھر شخص کو رطب اللسان بنا دیتی ھے ' ابسن در اصل دونوں کیفیتوں سے بے حد متاثر ھوا ' فطرت کی ساری رعنائی اس کی نگاہ کے سامنے تھی ھی اُس پر طرہ یہ ھوا کہ " صنادید عجم کے آثار " یعنی قدیم رومی تمدن کے نشانات دیکھہ کر وہ حیران رہ گیا فطرتاً روم کی تہذیب کا عروج و زوال اس کی نگاہ کے سامنے آگیا ' اور اسی نشیب و فراز کو وہ ایک ڈرامے کی صورت میں ڈھالنے لگا —

---

* He had now escaped from the dark cramping tunnel of Norwegian life where all was cold and bare, where all emotions and passions seemed frozen up, and where all moved in the spirit of the miserable every day routine, "

Compare this with the account given on page 60, 1st paragraph.

روم میں جو پروشیا کا سفارت خانہ تھا اُس کی حدود کے اندر گرجے میں ناروے اور ڈنمارک کے باشندے جاتے ' اور پادری کی دعاؤں کو خاموشی کے ساتھہ سنتے رہتے وہ پروشیا کی اُس فوج کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگتا جو اُسی زمانے میں ڈنمارک سے برسر پیکار تھی ' ابسن ذلت کا یہ سین دیکھتا اور غصے کے مارے کانپنے لگتا ' اور اپنے ہم وطنوں سے پوچھتا کہ آخر تمھاری خود داری ' عزت اور احساس کہاں گیا ؟ اُس کے جذبات میں طوفان اُٹھتا ' رگوں میں خون گردش کرنے لگتا ' اور بعض وقت فرط جذبات سے اُس کے آنسو نکل پڑتے ' وہ اپنی اُس کتاب حیات کو ایک ڈرامے کی صورت میں پیش کرنا چاھتا تھا جس کے صفحے صفحے پر اُصولوں کی قربانی کی داستان ثبت تھی' اسی دوران میں اُسے ایک پادری مسمی (Lammers) یاد آیا جو اسکین میں مذھبی جوش پھیلاتا تھا ' اس کی ھدایت کے مطابق رسومات بند کردی گئی تھیں' تصویریں پھینک کر جلادی گئی‌تھیں' اور یہ اصلاحات آگے چل کر اس قدر طاقتور ھوئیں کہ (Lammers) نے گرجے کی عمارت تک کو خیر باد کہا اور پہاڑ کی ایک چوٹی کو عبادت خانہ قرار دیا لوگ جوق جوق اس کی پیروی کے لئے چوٹی پر جاتے تھے' گو ابسن اپنے مذھب کے اساسی اصولوں کا قائل نہ تھا لیکن اسے اس پادری سے کچھہ دلچسپی پیدا ھو گئی تھی جس نے دیرینہ رسومات کا ایک آن میں قلع قمع کردیا تھا - مگر افسوس ھے کہ (Lammers) کا حشر اچھا نہ ھوا - مدت دراز تک وہ سرکاری مذھب کے آئین کی مخالفت کرتا رھا لیکن آخر کار افلاس اور تنگدستی نے بالکل مجبور کردیا - چنانچہ سنہ ۱۸۶۰ ع میں اسے ایک معافی نامہ شائع کرنا پڑا جس میں اس نے اپنے گناھوں کا اعتراف کیا ' اور معافی مانگی - پختہ اصول کی یہ قربانی ابسن کے دل کو گھائل کر گئی '

اور وہ ہفتوں اس واقعہ پر غور و فکر کرتا رہا —

در اصل اس سانحہ سے ابسن کے دل پر بہت گہرا اثر ہوا - اور آگے چل کر یہی حقیقت " شمشیر برہنہ * " کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ مگر مالی حیثیت کے اعتبار سے یہ زمانہ ابسن کے لئے سخت ابتلا اور مصیبت کا زمانہ تھا' اٹلی میں قیام کرنا خوشگوار ضرور تھا لیکن جب آمدنی سراسر بند ہو تو قیام کیسے جاری رکھا جاے' لخت جگر اور خون دل پر کہاں تک قناعت کی جاے' بعض اوقات تو ناداری یہاں تک بڑہ جاتی کہ اسے اپنے قونصل سے جاکر قرض لینا پڑتا - بار بار اس نے بادشاہ کی خدمت میں وظیفے کے لئے عریضے روانہ کئے' اور مدتوں انتظار کیا' اسی اثنا میں وہ بیمار ہوگیا لیکن اس کی با وفا بیوی بڑی ہمت اور بہادری کے ساتھہ اس کی دلجوئی اور تیمار داری کرتی رہی - ابسن اس زمانہ میں (Brand) لکھہ رہا تھا ' اسی اثناء میں اس کا (St. Peter's) کے گرجے میں جانا ہوا ' وہاں ابسن پر کچھہ عجیب کیفیت طاری ہوئی' جس کے متعلق وہ کہتا ہے :—

" سخت ترین مایوسی کی حالت میں'

---

* اس ڈرامہ کا نام (Brand) ہے - جس کے معنے ہیں " تلوار " یا " آگ " - اس ڈرامہ میں ابسن نے اپنے وطن کی طرز معاشرت ' خیالات ' عقائد ' سیاست ' غرض کہ زندگی کے ہر پہلو پر سخت ترین حملے کئے ہیں ' اس لئے میں نے اس کا نام' نام اور مضمون کے اعتبار سے شمشیر برہنہ تجویز کیا - اس کا ملک گہری نیند میں سو رہا تھا ' اس ڈرامہ کے ذریعہ سے اس نے ایسے بلند بانگ نقارے بجاے کہ ناروے کے باشندوں کو اٹھنا ہی پڑا —

رنج محن کے لرزتے ہوئے عمیق سمندر میں '
میں نے کیا محسوس کیا ' اگر وہ دعا نہ تھی'
وہ بے خودی' وہ کیف باطنی کہاں سے آیا ؟
موسیقی کا وہ سیلاب' ایک طوفان کی طرح اُمنڈتا ہوا '
جو دور تک سنائی دیا ' اور جلد سے جلد
مجھے بہا لے گیا ' اور مجھے آزاد کر گیا
کیا وہ دعا کا کیف باطنی تھا ؟
یا میں اللہ پاک سے ہم کلام تھا ؟ "

مکان واپس آ کر ابسن نے Brand کا مسودہ ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا ' اور اس ڈرامے کی ترتیب از سر نو شروع کی ' ابسن صبح کے چار بجے بیدار ہوتا ' اور صبح کی سہانی فضا میں باغات کا چکر لگاتا رہتا ' سورج کے بلند ہوتے ہی وہ اپنی میز پر لکھنے بیٹھ جاتا ' اور شام تک برابر لکھتا رہتا ' یہ ڈراما بہت ضخیم ہے ' لیکن جولائی کے وسط میں شروع کرکے ابسن نے اُسے اکتوبر کے آخر تک ختم کر ڈالا ' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس نے اس کی طیاری میں بہت زیادہ محنت کی ہو گی ' جب تک ابسن اپنے وطن میں رہا اس کی نگاہ محدود ' اور اُس کا خیال تنگ تھا - یہاں تک کہ وہ خود اپنے ملک کی حالت کا صحیح اندازہ نہ کر سکتا تھا ' جب وہ ناروے سے باہر نکلا اور اُس نے جرمنی ' پراشا ' اور اٹلی کی ذہنی اور دماغی ترقی دیکھی تو اس کی آنکھیں کھلیں ' اور وہ یہ اچھی طرح سمجھ سکا کہ اُس کا ملک ابھی کتنا پیچھے ہے ' وہ خود کہتا ہے :—

" میں نے اپنے وطن اور اس کی زندگی کا کبھی وطن

ہی میں وہ اندازہ نہ کیا جو ملک سے باہر جا کر ممکن تھا"

ابسن نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ " Tragic Muse " * کے مجسمے نے مجھے یونانی المیہ Greek Tragedy کی اصلی روح سے آگاہ کیا - چنانچہ اس کے ہیرو میں اور ارسطو کے کلاسیکل ہیرو میں بہت کچھ مشابہت پائی جاتی ہے - ارسطو † کا ہیرو ایک شریف نژاد بلند مرتبہ نوجوان ہے جس کے کیریکٹر کی ایک خاص قسمت کے ہاتھوں اس کی تباہی کا باعث ہوتی ہے اسی لحاظ سے گو ہم Brand کی جرأت اور ہمت کی داد دیتے ہوے اس سے کچھ مانوس ‡ ہو جاتے ہیں لیکن وہ بڑی نوع انسان کے فضائل سے واقف نہیں، اور اس لئے اس کا وہی حشر ہوتا ہے جو بہت سے رہنماؤں کا ہو چکا ہے -

برینڈ اس قدر فصیح، بلند، اور جادو اثر ڈراما ہے کہ اس کی خوبیاں ضبط تحریر میں لانے کے لئے ایک علحدہ کتاب کی ضرورت ہے —

" سفینہ چاہئے، اس بحر بیکران کے لئے "

---

* Muse یونانی اور رومن علم الاصنام کی وہ دیوی ہے جو شاعر کے دل و دماغ میں شاعرانہ خیالات پیدا کرتی ہے - اسی اعتبار سے Musaeus یونان کے قدیم شعرا کو کہتے ہیں —

† ارسطو کا یہ خیال تھا کہ ہیرو عالی خاندان اور ممتاز ضرور ہونا چاہئے - مگر انیسویں اور بیسویں صدی کے Social Plays میں ہیرو کی شخصیت کا ممتاز ہونا ضروری نہ سمجھا گیا —

‡ برینڈ کا کیریکٹر ایسا نہیں ہے کہ اس سے زیادہ انس ہو سکے - محبت کے عوض وہ ہمارے دل میں خوف اور ہراس کے جذبات پیدا کرتا ہے - اور اسی بنا پر وہ سپر کامنت کے خلاف انسانیت سے نسبتاً دور ہے —

پھر بھی جہاں تک ممکن ہوگا میں اختصار کے ساتھہ اس کی چند خوبیاں بیان کرتا ہوں' افسوس یہ ہے کہ اس ڈرامے کا اب تک اردو میں ترجمہ نہیں ہوا' اس لئے میری ذمہ داری فطرتاً زیادہ وزنی ہو جاتی ہے - اس سے قبل ابسن نے جس‌قدر ڈرامے لکھے تھے ان میں Sagas کا بہت دخل تھا' شکسپیر کی طرح وہ قدیم کہانیاں تلاش کرتا تھا' اور ان ہی کو اپنے کاک گھر بار کی مدد سے ھیرے بنا دیتا تھا- شکسپیر کی جتنی معرکۃ الآرا ٹریجڈی یا کمیڈی ھیں اُن کے قصے کہیں بھی طبع زاد نہیں - چنانچہ برینڈ کے لکھنے سے قبل ابسن بھی اسی اصول پر کار بند رہا - مگر اس کا یہ ڈراما سراسر طبع زاد ہے - نہایت اشتعال انگیز اور بہت ھی فصیح و بلیغ ہے - اس میں ناروے کی حالت پر شدید حملے کئے گئے ھیں مگر اس کے ساتھہ ساتھہ اس میں چپہ چپہ پر ناروے کی روایاتی خصوصیات کا رنگ و روغن موجود ہے - اگر مقامی رنگ کی جھلک نہ ہوتی تو یہ ڈرامہ ناروے میں کبھی اتنا مقبول نہ ہوتا' ۱۵ مارچ سنہ ۱۸۶۶ م کو شایع ہوا' اور اس کے شائع ہوتے ھی گویا سارے ملک میں ایک آگ سی لگ گئي- دو مہینے میں اس کا پہلا اڈیشن ختم ہو گیا اور سال بھر میں چار اڈیشنوں کي نوبت آ گئی' اس کے بعد تانتا بندھا رہا - یہاں تک کہ اس کی اشاعت اُنیسویں صدی کے نارویجین میدان ادب کا سب سے مہتم بالشان کار نامہ ہو گیا —

اب تک ابسن کی جو کچھہ شہرت اور عظمت تھی وہ مقامی تھی' مگر ابسن کے اس ڈرامے نے اس کو کل یورپ کے آسمان ادب کا ایک درخشاں ستارہ بنا دیا - جرمنی میں اس تصنیف کی بہت قدر ہوئی' اور یہ "ھیملٹ" اور "فاوسٹ" کا ھم رتبہ قرار دی گئی' اور سنہ ۱۸۷۲ ع

سے سنه ۱۸۸۲ م تک اس کے ترجمے کے جرمنی میں چار اڈیشن نکلے ' پھر رفته رفته اس کے تراجم فرانس اور انگلستان میں شائع ہو کر مقبول ہوے' اور اسکین کے دوا خانے کا ایک گمنام ملازم بین‌الاقوامی شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ' —

سنه ۱۸۶۳ ع میں ڈنمارک کے بادشاہ ' اور سویڈن کے بادشاہ میں ایک سیاسی اتحاد قائم ہوا ' جس کی رو سے Sles-oig کو ڈنمارک کا ایک جز قرار دیا گیا ' اور نا روے میں خوشیاں منائی گئیں ' حالانکه ایک ایسی جماعت موجود تھی جو ڈنمارک اور نا روے کے اتحاد کے لئے تیار نه تھی ' گو زیادہ تر وہ لوگ تھے جنھوں نے اس کا عہد کیا تھا که وہ اپنے بھائیوں کی میدان جنگ میں مدد کریں گے - فروری سنه ۱۸۶۴ م میں پروشیا اور آسٹریا نے ڈنمارک پر حمله کردیا - اُس وقت ابسن کے خیال میں صرف ایک ہی طریقۂ عمل تھا ' لیکن سویڈن کے بادشاہ نے مدد کرنے سے انکار کیا ' اور ڈنمارک کے بادشاہ کو مجبور کیا که وہ ملک کو لا وارث چھوڑ کر بھاگ جائے اس واقعه سے ابسن کی آتش غضب روشن ہو گئی ' اور اس کا غیظ برینڈ کی زبان سے ظاہر ہوا ' مقصد یه تھا که برینڈ ابسن کے ہیرو کے تمام اوصاف سے متصف ہو ' لیکن اس نے جلد یه محسوس کر لیا که کامیاب ہونے کے لئے ہیرو کا انسان ہونا نا گزیر ہے ڈراما نویسی کا شاید یه اولین اصول ہے که ہیرو جو بھی ہو اور کیسا بھی ہو لیکن اُس کا انسان ہونا لازم ہے ' اور انسان ہونے کی حالت میں اُس میں خامیاں اور کمزوریاں ہونا لابدی ہیں - برینڈ ایک دیو کی طرح ساری دنیا سے جنگ کرتا ہے ' لیکن اس کی روح ہمیشه بے چین متوحش ' متردد ' اور سر بسر پیکار نظر آتی ہے - اس کے دل میں تو ہمات ' شکوک اور خلش پیدا ہوتی ہے جو ہر انسان کو

ورثے میں ملی ھے' آپ کو ایسا انسان کہاں ملے گا جو خلش نہانی سے مبرا ھو' یا جس کو ترددات کی چاشنی کا ذائقہ حاصل نہ ھوا ھو' اس لئے اگر ھیرو کو فوق الانسان بیان بنایا جاے گا تو ڈرامہ غیر فطری ھوجائیگا —

برینڈ پہاڑ پر سے اُترتا ھے' اور ایک سوتے ھوئے ملک کو جگا کر یہی درس دیتا ھے وہ کہتا ھے کہ اپنے کیریکٹر میں اتنی جرأت اور اتنا استحکام پیدا کرو کہ جو تم ھو اُس کو جسارت کے ساتھہ ظاھر بھی کرسکو' بجاے اس کے کہ ڈانوا ڈول ھوتے رھو' یہی بہتر ھے کہ

"نفس کے غلام ھو جاؤ' عیش و عشرت کے بندے ھو جاؤ"

"مگر جو کچھہ ھو پوری طرح ھو"

اور جو کچھہ بھی ھو اس کی تبلیغ ھی نہ کرو بلکہ اس کی مثال عملاً پیش کرو'

برینڈ کے سین جس مقام پر دکھاے گئے ھیں اس کی خصوصیات بہت دلچسپ ھیں - شدید برفباری ھو رھی ھے' طوفان برپا ھے' غار کے عین کناروں پر برف کے پہاڑ معلق ھیں' اور اس غار میں سورج کی کرن پہنچتی ھی نہیں کہ ان کے باشندوں کو منور نظار کرسکے' اگر کرنیں آتی بھی ھیں تو محض تین ھفتوں کے لئے ھر وہ شے جو کمزور اور ضعیف ھے بے حس اور بیمار ھو کر مر جاتی ھے' غلہ کبھی نہیں پکتا' قحط ملک پر مسلط رھتا ھے باشندے کنجوس فطرت سے قوت لایموت حاصل کرنے کے لئے سخت عرق ریزی کرتے ھیں' جس کا وزن ان کو ناتواں اور مردہ کردیتا ھے' ان کی گردن اور کمر خمیدہ ھوجاتی ھے' ان کی نگاھیں زمین پر گری ھوتی ھیں' ان کے خیالات میں پرواز کا نشان تک نہیں ملتا؛ اور وہ زمین پر پیٹ کے بل رینگتے ھیں' ان کا کیریکٹر پختہ نہیں ھوتا' ایک نگاہ آسمان پر لگی ھوتی

ہے ' دوسری زمین سے وابستہ نظر آتی ہے ' اس لئے ہر کام کو بد دلی سے کرتے ہیں۔

پہلے سین کی ہیبت ناک فضا ملاحظہ فرمائیے - پہاڑوں کی بلندی آسمان سے باتیں کرتی ہے ' اونچے اونچے پہاڑوں کی وسعت برف کے میدان سے یخ بستہ نظر آتی ہے ' کہر اس قدر گھنا اور گہرا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آتا - کبھی بجلی کی کڑک اور موسلا دھار بارش شروع ہوجاتی ہے ' اور کبھی بادلوں کی گرج فضاے تاریک کے خوف ناک سکوت کو پاش پاش کرتی ہوئی کائنات کو لرزہ براندام کر دیتی ہے ' چنانچہ کسان کہتا ہے اس قیامت کا کہر ہے کہ مجھ کو تو ہاتھ بھر آگے یا پیچھے کچھ نہیں سوجھتا کسان کا لڑکا جواب دیتا ہے دیکھو دیکھو اہا ! آگے چٹانوں کے شگاف ہیں آگے چل کر کسان کہتا ہے ارے خدا کے لئے ٹھہر جاؤ ! یہ زمین نہیں پپڑی سی جم گئی ہے - خبردار برف پر پیر نہ ٹیکنا برینڈ کہتا ہے :- سنو ! آبشار کے گرنے کی آواز آتی ہے " کسان جواب دیتا ہے ایک چشمہ پہاڑ کو کاٹتا نیچے چلا گیا ہے اس قعر عمیق کی تہ کو کوئی نہیں پا سکتا معلوم ہوتا ہے یہ منہ پھیلاکر ہم سب کو ہڑپ کرجائیے گا اور آگے چل کر کہتا ہے :- یہاں سے دوفرسخ کے گرد میں کہیں کسان کا باڑا نہیں اور یہ کہر جس کا دَل اتنا کہ چاقو سے کاٹ لو ! —

ڈرامہ جس فضا میں شروع ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خون آشام فطرت برسر جنگ ہے اور ہر چہار جانب اجزا کی پریشانی اور عناصر کی پراگندگی پھیلی ہوئی ہے ' جس طرح برینڈ اپنے اُصولوں پر قائم ہے اور جذبات دلی و واقعات و حالات دنیاوی سے متاثر نہیں ہوتا اسی طرح سے فطرت اپنے بے رحم اور بے درد پہلو کے مظاہرے پر مصر ہے ' وہ برینڈ سے تو ضرور ہمدردی کرتی ہے لیکن عام کائنات

کی جانب سے بے پروا ہے - برینڈ اصول کی اُستواری کا علمبردار نظر آتا ہے جس نے اپنے دل سے سارے جذبات فنا کردئیے ہیں اسی طریقہ سے فطرت اپنے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہے لیکن کسان ، کسان کے بیٹے ، ایگنس (Agnes) اور ایلینر (Elinar) سے فطرت کو کوئی ہمدردی نہیں ، جس طرح برینڈ اپنی ماں اپنی بیوی اور بچے کی محبت سے دست بردار ہوچکا ہے - اسی طرح فطرت سرد مہر اور سنگدل ہوجاتی ہے —

برینڈ ابسن کا پہلا ڈراما نہیں ہے ، بلکہ ساتواں ہے ، لیکن یہ وہ ڈراما ہے جس میں وہ پہلی مرتبہ لوتھر کی طرح خیال پرستی کے خلاف میدان جنگ میں اُترتا ہے اور اخلاق کے مندر کے دروازے پر اپنے مضامین کی کیلیں گاڑتا ہے ، ڈراما کا ہیرو برینڈ ہے جس کا دل قوت ، جرات ، جوش سے لبریز ہے ، جذباتی آسودہ کن ، اور رسمی مذہب پرستی اس کی خوفناک دنیا میں بزدلی ، کمزوری ، اور خود غرضانہ تمکنت سے تبدیل ہو جاتی ہے ۔ وہ چلا کر کہتا ہے تمہارا خدا ضعیف العمر ہو گیا ، میرا خدا نو جوان ہے ، اُس کو سنتے ہی کل یورپ یکایک یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ جس خدا کو وہ پوج رہے تھے وہ ایک سن رسیدہ انسان کا عکس تھا جس کی ریش مقطع ، پیشانی رعبدار ، اور ہیڈ ماسٹر کا ساچہرہ بشرہ تھا - برینڈ اس احمقانہ بت‌پرستی سے گریز کرتا ہے اور اُس حالت کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے جو اس دنیا

میں جاری و ساری ہونا چاہئیے ' اس حالت کو پیدا کرنے کے لئیے وہ جنگ کرتا ہے اور ہر اُس شے سے خوفناک طریقے سے برسر پیکار ہوجاتا ہے جو اس کی راہ میں سد باب ثابت ہوتی ہے - اس کے خیال میں حیات بے معنی اور شخصیت بیکار ہے ' جو کچھہ حقیقت ہے وہ انسان مکمل ہے ' ناقص انسان ان خیالات سے گریز کرتے ہیں ' وہ ایک کسان کو برف کے پہاڑ عبور کرنے کی ترغیب دیتا ہے ' کیونکہ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی مرتی ہوئی لڑکی کو دیکھہ لے ' کسان انکار کرتا ہے ' نہ صرف یہ بلکہ وہ بریند کو یہ ترغیب دیتا ہے کہ وہ بھی نہ جائے ' بریند اُسے ٹھوکر مارکر ہٹا دیتا ہے اور نہایت جوش اور حرارت میں اُسے تلقین کرتا ہے ' اس کے بعد طوفانی حالت میں بریند کو ایک دریا عبور کرنا ہوتا ہے ایک مرتے ہوئے شخص کے پاس جانے کے لئیے جس نے اپنی زندگی میں بہت سے قتل کئیے تھے ' مگر جو اب کسی پادری سے تسکین حاصل کرنے کا آرزو مند ہے مگر بریند تنہا نہیں جاسکتا اُسے ملاح کی ضرورت ہوتی ہے ' مگر اس مہم کے لئیے کوئی راضی نہیں ہوتا ' ایک عورت بریند کی بہادری سے متاثر ہوکر کمر ہمت باندھتی ہے ' دونوں کی شادی ہوجاتی ہے ' اور لڑکا پیدا ہوتا ہے ' اب بریند کو اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ بلندی حاصل کرے

لیکن کرتا چلاجاتا ہے اور بہت سے خون کرتا ہے ' پہلے موسم کی سختی سے بچہ مرتا ہے ' بریند یہ گوارا نہیں کرتا کہ اپنی جگہ ایک ناکام پادری کو مقرر کرے اور ذاتی مفاد کے خیال سے متاثر ہو ' اس کے بعد وہ جبراً اپنے بچے کے کپڑے ایک آوارہ گرد عورت کو دلا دیتا ہے جس کا بچہ تکلیف میں ہے ' شکستہ دل ماں مشکل سے کپڑے جدا کرتی ہے ' لیکن ایک کپڑا نہیں دیتی ' اُسے بطور یادگار رکھنا چاہتی ہے ' برینڈ اسے حوا کے نقص سے تعبیر کرتا ہے ' وہ کپڑا دیدیا جاتا ہے اور ماں اس صدمے سے مرجاتی ہے ' وہ اپنی ماں کے بستر مرگ تک نہیں جاتا کیونکہ اُس نے اپنی جائداد کو تقسیم کرنے میں اُس کے اصول کا قلع قمع کیا۔ اب برینڈ گرجے کو ناکافی پاتاہے اس لئے وہ لوگوں کو خدا کے مندر میں یعنی پہاڑوں پر عبادت کی غرض سے لے جاتا ہے - مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد لوگ اس سے منحرف ہوجاتے اور اس کو سنگ سار کرتے ہیں حتیٰ کہ خود پہاڑ تک اس پر پتھر پھینک کر اسے ہلاک کر دیتے ہیں " -

اس کے بعد اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم ابسن کے فلسفہ اور خیالات کی جستجو کریں جو بربنڈ میں پائے جاتے ہیں تاکہ ہمیں یہ معلوم ہوسکے کہ یہ ڈراما لکھتے وقت ابسن کی ذہنیت کیا تھی' اور کیا عقیدہ تھا - وہ ملکی اور قومی حد بندی کا قائل نہیں * بلکہ وہ کہتا ہے کہ :

---

* ایک Artist کیلئے یہ حد بندی ہمیشہ سم قاتل ثابت ہوتی ہے ۔ اس بحث پر آگے چلکر کچھہ روشنی ڈالی گئی ہے - مگر یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر ایک جدا مستقل مضمون کی ضرورت ہے —

" میں ایک عظیم‌الشان کام کے لئے مامور ہوا ہوں
میں بڑی دنیا کے کان کی جستجو میں ہوں
اور مجھے حیات کے ساز کے ذریعہ سے بولنا چاہئے
میں یہاں کیوں ہوں؟ پہاڑوں میں بند ہوکر
انسان کی آواز ضعیف ہوجاتی ہے" —

اس جذبے میں جو اوپر بیان کیا گیا ہے یہ بات پائی جاتی ہے کہ ابسن کو اپنے پیغامبر ہونے کا یقین تھا' وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی تخلیق اسی لئے ہوئی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کا معلم بنے اور چند ضروری باتیں سکھائے اس کی آواز میں امید' توانائی' قوت اور خوشی کی جھلک پائی جاتی ہے' وہ جانتا ہے کہ وہ ایک طوفان برپا کر رہا ہے جو ساری مخالفتوں کو بہا لے جائے گا — چنانچہ وہ کہتا ہے :

"غار میں کون بند رہے گا
جب کہ وسیع مرغزار چاروں طرف سے اشارے کرتے ہوں -
شور زمین کو جوتنے کی کون محنت کرے گا
جب کہ چاروں طرف ہرے بھرے باغ موجود ہوں "

آگے چل کر وہ محسوس کرتا ہے :—

" اپنی روح میں
مجھے نئی قوتیں بیدار ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں'
مجھے دن کی روشنی نظر آرہی ہے'
میں وہ تلاطم محسوس کر رہا ہوں'
میرا دل بڑھتا اور آزاد ہوتا چلا جاتا ہے
اور دنیا کو اپنے آغوش میں لینے کے لئے طیار ہے

ایک نئی صدا بلند ہوتی ہے، یہاں
اس دنیا میں ایک نئی قوم آباد ہوگی -

ابسن نے جو کام اپنے ذمہ لیا تھا اس کی پوری اہمیت سے وہ آگاہ تھا، اس نے اپنے وطن کی سیاسی اور اخلاقی حالت کا بخوبی اندازہ کیا تھا - وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ سیاسی اقتدار جا چکا، قومی عزت کا خون ہوگیا - اخلاقی پستی حد کو پہنچ چکی، اور ہمسایہ قومیں شاہ راہ ترقی پر گامزن ہیں، ناروے کی حالت وہ دیکھتا اور خون کے آنسو روتا - چنانچہ اس نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہی بنایا تھا کہ ملکی اصلاح کرے،

"دوستو! آؤ وہ دوست
جو میرے وطن کی وادی کے قید خانہ میں محبوس ہیں -
بات چیت کرتے ہوے ہم سعی کریں گے
کہ اپنی روحیں پاک کرسکیں
سستی کو برباد اور دھوکے کو قتل کر ڈالیں گے
قوت ارادی کے شیر کو بیدار کریں گے
وہ ہاتھ جو زد و کوب کرتے ہیں
اتنے ہی قوی ہوجائیں گے جتنے
کہ وہ ہاتھ جو کدال کو استعمال کرتے ہیں -
ہم لوگوں کے لئے صرف ایک ہی انتہا ہے
وہ تختیاں طیار کریں جس پر خدا لکھ سکے" -

ابسن کو اس کا بھی علم تھا کہ جو کام اس نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے وہ کوئی آسان کام نہیں اس لئے وہ اپنی بیوی ایگنس سے کہتا ہے:

"ہمیں بہادری کے ساتھہ جنگ میں شریک ہونا چاہئے'
متحد ہوکر' کہ گریز نہ کرسکیں
ایک ایک انچ پر لڑنا ہوگا"

اس خیال میں کئی باتیں پوشیدہ ہیں' پہلی تو یہ کہ ابسن ایسا خیال پرست نہ تھا کہ وہ دنیا سے واقف نہ ہو' وہ جنگ شروع کرتا ہے اور جنگ کے خطروں سے کما حقہ آگاہ ہے' دوسرے کار زار حیات میں مرد اور عورت کا متحد ہوکر نبرد آزما ہونا ضروری ہے' پیکار حیات ایسی آسان نہیں ہے (خصوصاً بیسویں صدی میں) کہ مرد تنہا کامیاب ہوسکیں' اس کی سب سے اچھی مثال جنگ عظیم نے پیش کی جس میں عورتوں نے مردانہ وار کام کیا' اور مشرق کو بتادیا کہ اگر ان کی قوتیں افسردہ نہ ہوجائیں تو وہ دنیا میں بہت کچھہ کرسکتی ہیں' ایک اور جگہ برینڈ' ایگنس سے یہ کہتا ہے:

" تمام انسانوں سے خدا نے ایک بات طلب کی ہے '
وہ کوئی بزدلی کی سی رواداری نہیں
جو شخص اپنا کام ادھورا کرتا ہے یا جھوٹ موٹ کرتا ہے '
خدا اس کی ساری باتیں ٹھکرا دیتا ہے '
اس درس کو ہمیں استحکام دینا چاہئے
نہ صرف تبلیغ سے بلکہ عمل سے

ایگنس جواب دیتی ہے :—

" جہاں چاہو مجھے لے چلو ' میں تمہارے ساتھہ ہوں '

برینڈ کہتا ہے :—

" دو شخصوں کے لئے کوئی غار بھی خوفناک نہیں ہوسکتا۔"

اس زمانے میں رسم پرستی ' تو ہمات ' اور مہمل عقائد نے یورپ

میں ایسی فضا پیدا کردی تھی کہ لوگ 'مذہب' 'خدا' 'روح' کے نام تو ضرور سنتے تھے لیکن ان کی حقیقت سے واقف نہ تھے دماغ رسومات اور روایات کی زنجیروں میں مقید تھے ' آزادی کے ساتھہ غور و فکر کرنے اور ایک نقاد کی حیثیت سے نکتہ چینی کی اجازت نہ تھی - اس حالت کو دیکھہ کر ابسن کہتا ھے :—

" تمھیں اس کمزوری کو انگیز کرنے کی کیا ضرورت ھے '
وہ خدا جو اپنی انگلیوں میں سے جھانکے '
وہ جو تمھاری طرح ضعیف العمر ھے
اور اپنے سفید سر پر ٹوپی اوڑھے رھتا ھے -
میرا خدا دوسری قسم کا ھے !
میرا خدا طوفان ھے ' تیرا خدا جھوٹ '
میرا خدا اٹل ھے ' تیرا خدا مٹی کا تودہ '
میرا خدا محبت کرتا ھے ' تیرا خدا بے حس ھے '

اس کے بعد روح کی حقیقت کو بے نقاب کرتے ھوئے ابسن کہتا ھے :—

لیکن ایک شے ھے جو ھمیشہ موجود رھے گی '
روح ' جو کبھی پیدا نہ ھوئی
جو دنیا کے خوش منظر سحر میں
آزاد کی گئی جب کہ ھر طرف نا اُمیدی تھی
اُس نے جرات آمیز ایمان سے ایک شاھراہ طیار کی
جس کی مدد سے وہ گوشت سے مائل پرواز ھوکر خدا تک جا پہنچی
اب محض ریزوں ' اور پاروں میں
ھم اس روح کو محسوس کرسکتے ھیں

مگر ان ریزوں اور پاروں سے '
بغیر سر کے ھاتھہ ' اور بغیر ھاتھہ کے سر سے '
روح اور خیال کی ان شاخوں سے
ایک مکمل انسان پیدا ہوا
اور خدا اپنے شاندار بچے کو پہچان لے گا
اُس کا وارث آدم جسے خود اُس نے خلق کیا

اس سلسلے میں ابسن کے مذھبی خیالات کا جائزہ لینا ضروری معلوم ھوتا ھے ' ھم یہ دیکھہ چکے ھیں کہ مذھبی خیالات کی آزادی کی بنا پر اس کے اور اس کے خاندان کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل تھی کہ کبھی عبور نہ ھوسکی ' ابسن کو اپنی بہن سے بہت الفت تھی مگر وہ بھی ابسن کی آزاد خیالی اور بے راہ روی سے سخت نالاں تھی ' اور منتیں کرکے اُسے اپنے پاس بلانا چاھتی تھی اور مذھب کی دعوت دیتی تھی ' مگر ابسن اس جانب کبھی مائل نہ ھوا اور اس کے والدین و دیگر اعزا پھر کبھی اس محبت سے پیش نہ آئے ایک جگہ وہ کہتا ھے :—

" یہ (گرجا) وہ لباس ھے '
" جو آئین اور اس کی روح پر طاری ھوتا ھے !
" سالک کے لئے ' مذھب
وہ قوت ھے جو بلند ' اور تزکیہ کرتی ھے '
یہ وہ قلعہ ھے جہاں
دنیا کے اخلاق کا پیمانہ محفوظ رھتا ھے

پھر دوسری جگہ کہتا ھے :—

سب سے پہلے تو خدا منصف ھے

اُس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ حق حقدار کو پہنچے
صرف قربانی کے ذریعہ سے روح
جسد خاکي سے آزاد ہوسکتی ہے
(کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے)
دعا مانگنا ' دعا وہ لفظ ہے
جو شخص کے لب سے آساني کے ساتھہ بر آمد ہوتا ہے
یہ ایسا سکہ ہے جو ہر شخص جلد ادا کر دیتا ہے !
دعا کیا ہے ؟ طوفان اور مصیبت میں چلانا
نا معلوم فضا میں مدد کے لئے
عیسیٰ مسیح کے شانوں پر جگہ کی آرزو کرنا
اور آسمان کی جانب دونوں ہاتھہ بلند کرنا
حالانکہ اس حالت میں انسان گھٹنے گھٹنے شکوک میں دھسا ہوتا ہے" *

یہ فلسفیانہ نکات تو ضمناً ڈرامہ میں آگئے ہیں ' ورنہ ابسن کا مقصد تو

* برینڈ کے انداز بیان اور مطالب پر گذشتہ چند سالوں میں بہت کچھہ لکھا جا چکا ہے ' مگر برینڈ کے خیال خاص میں ایک وسیع سادگی موجود ہے' ایک ایسی سادگی جو رومانیت اور حقیقت پرستی کی وجہ سے کلاسیکل نمونوں کی یاد تازہ کرتی ہے' آپ ڈراما کو جو چاہیں سمجھیں مگر وہ بھی سادہ خیال ہے جس نے اس شاہکار میں جان ڈال دی ہے ' برینڈ پے در پے قربانیاں کرتا ہے ' اپنے حوصلے ' آرزوؤں اور مستقبل کو نثار کر دیتا ہے ' بیٹے ' باپ ' اور شوہر کی حیثیت سے وہ کیا کچھہ نہیں تج دیتا ' وہ ابدی جنگ جو حیات اور آئیڈیل میں ہمیشہ برپا رہتی ہے ایسی نمایاں قوت اور استحکام کے ساتھہ بیان کی گئی ہے کہ ڈرامے کے بعض سین ادبیات عالم میں سب

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کچھه اور هے ' وہ مجھه سے کہتا هے که جاؤ ' خدا تمهیں اس ابتری سے سے بلند کرنا چاهتا هے ' اقوام کتنی هی مفلس اور نادار کیوں نه هوں اپنی تصانیف سے قوت اور توانائی حاصل کرتی هیں ' یعنی سونا جس قدر آگ میں تپایا جاے گا اسی قدر اس کی کثافت دور هوگی ' انهیں عقاب کے

بقیه حاشیه صفحه گذشته

سے زیادہ دل هلا دینے والے هوگئے هیں ' جس وقت ضعیف فطرت انسان کا مقابله برینڈ سے هوتا هے همارے دل پر نقارے کی سی چوٹ لگتی هے ' اور نحیف و ناتواں فطرت انسانی برینڈ کے کرخت فلسفے کے سامنے سر بسجدہ هوجاتی هے ' جس وقت پاک اور لطیف محبت برینڈ کے اٹل مطالبوں سے پامال هوکر عرق عرق هوجاتی هے جذبات میں اس درجه رقت پیدا هوتی هے که آنسو بهی خشک هوجاتے هیں ' برینڈ ناروے کا ایک دیوانه مذهبی پیشوا هے ' لیکن اس سے قطع نظر وہ انسان هے ' جو دل هی دل میں خون کے آنسو بہاتا هے ' لیکن برینڈ کا آئیڈیل ناممکن الحصول هے ' مگر هر قابل قدر آئیڈیل ایک حد تک ناممکن الحصول هوتا هے برینڈ کا خدا عیسائیت کے بعد کا وہ درشت مزاج خدا هے جو عهد عشق میں پایا جاتا هے ' لیکن اس سے مذهب نے ایک ایسی کرخت قوت کی صورت اختیار کرلی هے جس کی آهنی گرفت میں پڑ نوع انسانی آج پارہ پارہ هو جاتی هے اور آیندہ بهی پارہ پارہ هوتی رهے گی ' چاهے هم پچاس نئے مذهب هی کیوں نه ایجاد کرلیں ' برینڈ کی حیات ناکام هے ' لیکن ابسن کے خیال میں هر ایسے شخص کا حشر هوتا هے جو مستقبل کے لئے جنگ کرتا هے ' اور ماضی کے واقعات اور حال کی پابندیوں سے جکڑا هوا هوتا هے ' معمۂ کائنات کا حال پهر حاصل نه هوسکا ' اٹل اصول (جو ذرہ برابر بهی تبدیل نهیں هوسکتے) اور محبت (جو هر شے کو نرم اور شیریں بنا دیتی هے) کے مابین پهر کوئی توازن قائم نه هوسکا ، لیکن یه تقاضاے فطرت هے که محبت کے ڈورے کو اختتام پر لرزاں چهوڑ دیا جاے - اور ایک امید موهوم کے ابهام سے قصے کو ختم کردیا جاے —

(ایڈمنڈ گوسٹ)

بازوؤں پر چڑھ کر اشیا کی حقیقت دیکھنے لگتے ہیں، وہ قوم جس کو شدائد نے باہمت نہ بنا یا ہو نجات کے لئے بیکار ہے، ابسن گفتگو کا قائل نہیں، زبان، دل، اور عمل تینوں کو یکساں دیکھنا چاہتا ہے، بار بار کہتا ہے —

" ہزاروں تقریریں
ایک عمل سے کم با اثر ہوتی ہیں"

چنانچہ برینڈ پہاڑوں پر اُتر کر ایک ایسی قوم کو بیدار کرتا ہے جو خواب گراں میں سرشار ہے۔ برینڈ محض تلقین نہیں کرتا ہے بلکہ جو کہتا ہے وہ کہہ کر بھی دکھا دیتا ہے، دھن کا ایسا پکا ہے کہ اپنی ماں اپنے بچے، اور آخر کار اپنی با ہمت بیوی تک کو اصول کی قربان پر نثار کر دیتا ہے، ابسن بلند تر انسان پیدا کرنا چاہتا ہے، اس کے خیال میں عوام کا اثر ملک کے اخلاق کے لئے ہمیشہ تباہ کن ہوتا ہے یعنی اس کے خیال میں ملک کے اخلاق کا پیمانہ عوام الناس کے ہاتھ نہیں چھوڑ دینا چاہئے۔ ملک میں ایک ایسی جماعت کا ہونا لازمی ہے جو اخلاق، کردار اور خیالات میں عوام الناس سے اتنی بلند ہوکہ عام لوگ ان کے قائم کردہ پیمانوں کی قدر کر سکیں اس ڈراما میں ابسن ایک بت شکن کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے، اور اخلاقی، سیاسی اور مذہبی رسومات اور پابندیوں پر سخت حملہ کرتا ہے، اس ڈرامے کا رنگ ملکی ہے، اس لئے "گڑیا کا گھر*" کو اس وضع کا گھریلو یا سوشیل ڈرامہ کہنا چاہئے، اول الذکر میں وہ آئین اور سیاسی روایات کا خاتمہ کرتا ہے، اور آخر الذکر میں وہ شادی، محبت، اور عورت کی حیثیت کے ان بتوں کا

---

* A Doll's House.

اس پر دوسرے حصے میں بالتفصیل ریویو کیا جائے گا—

قلع قمع کرتا ہے جن کا جادو اب تک بعض بد نصیب ملکوں میں چھایا ہوا ہے -
برینڈ در اصل ایک نقارے کی آواز ہے جو انسان میں ہمت اور کریکٹر پیدا کرتی ہے' ابسن تن آسانی' حیلہ جوئی' سمجھوتہ سرد مہری کا سخت ترین دشمن ہے وہ کہتا ہے کہ افراد اور اقوام دونوں کی تباہی انہیں باتوں سے ہوتی ہے' اس لئے اس کی تلقین یہ ہے کہ جو کچھہ کرو پورے استحکام اور خلوص قلب کے ساتھہ کرو —

اب ذرا برینڈ کی شخصیت کو اپنے ذہن میں رکھئے' اور اس کے گرد و پیش کے حالات پر نظر ڈالئے - دیکھنا یہ ہے کہ ایسی انوکھی شخصیت کس ماحول کی پیداوار ہے' وہ ایسی ماں کا بیٹا ہے جس نے اپنے شوہر کے چہرے پر مرنے کے بعد دوہتڑ مارے تھے وہ سنسان' برفستان' اونچے ڈھلوں' خوفناک آہنوسی پہاڑوں اور ہیبت ناک غاروں میں پرورش پاتا ہے' ڈرامے کا پڑھنے والا ان حالات کو دیکھہ کر برینڈ کی مذہبی وارفتگی' درشت مزاجی' اور انتہائی سنگدلی کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے طیار ہو جاتا ہے' اس کے بر خلاف اس کی بیوی ایگنس کو دیکھئے' از سر تا پا محبت اور عقیدت کی دیوی ہے - اس کے ساز دل سے بار بار محبت کی تانیں پیدا ہوتی ہیں' مگر برینڈ کی بلند بانگ آواز اس کو بار بار خاموش کردیتی ہے' آخر محبت کا جذبہ اس کے دل پر طاری ہوجاتا ہے' اور وہ پھر اس غیر خوشگوار حقیقت کو بھول جاتی ہے کہ اس کی متاہل زندگی برینڈ کبھی خوشگوار نہیں بنا سکتا' جتنا ڈراما بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اس کی آواز نحیف ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ اپنے بچے کے سارے کپڑے دے ڈالنے کے بعد وہ محض ایک تصویر یاس بن کر رہ جاتی ہے' اور یہ درد آفریں ساز ہمیشہ کے لئے خاموش ہوتا جاتا ہے - ایگنس (agnes) در اصل ایک پودا ہے' بغایت نازک و لطیف' مگر ایک طغیانی اور طوفان در بغل دریا کے کنارے پر نصب کیا جاتا ہے'

جس کا گرجتا ہوا اور اُبلتا ہوا بہاؤ اس کو ہمیشہ لرزہ بر اندام رکھتا ہے، ہوا کے جھونکوں اور دریا کے تھپیڑوں سے آخرکار عاجز آکر وہ فنا ہوجاتا ہے۔ حقیقتاً برینڈ کے لئے بیوی کا انتخاب اس انتخاب سے مختلف ہونا چاہئے تھا، لیکن پھر شاید ڈرامے کی دلکشی، اور کردار کی تکمیل نا ممکن ہوجاتی، اس لئے شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ اس ڈرامے کی خوبی کی ذمہ دار دراصل بیوی ہے نہ کہ شوہر۔ چنانچہ ابسن کا شاہکار اس ڈرامے میں برینڈ نہیں ہے بلکہ ایگنس ہے، گو جہاں تک اصول کا تعلق ہے ڈرامے کی یہ قطع و برید ارباب نظر پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ڈراما آرٹ کا ایک مکمل اور کامیاب نمونہ ہوتا ہے، جس کی کامیابی جدا جدا اجزا پر موقوف نہیں ہوتی بلکہ ان اجزا کی مجموعی حیثیت پر ہوتی ہے * —

* اگر تین ایسے درد انگیز مناظر کا جو درد آفرینی میں لاجواب ہوں انتخاب کیا جائے تو ایک نقاد کی نظر میں وہ مناظر یہ ہوں گے (۱) پٹیہ (Petya) کی مہم ناکام اور موت کا منظر جو ٹالسٹائے کی کتاب "وار اینڈ پیس" (War & Peace) میں درج ہے، (۲) برینڈ کا وہ منظر جہاں شکستہ دل ایگنس (agnes) اپنے فوت شدہ بچے کے یادگار کپڑے ایک آوارہ گرد عورت کے بچے کے لئے دے دینے کو مجبور ہوتی ہے، اور (۳) پی ار گنٹ کا وہ سین جہاں ایس (Aaes) شام کے وقت بستر پر لیٹی ہوئی بے چینی کی حالت میں اپنے دل سے باتیں کرتی جاتی ہے، اور پھر متوقع طور سے پی‌ار گنٹ نمودار ہوتی ہے، اور وہ اپنی داستان غم ان الفاظ میں شروع کرتی ہے:

"تم، نہیں وہ تو بد نصیب شراب تھی،
جس سے بد نصیبی کی ابتدا ہوئی
میرے لڑکے کا دماغ شراب نے اس قدر پریشان کردیا تھا کہ
وہ کھوٹے کھرے کی تمیز نہ کرسکتا تھا
تم بد حواس تھے، اس دن کی طرح جب تم نے ہرن کی ٹانگیں چیر کر
بلندی سے جست ماری تھی
... ...

برینڈ * مرتے دم تک ولی صفت رھتا ھے' لیکن اس کی ولایت ایسے شدید جرائم کا موجب ھوتی ھے جو ایک پکا گنہگار بھی نہیں کرسکتا' دوسرے ڈرامے میں ابسن ایک ایسے (Idealist) خیال پرست کو پیش کرتا ھے جو اپنے خواھشات کے پورا کرنے کو نجات روح تصور کرتا ھے' اور اسی آئیڈیل پرکاربند ھوتا ھے - دونوں ڈراموں کو بغور پڑھئے اور سوچئے کہ برینڈ ھونا بہتر ھے یا پیرگنٹ ھونا - کم سے کم یہ تو واضح ھے کہ برینڈ کی ماں یا محبوبہ ھونے سے یہ بدرجہا بہتر ھے کہ پی ا ر کی ماں یا محبوبہ بن جائیے' گو وہ بلند پایہ دروغ گو اور شاطر ھے - برینڈ اپنے آئیڈیل کو ھر ایک کے سر مڑھنا چاھتا ھے' پی ا ر گنٹ اپنے آئیڈیل کو اپنے ھی تک محدود رکھتا ھے' پی ا ر گنٹ † کا پہلا طفلانہ تصور اس شخص کے متعلق جس نے اپنی روح کو مکمل کرلیا ھو ولایت سے اتنا تعلق نہیں رکھتا جتنا کہ شان خداوندی سے' ایسا دیوتا جس کی قوت ارادی قسمت سے بھی زیادہ قوی ھوتی ھے' جو آقا' اور میدان کار زار کے ھیرو کی شان رکھتا ھے - زبردست شکاری' ھزاروں مہمات کو سر کرنے والا ھے' نسوانی ناول کے ھیرو کا صحیح چربا' یا کسی طفلانہ رومان کا ھیرو' مگر ایسا انسان نہ پیدا ھوا' نہ پیدا ھوگا اور نہ پیدا ھوسکتا ھے - وہ شخص جو نہ دبنے والی قوت ارادی رکھتا ھے' اور کسی شخص یا کسی اور شے کے لئے اپنے خیالات میں گنجائش نہیں رکھتا جلد محسوس کرلیتا ھے کہ وہ سڑک کے کسی موڑ پر بھی ٹریم کار کا مقابلہ نہیں کرسکتا' چہ جائیے کہ ساری دنیا اور کل بنی نوع انسان کا مقابلہ کرنا - صرف چند غلط فہمیوں میں مبتلا ھوکر جن کی تکذیب دنیا

---

* برینڈ کا یہ ملخص برنارڈ شا سے لیا گیا ھے —

† "Peer Cynt" اس کا صحیح تلفظ یہ ھے - "Pair Gunt"

کا هر واقعه کردیتا هے وہ یه باور کرلیتا هے که اس کی قوت ارادی دنیا کی ساری قوتوں کو پامال کرسکتی هے، پھر بھی پیرگنٹ کا تخیل قوی هے وہ اپنے آئیڈیل کی تعمیر کرسکتا هے نه صرف یه بلکه وہ ایسی غلط فہمیاں بھی پیدا کرلیتا هے جو اس کے آئیڈیل کے عدم حقیقت کو مدت تک پوشیدہ رکھتی هیں، اور اُسے باور کرادیتی هیں که دیہات میں پھرنے والا آوارہ گرد پیرگنٹ "اپنے دل کا بادشاہ" هے، اس کے شکار کے کارناموں کو اختراع کیا جاتا هے، اس کی فوجی قابلیت کی بنیاد شاهراهوں کی مار پیٹ پر قائم هوتی هے، اس کی بہادری اور دلیری کی شہرت اس وقت سے شروع هوتی هے جب وہ اس برات میں سے دلہن کو لے کر چھپت هوجاتا هے جہاں چند مہمان اس کی توهین کرتے هیں، صرف پہاڑوں کی تنہائی میں بے روک ٹوک اپنی غلط فہمیوں سے لطف اندوز هوتا هے، لیکن وهاں بھی ایسے روڑے اس کی راہ میں پیدا هوتے هیں جن کو وہ هٹا نہیں سکتا، وہ روحوں کی آوازیں سنتا هے جو اُسے واپس جانے کی هدایت کرتی هیں، لیکن وہ واپس نہیں هوتا، قسمت سے جنگ کرنے کو طیار هوجاتا هے، اور تلوار کے ذریعه سے راسته کاٹنے لگتا هے - پھر بھی اُسے مراجعت کرنا هوتی هے کیونکه دنیا کی قوت ارادی جس قدر پیرگنٹ سے دور هے اسی قدر قریب بھی هے —

جب شاہ ٹرولڈ کی بد صورت لڑکی سور پر سوار هوکر نمودار هوتی هے وہ اُسے ایک حسین شاهزادی، اور سور کو ایک شریف النسل اسپ تازی تصور کرنے کے لئے طیار هے اس شرط پر که وہ اس کی ماں کے شکسته مکاں کو جس کی کھڑکیاں خراب و خسته هو چکی هیں محل سرا تصور کرلے، وہ اس کے ساتھ ٹرو لڈس میں جانے کے لئے آمادہ هو جاتا هے اور خوفناک غاروں میں پہنچ جا تا هے جہاں وہ

اپنی منڈلی قائم کرتے ہیں، وہ ان کو پر شکوہ محلات تصور کرتا ہے، وہ ان کا غلیظ اور متعفن کھانا کھاتا ہے اور یہ باور کرتا جاتا ہے کہ یہ آسمانی من و سلویٰ ہے، وہ ان کے شتر غمزوں کو رقص عالیہ اور ان کی چیخ پکار کو موسیقی تسلیم کرتا ہے، آخر کار وہ ان پہاڑوں کو خیر باد کہتا ہے اور امریکہ میں پہنچ کر بڑی دولت کمانے لگتا ہے، اس کی تجارتی کامیابی اسے یہ باور کرا دیتی ہے کہ وہ خداوند کریم کے ساتھ عاطفت میں خاص طور سے ہے لیکن یہ خیال جلد دور ہو جاتا ہے افریقہ کے ساحل پر وہ اپنے آپ کو عاجز اور لاچار پاتا ہے، پھر اس کے دوست اس کی نگاہوں کے سامنے جل کر بھسم ہو جاتے ہیں اور وہ یہ مشہور الفاظ کہتا ہے :—

"او ہو، آخر کار خدا میرے اوپر باپ کی طرح مہربان ہے
لیکن وہ یقیناً جزرس نہیں ہے"

ریگستان میں اسے ایک سفید گھوڑا نظر پڑتا ہے، عربی قبائل اسے مسیح جان لیتے ہیں اور وہ اعلان کرتا ہے کہ اب اس کی پوجا اس کی ذات کی وجہ سے ہوتی ہے - امریکہ میں لوگ اس کی دولت کی پوجا کرتے تھے - تجارتی کامیابی ممکن ہے کہ اتفاقیہ ہو لیکن پیغمبر کے منصب کے لئے اس کا فطرتاً اہل ہونا لازمی ہے، یکایک وہ ایک طوائف پر عاشق ہو جاتا ہے، جو اس کا گھوڑا، اور پیغمبری ملبوسات لیکر غائب ہو جاتی ہے، وہ آوارہ گرد پھرتا ہوا (Sphinx) تک پہنچتا ہے، جرمنی کا ایک باشندہ اس سوچ میں ہے کہ آخر یہ (Sphinx) کیا شے ہے؟ پیر گنت اسے معرفت نفس کا درس دیتا ہے، وہ جرمن اسے قاہرہ لے آتا ہے جہاں اس موضوع پر لوگ ہدایت کے طلب گار ہوتے ہیں، پیرگنت اس کلب میں

پہنچتا ہے، اور کلب کی بجائے ایک پاگل خانے میں داخل ہوتا ہے جہاں پاگلوں کی مدد سے وہ " اپنے نفس کا بادشاہ " بنایا جاتا ہے —

پھر ناتواں ہوکر پیرگنت اپنے اولین مہمات کے سین میں واپس آتا ہے جہاں اس کی ایک بٹن بنانے والے سے ملاقات ہوتی ہے، جو بٹنوں کو ایک گرم آتش دان میں ڈال کر فنا کر دیتا ہے، موت کی ہیبت ناک صورت سامنے آ جاتی ہے، آخر کار اس کی ایک محبوبہ ملتی ہے جو اب تک اس کا انتظار کر رہی ہے، اس بوڑھی عورت کے تصور میں وہ پیرگنت کا آئیڈیل حاصل کرتا ہے، اور اپنی حیات کے ہر پہلو کو بلندی سے معرا پاتا ہے وہ حیات جس میں ہوس پرستی، بزدلی، خود پسندی اور خود رائی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا - اس احساس کو ساتھ لے کر جو حقیقت سے دور ہے وہ موت کا انتظار کرتا ہے —

ویسے تو (Peer Gynt) ایک معمولی انسان کی حیات کی داستان ہے جس میں ہر شخص اپنے خد و خال کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ لیتا ہے، لیکن حقیقتاً اس ڈرامے میں ناروے کے باشندوں کو مخاطب کیا گیا ہے، اور انہیں بتایا گیا ہے کہ ان کی حب الوطنی اور بہادری کے دعوے سب باطل ثابت ہوے —

پیر (Peer) کوئی برا شخص نہیں ہے - وہ کاہل ضرور ہے لیکن ہر وہ شخص جو ایک دولت مند شرابی باپ کا بیٹا اور ایک کمزور ماں کا لاڈلا ہوتا ہے ضرور کاہل ہوتا ہے - پھر بھی وہ اتنا باصول ہے کہ وہ ایک نوجوان لڑکی سے محض اس کی دولت حاصل کرنے کے لئے شادی نہیں کرتا، حالانکہ اس کی ماں اس پر مصر ہوتی ہے - وہ گنوار نہیں، بے حس نہیں کیونکہ سلویگ

کا جادو اس پر چل جاتا ہے - وہ بزدل بھی نہیں کیونکہ دلہن کو اس طرح اڑا لے جانا کچھہ آسان نہ تھا ' وہ دلکش ' مہربان ' اور ذہین ہے ' وہ نا کام بھی نہیں ' کہانے پر آتا ہے تو امریکہ میں دولت کا انبار لگا دیتا ہے ' اور اسی آسانی سے پیغمبری کا واجب التعظیم رتبہ حاصل کر لیتا ہے جس آسانی سے وہ دلہن اُڑا لے جاتا ہے ' لیکن ان امور کے باوجود اس میں بلندی نہیں ' وہ کبھی اتنا آگے نہیں بڑھتا کہ پھر واپس نہ ہو سکے ' اس لئے وہ ایک پیاز کی گٹھی کی مانند ہے ' جس پر تہ بہ تہ چھلکے جمے ہوتے ہیں لیکن اندر کچھہ نہیں ہوتا - وہ کسی مقصد کے لئے اپنی روح کی طاقت صرف نہیں کرتا ' وہ قسمت کا مقابلہ نہیں کر سکتا ' بلکہ جہاں غیر خوش گوار امور آ جاتے ہیں وہ موضوع بدل کر دوسری گفتگو چھیڑ دیتا ہے ' حالات اگر اُسے کامیاب کر دیتے ہیں تو وہ اس کامیابی پر نازاں ہو جاتا ہے ' اور اپنی ہر ناکامی کو سخت اور وقت کی نامساعدت سے تعبیر کرتا ہے ' وہ اپنی دقتوں کو ٹالتا رہتا ہے ' مقابلہ کرکے فنا ہو جانا پسند نہیں کرتا ' اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا کریکٹر روز بروز تنگ ہوتا جاتا ہے ' اور اس کی زندگی کھوے ہوئے مواقع کا ایک غیر دلکش کھنڈر بن جاتی ہے —

جس طرح ابسن یعنی برینڈ کا ہلکا سا خاکہ موجود تھا اسی طرح ابسن اور پیئر ایک دوسرے سے مشابہت اور موانست بھی رکھتے ہیں ' ابسن بچپن سے بڑے بڑے حوصلے اور ارادے رکھتا تھا ' گو حقیقت ایسی ہی ہمت شکن تھی جیسی کہ پیئر کے لئے - کامیابی کی جھلک نہ پا کر ابسن نے بھی شراب خوری شروع کر دی تھی - ابسن نے بھی یہ بارہا محسوس

کیا تھا کہ وہ بزدل اور ڈرپوک ہے، بار بار وہ اس کا ذکر کرتا تھا کہ ناروے کو جنگ میں شریک ہونا چاہئے مگر اس کے ساتھہ ساتھہ یہ مانتا تھا کہ شاعر کے فرائض فوجی فرائض سے مختلف ہوتے ہیں —

پئیر گنٹ کو ڈرامے کی بجائے اگر محض ایک طویل نظم کی حیثیت سے پڑھا جائے تو اغلباً شاعر کی قادرالکلامی، اور نازک خیالی کا زیادہ خوش گوار اثر ہو گا - پئیر کا سور پر سوار ہو کر کام زن ہو گی، آسے (Aase) کی حسرتناک موت، بٹن بنانے والے کا تصور ابد، اور آخر میں سلویگ کی محبت اور عقیدت، یہ ایسے دلکش اجزا ہیں کہ جن کی تابناک درخشانی نے نظم کو ایک حسین مرقع بنا دیا ہے جس طریقہ سے پئیر گنٹ خالی ہے اسی طرح سے سلویگ کی محبت اور عقیدت غیر مستحق کو پہنچتی ہے - اس کے علاوہ ڈرامے میں ظرافت کا عنصر نمایاں ہے، اسی وجہ سے اس ڈرامے کو ابسن کا سب سے زیادہ ظریفانہ (یا سب سے کم غم آگیں) کہا جاتا ہے بہر حال ابسن نے پیرگنٹ کا ایک ایسا غیر فانی کریکٹر پیدا کر دیا ہے جس کی دلکشی Don Quixote کے لگ بھگ پہنچ گئی ہے —

ابسن نے ان آئیڈیل کو ناممکن ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ کچھہ انوکھی نہیں ہے، اس میں اس نے * (Cervantes) کا تتبع کیا ہے - آخرالذکر قدیم بہادری (Chivalry) کو لیتا ہے اور یہ دکھاتا ہے کہ ایسے شخص کا کیا حشر ہوا جو وہم کو حقیقت سمجھہ کر اس پر عمل کرنے لگا، ابسن برینڈ اور پیرگنٹ کے آئیڈیل کو لیتا ہے، اور ان کو اسی طرح جانچتا، پرکھتا ہے، (Don Quixote) اس زعم باطل میں ہے کہ وہ دیو، بھوت، مصیبت زدہ شہزادیوں کی دنیا میں ایک مکمل (Knight)

کی حیثیت سے سر گرم عمل ہے حالانکہ وہ حقیقتاً ایک دیہاتی سرائے میں بھٹیاروں اور کھیت پر کام کرنے والی چماریوں سے اُلجھتا ہے، اسی طریقہ سے بریند اپنے آپ کو انسان کامل خیال کرتا ہے، اور ضعف انسانی کی رواداری کو ٹھکرا کر روح اور مادے کے درمیانی پل کو برج بابل کی طرح استوار اور مستحکم بنانا چاہتا ہے، اور انسان کو اس حالت میں نچانا چاہتا ہے جب کہ وہ خدا کے ساتھہ باغ عدن میں چھل قدمی کرتا تھا - پیئرگنت اس یقین کے ساتھہ عمل شروع کرتا ہے کہ اس کی روح میں ایسی قوت موجود ہے جو دنیا کے اور ساری قوتوں کو پامال کرسکتی ہے، لیکن دونوں حقیقت سے دور، کوسوں دور ہیں، وہ یہ فراموش کردیتے ہیں کہ وہ خود کیا ہیں، نلسن کی طرح نہ صرف ان تنبیہوں (Seuqels) کو نظر انداز کردیتے ہیں جو ایک بہادر انسان عموماً نظر انداز کردیتا ہے، بلکہ دیدہ و دانستہ اُس چٹان پر پہنچ جاتے ہیں جسے کسی انسان کا عزم نہ ہٹا سکتا ہے اور نہ مٹا سکتا ہے مگر سروندٹس اور ابسن آئیڈیل کی زبردست قوت سے بے خبر نہیں ہیں، Don Quixote نے کیسی حماقت آرائی پر کمر باندھی ہے، لیکن ہم نہ اسے ناپسند کرتے ہیں اور نہ ہم اس سے نفرت کرتے ہیں، اسی طرح پیئرگنت اگرچہ خود غرض اور بدمعاش ہے لیکن محبت کے قابل ضرور ہے، بریند کو اس کے رویہ کے المناک نتائج نے نہایت خوفناک بنادیا ہے لیکن وہ بہادر ضرور ہے، ان کے ہوائی محلات صفحہ عالم پر بنے ہوئے محلات سے زیادہ حسین ہیں، لیکن وہاں کوئی رہ نہیں سکتا - اور وہ انسانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر غار

Cervantes , author of Don Quixote

ایسا ہی محل ہے جس طرح پی‌ارگنت یہ باور کئے ہوئے تھا کہ ترولڈ کے بادشاہ کی کٹی ایک عالیشان محل ہے۔

ابسن کی حقیقت نگاری، اور صداقت پرستی بریںڈ کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ ابسن کی جسارت اس لئے قابل دید ہے کہ اس نے قدیم شعرا اور ہمعصر ناظموں کے دستور کے خلاف روش اختیار کی۔ شعرا کا دستور تھا کہ وہ ناروے کی حسن و خوبی اور دلفریبی و دلکشی ہی کا ذکر کرتے تھے، پڑھنے والے کو یہ دھوکا ہوتا تھا کہ ناروے یقیناً بہشت برین کا ایک ٹکڑا ہوگا۔ اور سال بھر وہاں دل کش اور لطیف بہار کا دور دورہ رہتا ہوگا، ویلہیون کہتا ہے :-

"مہربان دھوپ نے دنیا کے سب سے بنجر حصے کو بھی ایک ایسا درخشان گہوارا بنادیا ہے جہاں حسن و عشق کی داستانیں آسودہ ہوتی ہیں، Asbjornsen کے قصوں میں ہم جنگلوں اور پہاڑوں کی مزے دار گلگشت کا حال پڑھتے ہیں، اور درختوں کی خوشبو اور پرندوں کے نغموں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، لیکن کوئی ایسا نہیں جو اس سر زمین کی خشکی اور نامہربانی کا حال حوالۂ رقم کرے، اگر کوئی شاعر اتفاقیہ پہاڑی علاقے کے مناظر کا تذکرہ بھی کرتا ہے تو پہاڑوں کی عظمت اور جلالت ہی کا ذکر کرتا ہے، جب موسم سرما کی داستان شروع کی جاتی ہے تب بھی شاعر کو سوائے حسن و خوبی کے اور کچھ نظر نہیں آتا - لیکن اس کے برخلاف ابسن کے مناظر دیکھئے جو اس اس نے بریںڈ میں نہایت وضاحت اور صحت کے ساتھ سپرد قلم کئے ہیں، اور اندازہ کیجئے کہ س نے کس صحت، صفائی، اور

شاعرانہ خوبی کے ساتھہ ناروے کے مناظر کی تصاویر سے صفحہ
قرطاس کو دیبائے مشجر بنا یا ہے' نہ صرف یہ بلکہ وہاں کے
باشندوں کے حالات و خصائل کا ایسا چربہ پیش کیا ہے جو ادبی
حیثیت سے ' قابل تحسین ہے بریند پر اس شے کی ضد ہے جس
کی ابسن مخالفت کرتا ہے' ہر وہ خصوصیت جو عام افراد کے
پاس نہیں اس کے پاس بدرجہ اتم موجود ہے' مگر یہ خیال
کرنا کہ ابسن نے اپنے آپ کو بریند کے لباس میں پیش کیا ہے
نادانی ہے' کیونکہ گو وہ آئیڈیل کا خاکہ ہے لیکن ہم شروع
ہی سے اس میں چند خامیاں اور کمزوریاں پاتے ہیں' اور جس
طریقے سے ڈرامے کا عمل مکمل ہوتا جاتا ہے برینڈ بھی اسی کے
ساتھہ ساتھہ عالم وجود میں آتا جاتا ہے - ابسن در اصل گرد
و پیش کے نا خوش گوار اور تلخ حقائق اور حالات پر خندہ
زن ہے' اس لئے برینڈ فطرتاً ان کے اضداد کا مجسمہ ہے'
جیوں جیوں وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ان اضداد میں قرابت
باہمی پیدا نہیں کرسکتا اسی قدر اس کی ہستی مکمل ہوتی
جاتی ہے' اس کی یہ سعی ہے کہ وہ سوسائٹی کے ہر فرد کو
باہوش اور با عمل بنا دےاور ملک میں سے سہل انگاری اور سستی کا
قلع قمع کر دے' اس لئے وہ حکومت ' مذہب' دیرینہ روایات اور
رشتہ داری غرض ہرادارے سے جنگ کرتا ہے' اور اس شدت سے کہ فضاکو
زیر و زبر کردیتا ہے' وہ عوام یا پوری سوسائٹی کو تلقین نہیں
کرتا' نہ سوسائٹی اور قوم کو سمجھتا ہے' اس کا خطاب
افراد سے جدا جدا ہے' وہ ہر شخص کو ملک اور سوسائٹی

کا ایک رکن عظیم سمجھتا ہے' کمزور سے کمزور انسان کی قدر اس کی نگاہ میں وہی ہے جو ایک بادشاہ کی' اس لئے اس کی تعلیم نہ وقتی ہے اور نہ ملکی اس کا پیغام ہر ملک اور ہر زمانے کے لئے ہے' وہ ہر اس شخص کو خاک میں سے بلند کرنے کے لئے طیار ہے جو اس کا پیغام سننے کے لئے آمادہ ہو۔ مگر ابسن نے یہ جنگ جلد ختم نہ کی' کیونکہ برینڈ کے بعد بھی پی ار گنٹ منصہ شہود پر آ موجود ہوئے اور دنیا کو درس حیات دینے لگے' برینڈ اور پیر کا چولی دامن کا ساتھ ہے' ابسن نے اپنی قوم میں جتنی خامیاں دیکھی تھیں وہ سب پیر میں یکجا موجود ہیں" وہ خود غرضی' کمزوری' اور لیت و لعل کا مجسمہ ہے' ڈرامے کو سمجھنے کے لئے اس بات کو ذہن میں رکھنا از حد ضروری ہے —

رامسڈل (Romsdal) اور سونڈ مور (Sondmore) میں ابسن نے مہینوں قیام کیا تھا' کیوں کہ ناروے گورنمنٹ سے وہ قصباتی اور دیہاتی روایات و قصص پارینہ حاصل کرنے کے لئے وظیفہ پا چکا تھا' اسی لئے برینڈ اور پی‌ارگنٹ دونوں میں مقامی رنگ بہت گہرا ہے' اور یہ درِ اصل ان دونوں ڈراموں کا نقص ہے' کیوں کہ عوام الناس ان سے وہ لطف حاصل نہیں کرسکتے جو مقامی افراد حاصل کرسکتے ہیں' اسی بنا پر آرٹ محض آرٹ کے لئے (Art for the Sake of Art) بہتر ہے اس نمونے سے جس میں پبلک کے خاص طبقہ کےلئے کوئی پیام ہو' بعض پیامات کسی مخصوص حلقے کےلئے مناسب ہوتے ہیں' دوسرے طبقوں کے لوگ اس سے استفادہ نہیں کرسکتے' اس لئے وہ خاص شے عوام الناس کے لئے نہیں ہو سکتی' بعض ارباب نظر کا یہ بھی خیال کافی

وزنی ہے کے اگر آرٹ کے ذریعہ سے تعلیم و تبلیغ کا کام لیا گیا تو آرٹ ناقص ہوجاے گا، کیوں کہ آرٹ کو محض حسن و خوبی کا مجسمہ ہونا چاہئیے —

پی ار گنت کو اگر ہم ڈراما کہیں تب بھی اس کی دلچسپی میں فرق نہیں آتا، اس میں روانی نہیں ہے مگر آپ اسے ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتے، اس سے یہ صاف عیاں ہوتا ہے کہ اپنی ذات کو ایک شدید غلط فہمی میں ڈال کر غیر اصولی عیش پر ستی کا بندہ ہو جانا ایک مہلک جرم ہے جس کی پاداش میں سخت مصیبتیں جھیلنا پڑتی ہیں۔ پی ار گنت کو ہم روایاتی قصص میں ہمہ تن ملوث پاتے ہیں، اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ ایک آزاد منش رند کی طرح زندگی کی ابتدا کرتا ہے، اور جائز و نا جائز طریقے سے دولت کمانا شروع کردیتا ہے، ہر قسم کے افعال قبیحہ کا بے دھڑک مرتکب ہوتا ہے، طرح طرح کے مظالم کرتا ہے، اور اپنے دل میں نہ شبہ پیدا ہونے دیتا ہے، اور نہ رحم، اور اس کے باوجود اس اعتقاد میں مگن رہتا ہے کہ اس پر خدا خاص طور سے مہربان ہے۔ پی ار گانت کی قدم قدم پر یہی صدا ہے کہ انسان کو اپنی ذات سے سچا ہونا چاہئیے، لیکن ذرا غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اصول محض عیش پرستی کا ایک حیلہ ہے ان تمام امور کو ذہن میں رکھئیے اور اندازہ کیجئیے کہ ابسن عوام الناس کے کیریکٹر کے نمایاں اور غیرنمایاں پہلوؤں پر یکساں حملہ آور ہوتا ہے، اور اسی لئے اس تازیانۂ عبرت کی چوٹ ہر دل پر لگتی ہے، چنانچہ اسی مصنف نے اس ڈرامے کو شاہکار بنا دیا ہے۔ ایک پیشہ ور نقیب کو ذہن میں رکھئیے جو پلیٹ فارم پر آکر کوئی مفوضہ پیام ببانگ دھل سناتا ہے، سننے والے جانتے ہیں کہ یہ آواز ضرور اس کی ہے لیکن کلام اور پیام کسی اور کا ہے، نقیب کی روح پیام کی ہوس سے یکسر خالی ہوتی ہے۔ یہی حالت پی ار گنت کی ہے، اس کی روح

کھوکھلی ہے، اس کا وجود ایک وہم ہے ایک خیال ہے، جسے انسانی لباس پہنا دیا گیا ہے، آخر میں ایک عورت نمودار ہوتی ہے اور پی ار کو یقین دلاتی ہے کہ اس کے اعتقاد، امید اور محبت میں وہ یقیناً ایک ایسا شخص ہے جو اپنی ذات سے سچا ہے، لیکن در اصل یہ خیال ان سوالوں کا جواب نہیں ہوسکتا جو پی ار گنٹ کی حیات کا مطالعہ ہمارے ذہن میں پیدا کرتا ہے۔ اس کے باوجود اس ڈرامے میں دلچسپ اور موثر مقامات کثرت سے موجود ہیں، اس میں ظرافت کی بھی چاشنی موجود ہے، گو یہ ظرافت بھونڈی اور بے تکی معلوم ہوتی ہے، اس میں غیر اصولی مجرم کی حیات کے مختلف پہلوؤں کو بے دردی کے ساتھہ پیش کیا جاتا ہے، لیکن یہ نقشہ کوئی اہم سوال یا کوئی پیچیدہ نکتہ طیار نہ کرسکا، نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا تشنہ رہ جاتا ہے، قدم قدم پر یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید اب خصلت انسانی کا کوئی پہلو بے نقاب کیا جاے گا، یا اب معمۂ کائنات کا کوئی اہم ترین حل سامنے آے گا، لیکن ایسا کہیں نہیں ہوتا، اور شاید اسی وجہ سے اس کا رتبہ برینڈ سے کمتر ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نقش ثانی نقش اول سے بہتر ہوتا ہے۔ لیکن علم ادب میں اکثر اس کی تکذیب دیکھی گئی ہے، اگر ابسن برینڈ کے بعد پی ار گنٹ نہ لکھتا تو اس کی شہرت کی وسعت میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی، یہی حال Paradise Regained اور "جواب شکوہ" کا ہے —

برینڈ در اصل دوسری وضع قطع کی شے ہے، اس میں سنجیدگی نے ظرافت کو کہیں جگہ نہیں دی، اس میں اعلیٰ مقاصد Ideals کا دور دورہ ہے، اور سب سے بلند مقصد Ideal یہ ہے کہ اپنی ذات کو یکسر قربان کردیا جاے، اس آئیڈیل کو ان الفاظ میں بار بار دہرایا جاتا ہے

معمولی ڈرامہ نویس رائے عامہ کی قدر کرتے ہوے اپنے ڈرامے میں محض ایک دو بدنما کیرکٹر پیدا کرتا ہے، اور باقی کیرکٹرس کو بالعموم بہتر، اعلیٰ یا کم از کم مستحق ہمدردی بناتا ہے، وہ دنیا کے بد ترین پہلو کو بجنسہ پیش کرنے سے ڈرتا ہے، چنانچہ بہتر کیر یکٹرس کا وجود دنیا والوں کی خوشامد پر مبنی ہوتا ہے، اس رویہ پر دنیا کے بیشتر و اکثر ڈرامہ نویس و ناولسٹ کاربند ہیں ، آپ خود غور کیجئے کہ آپنے جسقدر ڈرامے یا ناول پڑھے ہیں اس میں کمزور کیریکٹر کتنے کم ہوتے ہیں ، مگر ابسن کا رویہ اس کے بر خلاف ہے وہ ہر کیر یکٹر کی خامی اور کمزوری کو بے دریغ عیاں کرتا ہے ، وہ سنگدل اور سخت مزاج ہے ، رائے عامہ کو وہ نظر حقارت سے دیکھتا ہے ، وہ پرانے اصول و ترا کیب پر کاربند ہونا اپنی تو ہین تصور کرتا ہے ، وہ خود ایک نیا پیمانہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے ، اور اسی پیمانہ سے وہ دنیا اور دنیا والوں کے خیالات ، جذبات و حرکات کو ناپتا ہے ، اس کی تصانیف میں (Self) نفس انسانی کی جسقدر چھان بین کی گئی ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی ، وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے افعال سے وابستہ جذبات کا جائزہ لینا شروع کر دیں جن کے ماتحت وہ افعال سرزد ہوتے ہیں -

ابسن جس طرح قومی حیات کے لئے آئیڈیل پیش کرتا ہے ، اسی طرح کے گھریلو زندگی کے لئے آئیڈیل مہیا کرنا اپنا فرض تصور کرتا ہے ، اس کے خیال میں سکوت سے کوڑے کی مار بہتر ہے ، قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ Heroism کے جذبات پیدا کرے ورنہ وہ قوم نجات کی مستحق نہیں —— اور یہ ہر اُس شخص کا حشر ہونا چاہئے جو زندہ رہنے سے تو عاجز ہوتا ہے لیکن موت سے بھی نہایت خائف پایا جاتا ہے ، اس کے خیال میں اگر دو عاشق ومعشوق کی محبت انھیں رکیک افعال کی جانب متوجہ کرکے ان کو فرائض سے نا آشنا کردیتی

ہے تو بہتر ہے کہ ایک عالمگیر طوفان نوح ' تند ہوائیں اور موجوں کے غضب ناک تھپیڑے اُنھیں ایک دوسرے سے جدا کردیں ' وہ یہ کہتا ہے کہ عقیدہ جس قدر رسمیات سے دور ہوگا اسی قدر اُستوار اور مستحکم ہوگا - جن حضرات کی بصارت صحیح ہوتی ہے وہ افراد روشنی اور بازوؤں دونوں کے مالک ہوتے ہیں ، یہ بھی ممکن ہے کہ جلوہ ایزدی جس کی جھلک مفقود ہوتی جاتی ہے قوت ارادی کی مدد سے پھر منور ہو جائے ' — ہمیں اسی نوع کی زندگی اختیار کرنی چاہئے جو ہم اختیار کر سکتے ہیں —— خدا کی محبت نہ خام ہے اور نہ کم ' وہ اپنے بیٹے یسوع مسیح پر کچھ زیادہ مہربان نہ تھا ' حیات اورمذھب کے درمیان اب بھی ایک شاہراہ کی اشد ضرورت ہے - جو راہیں آج موجود ہیں وہ اسقدر پریشان کن ہیں کہ اُنھیں آپ دھندلا چراغ کہہ سکتے ہیں یا " صبح شمال " .... " -

---

صبح شمال " Northern Morn " (Tenryson - Morte D ' Arthur) قطب شمالی اور قطب جنوبی کی وہ دھندلی روشنی جو وہاں کی طویل راتوں کو خفیف سا منور کردیتی ہے —



ترکی ادبیات کا احیا

(۳)

(نوشته پروفیسر جولی یس جر سانوس)

مترجمه سید وہاج الدین صاحب لکچرار اورنگ آباد کالج

جس طرح سلطان عبدالحمید کی ذات اپنی عجیب و غریب نفسیاتی پیچیدگیوں کی وجه سے ، ترکی کی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی هے ، اسی طرح اس کے عهد حکومت سے ترکی ادبیات کا بهی ایک نیا دور شروع هوتا هے - اس کے مخالفین ، یعنی نوجوان ترک ، اسے صرف ایک سنکی اور ظالم بادشاہ سمجهتے تهے ، انهوں نے اس کی اس سیاسی صلاحیت کو پوری طرح نہیں سمجها ، جس سے کام لیکر وہ حوادث و واقعات کی بڑهتی هوئی رو کو روکتا اور تهامتا رہا - افسوس هے که اس کی یه مایوسانه کوشش کامیاب نہیں هوئی - سلطان عبدالحمید ، اپنے عهد حکومت کے شروع میں مشروطه کا حامی تها ، لیکن بعد کو انتہائی قدامت پرست بن گیا - اس نے پہلے هی سے سمجهه لیا تها که ترکی کے جیسے ملک میں ، جہاں عیسائی اور مسلمان ، یونانی ، ارمنی ، یہودی ، البانی ، عرب ، کرد ، شامی سب کے دلوں میں اسی قسم کی قومی بیداری کا احساس پیدا هوگیا تها ، جیسا کے خود ترکوں میں ، پارلیمنٹی نظام حکومت چلنے والا

نہیں ہے - وہ جانتا تھا کہ ایک ایسا ترقی پسند ' عثمانی اسلام ' جس کی حمایت میں دوسری قومیتیں بھی مساوات کے ساتھہ زندگی بسر کرسکیں اسی صورت میں پیدا ہوسکتا ہے کہ انتہائی قدامت پسندی سے کام لیا جائے - اس قدامت پسندی کی پالسی کا خاص مقصد یہ تھا کہ سلطنت ترکی کو ایک (نام نہاد) سلطان کی شخصی حکومت کے مرکز پر قائم رکھا جائے ' جو جمہوریت کے اصول پر تمام رعایا کے ساتھہ یکساں برتاؤ کرے ' لیکن معاملات سلطنت میں انہیں دخیل نہ کرے - اس نے پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا ' اس لئے کے وہ رعایاے ترکی کے متضاد اغراض کی کش مکش سے عہدہ برآ ہونے سے لاچار تھی ' اور نہ اس کی قابلیت رکھتی تھی - اس نے کوشش کی کہ قوم خواہوں کی سیاسی جماعتوں کو ' قبل اس کے کہ وہ علانیہ میدان میں آ جائیں ' توڑ ڈالا جائے - وہ سلطان "عبدالعزیز" اور سلطان "مراد" کی معزولی سے اتنا سہما ہوا تھا ' اور خود اپنے معزول کر دئے جانے کا خوف اس کے دل و دماغ پر اس طرح حاوی ہوگیا تھا کہ اس نے اس روز بد سے بچنے کے لئے ' نظام حکومت کی ایسی ایسی خیالی تجویزیں سوچیں ' جو اپنی بعض حیثیات میں اتنی ہی مہمل اور خبط تھیں ' جتنی کہ ان کی مستبدانہ روح اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے ' جائز کہی جا سکتی تھی - وہ ترکی بیڑے کے ڈر سے کانپتا رہتا تھا ' لہذا اس نے اسے بھی توڑ ڈالا - اس نے ایسے ایسے لوگوں کو مقربین بارگاہ بنایا ' جو وفادار اور خوشامدی تو ضرور تھے ' لیکن بدقسمتی سے اس دیانت اور ایمانداری سے خالی تھے ' جو ایک مضبوط مرکزی حکومت کے لئے بمنزلۂ لوازمات ہوا کرتی ہے - وہ اپنے صاحب حشمت و شوکت اسلاف کی طرح مستبدانہ طریقہ پر حکومت کرتا تھا ، لیکن نہ اس میں ان کی

سی حشمت تھی اور نہ شوکت - اس نے اخباروں کی زبان بندی کردی ' اور پبلک کی آواز کا گلا گھونٹ دیا —

وہ چاھتا تھا کہ صرف میں ھی پوری سلطنت کا مالک و مختار رھوں ' اور صرف میرے ھی احکام واجب التعمیل ھوں ' لیکن اسے ایسے کام کے آدمی نصیب نہ ھوے ' جو اس کی پالسی کو دیانت داری کے ساتھہ چلاتے ' اور وہ اپنی رعایا کے دلوں میں یہ خیال بھی پیدا نہ کرسکا کہ ایک ایسی سلطنت میں جو مختلف قومیتوں پر مشتمل ھو ' قومیت کی تباہ کن قوتیں بغاوت اور بدامنی پیدا کرکے رھتی ھیں - تاریخ شاھد ھے کہ آج تک کوئی مستبد جمہور کے خیالات کی رو کے مخالف نہیں جاسکا ھے ' اور پھر سلطان عبدالحمید کی پالسی کسی طرح بھی منصفانہ ' یا عاقلانہ استبداد کی پالسی نہ تھی - نوجوان ترکوں کی پارٹی اس کی سب سے بڑی دشمن تھی ' اور اس نے اس کی کئی مرتبہ کوشش کی کہ ظلم و تعدی کے زور سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اس جماعت کا قلع قمع کردے ' جو وطن پرست ضرور تھے لیکن جن کی وطن پرستی پر شاعرانہ خیال آرائی اور مثالیت غالب تھی - " انجمن اتحاد و ترقی " پر کوئی صحیح اور قابل ثبوت الزام نہیں عاید کیا جاسکتا - یہ صحیح ھے کہ وہ عملی حیثیت سے ماھرین سیاسیات نہ تھے اور اسی وجہ سے واقعات کی رفتار کو قبل از قبل نہ سمجھہ سکتے تھے - وہ ایک ایسے ملک میں فرانس اور سوئٹزر لینڈ کے آئینی نظام حکومت کی نقل کرنا چاھتے تھے ' جو تاریخی حیثیت ' جغرافی محل وقوع ' اور تہذیب و شائستگی کی سطح کے اعتبار سے ان دونوں سے بالکل مختلف تھا - لیکن ھمیں یہ بھی یاد رکھنا چاھئے کہ دنیا میں ایسا سیاسیات دان ' یا وطن پرستی کے خواب

دیکھنے والا شاذ و نادر ھی ملتا ھے جو اپنے نظری قیاسات کے عملی نتائج کو قبل از قبل دیکھہ سکے، اور یہ نظری قیاسات عموماً ایک اھم ترین جز، یعنی باشندوں کے روحی عنصر کو بالکل نظر انداز کردیتے ھیں - اپنے ان اخبارات میں جو یورپ میں شایع ھوتے تھے، اور خفیہ طور پر جن کی اشاعت ترکی میں بھی ھوتی تھی، نوجوان ترک بڑی جرات کے ساتھہ سلطان عبدالحمید کی صلح پسند پالسی پر حملے کرتے تھے، اور اس پر یہ الزام عائد کرتے تھے کہ اس نے رعایاے ترکی کے محبوب ترین اغراض و مفاد کو اس پالسی پر قربان کردیا ھے - اس قسم کی نکتہ چینیوں سے خائف ھوکر سلطان عبدالحمید کا جابرانہ رویہ اور سخت ھو جاتا تھا - متوسط طبقہ پر اس ظلم و تعدی کا ایک نہایت افسوسناک اثر یہ پڑا کہ ان کے مزاجوں میں خوشامد پسندی پیدا ھوگئی، جس نے حیات اجتماعی کو اور زیادہ ناقابل برداشت بنادیا - کسی شخص کو اپنے گھرے سے گھرے دوست کی طرف سے بھی یہ اطمینان نہ تھا کہ وہ حکام کی رضا جوئی یا چند روپیوں کے لئے ان کی مخبری نہ کردے گا - اس زمانہ میں ایک ضرب المثل تھی:

"پادشاھی مز سیاسندہ خے پی مز جاسوسوز"

یعنی "ہم سب اپنے بادشاہ کے جاسوس ھیں"-

ظاھر ھے کہ ایک ایسی حیات اجتماعی میں جس کے افراد کو ھمہ وقت ایک نہ ایک خدشہ لگا رھے آزاد ادبیات پیدا نہیں ھوسکتی - سنہ ۱۸۷۰ع اور اس کے قریبی زمانے کے مصنفین کی کتابیں قابل ضبطی قرار دی گئیں، فرانسیسی ناولوں اور پیرس کی عیش پسندیوں نے طبقہ اعلیٰ کے تخیلات پر قبضہ جمالیا اور ساری ترکی جمہور پر ایک عجیب قسم کا خمار اور جمود طاری ھوگیا - بعض ھفتہ وار اخبار اس جمود کے خلاف احتجاج بھی کرتے تھے - ان میں اکثر یورپ کے ھفتہ وار اخباروں کی تصویریں نقل کی جاتی تھیں اور ان کے نیچے

نوجوان ترک تصویروں کو سمجھانے کے لئے اشعار لکھا کرتے تھے - "مکتب" اور "خزینہ فنون" اسی قسم کے اخبارات تھے - اس بحث کے سلسلہ میں کہ لفظ 'عبث' کا قافیہ 'مقتبس' ہوسکتا ہے یا نہیں، ایک اور اخبار یعنی "ثروت فنون" منظر عام پر آیا جس کے مدیر "توفیق فکرت" تھے اور وہ بہت جلد ترکی کے سب سے زیادہ مقبول شاعر بن گئے - ان کی جدید طرز کی اور جسارت آمیز نظموں نے، جن میں پردے ہی پردے میں ظلم و استبداد پر چوٹیں ہوتی تھیں، نوجوانوں کے دلوں کو مسخر کرلیا - ان کا اسلوب بیان تمثیلی ہوتا تھا، اور فرانس کے 'پارنسی'* (Parnassian) طرز کی جھلک اس میں پائی جاتی تھی - وہ اپنی نظموں کے موضوع زندگی کے مختلف پہلووں میں سے انتخاب کرتے تھے - ان کی نظمیں جو "ثروت فنون" میں نکلتی رہتی تھیں سنہ ۱۸۹۶ ع میں کتابی شکل میں "رباب شکستہ" کے عنوان سے شایع ہوئیں - ترکی نظم کی کسی تصنیف کو وہ مقبولیت نصیب نہ ہوئی جو اس مجموعہ کو ہوئی - ایک سال کے اندر ہی اندر اس کے تمام نسخے ہاتھوں ہاتھ بک گئے، اور بازار میں یہ کتاب نایاب ہوگئی - فکرت کے مداح ہر جگہ ان کی نظموں کے اشعار پڑھتے تھے، اور اس شہرت ہی کی وجہ سے پولیس اُن کی طرف سے بدظن ہوگئی، انہیں گرفتار کرلیا گیا اور ان کے ہفتہ وار اخبار کو بند کردیا گیا - وہ تو کہئے کہ ایک امریکن کالج یعنی رابرٹ کالج میں پروفیسری کی خدمت انہیں مل گئی، اور اس طرح سر چھپانے اور روٹی کھانے کا ذریعہ میسر آیا، اب وہ عزلت پسندی کی زندگی بسر کرنے لگے - اس کے بعد سے ان کی کوئی نئی

---

* یہ ایک فرانسیسی مذہب ادبیات تھا، جن کا اصول "L' Art pour l' art" یعنی 'فن برائے فن' تھا - اس رنگ کے مقلد شاعری میں اپنے ذاتی احساسات یا موعظت و اخلاق کو دخل دینا گناہ سمجھتے تھے، ان کا نصب العین صرف حسن صورت اور حسن معنی ہوا کرتا تھا - ۱۲ مترجم -

نظم شایع نہیں ہوئی ' لیکن ان کے احباب اُن کی تازہ نظموں کی نقلیں حاصل کر کے انھیں زبانی یاد کر لیا کرتے تھے - فکرت کی ذات اپنے ہم وطنوں کے ادبی ضمیر کا آئینہ تھی - انھوں نے نوجوان ترک پارٹی کے لئے ایک نظم " ملت سر کیھسی " " قومی گیت " لکھی تھی جس نے اس طبقہ کے دلوں میں وطن کی گہری محبت اور مستقبل کے لئے اُمیدیں پیدا کردیں - کہتے ہیں :-

ملت یولیدر حق یو لیدر طوتد یغمز یول
اے حق یا شا اے سوکیلی ملت یا شا وار اول
ظلمت طوپی دار ' کلہ سی دار ' قلعہ سی دار سہ
حقاے بو کولمز ' قولی دو نمز یوزی وار در

" ہمارا راستہ حق اور ملت کا راستہ ہے -
مبارک ہے حق ' مبارک ہے ہماری پیاری محبوب ملت
ظلم کے پاس توپیں ہیں ' گولیاں ہیں ' قلعے ہیں
" حق کے پاس خم نہ کھانے والا بازو ' ہار نہ ماننے والا ایمان ہے "

یہ ترانہ اثر کئے بغیر نہ رہا - نوجوان ترکوں نے فوج کو ہموار کر کے سلطان عبدالحمید کو ہار ماننے پر مجبور کرا دیا اور اس سے دوبارہ مشروطہ عطا کرنے کا اعلان کروایا - فکرت شاعر سے کہیں زیادہ فن شعر میں صاحب فن تھا - اگرچہ اس نے اپنے طرز اور زبان میں اختراعیں اور بدعتیں کی ہیں ' لیکن حسن صورت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا - اس کی نظمیں ایسی مکمل اور ترشی ہوئی ہیں کہ انھیں جواہرات کی لڑیاں کہا جائے تو مبالغہ نہیں - وہ کبھی خالص ترکی زبان لکھتا ہے ' اور کبھی کبھی ترکی ادبیات نے ماضی کی یاد کو زندہ کرنے کے لئے فارسی زبان کی موسیقیت سے کام لیتا ہے —

سلی پرو دھامے (Sully Proudhamme) اور لے کانتے دلیل (Le Conte de Lisle) کا اثر فکرت پر بہت غالب ہے اور " رباب شکتہ " میں ان دونوں کے ترکی بول صاف سنائی دیتے ہیں - لیکن چاہے اس " رباب شکستہ " کے سر دھیمے ہوں ' لیکن اس کا راگ مسلسل ہے - وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بحروں کا انتخاب کرتا اور ان میں رد و بدل کر دیا کرتا تھا - مثلاً دیکھئے کہ اپنی نظم " رقص مار " میں وہ رقص کی مختلف حرکتوں کے اعتبار سے بحر کو کس طرح بدل دیتا ہے :—

صنعت ' صاری سور پنپہ یشیل قیر میزی مائی
الوان ضیائیہ بر قدرت جولان
بخش ایلیرک ہپسی پریلر کبی مخفی
مخفی و سکونتلی آدیملرلہ شتابان
اطرافنی بردن صاری پور لر اوسمائی
برتودۂ از ہار مخیل کبی لرزان
لرزان و پریشان بر شب صافی
تنویر ایدییور صانکہ بر آویزۂ رقصان

" صنعت ' تحریک رقص دیتی ہے "
" روشنی کے زرد ' گلابی ' قرمزی ' سبز ' سرخ "
" اورنیلے رنگوں کو یہ سب کے سب ' نظروں سے اوجھل "
" پریوں کی طرح جھٹ پٹ جگہ کو گھیر لیتی ہیں ' لرزان "
" مثل اس خیالی گلدستہ کے جو آسمان سے پھینکا گیا "
" ہو - لرزان اور ایک دوسرے میں گھل مل کر وہ رقص "
" کرتی ہیں اور ایک رقصان آویزہ (جھاڑ) کی طرح "

صاف روشنی میں اپنی تنویر پیدا کرتی ھیں " فکرت کا سب سے بڑا کمال ان کی قدرت زبان ھے - ایسا معلوم ھوتا ھے کہ ان کے ھاتھہ میں آکر زبان ایک نہایت کار آمد اوزار اور ان کی مرضی کی تابع بن جاتی ھے —

یہ ایک عجیب بات ھے کہ زندگی میں اس قدر مقبول اور ھردلعزیز ھونے کے باوجود فکرت کی موت کے بعد ھی بہت جلد ان کے فصیح سے فصیح اشعار بھی زبانوں اور دلوں سے محو ھونے لگے - زندگی بھر تو وہ لوگوں سے ادب اور احترام کا خراج وصول کرتے رھے ' لیکن ان کی آنکھہ بند ھوتے ھی کئی طرف سے نکتہ چینوں کی زبانیں کھل گئیں - آج کل تو اکثر لوگ ان کو اعلیٰ درجہ کا شاعر ماننے میں بھی تامل کرتے ھیں اور ان کے " رباب شکستہ " کو ایک پھٹا ھوا ربابہ کہا جاتا ھے جس میں سے کوئی سر تال نکلتا ھی نہیں !

شاعری جس موسیقیت کی نمائندہ تھی ' وہ بہت جلد افسانوں اور ناولوں میں بھی پیدا ھوگئی ' اس صنف میں سب سے زیادہ کمال خالد ضیا نے پیدا کیا - میں پہلے کہہ چکا ھوں کہ ترکی ناول نویسی کا باوا آدم سزائی بے تھا ' جس کی تصنیف " کوچک شے لر " (چھوٹی چھوٹی چیزیں) ھے - یہی " کوچک شے لر " اور دوسری کہانیاں خالد ضیا کی دلیل راہ بنیں ' اور وھی ترکی کا پہلا قومی افسانہ نگار ھوا - ان کے اس افسانہ کا نام " ملی " ھے اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ھے کہ اس میں قومی مباحث و موضوعات سے بحث کی گئی ھے - ترکی معاشرت پر جو حالت جمود و خمار طاری تھی ' اسی کے قصہ اور افسانہ خمار شکن اور تفریح آور ثابت ھوئے - ترکی نثر کی تاریخ اتنی قدیم نہیں ھے جتنی ترکی نظم کی - اس لئے جدید طرز کے افسانوں کے لئے گویا ایک نئی نثر پیدا کرنی پڑی '

اور ترکی مصنفین نے اس کی بے انتہا کوشش کی کہ وہ جمہور کے مذاق پر پورے اتریں اور ساتھہ ھی ایسی زبان بھی لکھیں جو جدید خیالات اور قصوں کے بیان کرنے کے لئے موزوں ھو ۔ خالد ضیا کی زبان ان دونوں خصوصیات کا سنگم ھے - وہ مصنوعی اور دقیق بھی ھے' اور ساتھہ ھی اظہار جذبات کی صلاحیت اور زور بھی اس میں پایا جاتا ھے۔ ایک طرف اس کا طرز قدیم طرز کو یاد دلاتا ھے' تو دوسری طرف اس کے قصے آج کل کی جیتی جاگتی تصویریں ھیں —

اپنے پیش روؤں کی طرح' خالد ضیا کی تربیت بھی فرانسیسی ادبیات کی فضا میں ھوئی تھی - اس زمانہ میں محیرالعقول داستانوں اور جرائم کے قصوں کا بہت زیادہ زور تھا - بچپن ھی سے خالد نے دوماس خورد * اور آکیٹو فوالے کی ناولیں پڑھنا شروع کردی تھیں جنھوں نے اس کے مذاق کو سنوارا اور کلاسک طرز کی ناولوں کی طرف اس کی رھبری کی - سولہ برس کی عمر ھی میں وہ ادبیات کا پر جوش محصل بن چکا تھا اور اس نے ایک تاریخی تصنیف کا مقدمہ شایع کیا جس میں "مغرب سے مشرق کی طرف ادبیات کے سفر" سے بحث کی گئی تھی - یہ نوجوان طالب علم بہت جلد ایک ھونہار ادیب بن گیا - اس کی پہلی ناول محکمہ احتساب کی طرف سے قابل ضبطی قرار دی گئی' اور اس نے اس کے مسودہ کو جلا دیا - اس کی سب سے پہلی مطبوعہ ناول "نومیدہ" جس وقت شایع ھوئی ھے' اس وقت اس کی عمر ۱۸ سال کی تھی - اس کی مقبولیت نے اس کے ادبی جوش کو اور تیز کردیا' اور اس کے تھوڑے ھی عرصہ بعد ایک اور ناول " بیر الومون دفتری" (ایک مردہ شخص کی بیاض)کے عنوان سے نکلی' اور اس کے بعد ھی تیسری ناول فردی و شرکاء (فردی اینڈ کمپنی) شایع ھوئی۔ خالد ضیا ھی پہلا مصنف ھے جس نے سب سے پہلے نئے طرز کے مختصر افسانے

---

* خورد اس وجہ سے کہ اس نام کے دو مصنفین باپ اور بیٹے ھوے ھیں۔ ۱۲ مترجم

لکھی، مثلاً "ایک بیاض کے آخری صفحات" "محبت کی شادی کا قصہ" "کیا یہ ٹھیک ہے" وغیرہ - اس کے ساتھ ھی اس نے کئی درجن فرانسیسی ناولوں اور مختصر افسانوں کا ترجمہ بھی کیا - اس زمانے کے فرانسیسی ادبی رنگ میں ترکی ناولیں لکھنا آسان بات نہ تھی - تقریباً ہر پڑھا لکھا ترک فرانسیسی بولتا تھا، اور فرانسیسی زبان کے ترجمہ اس کثرت سے ہوئے تھے کہ ملک منتخب سے منتخب فرانسیسی افسانوں سے روشناس ہوچکا تھا - ترکی مصنف کا سب سے بڑا حریف فرانسیسی مصنف تھا، اور اس کو اگر اس سے بڑھنا نہیں تو کم از کم اس کی برابری ضرور کرنی پڑتی تھی - جدید عربی ادبیات میں بھی جس نے آج کل یورپی طرز ادا کو اختیار کرنا شروع کردیا ہے، ہم زبان کی یہی مشکلات پاتے ہیں، یعنی اسے بھی اپنے کمال کے اظہار کے لئے ہاتھ پیر مارنے پڑتے ہیں، اور حالانکہ یورپی ادبیات کے بعض بہترین شاہکار عربی میں ترجمہ ہوچکے ہیں لیکن اب تک کوئی ممتاز عربی ناول نویس نہیں پیدا ہوا ہے - پس اسے ترکوں کی ذہانت کا ایک کمال سمجھنا چاہئیے کہ وہ اپنے فرانسیسی حریف کا مقابلہ کرسکے، اور اپنے قومی افسانے لکھ سکے - خالدہ ضیا ان با کمال ادیبوں میں سے تھا جنھوں نے اپنے ملک کی بیش بہا خدمتیں کی ہیں - وہ اتنا جامع الکمالات اور صاحب حیثیات تھا کہ سائنس اور افسانہ دونوں موضوعوں پر اس نے قلم اُٹھایا ہے - اس نے سنسکرت کی ادبیات پر بھی ایک رسالہ لکھا تھا، لیکن محکمہ احتساب نے اس شبہ پر کہ اس میں درپردہ سیاسی بحثیں کی گئی ہیں، اسے گرفتار کرلیا - گرفتاری کے بعد ایک پولیس کے افسر نے اس سے کہا کہ "تم با غیانہ خیالات کی اشاعت ایسے دقیق طرز عبارت میں کرتے ہو کہ خفیہ کا محکمہ بھی اسے نہیں سمجھ سکتا" اس پر خالد نے جواب دیا "کہ پھر ایسی کتاب سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے جسے خود آپ بھی نہیں سمجھ سکتے" اس کی خانہ تلاشی لی گئی، اور

اس کے خطوط ضبط کر لئے گئے - اس ظلم و جبر کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت دنوں کے لئے اس نے قلم ھاتھہ سے رکھدیا - اور اس واقعہ کے تین سال بعد اس کی ایک نئی ناول اخبار " ثروت فنون " میں چھپی - اس ناول سے جس کا عنوان " مائی و سیاہ " (نیلا و کالا) تھا اس کی ادبی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے یہ ناول ایک نئی چیز تھی اور اس کے ساتھہ ھی اس پر نویس مصنف نے دوسرے روزانہ جرائد میں مختصر افسانوں کا ایک سلسلہ بھی لکھا جو بعد کو " سو ل گون د مت " (گلدستۂ پژمردہ) اور " بریازن تارھی " (گرمیوں کی کہانی) کے عنوانوں سے علحدہ کتابی شکل میں شائع ہوے - " ثروت فنو ن " کے بند ہو جانے سے ادبی بہار آورد کا یہ زمانہ ختم ہوگیا - اس کی دو اور مشہور ناولیں " عشق ممنوع " اور " کیرک حیاتلر " (شکستہ زندگیاں) بھی اسی اخبار میں نکلی تھیں - مشروطہ کے اعلان کے بعد خالد پر سے بھی حکم زبان بندی اٹھا لیا گیا ' اور اب وہ آزادی سے اپنے جامع دماغ سے کام لینے لگا - اس کی بعض ناولوں میں سے محکمہ احتساب نے کچھہ حصے حذف کردیے تھے' اب وہ بھی دوبارہ اضافہ کے ساتھہ شائع ہوئیں —

اس کی ابتدائی ناولیں "نومیدہ" (مایوس) اور (ایک مردہ شخص کی بیاض) پر جوش عشقیہ افسانے تھے' اور اس میں وہ جذباتی رنگ جو جنگ جو ترکوں کا خاصہ ہے ' کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا - "فردی و شرکاء" میں ایک نئے قسم کا قصہ لکھا گیا ہے' یعنی حب زر کا - اس میں عشق اور محب زر میں زبردست کشمکش ہوتی ہے اور آخر کو حب زر کو شکست ہوتی ہے - اس افسانہ میں مصنف نے بہت زیادہ آورد سے کام لے کر اپنی انشا پردازی کا کمال دکھانے کی کوشش کی ہے' لیکن بھونڈا پن آگیا ہے - برخلاف اس کے' اس کی ناول "مائی وسیاہ"

میں اس کا شاعرانہ کمال اصلی رنگ میں ظاہر ہوتا ہے' اس میں اس نے اپنی توجہ کو زندگی کے محض جذباتی پہلوؤں سے ہٹاکر' اسے حقائق کی طرف مبذول کردیا ہے' مثلاً شادی کے مسائل' مزدور پیشہ طبقہ کی مشکلات اور قسطنطنیہ کے بو قلموں ماحول اور اس کی خفیہ ادبی انجمنوں میں ایک مصنف کی شہرت کے لئے جد و جہد —

اس ناول کا ہیرو (بطل) ایک غریب شاعر ہے جس پر اپنی ماں اور بہن کی پرورش کا بھی بار ہے اور گزر اوقات کے لئے بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے - اس شاعر کی تین آرزوئیں ہیں - دولت پیدا کرنا' مشہور شاعر بننا اور اپنی محبوبہ سے شادی کرنا - اسے ان تینوں آرزوں کے پورے ہونے کی امید ہے' اور اسے یقین ہے کہ اس پر "باران در و الماس" ضرور ہوگا - کتاب کے عنوان " مائی و سیاہ" کا پہلا لفظ گویا اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے - لیکن زندگی میں باران در و الماس کہاں ؟ - اس کی بہن کی شادی ایک کمدہ ناتراش سے ہوتی ہے' جو اس پر طرح طرح کے مظالم کرتا ہے - اس کی محبوبہ اس کو چھوڑ کر ایک افسر سے شادی کرلیتی ہے' اور اس مایوسی میں وہ (شاعر) اپنے اس مسودہ کو جس سے اسے ادبی شہرت حاصل کرنے کی امید تھی' تلف کردیتا ہے - یہاں سے تصویر کا منظر نیلگوں افق کی بجائے شب تیرہ و تار ہوجاتا ہے - ہر اعلی درجہ کی ادبی کتاب کی طرح' "مائی و سیاہ" میں بھی ہمیں اظہار جذبات و یاس و حرمان کے ساتھ ساتھ اصلی اور حقیقی زندگی کے چربے نظر آتے ہیں - اس کتاب کے دوسرے ضمنی افراد کی سیرتیں پرزور قلم سے اور عین فطرت کے مطابق لکھی گئیں ہیں ' لیکن خود ہیرو کی سیرت' جسے مصنف خاص طور پر پر زور بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا اتنی مصنوعی ہوگئی ہے کہ حقیقت سے اس کا کوئی لگاؤ ہی باقی نہیں رہا - مصنف کو فرانسیسی ادبیات کی جو واقفیت تھی ' اس

سے اس نے هیرو کو متصف کر دیا ہے ' جو ایک دهاتی مدرسہ کا پڑھا هوا اور تجربات زندگی سے بالکل کورا ہے - " عشق ممنوع " میں ایک لڑکی کی پر جوش محبت کا قصہ بیان کیا گیا ہے ' اس کی شادی ایک معمر دولت مند سے هوتی ہے ' جس کی دو لڑکیاں پہلے سے موجود هیں - یہ دونوں لڑکیاں اپنی سوتیلی ماں کی طرف سے رقابت رکھتی هیں ' انجام یہ هوتا ہے کہ سوتیلی ماں کو آخر کو شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے اور وہ خود کشی کر لیتی ہے —

اگرچہ اس ناول کی تصنیف کو پینتیس سال هوچکے هیں ' لیکن اس کی تمام دلکش خصوصیات آج تک تازہ هیں - قصہ شروع سے آخر تک جاندار ' دلچسپ اور حقیقی ہے ' البتہ نفس قصہ میں کسی قدر الجھن پائی جاتی ہے - ایسا معلوم هوتا ہے کہ مصنف کو حقیقی زندگی پیش کرنے ' اور جسم و روح انسانی کے جذبات کو بے نقاب کرنے کی آرزو تو تھی ' لیکن بعد کو حقیقت نگاری کے میدان میں قدم رکھنے سے وہ خود جھجکنے لگا ' اور اپنے ابطال (هیروز) کی پردہ پوشی کے لئے اس نے ان کی کوتاهیوں پر راے زنی شروع کردی - ایک اور چیز قابل لحاظ یہ ہے کہ خالدضیا کی اِن ناولوں میں ' —— مثلاً شکستہ زندگیاں ' جس میں اس نے ایک ڈاکٹر کے مجنونانہ عشق کا ذکر کیا ہے ' جو اپنے خاندان والوں کی طرف سے غافل هوکر دوسری هی طرف عیش و عشرت میں مشغول هو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ هوتا ہے کہ اس کی خاندانی زندگی تباہ هو جاتی ہے ' اس کی لڑکی بھی هاتھ سے جاتی رهتی ہے —— همیں وہ رقیت اور خیالی رومانیت نہیں نظر آتی جو پیری لوتی کی ناول Les Desenchantees (پریرویان ناکام) * میں ملتی ہے - خالد ضیا ترک تھا ' اور اس نے ترکی

* یہ لوتی کے ناول کا ترکی ترجمہ ہے - ۱۲ - مترجم

زندگی کے خد و خال حقیقت نگاری کے موقلم سے اتارے ہیں ' جن کے رنگوں میں ہمیں باسفورس میں غروب آفتاب کا منظر نظر آتا ہے - لیکن مقتضاے زمانہ اور ۱۸ ویں صدی کے آخر میں قسطنطنیہ کی جو عام فضا تھی ' اس کا اثر اس پر بھی نظر آتا ہے ' مثلاً اس کی ناولوں کے ہیرو اور ہیروئن سب یورپی ادب اور فن کی اعلیٰ واقفیت رکھتے ہیں - حالانکہ اصل میں یہ واقفیت خود مصنف کو حاصل تھی ' جسے اس نے غلطی سے اپنے قصوں کے افراد سے بھی منسوب کر دیا ہے ' لیکن اس کا قصہ لکھنے کا ڈھب ایسا پسندیدہ ہے جس سے بہتر شاید ہی نظر آسکے - خالدضیا سے ترکی افسانہ نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے - اس نے جو بیج بویا تھا ' وہ آخر میں چل کر بہت بار آور ثابت ہوا ' اور اپنے ابناے ملک کے دلوں پر جو نقوش وہ بٹھا گیا ہے وہ فنا نا پذیر ہیں —

اب ہمیں ترکی آسمان ادب پر ایک اور شہاب ثاقب نظر آتا ہے ' یعنی جناب شہاب الدین ' جو شاعر ' نثار ' اور مضمون نگار تھا - اگرچہ اس کا پیشہ طبابت تھا ' لیکن وہ فطرتاً اہل فن تھا ' اس نے فرانسیسی ادبیات پر جس پر اسے پورا عبور تھا ' کتابیں لکھی ہیں - علیٰ ہذا سفر حجاز کے متعلق بھی اس نے ایک سلسلہ مضامین لکھا ہے ' یعنی " حج یولندہ " اور " یورپ مکتبلری " شاعری میں وہ شستہ اور شائستہ عاشقانہ مذاق رکھتا ہے ' اس نے اپنی شاعرانہ خصوصیات کو ذیل کے اشعار میں بیان کیا ہے —

وجودہ فکرمہ بر شہپر ملک یا پسدم
شب الفاظ و نور خولیا دن
بر فکر ملہ حوض رو یا دن
آلوپ کو پوکلری دو قمجہ بر چیچک یا پسہ م

بنم بوتنن اصلم بویدی شعرہ با شلا رکن

(میں نے اپنے شبدیز خیال میں فرشتہ کے پر لگا دئے ھیں
شب الفاظ و نور تخیلات سے
اپنے مذاق کے مطابق ایک پھول لگانے کے لئے
خوابوں کے حوض کے کف سے
یہ ھے میرا مدعا شعر گوئی سے —)

ہرت پر اس نے جو نظم لکھی ھے اس کی موسیقیت اس وقت تک سحر آفرینی کرتی رھے گی جب تک کہ موسیقیت کا لطف لینے والا سامعہ باقی ھے —

اشکی غیب ایلین بر قوش کبی قار
کنچی ایام نو بہاری آرار
اے قلوبک سرود شیداسی اے کبوتر لرک نشیدہ لری
نو بہارک او الیشتہ فرداسی قاپلادیں بردریں سکوتہ یری
کہ خموشانہ دو شر ' دو شر آغلار

(اس پرندے کی طرح سے جس کا جوڑا کھو گیا ھو ' ہرت
ایام نو بہار کو تلاش کر رھی ھے
آہ ' وارفتہ دلوں کا شیدا یانہ نغمہ
آہ ' زمزمہ سنج مغنیوں کا نشید
فردائے بہار کی یاد میں
وہ دنیا کو ایک حلقہ سکوت میں لے لیتی ھے
اس کے لئے آھستہ آھستہ نیچے کی طرف
گھرے درد والم کے ساتھ گرتے ھیں)

اپنے عشقیہ اشعار میں وہ اپنے عشق کا اظہار اور محبوبہ کی پرستاری لطیف ترین الفاظ میں کرتا ہے ' اور اسے اپنے الفاظ کو ایک ایسی موسیقیت کا جامہ پہنانے کی قدرت ہے ' جس سے ایک ترنم خیز چشمہ کے اوپر قوس قزح کے نکلنے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ " ثروت فنون " کے صفحات میں اس کے اشعار بہ کثرت نکلے ہیں —

صوفیوں کی طرح ' اس کی نظر میں ' دنیا میں اگر کچھ ہے تو عشق ہے : —

بوجیابان وزن و قافیہ دن کچیرن فکر می خیالکدر
کو کلمی رقص شعرہ دعوت ایدن موسیقی لب و مقالکدر

(وزن اور قافیہ کے اس بیان میں
تیری تصویر ہی میرے خیال کو سیدھا رستہ دکھاتی ہے
جو چیز میرے دل کو رقص شعر پر ابھارتی ہے
وہ تیرے لب و گفتار کی موسیقی ہے)

اس کا یہ مجازی عشق کبھی کبھی بلند ہو کر اس سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں عشق حقیقی کی روحانی پیاس کی تسکین ہو جاتی ہے۔ تان جوان پر (جو عیش پرستی اور عشق حقیقی دونوں رکھتا ہے) جو نظم اس نے لکھی ہے ' وہ معمولی انسانوں ' اور خواب غفلت سے چونکے ہوئے مشککین دونوں پر صادق آتی ہے۔ مسرت ' الم دنیا کی کھکھیڑیں ' جرائم غرض ہر پہلو سے وہ محبت ہی کا جویا ہے۔ اسے مسرت سر مدی کی جستجو ہے ' لیکن انجام میں اسے اکثر " صلف نازک " ہی ملتی ہے —

جناب شہاب‌الدین کے کلام میں جس عشق کو بیان کیا گیا ہے ' وہ اس خالی ہاے واے سے بالکل مختلف ہے ' جسے دوسرے شعرا پامال استعاروں

اور تشبیہوں میں بیان کیا کرتے ہیں - اگر چہ ان کے اشعار ترکی زبان ہی میں ہیں ' اور ان میں فارسی الفاظ کا استعمال بھی کیا گیا ہے لیکن ان میں ' اور ' باقی ' ' نفی ' اور ' وہبی ' کے اشعار میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے -

انھوں نے یورپ کی روح کو جذب کرکے اسے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے لکھتے ہیں —

پک پوش در او حس لکن او بو شلق صلولار دل
آفاق حیاتیہ دہ کی جوفی او اور تر
ہر کس ہپ او بو شلقدہ آرار بر طوتہ جق یر
پہر امن عمرندہ کی کردا بہ مقابل
(یہ حس خود خالی ہے ' لیکن دل اس سے بھرا ہوا ہے
افق حیات کا خلاء اسی سے پر ہے
ہم سب اس خلا میں ایک جاے قیام کی تلاش کرتے ہیں
تا کہ زندگی کے گرداب سے بچ کر اس میں پناہ لیں)

مرغ عشقک ہتون ترانہ لری افق رو حمدہ اہتزاز ایتدی
ہر بری آیری بر بہار اثری کیبی بر موسم اکلنوب کیتدی
(مرغ عشق کے زمزمے جو میرے افق دل میں اہتزاز پیدا کرتے ہیں
ان میں سے ہر ایک اثر بہار ہے ذرا دیر کھلا ' اور غائب ہوگیا)

ہر ہمت ایچندہ حبس ایدرک انفعالی روحم ایدر بوکتم ایلہ تعدیل انکسار
آنجق طویار شہیق تحسر مالمی بر سند یلک ایچندہ قالان عطر یادگار
(میرے درد پر دردوں کا طومار ہے —
میں اپنی روح میں اس کے نیش کو چھپا لینے کی کوشش کرتا ہوں
میری حسرت کی سانسیں صرف اس خوشبو کو سونگھتی ہیں جو اس

عطر رخصت * سے نکلتی ہے جو رومال میں لگا ہوا ہے —

نثر نگاری میں شہاب‌الدین کا پایہ شاعری سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اور ان کی تصانیف کو اول درجہ کی انگریزی یا فرانسیسی تصانیف کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ سیاحت و سفر کے متعلق جو مقالات انھوں نے لکھے ہیں ان میں مختلف ممالک کا بیان اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کی جیتی جاگتی تصویر لفظوں میں اتر آتی ہے، اور اس سے ان کی قوت مشاہدہ اور قوت بیان کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کی نثر کو پڑھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ ترکی زبان کی صفائی کے مدعی ٹھیٹ روز مرہ لکھہ کر طرز عبارت کو اس کے ذخیرۂ لفظی سے محروم کرنے کی کوشش آخر کیوں کرتے ہیں —

دستوری حکومت کے قیام نے ادبیات میں ایک نئی تحریک پیدا کی۔ چونتیس سال کی امید و بیم کی حالت کے بعد جو دھڑکتے ہوے دل کے ساتھہ بسر کئے گئے تھے، یکایک مسرت و شادمانی کے غلغلے بلند ہوے اور ترکی دنیاے صحافت نے آزاد ہو کر سانس لی اور اس میں لا محدود جوش اور سر گرمی پیدا ہو گئی۔ سینکڑوں کتابیں تصنیف ہوئیں اور لوگوں نے انھیں کمال شوق کے ساتھہ پڑھا۔ یہ ایک پوری قوم کی سچی اور اعلی درجہ کی مسرت کا نظارہ تھا، اور جن لوگوں نے ہمدردی کے ساتھہ ترکی کے حالات و واقعات کا مطالعہ کیا تھا، وہ بھی اب ترکی کے نئے اور شاندار مستقبل کو دیکھہ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ محکمہ احتساب نے جن مصنفوں کی زبان بندی کر دی تھی، اب وہ پھر میدان میں آگئے،

---

* عطر رخصت۔ وہ عطر جو رخصت ہوتے وقت مہمانوں کے رومالوں یا لباس میں ملا جاتا ہے — مترجم۔ ۱۲۔

اور ترکوں کی روح میں ایک نئے قسم کی لرزش اور تحریک پیدا ہوگئی۔ ان نو جوان مصنفین میں افسانہ نگار، تاریخ اور معاشرت کی چھان بین کرنے والے فلسفی، اور خواب شیریں دیکھنے والے شعرا، جو جوش میں آ آ کر عشق و محبت کی داستانیں سناتے تھے، سبھی شامل تھے۔ وطن پرستی اور جوش کی اس نشاۃ ثانیہ میں صرف ایک رجحان کار فرما نظر آتا تھا، اور وہ یہ کہ قدیم چیزوں سے دامن چھڑا کر اس نئے نور کو جذب کیا جائے جو یورپ سے چھن چھن کر آ رہا تھا۔ قومیت اور ترکی شہنشاہیت ان دونوں جذبات نے مل کر ایک نئی معاشرت کی آرزو کی شکل اختیار کرلی۔ حیات اجتماعی کی پرانی شکلیں رفتہ رفتہ مٹنے لگیں۔ پڑھے لکھوں کے دلوں سے بھی پرانے مدرسہ کی تعلیم کا شوق محو ہو گیا اور اعلی طبقوں کے اندر فرانسیسی تہذیب سرایت کرگئی۔ السنہ عربی و فارسی، اور فلسفہ مشرق کی تحصیل کے شوق نے کانٹ کے فلسفہ کے لئے جگہ خالی کردی، اور صفائی زبان کی تحریک کی وجہ سے عربی و فارسی لغات کی جگہ ترکی محاورات و الفاظ نے لے لی۔ اس رجحان کی دو حیثیتیں تھیں۔ یعنی تمدن کے لئے مغرب کو، اور تہذیب و شائستگی کے لئے مشرق کو سر چشمہ ہدایت قرار دیا گیا تھا، لیکن آثار بتا رہے تھے کہ یہ مشرق، اسلامی تہذیب و شائستگی کا مشرق نہ ہوگا۔ قومیت نے مذہب کے علاوہ ایک اور نصب العین بھی پیدا کردیا تھا، اور اب ترکوں کو اپنی قدیم تاریخ اور اسلام سے پہلے کی داستانوں سے خوشی اور ان پر فخر ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ مذہبی احساس اور اسلامی اخوت کے بدلے نسلی تاثرات پیدا ہوتے گئے۔ نامق کمال اور عبدالحق حامد کا "وطن" تو "دارالاسلام" تھا، لیکن اب قومیت کی نئی تحریک نے دوسروں کے مقابلہ میں صرف ترکی نسل کو

اپنا مطمح نظر بنا لیا - یورپ کے نسلی اور قومی تصورات ترکی نوجوانوں کے دماغوں پر بھی غالب ہوگئے اور کاھوں " Cahun " کی تصنیف (مقدمہ تاریخ ایشیاے وسطی) Introduction to the History of Central Asia نے ان میں اپنی قدیم تاریخ پر فخر کرنے کا شوق پیدا کر دیا - اب ترکی رسالوں اور مجلوں میں قدیم عقائد و خیالات پر آزادی کے ساتھ تنقیدیں اور نکتہ چینیاں ہونے لگیں - افسانوں میں افراد قصہ کی نفسی تحلیل نے اب مصنفین اور قارئین دونوں میں یہ شوق پیدا کر دیا کہ یہ دیکھیں کہ معاشرتی اور تاریخی واقعات کے پس پردہ کیا ہے - اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ترکی کی یہ کایا پلٹ کسی قدر اچانک ضرور تھی ' اور مغربی سائنس کے انکشافات نے ان کے دلوں میں طفلانہ مسرت پیدا کر دی تھی - لیکن شروع میں خود یورپی لوگوں کا بھی یہی حال تھا ' ہمیشہ اور ہر جگہ عمل کے بعد رد عمل ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ خیرالامور اوسطہا کی شکل پیدا ہوتی ہے - اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یورپی تہذیب اختیار کرکے اسے اپنی تہذیب کے موافق بنانے میں ترک ہی تمام دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں پیش پیش تھے - اب قدیم اور جدید کا معرکہ شروع ہوگیا - ایک طرف ترکی ناول نویس مغرب کی ٹکر کی ناولیں تصنیف کر رہے تھے ' تو دوسری طرف اہل مدرسہ اب تک " تقلید " کے قائل اور بے نتیجہ موشگافیوں میں مصروف تھے - اس معرکہ کا انجام بدیہی تھا - دور ظلم و تعدی کے ختم ہوتے ہی ایک نئی روحانی اور باطنی زندگی جنم لے چکی تھی —

محمد رؤف نے اپنا دل آویز افسانہ ایلول (ستمبر) تصنیف کیا - یہ ایک بغایت دل کش داستان حسن و عشق ہے جس کا منظر ساحل باسفورس

کے سرو کے درخت ہیں۔ اس افسانہ نگار کو لطیف سے لطیف جذبات اور قلب انسانی کے پوشیدہ سے پوشیدہ واردات بیان کرنے میں خاص کمال حاصل تھا۔ اسی کا دوست، حسین جاہد اسم با مسمی یعنی دراصل مجاہد تھا۔ وہ تقلید اور اس کی جمود آفرینی پر دلیری کے ساتھ تنقیدیں کرتا، اور خیالات و افکار کی ترقی اور تجدید کا حامی تھا۔ اسی کی تحریروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشروطہ کے اعلان سے ایک روز قبل اخبار "ثروت فنون" نکلنا بند ہوگیا۔ وہ افسانہ نگار، مختصر قصے لکھنے والا، اور نقاد تھا۔ اس کے بہترین افسانے یہ ہیں: "خیال" اور "کیوے دیوے نوے" (دیہاتی شادی)۔ ان دونوں میں حقیقت نگاری کا رنگ پایا جاتا ہے، لیکن اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے لسانیاتی مباحث پر تنقیدی نظر ڈالی اور فنون لطیفہ کے متعلق یورپی افکار و تصورات کی معلومات لوگوں میں پھیلائی۔ جب ترکوں کو ازسر نو سیاسی آزادیاں حاصل ہوگئیں، تو اس نے بھی اپنی تمام‌تر توجہ صرف اخبار نکالنے ہی پر مبذول اور اسی کی حد تک محدود کردی، اور در حقیقت اس کی پر جوش طبیعت اس کام کے لئے موزوں بھی بہت تھی —

جدہ زندگی کا اکیلا مسافر، سلیمان نزیف، اپنے سیاہ چہرے اور سفید چمکدار دانتوں کی طرح، ترکی ادبیات میں بھی دو رخی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کبھی تو جری اور بہادر نظر آتا ہے، اور کبھی منکسرالمزاج اور خوشامدی، اور اس کی سیرت کی یہ دو رنگی اس کی تصانیف میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ ترکی زبان کی لطافتوں اور باریکیوں پر بہت کچھ عبور رکھتا تھا، اور اس کی وجہ سے اسے مشہور ترین مصنفوں کے زمرے میں جگہ ملنی چاہئے تھی، لیکن اس کی طبیعت کی لٹک نے اسے ہمیشہ انتہا پسند بنائے رکھا۔ اس کی نثر کا پایہ، بمقابلہ شاعری کے، کہیں

زیادہ بلند ہے —

احمد حکمت کی تصانیف سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ترکی ادب پر تورانی خواہی اور ترکی نسل پرستی کے رجحانات غالب ہوتے جا رہے ہیں۔ احمد حکمت نے اس رجحان کی روز افزوں قوت کا اندازہ لگا لیا تھا اور اپنے افسانوں کے ذریعہ اس نے اسے اور تقویت دی۔ اس کی کتاب " خارستان و گلستان " ایک رومانی داستان حسن و عشق ہے۔ اس کے مطالعہ سے فطری رجحانات قوی تر ہو جاتے ہیں، وہ گویا ترکوں کے کان میں یہ بات ڈالتی ہے کہ اپنی نسل سے محبت کرو، اپنے آپ پر فخر کرو —

ایک طرف تو رومان نگار ترکی نسل کے دلوں میں شعور ذات اور خود شناسی کے احساسات بیدار کر رہے تھے، تو دوسری طرف، حسین سیرت، اور اسی کے رنگ کے دوسرے شعراء زندگی کی تنہائی، اور فراق یار کا ماتم کر رہے تھے، یہ موضوعات اس میں شک نہیں کہ نہایت فرسودہ اور پا مال ہیں، لیکن جب انسان کے سینہ میں دھڑکتا ہوا دل موجود ہے، اس وقت تک ان میں بھی تازگی باقی رہے گی حسین سیرت کی زبان اس لازوال اور فنا پذیر غم والم کو نئے سروں میں ادا کرتی تھی۔ اس میں میں ترنم اور خلوص تھا، الفاظ کے اندر جو اصلی جذبات مضمر ہیں انہیں چھپانے یا مبالغہ کے ساتھ پیش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی —

کونش باتار طاغیلیر افقدہ ہپ تخیل شام

اوز اقدہ بر اوداہن چنغراق صداسی دلیر

آقین آقین سوورولر ہپسی عودت الیدہ در

قویو نلری طاغیلاں بر چوبان کبی طالغین

نہ بکلرم یولک اوستندہ بویلہ هر آقشام

آرار میسک بنی بیلمم خجستہ یا وردم سن

سنک خیال یتیمہ کلہ اغلا یورکن بن

سورج نیچا هوتا جاتا ہے - دھوپ آسمان پر پھیلی هوی ہے - شام

کے تخیلات پیدا هو رہے هیں

دور سے کسی چرا گاہ میں گھنٹیوں کے بجنے کی صدا سنائی دیتی ہے

بھیڑوں کے گلے آهستہ آهستہ واپس آ رہے هیں

اس گڈرئیے کی طرح ' جس کی بھیڑیں بھٹک گئی هوں ' خیال میں ڈوبا هوا

[میں هر مرتبہ سڑک پر کس چیز کا انتظار کرتا هوں

اے خجستہ بچے ' کیا تو مجھے ڈھونڈتا پھرتا ہے ؟

اور ادھر میں تیرے یتیم خیال کے لئے آنسو بہا رہا هوں]

او کوزلر بکا توجیہ ایتمیجک او دور اقلر بنی سیرت دیدہ یاد ایتمیجک

آیریلان اللرمز بردھا بر لشمیجک آرا مزدن آجی بوباد خزان اسدی بوکون

اے نہا للدہ دو کولمش داغیلان نازلی چیچک

[آہ ' اب وہ آنکھیں مجھے نہ دیکھیں گی

وہ لب اب مجھے نہ پکاریں گے -

همارے هاتھ جو الگ هوگئے ' اب دوبارہ نہ ملیں گے

یہ کیسی غم انگیز آندھی هم دونوں کو جدا کرگئی

آہ ' حسین غنچہ نا شگفتہ جو خاک میں مل گیا]

سلیمان نزیف کا چھوٹا بھائی ' فائق علی ان زبردست نا کامیوں اور محرومیوں کا ایک بہادر ' لیکن غمگیں شاعر تھا جو ترکی قوم کو اٹھانا پڑی تھیں - زمانے کے آهنی پنجہ نے ان کی بڑی بڑی آرزوں کا گلا گھونٹ دیا

زیادہ بلند ہے —

احمد حکمت کی تصانیف سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ترکی نثر پر توران خواہی اور ترکی نسل پرستی کے رجحانات غالب ہوتے جا رہے ہیں۔ احمد حکمت نے اس رجحان کی روز افزوں قوت کا اندازہ لگا لیا تھا اور اپنے افسانوں کے ذریعہ اس نے اسے اور تقویت دی۔ اس کی کتاب " خارستان و گلستان" ایک رومانی داستان حسن و عشق ہے۔ اس کے مطالعہ سے فطری رجحانات قوی تر ہو جاتے ہیں' وہ گویا ترکوں کے کان میں یہ بات ڈالتی ہے کہ اپنی نسل سے محبت کرو' اپنے آپ پر فخر کرو —

ایک طرف تو رومان نگار ترکی نسل کے دلوں میں شعور ذات اور خود شناسی کے احساسات بیدار کر رہے تھے' تو دوسری طرف' حسین سیرت' اور اسی کے رنگ کے دوسرے شعراء زندگی کی تنہائی' اور فراق یار کا ماتم کر رہے تھے' یہ موضوعات اس میں شک نہیں کہ نہایت فرسودہ اور پا مال ہیں' لیکن جب انسان کے سینہ میں دھڑکتا ہوا دل موجود ہے' اس وقت تک ان میں بھی تازگی باقی رہے گی حسین سیرت کی زبان اس لازوال اور فناناپذیر غم والم کو نئے سروں میں ادا کرتی تھی۔ اس میں ترنم اور خلوص تھا' الفاظ کے اندر جو اصلی جذبات مضمر ہیں انھیں چھپانے یا مبالغہ کے ساتھ پیش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی —

کونش باتار طاغیلر افقدہ ہپ تخیل شام

اوز اقدہ بر اودادن چنغراق صداسی دلہر

آقین آقین سوورولر ہپسی عودت الیدہ در

قویونلری طاغیلاں بر چوبان کبی طالغین

نہ بکلرم یولک اوستندہ بویلہ ہر آقشام

آرار میسک بنی بیلمم خجستہ یا وردم سن

سلک خیال یتیمہ‌کلہ اغلا یورکن بن

سورج نیچا ہوتا جاتا ہے - دھوپ آسمان پر پھیلی ہوی ہے - شام کے تخیلات پیدا ہو رہے ہیں

دور سے کسی چرا گاہ میں گھنٹیوں کے بجنے کی صدا سنائی دیتی ہے

بھیڑوں کے گلے آہستہ آہستہ واپس آ رہے ہیں

اس گڈریئے کی طرح ' جس کی بھیڑیں بھٹک گئی ہوں ' خیال میں ڈوبا ہوا

[میں ہر مرتبہ سڑک پر کس چیز کا انتظار کرتا ہوں

اے خجستہ بچے ' کیا تو مجھے ڈھونڈتا پھرتا ہے ؟

اور ادھر میں تیرے یتیم خیال کے لئے آنسو بہا رہا ہوں]

او کوزلر بکا توجیہ ایتمیجک او دور اقلر بنی سیرت دیبہ یاد ایتمیجک

آیریلان اللرمز بردھا بر لشمیجک آرا مزدن آجی بوباد ھزان اسدی بوکون

اے نہا لندہ دو کولمش داغیلان نازلی چیچک

[آہ ' اب وہ آنکھیں مجھے نہ دیکھیں گی

وہ لب اب مجھے نہ پکاریں گے -

ہمارے ہاتھ جو الگ ہوگئے ' اب دوبارہ نہ ملیں گے

یہ کیسی غم انگیز آندھی ہم دونوں کو جدا کرگئی

آہ ' حسین غنچہ نا شگفتہ جو خاک میں مل گیا]

سلیمان نزیف کا چھوٹا بھائی ' فائق علی ان زبردست نا کامیوں اور محرومیوں کا ایک بہادر ' لیکن غمگین شاعر تھا جو ترکی قوم کو اٹھانا پڑی تھیں - زمانے کے آہنی پنجے نے ان کی بڑی بڑی آرزوں کا گلا گھونٹ دیا

تھا - نئی آزادی اور مسرت کی زندگی پر وہ دل کھول کر خوشیاں بھی نہ منانے پائے تھے کہ حریص یورپ کے دغا بازانہ حملوں نے ان کی خوشیوں کو ملیامیٹ کر دیا - جنگ طرابلس اور ریاست ھائے بلقان کی منحوس فوج کشی نے رعایا کی آرزوں کے غنچھ نا شگفتہ کو پامال کر دیا - اس قدر جان بازی اور بہادری سے لڑنے کہ باوجود شکست اور مایوسی کا منہ دیکھنا یہ ترکی قوم کے لئے ابتلائے عظیم تھا - فائق علی نے اپنی نظموں میں اسی منحوس زمانے کی رام کہانی بیان کی ھے - اس کے کلیات کا عنوان " فانی قسلی لر" (فانی امیدیں) ھے ' اور اس ایک قابل قدر ضمیمہ " الحان وطن " ھے —

جو حلقے پہلے محض اپنی جنگ جوئی کہ لئے ممتاز تھے ' ترکی کے ابتلاء کی وجہ سے ان میں بھی شاعرانہ روح جوش زن ھوگئی - جنگ روس میں ' سلیمان پاشا ترکوں کا ایک مشہور افسر تھا - اس کا لڑکا سلیمان نسیب شاعر تھا ' اور فطرتاً نہایت ھمدرد اور حلیم الطبع - اس کی طبیعت نہایت صاف تھی اور اس کی نظموں میں ھمیں رحم اور نیکی کی شمیم جاں فزا ملتی ھے - " جلال ساحر " شاعر نسائیات اس کا جواب تھا - معلوم ھوتا ھے کہ وہ ایک رنگین مزاج تتلی ھے اور پھول پھول اڑنا اور زندگی کے گلستان سے شبنم اور شہد حاصل کرنا ' یہ اس کا کام ھے - فرانسیسی شاعر بادلی لے یر (Baudelair) کی عریاں نظموں کو پڑھ کر اس کے دل میں بھی نئے جذبات پیدا ھوے ' چنانچھ اس نے نہایت حسن و خوبی کہ ساتھ اپنی نظموں میں اسی کا رنگ اتارا ھے —

قاد ینلر اوطاسہ اوکسوز قالیردی اشعارم
قادین بوسہسلی حیاتک یگانہ یلیدیر یدر

(اگر جنس لطیف نہ پیدا ہوئی ہوتی ' تو میرے اشعار یتیم ہی رہتے عورت ہی اس زندگی کے ابر آلود مطلع کا درخشاں ستارہ ہے)

اب ہم اپنی توجہ ایک ایسے شاعر کی طرف مبذول کرتے ہیں ' جسے آج کوئی جانتا بھی نہیں ' اور جس نے بورژے (Bourget) یا فلابرت (Flaubert) کے نقش قدم کو اپنا دلیل راہ نہیں بنایا ' یعنی حسین رحمی - اس نے اپنے افسانوں کے لئے اعلیٰ طبقہ کے افراد کا نہیں ' بلکہ شہر کی گلی کوچوں اور چوراہوں کے لوگوں کا انتخاب کیا - ہمارے لئے ' بمقابلہ دیگر شعرا کے ' وہ اس وجہ سے زیادہ قابل قدر ہے کہ اس نے اپنے قصوں میں ان لوگوں کو زندہ جاوید بنایا ' جو مشرق کی اس خاص رنگینی کے نمائندے تھے ' جو آج کل روز بروز مٹتی جارہی ہے - اس کے افراد قصہ اپنی خاص زبان بولتے ہیں جو اس میں شک نہیں کہ کرخت اور درشت ہے ' لیکن سچی بھی ہے - اسے ترکی کا ایمیلی زولا (Emile Zola) کہا جاسکتا ہے - اس نے اپنی زندگی ان تنگ گلیوں میں بسر کی تھی ' اور دونوں وقت کا کھانا ان آش خانوں میں کھایا تھا جہاں حمال ' لڑاکا بڑھیا عورتیں ' مدرسہ کا شرمیلا طالب علم اہل حرفہ اور ان کے ساتھی اپنی حقیر ' لیکن رنگین زندگی بسر کرتے تھے - اس کی تصانیف مسترس (مالکہ) " مربیہ " (اتالیقہ) " سون آرزو " (آخری آرزو) وغیرہ ہیں ' وہ بہت پر نویس اور تیز نویس تھا - اور چاہے اس کا طرز تحریر اعلیٰ درجہ کا نہ ہو ' تاہم اس کے قصہ کے افراد ہمیشہ اور ہر وقت دلچسپ ثابت ہوں گے —

احمد وسیم جامعیت کے اعتبار سے رحمی ہی کے برابر تھا - اس نے ہر ترکی اخبار میں ' اور ہر موضوع پر مضامین لکھے ہیں - نظم و نثر ' تاریخ افسانہ ' قدیم روائتیں ' رسم و رواج کا بیان ' غرض کہ ہر ممکنہ مبحث پر

اس نے قلم اٹھایا ہے - وہ اس شہر قسطنطنیہ کی آخری یاد گار ہے جو اپنی تاریکیوں کے با وجود روشن تھا ' پر اسرار اور قابل محبت ' شرمیلا اور عیاش غرض کہ رومان اور حقیقت دونوں کا شہر تھا اور جو جدت پسندی کی رو میں آکر ' ہماری آنکھوں کے سامنے کچھہ کا کچھہ ہوگیا ہے ' اور اس کی پرانی رنگینیاں اب محض افسانہ بن کر رہ گئی ہیں —

ترکی شاعری میں توران خواہی کی آرزو کی نمائندگی محمد امین نے کی اور وہی پہلا شاعر ہے جس نے کوچہ و برزن کی زبان میں اشعار لکھے - اس نے چھوٹی چھوٹی وطنی نظمیں لکھی ہیں جن میں وہ بڑے فخر کے ساتھہ اپنے آپ کو ترک کہتا ہے - واضح ہو کہ پہلے لفظ ترک وحشی اور غیر متمدن کا مرادف تھا ' اور کوئی شخص اپنے لئے ترک کا استعمال پسند نہ کرتا تھا —

بن بر تو رکم دینم جنسم اعلاو در

(میں ترک ہوں ' میرا دین اور میری نسل اعلیٰ ہے)

یہ اشعار آئندہ کے لئے ایک فال اور نئے نصب‌العین کا پیش خیمہ تھے - اس کے اشعار عملی باتوں کے متعلق ہوتے تھے - وہ کاشتکار کو ابھارتا تھا کہ اور زیادہ غلہ پیدا کر ' اور اپنی زمین سے محبت کر ' جو مسرت اور فیاضی کی ان داتا ہے - اپنی نظم " جنگ گیدر کن " (میدان جنگ کی طرف روانگی) میں اس نے ترکی سپاہی کی عظمت بیان کی ہے - اس کی نئی نظموں میں ' جن میں اس نے عربی ' لفظ " اللہ " کی جگہ قدیم ترکی لفظ " تنری " یعنی " خداے ترک " استعمال کیا ہے ' ترکی قارئین کے مقابلہ میں یورپی علماء نے زیادہ دلچسپی لی ہے ' اور ترکی جمہور نے بھی خواہ وہ اس کی بے جوڑ نظم کو نا پسند کرتے ہوں ' اس کے جذبات کے

ساتھہ ھمدردی کی ھے - اس پر تنقیدیں بھی ھوئیں ' لیکن وہ ان کو برداشت کرلے گیا اور تھوڑے ھی دنوں میں ضیا گیوک الپ ' تیکن الپ اور دوسرے شعرا کی توران خواھی نے ثابت کر دیا کہ اس کی بدعت ' بدعت حسنہ تھی —

اسی زمانے میں بعض فرانسیسی مصنفین مثلاً باودی لیر اور ورلائن کے رنگ کا اثر بعض نوجوان مصنفین مثلاً امین بلند ' شہاب الدین سلیمان اور تحسین ناھید پر یہاں تک پڑا کہ انھوں نے فجر آتی (صبح طالع) کے نام سے اپنی ایک الگ انجمن قائم کرلی ' اور قافیہ حتی کہ بعض اوقات اوزان تک کی قیود سے دست بردار ھوکر محض ترنم الفاظ کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے - یہ لوگ فرانسیسی پارنسی (Parnassian) مصنفین کے متبع تھے ' جو ادب میں نئے نئے اشکال اور نئے نئے طرز ادا ایجاد کر کے اپنی جدت پسندی کا ثبوت دیا کرتے تھے - اس گروہ کا سب سے مشہور نمائندہ احمد ھاشم تھا ' جس کا اصول یہ تھا کہ :—

" شاعری کسی بندھے ھوے معنے کی مظہر نہیں ھے - رات کے وقت جب آگ لگے ' تو وہ آسمان والوں کو نظر آسکتی ھے ' لیکن گڑھوں میں پڑے ھوے لوگوں کو نظر نہیں آتی - بہترین نظم اپنی تحریکی قوت پڑھنے والے کے تخیل سے حاصل کرتی ھے یہ کچھہ ضروری نہیں کہ نظم میں صفائی اور سلاست ھی ھو ' اس لئے کہ ان چیزوں کے موجود ھونے سے تخیل خالی رہ جاتا ھے - انبیاء اور پیغمبروں کے الفاظ کی طرح ' شاعری کو ایک سے زیادہ تعبیروں کا متحمل ھونا چاھئے " —

" فجر آتی " اس زمانے کے حالات اور واقعات کی پیدا وار تھی ' اس کے لوا بردار زیادہ تر اھل صحافت تھے ' لیکن اس کے نشو و نما کا نہم

دوسرا ہی تھا —

کسی قوم کی تاریخ کا تعین اور اس کی تشکیل محض اس کے جغرافی محل وقوع اور معاشی نظام سے نہیں ہوا کرتی - ایسے خیالات ' جن کی اصل تو خارجی ہوتی ہے ' لیکن جن کی قلم قومی دماغوں پر لگادی جاتی ہے ' اور پھر وہ دوسرے خیالات و جذبات جو ان پر پھلتی اور ان سے پیدا ہوتے ہیں - یہ تاریخ کے زبردست ترین عوامل اور محرکات ہوا کرتے ہیں - جذبات کے تلاطم سے اس میں شک نہیں کہ خیالات و افعال انھی نالوں اور نہروں میں بہتے ہیں جو مادی حالات زندگی نے پہلے سے تیار کردی ہیں ' لیکن کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ خود ان نہروں اور نالوں کو بھی اپنی رو میں بہا لے جاتے ہیں - نوجوان ترکوں کی آرزوؤں اور امنگوں کے تین خاص رخ تھے ' عثمانی نصب العین ؛ اسلامی نصب‌العین ' اور " ہمہ ترکیت " * یا تو رانی نصب‌العین ' لیکن مادی حقائق و واقعات نے ان تینوں کو دبا دیا اور پورا نہ ہونے دیا - جنگ بلقان ' جس میں مسیحی دول کی طرف سے برابر قومی رجحان اور قومیت پسندی کا اظہار ہوتا تھا ' ترکی قوم خواہی کا ایک قدرتی جواب تھا - اس جنگ میں اسلام خواہی کے جذبات کی بھی کئی اعلی درجہ کی مثالیں دیکھنے میں آئیں - ہندوستان سے بھی روپیہ اور دیگر ضروریات زندگی بکثرت ترکی بھیجی گئیں ' اور ہندی مسلمانوں کی ہمدردی ترکوں ہی کے ساتھ تھی لیکن یہ ہمدر دانہ مظاہرات ' آخر میں

* ہمہ ترکیت (Pan - Tur kis) یعنی ہر طرف ترکی ہی کا بول بالا ہو ' اور جملہ ادارات اور تشکیلات ترکی ہی ہوں —

۱۲ — مترجم

چل کر سادی نتائج و فوائد سے خالی ثابت ہوئے - جنگ بلقان کے بعد ہی جنگ عظیم ہوئی ' لیکن زندگی اور موت کی اس کشمکش میں کسی نے ترکوں کی مدد نہیں کی ' اور ہمہ اسلامیت ' یا اسلام خواہی کی تحریک بھی سیاسی آلہ کی حیثیت سے فاکارہ ثابت ہوئی - جنگ بلقان نے سلطنت ترکی کا شیرازہ پراگندہ کردیا ' جس کے وسیع اور مختلف الحالات صوبجات کے درمیان اگر کوئی وحدت تھی تو وہ صرف عثمانیت تھی ' یعنی خانوادہ عثمان کا اثر ' جو شیرازہ بندی کئے ہوئے تھا - زمانۂ قدیم میں ترکی سلطنت کا سنگ بنیاد عثمان کا خاندان ہی تھا اور یہ سلطنت صرف اس حد تک ترکی تھی کہ اس میں ترکی زبان بولی جاتی تھی ' ورنہ در اصل یہ ایسی مختلف اقوام کا ایک معجون مرکب تھی جو ایک ہی سلطان کی مرضی اولی کی تابع تھیں —

خانوادہ عثمان کسی حیثیت سے بھی یورپ کے کسی شاہی خاندان سے نیچے درجہ کا نہ تھا - اس خاندان کی آخری یادگاروں میں بھی ہمیں قابل قابل افراد اور خواتین نظر آتی ہیں - ان میں سے اکثر نہایت باکمال صاحب فن تھے ' خصوصاً فن عمارت اور موسیقی میں خاص کمال پیدا کیا تھا - جنگ عظیم نے اس آخری رشتہ اتحاد کو بھی توڑ دیا - ترکی کو شکست ہوئی - اور اسے پامال کیا گیا " دشمنان ترکی کے کیچڑ میں لت پت جوتوں نے " قسطنطنیہ کی مقدس عمارتوں کو ناپاک کیا - ترکی کی روح کو شدید سے شدید ابتلا کا سامنا کرنا پڑا - اسے اپنے ایک صدی پرانے نصب العین کی طرف سے بھی کوئی امید نہیں رہی ' وہ سب خیالات محض خواب اور سراب ثابت ہوے ' لیکن یہ نہ سمجھنا کہ ان حوادث نے روح ترکی کو فنا کردیا - نہیں ' ہرگز نہیں - ترکی کی روح نے اپنے اندر اب ایک نئے نصب العین کی تعمیر اور پرداخت شروع کردی ' جس کو ماضی پر غالب آنا ' اور ایک زیادہ

روشن مستقبل کی بنا ڈالنا تھا - یہ مستقبل ترکوں کا اپنا اور ان کے لئے حقیقی معنوں میں ترکی ہوگا ' اس لئے کہ اپنے ہم مذہب ہوں ' یا غیر مذہب رکھنے والے حلیف اور ساتھی ' سب ترکوں کو چھوڑ چکے ہیں - یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نئی تحریک نے ماضی کی طرف سے بالکل ہی آنکھیں بند کرلی ہیں - انھوں نے صرف اس روداد ماضیہ کو خیر باد کہا ' جو ترکوں کی موجودہ سیاسی اور ذہنی زندگی سے کسی طرح میل ہی نہیں کھاتی ' اور اس کے بدلے اب وہ ماضی کی زیادہ حقیقی اور سچی تعبیر کرنے لگے ہیں ' یعنی خود ترکی قوم کی ماضی کی - اب توران خواہی ' ترکوں کا نصب العین بن گیا ہے - یعنی ان ترکوں کی زبان ' مذہبی خیالات اور اخوت جو زمانہ قدیم میں پراگندہ اور شکست خوردہ ہوکر ایک دوسرے سے الگ ہوگئے تھے - خون اور تہذیب کی یہ پرانی وحدت اور پرانا رشتہ اتحاد اب برملا ظاہر ہونا چاہئے ' اور اس نصب العین کو عملی طور پر حاصل بھی کرنا چاہئے - ضیا گیوک الپ نہایت بے باکی کے ساتھ اسی جذبہ کو ظاہر کرتا ہے :-

وطن نہ تورکیہ در تورکلرہ نہ تورکستان
وطن بو یوک و موبد بر اولکہ در توران
(ترک کا وطن نہ ترکی ہے نہ ترکستان
بلکہ یہ وطن ایک عظیم اور ابدی جگہ ہے یعنی توران)

اپنی تصنیف " ترک چولوک اساس لری " (اساس تورانیت) میں اس نے ان انتہا پسند توران خواہوں کے مقابلہ میں ایک زیادہ متعین روش ختیار کی ہے ' جو تمام یورالی الطائی السنہ کے بولنے والوں کے سیاسی اور تمدنی اتحاد کا خواب دیکھتے ہیں - برخلاف اس کے ' ضیا گیوک الپ کا

توران خواہی کا تصور صرف معاشرتی اتحاد کی حد تک محدود ہے - اس کا یہ معاشرتی اتحاد " در خانیم " کے اصول پر ہے' اور وہ اس اتحاد کو وسط ایشیا کے صرف انھی ترکی زبان بولنے والوں تک محدود رکھنا چاہتا ہے جو اپنے تمدن اور تہذیب کے اعتبار سے بھی ایک سیاسی وحدت بنا سکیں —

اسلامی ترکی نصب‌العین کو چھوڑ کر' ترکوں کا بتدریج تورانی نصب‌العین اختیار کرنا' خالدہ ادیب خانم کی ناول یئی توران (توران جدید) میں بیان کیا گیا ہے - یہ کتاب اپنے وطن خواہانہ جذبات کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی' اور اس کی وجہ سے اس کی مصنفہ کو بہت کچھ ادبی شہرت حاصل ہوئی —

اس نئی روح کے خیر مقدم کے لئے' نوجوان مصنفین کا ایک ادبی حلقہ " تورک یردو " کے نام سے قائم ہوا جس کے بانی مبانی عمر سیف‌الدین' جو ظرافت کا خاص ملکہ رکھتے تھے' اور ضیا گیوک الپ تھے' اس ادبی حلقہ کی طرف سے ایک مجلہ بھی شایع ہوتا تھا' جس کی زبان نہایت چھبتی ہوئی اور پڑھنے کے قابل ہوتی تھی' اور جس میں توران خواہی کی تحریک کار فرما نظر آتی تھی - روسی ترک مثلاً اقچورہ اوغلو یوسف جو ایک نہایت موثر مقرر تھے' اور آذر بائیجانی ترک مثلاً آغا اوغلو احمد یہ دونوں بھی' جو یوروپی روسی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوے تھے' اس حلقہ میں شریک ہوگئے - قدیم نصب‌العین' پاکی زبان کو وسعت دیکر اب اسے " تحریک عود بہ ترکی قدیم " میں بدل دیا گیا تھا' اور اب متروک الفاظ اور مقامی بول چال کے ایسے محاورات بھی جزو زبان ہونے لگے' جو ایک معمولی قاری کی نظر میں کسی طرح بھی عربی اور فارسی کے غیر مانوس لغات سے کم دور از کار نہ تھے - لیکن حقائق زندگی نے پھر نظریہ بازی پر فتح پائی'

اور رفتہ رفتہ اس شدت اور غلو کو مناسب اور قرین عقل حدود میں محدود کر دیا گیا —

رفتہ رفتہ اس نئی جد و جہد نے ادبی حلقہ سے نکل کر زیادہ وسعت اختیار کرلی ؛ اور اب معاشرتی حلقوں میں بھی اس کی کار فرمائی نظر آنے لگی - سب سے پہلے قسطنطنیہ میں اور پھر بعد کو صوبجاتی شہروں میں ایسے ادارات قائم کئے گئے ' جن کا مقصد نوجوان ترک مردوں اور عورتوں کو آئندہ قومی تشکیل کے قابل بنانا تھا - اس ادارہ کا نام ترک اوجاغی (ترکی گھر) ہے ' اور اس کے صدر حمداللہ صبحی میں جو ایک نہایت با مشقت شخص ہیں اور مصنف کی حیثیت بھی رکھتے ہیں ' اگر چہ ان کے بال ایک کہن سال اہل علم کی طرح سفید ہیں ' لیکن ان کے بشرے سے ہمیشہ نوجوانی کی شگفتگی ٹپکتی ہے - غالباً وہی خالدہ ادیب خانم کی ناول کے ہیرو ہیں ' یعنی ایک مصلحتی منظم ' اور اپنی قوم کی ترقی کے لئے آزاد خیالی کے حامی - ترک اوجاغی ایک تعلیمی کلب ہے ' جہاں شعراے قوم اپنا تازہ کلام سناتے ہیں ' سائنس داں اور علماء عالمانہ تقریریں اور مباحثے کرتے ہیں ' تفریحی اجتماع ہوتا ہے ' اور ایک زبردست کتب خانہ ہے جس سے ترکی سوسائٹی میں ترقی اور تجدید کی نئی روح پھونکی جاتی ہے - ہر ادارہ اپنی تاثیر میں کامیاب نظر آتا ہے اور میں نے اکثر شام کے جو اوقات ان اداروں کے جلسوں میں گزارے ہیں ' اور ان میں جو کچھ دیکھا ہے ' اس سے مجھے یہ یقین ہوگیا ہے کہ ان عجیب و غریب ادارات کے اندر ایک نہایت زبردست تحریکی قوت کام کر رہی ہے ' جو ان کی زندگی اور ان کی قوت کی ضامن ہے - انہی حلقوں میں فن اور ادب کا نیا مذاق پیدا کیا جاتا ہے اور اس کا اثر دور دور کے قریوں تک پہنچتا ہے - بہترین نئی

ترکی ناولوں کی قدر جس جوش کے ساتھہ ان حلقوں میں کی جاتی ھے اس سے معلوم ھوتا ھے کہ ترکوں کی حیات روحانی کا مستقبل نہایت حوصلہ افزا ھے —

ترکی کے جدید ترین ادبیات پر رائے زنی کرنا کسی قدر مشکل کام ھے ' اس لئے کہ ھم لوگ اس زمانے سے بہت قریب ھیں جس میں یہ کتابیں تصنیف ھوئیں ' اور ان کے مصنفین سے ذاتی طور پر واقف ھونا اور ان سے شناسائی رکھنا تنقیدی نظر کو تیز کرنے کی بجائے اسے کسی قدر دھندلا بنا دیتا ھے - اکثر باتوں میں مجھے ترکی کی رائے عامہ سے کسی قدر اختلاف ھے ' اور یہ چیز کہ میں ترکی کتابوں پر محض ایک ھمدرد غیر ملکی کی حیثیت سے نظر ڈالتا ھوں ' اگر بعض حیثیتوں سے میرے لئے مفید ھے ' تو اکثر حیثیتوں سے غیر مفید بھی ھے - مثلاً خالدہ ادیب خانم کی مثالی سیرت نگاری اور ان کے ناھموار طرز ادا کا مجھہ پر کچھہ بہت زیادہ اثر نہیں ھوا ' اور میں ان کی مقبولیت کی وجہ صرف یہ سمجھتا ھوں کہ انھوں نے وطن کی زبردست خدمات انجام دی ھیں ' لیکن اس میں کسی کو شک نہیں ھوسکتا کہ انھوں نے نئی ترکی ذھنیت پیدا کرکے بہت قابل تعریف کام کیا ھے —

یعقوب قادری ' جو نثر منظوم لکھنے میں ایک صاحب فن کی حیثیت رکھتا ھے ' میری نظروں میں بہت کچھہ وقعت ھے - سب سے پہلے اخبار ثروت فنون کے ایک مضمون بہ عنوان " استبداد " میں یعقوب قادری نے اس طرح کی نثر منظوم لکھی ' اس مضمون میں انھوں نے تحریک پاکی زبان کے ان حامیوں پر تنقید کی تھی ' جو زبان کی صفائی کے بارے میں غلو سے کام لیتے ھیں - ان کی پہلی ناول " سرانجام " مصر کی ایک کنیز کی سیدھی

سادی داستان ہے ' لیکن اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف میں جذبات انسانی کی دھوپ چھاؤں دکھانے کی صلاحیت ہے ' اور ان کا دل پرسوز و گداز ہے۔ ان کی تصنیف ارنلرین باغی (گلشن تقدس) میں زہد خشک کا خاکہ اڑایا گیا ہے ' اور اسی مضمون کو دوبارہ ایک اور ناول نور بابا میں بیان کیا گیا ہے ' جس کا قصہ یہ ہے کہ ایک عقیدت مند عورت ایک بکتاشی درویش سے محبت کرتی ہے ' جو عشق مجازی کے توسط سے عشق حقیقی حاصل کرنا چاہتا ہے - جب عورت کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے محض ایک اعلیٰ اور شریفانہ مقصد کے حصول کے لئے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے ' تو وہ اپنی قسمت پر شاکر ہوجاتی ہے ' اور درویش کو معاف کرکے طمانیت قلب حاصل کرتی ہے - اس ناول نے ایک اچھا خاصہ ہنگامہ پیدا کردیا ' جانثاریوں کے قلع قمع کے بعد بکتاشیوں کا حلقہ غیر ہردل عزیزبن گیا ' دوسری طرف بعض لوگوں نے ان درویشوں کے مخفی رسوم و عبادات کے اس طرح برملا بیان کرنے کو ایک طرح کی مذہبی جسارت اور سوء ادبی خیال کیا —

رفیق خالد ترکی ظرافت کے ایک قابل نمائندے ہیں - ترکی ظرافت اپنی سادگی کے اعتبار سے ایک اعلیٰ درجہ کی چیز ہوتی ہے اور گزشتہ صدیوں میں بھی جب ترکی ادبیات کا گزر یورپ تک نہیں ہوا تھا ' ایک کتاب ایسی تھی جس نے یورپ کی توجہ کو خاص طور پر جذب کرلیا تھا : یعنی خوجہ نصرالدین کے قصے - اس کتاب کی ظرافت ' اس کے کنائے ' اور اس کے چلتے ہوے فقرے ' جب کبھی پڑھے جائیں گے ہنسی کی گد گدی ضرور پیدا کریں گے - رفیق خالد نے اپنی کتاب کرپنی دیدہ کلری (خارپشت کے مقولے) میں خوجہ نصرالدین ہی کو نمونہ بنایا

ہے' اور اپنی تیز زبانی سے نوجوان ترکوں پر حملے کئے ہیں اور سیاسیات میں ان سے جو حماقتیں ہوئیں اس کا مذاق اڑایا ہے - اس نے قدیم مورخ نائمہ کی عبارت کی مزاحیہ نقل کرکے اسی رنگ میں دستوری حکومت کے خاص خاص افراد' مثلاً احمد رضا' رضا نور وغیرہ کا خاکہ اڑایا ہے - ہنسنے ہنسانے کی باتوں' اور خاکہ اڑانے کے علاوہ' اس سلسلہ مضامین میں ہمیں ان ایام کا سارا حزن و ملال بھی جھلکتا نظر آتا ہے' جن سے جمہور ترکی کو بڑی بڑی امیدیں تھیں —

لیکن رفیق خالد صرف اپنی ظرافت ہی کے لئے ممتاز نہیں ہے' بلکہ قصہ لکھنے کا سلیقہ بھی اس میں بہت اچھا ہے - وہ اپنے افراد قصہ کے نقش و نگار ایسے مو قلم سے اتارتا ہے کہ وہ حقیقی بن کر اس کی ناولوں کے صفحات سے مجسم باہر آ جاتے ہیں - اپنی کتاب (اناڈولیوناسل گیور دیوم) میں اس نے ایشیاے کوچک کا جو بیان کیا ہے وہ بہت مفصل اور مطابق اصل ہے' لیکن قدرے خشک بھی ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایجابی تخلیقی قوت کے مقابلہ میں سلبی تنقیدی قوت بہت زیادہ تھی - اس کی استادانہ زبان نہایت سلیس اور شیریں ہے' اور ظریفانہ استعارات اس میں بھرے ہوے ہیں - ترکی کے سیاسی انقلابات کی وجہ سے وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوا - جب ایک نئی قوم بن رہی ہو' اس حالت میں ایسی تیز اور کاٹ کرنے والی زبان کا بھلا نہیں ہو سکتا - ہمیں امید ہے کہ اپنے آبائی وطن کی محبت اور آرزو اس کے احساسات میں گہرائی پیدا کرے گی اور اس کی تحریک سے وہ کوئی پائندہ تر ادبی شاہکار پیش کرسکے گا —

ظرافت میں رفیق خالد کا ایک قابل حریف عمر سیف الدین تھا -

وہ فوجی افسر تھا اور ادبیات میں نیا رنگ پیدا کرنے کی تحریک میں وہ پیش پیش تھا - وہ ایک طرف میدان جنگ میں تلوار کے جوہر دکھاتا تھا، تو دوسری طرف اپنے قلم سے مخالفوں کا مقابلہ کرتا تھا - اگرچہ اس کا انتقال بہت قبل از وقت اور کم عمری میں ہوا، تاہم اپنی تصانیف کی بدولت ترکی ادبیات میں وہ زندہ جاوید ہوگیا ہے - اس کے مزاحیہ مختصر افسانے جو "اونچی ایڑی" (پیوسک پیوکچلر) کے عنوان سے شایع ہوے ہیں اس کے لاجواب قدرت فن اور سنجیدہ ظرافت کے ثبوت ہیں اور بہت دنوں تک پڑھے جائیں گے —

خالد ضیا کی ناولوں کے بعد سب سے زیادہ شہرت رشاد نوری نے حاصل کی، اور در حقیقت وہ اس شہرت اور کامیابی کے مستحق بھی ہیں، اس لئے کہ وہ حقیقی معنوں میں قصہ بیان کرنے میں کمال رکھتے ہیں اور ان کی ناولیں ہر حیثیت سے مغربی ناولوں کی ٹکر کی ہیں - انھوں نے اپنی ادبی زندگی ڈراموں کے نقاد کی حیثیت سے شروع کی، اور یورپ کے ڈراموں کی وسیع معلومات حاصل کرنے کے بعد انھوں نے خود بھی بعض کامیاب ڈرامے لکھے جن سے ان کی قدرت فن ظاہر ہوتی تھی - اس کے بعد انھوں نے مغربی ڈراموں کو "اپنانا" شروع کیا، اور احمد وفیق پاشا کے زمانے سے، جس نے مولی یر کے ناٹکوں کو اپنایا تھا، یہ چیز ترکوں میں بہت مقبول تھی - ڈراموں سے حقیقت میں اور اصناف ادبیات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مالی منفعت ہوتی ہے اور چونکہ ترکی عہد نامہ برن (Berne) میں شریک نہیں ہوا تھا، اس لئے ہر یورپی ناٹک کا بغیر کسی معاوضہ یا حق تصنیف کے ادا کئے ہوے، ترکی میں ترجمہ کیا جا سکتا تھا - رشاد نوری کی سب سے پہلی ناول "چالی کوشو" تھی جس میں ایک

خود سر لڑکی کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو عین شادی کے دن، اپنے منگیتر سے عقد کرنے سے انکار کردیتی ہے، اس لئے کہ اسے یہ خبر مل جاتی ہے کہ شادی سے پہلے یہ شخص کھل کھیل چکا ہے، اس کے بعد وہ ایشیاے کوچک میں اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہے جہاں اسے کئی حادثات درپیش آتے ہیں، بالآخر واپس آکر وہ اپنے منگیتر کو معاف کردیتی اور اسی سے شادی کرلیتی ہے۔ اس ناول کا موضوع، جو چھ سو صفحات میں بیان کیا گیا ہے، سیدھا سادھا ہے، اور فن کی حیثیت سے اس میں کئی خامیاں نکالی جاسکتی ہیں، لیکن اس کے باوجود قصہ اس قدر دلکش اور دلچسپ ہے کہ پڑھنے والا اسے ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ ناول سرتاپا ترکی ہے اور قارئین نے اسے دل سے پسند کیا ہے۔ مصنف ہمیشہ کوئی نہ کوئی مثالی واقعہ بیان کرتا ہے جو ناول کے موضوع کی بنیاد ہوتا ہے —

اس کی ایک اور ناول (دو دکتن کلبہ) " از لب تا دل " ہے اور اس میں بھی ایک مرکزی واقعہ ہے جسے ناول میں پھیلا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس کا غم انگیز اور کسی قدر مایوسانہ لب ولہجہ ترکی مزاج کی سچی تصویر ہے، اس لئے کہ یہ فوجی قوم باطن میں غمگین اور ملول ہے اور رقیق جذبات سے متاثر ہوتی ہے۔ اس میں ایک مغنی اور ایک لڑکی کی داستان حسن و عشق بیان کی گئی ہے۔ لڑکی، اس وقت سے جب کہ اس کا عاشق پہلا بوسہ محبت لیتا ہے، آخر تک بدنصیبی اور رسوائی کے باجود اپنی وفا پر مستقل رہتی ہے، لیکن مغنی کو اپنی دنیاوی کامیابی سے کسی قسم کی مسرت حاصل نہیں ہوتی اور وہ اپنی پہلی محبوبہ کی طرف پھر رجوع کرتا ہے، لیکن بہت بعد از وقت۔ قصہ کی تان خود کشی پر ٹوٹتی ہے —

دیہات کی فضا کا بیان، دلکش انا طولیہ کی لفظی تصویریں، اس کی

بہار کی نگہتیں اور خزاں کی رنگینیاں ' هیروئن کے گہرے اور سچے جذبات ' انسانی جذبات نفرت و غصہ کا تلاطم - انسانوں کا زندگی کی بھول بھلیاں میں مایوس اور ناکام بھٹکتے پھرنا ' ان سب باتوں کا بیان اتنا تمثیلی ' حقیقی اور ساتھہ هی پر لطف هے کہ پڑھنے والا بے اختیار تعریف کرتا هے - سینما کی تصویر بنانے کے لئے یہ قصہ نہایت مناسب اور موزوں هے - حال میں رشاد نوری کا ایک اور قصہ " دمغہ " (داغی) نکلا هے ' جس کا ماحصل یہ افسوس ناک حقیقت هے کہ معاشرتی زندگی میں نمود اور نمائش حقیقت اور صداقت سے زیادہ موثر هوا کرتی هے ' اور هیرو کو ' جس نے اپنی هر چیز حتی کہ عزت تک کو اپنی محبوبہ کے لئے قربان کردیا هے ' آخر میں هر طرف سے ' اور خود معشوقہ کی طرف سے بھی دھتکار هی ملتی هے - اس ناول میں انقلاب کے زمانے کا قصہ بیان کیا گیا هے اور اس سے نو جوان ترکوں کی تحریک ' ان کی امنگوں اور ناکامیوں پر بھی اچھی روشنی پڑتی هے - اس کے بعض ابواب میں زمانہ جنگ کے مصیبت ناک واقعات کی تصویر بھی دکھائی گئی هے —

ادھم عزت کی ناول " شادراں کاون " (مجنونہ) حقیقی معنوں میں افسانۂ جنگ هے ' جس میں کمال حقیقت نگاری کے ساتھہ ترکی کے مصائب جنگ ' لڑائی کی ناقابل بیان تکلیفیں ' اور اس کی حماقتوں کا ذکر کیا گیا هے - قصہ یہ هے کہ ایک ترکی جنرل در دانیال میں داد شجاعت دیتا هے - لیکن گھر میں ' اس کی بیوی اس سے بے وفائی کرکے اس کے ایڈی کانگ کے ساتھہ عشق بازی کرتی هے - انجام یہ هوتا هے کہ پاشا خودکشی کرلیتا هے ' اور اس کی بیوی ان مجنونانہ عیش پرستیوں اور هوسناکیوں میں مبتلا هوجاتی هے جس نے اختتام جنگ پر قسطنطنیہ کو تہ و بالا کردیا

تھا ' بالآخر کئی حادثات اور معاشقوں کے بعد وہ ادنی ترین کردار پر اتر آتی ہے ' اور پاگل ہوجاتی ہے - اس ناول کا طرز بیان اخباری ناولوں کی طرح سیدھا سادہا ہے ' اور اس میں بہت چھوٹے چھوٹے جملے لکھے گئے ہیں - یہ بھی رشادنوری کی ناولوں کی ایک خصوصیت ہے - التواے جنگ کے دوران میں قسطنطنیہ کی جو کچھہ معاشرتی حالت رہی اس کے متعلق آئندہ یہ کتاب ایک تاریخی ماخذ کا حکم رکھے گی - اس کے علاوہ ادھم عزت نے بعض دلکش مختصر افسانے بھی لکھے ہیں' جن میں ترکی کی موجودہ زمانہ کی بے فکریوں کی سچی تصویر کھینچی ہے —

روشن اشرت کی تصنیف " دییور لرکی " (" لوگ کہتے ہیں یا " سی گویند ") میں ادبی زندگی' اور مصنفین کی سیرت کا سچا سچا حال لکھا گیا ہے' اور اس میں مصنفین سے ان کی تصانیف کے متعلق گفتگو بیان کی گئی ہے' اس کتاب کا طرز تحریر کسی قدر تصنع لئے ہوے ہے' لیکن یہ مصنفوں کا اچھا خاصہ مرقع ہے - ارجمند اکرم نے بھی جو مشہور استاد اکرم کا بیٹا ہے' بعض حقیقت آمیز اور پڑھنے کے قابل ناولیں لکھی ہیں' جو وطن پرستی کے جذبہ سے مملوء ہیں' اور سیرت نگاری کا کمال ان میں پایا جاتا ہے - اس کی ناول کان و ایمان (خون اور ایمان) میں ان ترکی خواتین کی جانبازی اور ایثار کو دکھایا گیا ہے جنھوں نے اپنے بہادر شوہروں کے دوش بدوش مصطفی کمال کے جھنڈے کے نیچے لڑکر حق رفاقت ادا کیا - اس کی ناول " گیون بتوکن " (قریب غروب) ایک معاشرتی افسانہ ہے' جس میں استادانہ انداز سے یونانیوں کی زندگی اور ایماندار اور راست کردار مسلمانوں پر ان کے طرز عمل کے پست کن اثرات کو بیان کیا گیا ہے اور اس دلخراش واقعہ کی تفصیل دی گئی ہے - اس میں ایک اخلاقی

سبق بھی دیا گیا ہے - مسلمان ہیرو جو فلاکت زدہ' سفلہ مزاج اور غدار ہوگیا تھا ' سنبھل جاتا ہے' اور پھر حب وطن کی قدیمی روایات پر مستقل ہوجاتا ہے' اور اپنی بیوی کے پاس واپس آکر از سر نو نیکی اور سچائی کی زندگی بسر کرتا ہے - زمانہ جنگ میں قسطنطنیہ کی حالت' دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو لوٹنے والے سوداگروں کی دنایت' سڑکوں پر فاقہ زدہ بچوں کا پڑا رہنا ' زخمیوں کے اترے ہوے چہرے اور دھنسی ہوئی آنکھیں'—— ان سب چیزوں کے نقش اس نے کچھ ایسے حقیقت نگاری کے موقلم سے اتارے ہیں کہ اس ناول کی حیثیت آئندہ ایک تاریخی ماخذ کی سی ہو جاے گی - یہ ناول' یقیناً کان و ایمان سے بڑھی ہوئی ہے - اس کی ایک کتاب اولیاے جدید ہے' جو اولیاے چلبی کے سیاحت نامہ کی مزاحیہ نقل ہے' اس کا منظر قسطنطنیہ ہے' اور اس میں نئی نئی اختراعات اور بود و باش کے نئے نئے طریقوں کا خاکہ اڑایا گیا ہے ——

ترکی ادبیات کے دور جدید میں نئے شاعر بھی پیدا ہوے ہیں - ان میں ہماری راے میں اولیت کا شرف رضا توفیق کو حاصل ہے جو بہ حیثیت فلسفی' مورخ' سیاست داں اور اعلی تعلیم و تہذیب یافتہ شخص کے شاعری کے میدان کا دھنی ہے اور اس کی شہرت پائدار ثابت ہوگی - وہ ترکی میں اپنے زمانہ کا جید ترین عالم تسلیم کیا جاتا تھا' اور فن خطابت میں تو وہ لا جواب تھا - یورپی السنہ اور ادبیات کی جو گہری واقفیت اسے تھی' اس کے اعتبار سے وہ عالمانہ زندگی کے لئے نہایت موزوں تھا ' لیکن سیاسی انقلابات نے اس میں خلل ڈال دیا - اس نے بکتاشیوں کے گیتوں کے حسن کو اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا اور انھی کے رنگ میں' بزم جم کے عنوان سے اس نے کئی رندانہ گیت لکھے ہیں' جن میں اپنے فطری رنگ تغزل کو دکھانے کا اسے خوب موقع ملا ہے ——

مذہبی احساسات کو نظم کا جامہ پہنانے والا محمد عاقف تھا، جو شاعر ہونے کے علاوہ واعظ اور عمرانیات پر بعض کتابوں کا مصنف بھی ہے۔ وہ گلی کوچوں کے قہوہ خانوں میں جاکر وہاں کے بے فکروں سے گفتگو کیا کرتا تھا ۔ اس نے آوارہ گردوں اور خانہ بدوشوں کی زبان سے ان کے قصے سنے ہیں ۔ اس کے حساس دل و دماغ پر ان مفلوک‌الحال اور ادنی درجہ کے لوگوں کے مصائب اور آلام کا بہت گہرا اثر پڑا ، اور اس نے گویا اپنے موسیقیت سے بھرے ہوے اور پر تاثیر اشعار میں ان کی دل ہلا دینے والی فریاد کے چربے اتار کر رکھدئے ہیں ۔ اس کو ترکی معاشرت کی اصلاح کی دھن تھی ، وہ چاہتا تھا کہ ترکوں میں ان کی خامیوں اور پستیوں کا احساس پیدا کردے ۔ حسین رحمی نے جو خدمت اپنی ناولوں کے ذریعہ ، احمد راسم نے اپنے مضامین سے اور ایک جری ناشر کتب ابراہیم حلمی نے اپنی کتابوں کی مدد سے انجام دی وہی کام عاقف نے اپنی شاعری کے ذریعہ کیا ۔ اس نے قومی تحریک کے خلاف اس حیثیت سے کہ وہ اسلام خواہی کی تحریک کے منافی تھی ، نہایت گہرے مذہبی احساسات کے ساتھہ اور پاکیزہ ترکی زبان میں مضامین لکھے ہیں ۔ اس نے کمال جسارت کے ساتھہ اور علی‌الاعلان اپنے اشعار میں ترکوں کے زوال کا ماتم کیا ہے ، اور اس کی علت فائی احکام مذہب سے بیگانگی اور سچے جذبات ایمانی سے انحراف کو قرار دیا ہے ۔ اگرچہ اس کے دلائل نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوے ، تاہم اس کی شاعری نے قارئین کے قلوب کو ضرور مسخر اور مسحور کیا اور خان سیفی نے بھی ، دوسرے جدت پسندوں کی طرح ، قدیم عروض کو چھوڑ کر ، محمد امین کی طرح بول گننے کا طریقہ اختیار کیا ۔ لیکن اگر پہلے یہ ساز اکتارہ تھا ، تو اب ساز صدرنگ بن گیا ، جذبات وہی

پرانے تھے ' لیکن الفاظ اور طرز ادا نئی اور دلکش تھی - اس کی کتاب " گیونیولوں سسلر " (دل کی آوازیں) آج ترکی شاعری میں ایک قابل تقلید نمونہ سمجھی جاتی ہے ——

یوسف ضیا نے ' جو ایک نہایت قابل اور پرگو شاعر تھا ' لڑائی کے متعلق نظمیں لکھیں ' جن میں زمانۂ جنگ کی تصویریں کھینچی گئی ہیں - اس کی نظمیں " اکندن اکینہ " (طوفان پر طوفان) " شاعرن دعاسی " (شاعر کی دعا) پرجوش اور وطن پرستی کے جذبات سے لبریز ہیں - اس نے منظوم ڈرامے بھی تصنیف کئے ہیں - اس کی زبان اگرچہ کٹھی ہوئی ہوتی ہے ' لیکن مطلب میں کسی قسم کا کنجلک نہیں ہوتا - انیس بیہج کی نظموں میں ہمیں ترکی زبان کی موسیقیت کا تموج نظر آتا ہے - " ترک اوجاغی " کے جلسہ میں اس نے جس درد بھرے انداز سے اپنی نظم " سواری او " (سوار) سنائی تھی اس کی گونج میرے کانوں میں آج تک باقی ہے ' یہ نظم جذبات کی گرمی ' جوش اور موسیقیت سے بھری ہوئی ہے - بیہج کی شاعری میں رقیت پسندی کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا ——

عالی جانب نے رنگ تغزل چھوڑ کر ' فرانسیسی ادبیات کا رنگ اختیار کرلیا ہے - خالد فخری ترکی کا یاسیہ شاعر ہے - فاروق نافذ نے بول گننے میں کمال حاصل کیا ہے ' فرانسیسی عروض کے متعلق اس کی واقفیت بہت گہری ہے اور وہ اپنے موضوع کے مناسب حال بحروں کا استعمال خوب کرتا ہے - ناظم حکمت ترکی سے روس کی طرف فرار ہوگیا ہے ' اب وہ بالشویک ہے اور کسی فرضی نام سے ترکی رسالوں میں اپنی نظمیں بھیجتا رہتا ہے - ان نظموں کی بحریں غیر معمولی طور پر چھوٹی ہوتی ہیں اور اکثر تو ایک پورے مصرعہ میں صرف ایک لفظ ہی ہوتا ہے ' تاہم یہ فجائیہ طرز

بھی حسن سے خالی نہیں ہے —

ترکی کی ادبیات شعر' خواہ آج کل اس کے اوزان' اصناف اور موضوع دوسرے ہوگئے ہوں' پھر بھی کئی حیثیتوں سے قدیم شعر و شاعری کا ایک سلسلہ ہی ہے' لیکن تمثیلی ادبیات' ڈراما وغیرہ اسلامی ممالک میں ابھی بہت قریبی زمانے سے نظر آنے لگی ہے - ترکی کی عامیانہ ادبیات میں " اورتا اوینو " بہت قدیم زمانے سے نظر آتے ہیں جو یونانیوں اور چینی ناٹکوں سے لئے گئے تھے' لیکن ان تماشوں کو صرف مرد ہی دیکھہ سکتے تھے اور ان کی زبان کرخت' لیکن خالص ترکی ہوا کرتی تھی' اس لئے کہ وہ جہلاء کے لئے لکھے جاتے تھے - آج کل کا ترکی ڈراما اس قدیم ڈرامے کی ترقی یافتہ شکل نہیں ہے بلکہ اس میں یورپی ناٹکوں کو ترکی رنگ میں پیش کیا جاتا ہے - اس حیثیت سے جدید ترکی ڈراما ایک غیر ملکی چیز ہے' اور عورتوں کے پارٹ نہ کرنے کی وجہ سے اس کی حیثیت ابھی قومی نہیں ہوئی ہے - کمال اور عبدالحق حامد کے ڈرامے کھیلے جانے کے لئے موزوں نہیں ہیں - پس سب سے آسان صورت یہی تھی کہ فرانسیسی ناٹکوں کو ترکی ماحول میں پیش کیا جاے - اسی سے رفتہ رفتہ اصل اور اوریجنل ڈرامے لکھنے کا خیال ترکوں میں پیدا ہوا - ترکی معاشرت کے احیاء پر ترکی اسٹیج کا اثر آئندہ بہت زیادہ پڑنے والا ہے' اس لئے کہ اور کوئی صنف ادبیات اجتماعی حیثیت سے جمہور پر اتنا زیادہ اثر نہیں ڈال سکتی جتنا کہ ناٹکوں کا ہوتا ہے - لیکن اس میں ادبی اہمیت اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب کہ پہلے ایکٹروں اور منیجروں کی ایک پوری تیار ہوجاے اور ناٹک میں فن کی حیثیت پیدا ہوجاے - ترکی ڈراموں میں ابھی ان چیزوں کی کمی ہے - سلطان عبدالحمید کے زمانے میں کسی

ناٹک کے کھیلے جانے کی اجازت نہ تھی اور اسی لئے کسی مصنف نے اسٹیج کے خیال سے ڈرامے تصنیف نہیں کئے - دور جدید کے آغاز سے ترکی ڈرامے نے بھی اپنی نئی زندگی شروع کی ہے' اور اگرچہ زیادہ تر ناٹک غیر زبانوں سے ماخوذ ہیں' تاہم کچھہ اوریجنل ڈرامے بھی آج کل کھیلے جاتے ہیں' اگرچہ اب تک ان میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی ہے —

ڈرامے کے فن سے ملتا جلتا خطابت کا فن ہے - تاریخ اسلام کی طرح' ترکی تاریخ میں بھی فن خطابت زیادہ تر مذہب کا آفریدہ تھا . آنحضرت صلعم کے خطبہ عرفات سے آج تک ہزاروں مسجدوں میں ہر جمعہ کو جماعتیں خطبے سنتی ہیں - تاریخ اسلام کی پہلی صدی میں ان خطبوں میں پرزور' فصیح' اور مدلل بحثیں کی جاتی تھیں' لیکن بعد کو ان پر حالت جمود طاری ہوگئی اور ان کی خصوصیت امتیازی غائب ہوگئی - ترکی میں ویسے تو بعض سلاطین اور قائدین وقت فوج یا باغی جانڈ'ریوں کے سامنے تقریریں کرتے تھے' یا بعض درویش آج کل کے زعماء کے رنگ کی تقریریں کیا کرتے تھے' لیکن اصل میں فن خطابت مشرق میں دستوری حکومت کے ساتھہ داخل ہوا' اور انقلاب کے زمانوں میں " سوقیانہ " مقرروں کو جادو بیانی کے خوب موقع ملے - ترکوں کے تیز اور بے چین مزاجوں کو یہ نئی صنف ادبیات بہت کچھہ پسند آئی اور بعض بلند پایہ خطیب مثلاً عمر ناجی اور حمداللہ صبحی اور آج کل کے زمانے میں صدر جمہوریہ ترکی غازی مصطفی کمال پاشا پیدا ہوے' جن کی تقریر مسلسل پانچ روز تک جاری رہی اور اس میں انھوں نے انقلاب اور اس کے بعد کی فوجی کامیابیوں کی مکمل تاریخ بیان کر دی تھی' یہ تقریر فن خطابت میں ایک بالکل نئی چیز ہے —

ایک اور جدید اور تہذیب سے ترقی کرنے والی صنف ادبیات ظریفانہ صحافت ہے جس کے نمونے ترکی کے ظریفانہ رسالوں اور اخباروں میں آج کل نظر آتے ہیں، اور جن میں آج کل کی زندگی کے مضحکہ خیز اجزا کو دکھایا جاتا ہے، اس صنف ادبیات کی طرف سے آئندہ کامیابی کی بڑی بڑی امیدیں ہیں، اس لئے کہ ترکی مزاج اس کے لئے خاص طور پر موزوں ہے —

لیکن سب سے زیادہ ترقی کے آثار ہمیں ترکی علمیت میں نظر آتے ہیں۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ آج سے پچاس سال پہلے ترکی میں علمیت کا فقدان تھا، اور کوئی ترکی تاریخ یا تاریخ ادبی، یا تاریخ مذہبی یا سوانح عمری علمی اصولوں پر نہیں لکھی گئی تھی۔ تاریخ کی کتابیں زیادہ تر تالیفات ہوا کرتی تھیں اور ان میں کسی قسم کی سنجیدہ اور وقیع تحقیق نظر نہ آتی تھی۔ لیکن انجمن تاریخ کے قیام کے بعد سے یہ حالت بدل گئی۔ نجیب عاصم جیسے علماء نے جنھیں یورپی لسانیات پر عبور حاصل تھا، ترکوں کی قدیم تاریخ کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں پیش کیا۔ نجیب عاصم کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ آج کل اس صنف میں ترکوں نے کس قدر ترقی کرلی ہے۔ عثمانی شاہیت یا عہد سلاطین کے بہترین مورخ احمد رفیق ہیں، جنھوں نے قدیم مآخذ کی تلاش اور تحقیق کی ہے اور ترکی تاریخ کے مخصوص دوروں کے متعلق تصنیفیں کی ہیں، تاریخ تمدن پر روشنی ڈالنے والے کاغذات اور ماخذ کے علمی اصولوں پر طباعت احمد رفیق ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے —

تاریخ ادبیات کا کام سب سے پہلے عبدالحلیم ممدوح نے اپنی ایک مختصر تصنیف سے شروع کیا، جن میں تاریخی حالات کے علاوہ قارئین کے

لئے کچھہ انتخابات کلام بھی شریک کئے گئے تھے - جدید مصنفین کی جدت پسندیوں پر جو تنقیدیں ہوئیں ان کی وجہ سے بھی ادبیات پر کئی کتابیں لکھی گئیں - یہ کتابیں ان پرانے تذکروں سے بہت مختلف تھیں جن میں صرف چند سطروں میں شاعر کا حال اور اس کی تصانیف کا ذکر کردیا جاتا تھا - جو ترک طلبہ فرانس میں زیر تعلیم تھے - وہ جب اپنے وطن واپس آے تو انھوں نے بہت جوش و خروش سے کام شروع کیا اور جمالیاتي (Aesthetic) نقطہ نگاہ سے ترکی تصانیف پر تنقیدیں لکھیں - ان سے بحث و مباحثہ کا جو بازار گرم ہوا ' وہ ادبی حیثیت سے بہت کچھہ نتیجہ خیز اور بار آور ثابت ہوا - علی کمال نے اپنی تصنیف " ادبیات حقیقیہ " میں یہ بحث کی ہے کہ ادبی تصانیف میں حقیقت اور تخیل کی آمیزش ضروری ہے ' اور ادبیات کو انسانی زندگی کے ہر پہلو کا آئینہ ہونا چاہیے - اس نے ترکی مصنفوں پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ صرف اپنے تخیل کے غلام بن گئے ہیں اور انکا مدعا صرف چیدہ چیدہ نمونوں کی نقل اُتارنا رہا ہے - اس نے ترکی ادبیات پر بہت سخت تنقیدیں کی ہیں اور اسے صرف مہمل اور بے معنی قوافی کا مجموعہ کہا ہے —

رئیف نجدت کی تصنیفیں " حسر و فکرلر " (حسیات و افکار) اور " حیات ادبیہ " ایک سلسلہ مضامین ہیں ' ان مقالات میں مصنف نے یورپی مذہب ادبیات کی حمایت کی ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ ادبیات میں معاشرتی رجحانات کا دخل ضرور ہونا چاہئیے اور زمانۂ قدیم کی طرح اسے محض " فن لطیف " نہیں ہونا چاہئیے - وہ روسو اور ٹالسٹاے کے مداح ہیں ' ان کا خیال ہے کے ادبیات کو جمہور کا مدرسہ سمجھنا چاہئیے اور مصنفوں کو اخلاقی نصب العین پیش نظر رکھنا چاہئیے - ترکی کی

غزلیه شاعری کے متعلق ان کی راے ھے که اس میں کوئی خوبی نہیں پائی جاتی —

حسین جاھد بھی جدید یوروپی مذھب ادبیات کے پر جوش حامی ھیں انھوں نے " گو کلاوم " (میری جد و جہد) کے عنوانات سے تنقیدی مقالات کا ایک سلسله شایع کیا ھے - وہ ایک نہایت بلند پایه نقاد ھیں ' اگرچه ان کی تنقیدیں کہیں کہیں بہت سخت ھو جاتی ھیں ' انھوں نے علی کمال اور دوسرے مصنفوں پر حملے کئے ھیں - وہ ادبیات میں عربی رنگ کے سخت مخالف ھیں اور ان کا خیال ھے کے آج کل کے لحاظ سے عربی اور فارسی تہذیبوں میں مطلق جان نہیں پائی جاتی —

جن مصنفین نے نئی ترکی زبان (جسے پست اور زوال پذیر کہا جاتا ھے) لکھی ھے ' ان کے وہ مدام ھیں اور احمد مدحت ناول نویس اور سامی ماھر لسانیات ' یہه دونوں بھی اس بارے میں ان کے ھم خیال ھیں - انھوں نے ترکی ھجاء سے بحث کی ھے اور اس پر زور دیا ھے کے صوتی تحریر کے اصولوں پر عربی حروف تہجی میں اصلاح کرنی چاھئے لیکن اس بارے میں وہ پھر بھی انور پاشا سے پیچھے ھیں جنھوں نے سالم اور منفرد حروف سے الفاظ بنانے کا ایک نیا ھی طریقه نکالا تھا —

ان مقالات اور تصانیف سے معلوم ھوتا ھے ترکی جمہور کو ادبی تنقید میں کتنی دلچسپی تھی ' اور اگرچه آج بھی کتب فروشوں کی الماریوں میں ھمیں بکثرت ادنیٰ درجه کی اور بد مذاقی سے لکھی ھوئی ناولوں اور قصوں کا انبار نظر آتا ھے ' لیکن اب فنی اور ادبی علوم سے ترکوں کو روز بروز زیادہ شغف ھوتا جاتا ھے —

ادبیات کی علمی اصولوں پر تحقیق سب سے پہلے برو سلی محمد طاھر نے شروع کی ' ان کی تصنیف " عثمان لی مولف لری " (عثمانی مصنفین)

سے ' قدیم مصنفین کے متعلق ان کی وسیع معلومات کا اندازہ ہوتا ہے - وہ ایک بلند پایہ عالم تھے - اور انہوں نے بہت جلد ادبی تنقید کا ایک خاص نہج ڈال دیا اور اہم تحقیقی کام کیا - کپو پرولیو زادہ محمد اد نے ' جو ایک اسیر خاندان کے رکن تھے ' متعدد قابل قدر کتابیں لکھی ہیں ' مثلاً " بوگھوفیکو ادبیات " (ادبیات جدید) ' جس میں انہوں نے ترقی پسند جماعت کی تائید کی ہے ' علی ہذا انہوں نے ترکی تصوف کے پرانے آثار بھی ڈھونڈھ نکالے اور اسے ایک نہایت ہی دقیق النظر ' اور عالمانہ کتاب " تورک ادبیات الک متصوفلر " (ترکی ادبیات کے اولین متصوفین) میں پیش کیا - اس کے علاوہ انہوں نے ترکی کی بعض کلاسک کتابیں بھی اپنے بیش قدر حواشی کے ساتھہ مرتب کیں '

اسمعیل حبیب کی زبردست تصنیف " ترک تجدد ادبیات تا رھی " (تجدد ادبیات ترکی) اپنے طرز کی پہلی باقاعدہ اور تنقیدی تصنیف ہے جس میں متعدد نمونوں اور حواشی کے ساتھہ گزشتہ صدی کے ترکی ادب کی تنقیدی تاریخ بیان کی گئی ہے - ان کی فاضلانہ تشریح و توضیح و ترتیب سواد سے میں نے بھی بہت کچھہ استفادہ کیا ہے - دینیات کے شعبہ کے متعلق اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ جب سے قدیم مدرسوں کی تعلیم کے بجاے جامعات کی منضبط تعلیم کا رواج ہوا ہے ' اس شعبہ میں بھی بہت کچھہ ترقیاں ہوئی ہیں - تاریخ فنون میں بھی نئی ترقی نظر آتی ہے ' اور اس کے آثار بہت اچھے نظر آرہے ہیں - جلال اسد کی تصنیف " تورک صنعتی " (ترکوں کے فنون) اس کی مثال ہے —

سیاسی اور معاشرتی اصلاحات کے بعد سے ' اصول قانون ' سیاسیات اور معاشیات کے شعبوں میں بھی قابل تعریف ترقی اور اضافہ ہوا ہے '

اور عصر ماحاضر کے ترکی ادبیات کے ذخیرہ میں آج ھمیں ھر جدید علم پر ترکی مصنفین کی تصنیفیں نظر آتی ھیں —

دنیا نے اس خبر کو بہت حیرت کے ساتھہ سنا تھا کہ ترکی رسم الخط میں بھی اصلاحات ھوئي تھیں اور عربی حروف کی بجاے لاطینی حروف کا استعمال شروع ھوا ھے یہ بدعت موجودہ زمانہ کے ترکی رجحانات کا عین اقتضاء ھیں - اس میں شک نہیں کہ ابتداء میں اس تبدیلی نے سب کو حیرت میں ڈال دیا تھا ' لیکن آج کل وہ بغیر کسی رکاوٹ کے کام دے رھی ھے ' اور اگرچہ اس کي وجہ سے نئی پود کو قدیم ادبیات کی واقفیت نہ ھوسکے گی اور آئندہ نسلوں کے لئے پرانے ادب کي لطافتیں ناقابل فہم ھوجائیں گی تاھم نئے ادب کے نشو ونما میں اس سے کسی قسم کا خلل نہیں پڑے گا ' صرف شرط یہ ھے کہ بلند پایہ مصنفین پیدا ھوتے رھیں - اتنا بھرحال یقینی ھے کہ" اصلاح رسم الخط سے ترکی تہذیب و تمدن کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ھوتا ھے —

تاریخ ادبیات ترکی کے اس خلاصہ کو میں بغیر اس امر کا اظہار کئے ھوے ختم نہیں کرسکتا کہ ادب صرف مصنفین ھی کی وجہ سے پیدا نہیں ھوتا ، اس ادب کی پڑھنے والی جمہور اور پبلک ھوتي ھے ' جو اسے مختلف طریقوں سے پڑھتی ھے - قارئین کی سند قبولیت اگر نہ ھو' تو مصنفین کی ذھانت اور ذکاوت سب نقش برآب ثابت ھوتی ھے . ھماری یہ آرزو اور دعا ھے کہ خدا کرے کہ پرانے مشاھیر مصنفین ترکی کی روایات سے پوری قوم میں ایک ایسی نئی اور اعلیٰ روح پیدا ھوجاے جو ایک قومی ترکی تہذیب و تمدن کی تشکیل مضبوط بنیادوں پر کردے —

-)‡o‡(-

یورپ میں دکھنی مخطوطات

پر ایک تنقیدی نظر

از

مولوی شیخ چاند صاحب ' ایم اے ؛ ایل ایل - بی '
ری سرچ سکالر عثمانیہ یونیورسٹی

گذشتہ پندرہ برس سے لوگوں کو قدیم اردو ادب سے خاص دلچسپی ہوگئی ہے خصوصاً قدیم دکھنی زبان کے متعلق جو کام ہوا ہے وہ ہر طرح غنیمت ہے زبان و ادب کی تحقیقات میں مختلف حیثیتوں اور قابلیتوں کے اہل قلم لگے ہوے ہیں - بعض برسوں کی کد و کاوش اور مسلسل محنت و سعی کے بعد کچھہ لکھنے اور پیش کرنے کی جرات کرتے ہیں اور خاص علمی انداز میں اپنے نتائج پیش کرتے ہیں ' بعض جس طرح ممکن ہوا عجلت میں ضخیم ضخیم کتابیں لکھتے اور شایع کرتے ہیں اور شہرت کی دھن میں بے کھٹکے ادبیات کے وسیع میدان میں اُتر آتے ہیں ' اور بعض دوسروں کی محنتوں سے فایدہ اٹھاتے ہیں اور اس کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ گویا یہ ان کی ذاتی تحقیق و تدقیق کا نتیجہ ہے —

زبان و ادب کی تحقیق کے لئے بڑے وسیع مطالعہ ' گہری تنقیدی نظر اور خاص علمی قابلیت کی ضرورت ہے - ہندوستان کے وسیع و عریض رقبے میں چند ہی صاحب نظر ایسے ہیں جو اس کی صلاحیت رکھتے ہیں ' باقی

نام نہاد ہیں، یہ محققوں اور ادیبوں کی ایک خاص نوع ہے، جس کی خصوصیات کا موضوع ایک زبردست ظرافت نگار قلم کی تراوش کا محتاج ہے۔ کتاب زیر تنقید بھی اسی گروہ کے ایک صاحب قلم کے کمال کا عمدہ نمونہ ہے —

اس میں ان چھوٹی بڑی ۹۹ کتابوں اور ۱۴ مختلف نظموں اور مرثیوں کی تفصیلی فہرست ہے جو یورپ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں - ترتیب فہرست کا ڈھنگ کم و بیش وہی ہے جو یورپ کی فہرست مخطوطات کا ہے۔ کل مخطوطات کو سات مختلف مرکزوں پر ان کے تعلق کی بنا پر تقسیم کیا گیا ہے - پہلے نشان کے تحت قطب شاہی مخطوطات کا ذکر ہے دوسرے پر عادل شاہی کا تیسرے پر دور مغلیہ کا چوتھے پر سدھوت کا پانچویں پر میسور کا، چھٹے پر ارکاٹ کا اور ساتویں پر دور آصفیہ کا - اور آخر میں ایسے مخطوطوں کا ذکر ہے جن کے مصنفوں کے حالات مرتب کو معلوم نہ ہو سکے —

کتاب کے مرتب نصیرالدین ہاشمی صاحب ہیں، جنھوں نے اس سے قبل ایک کتاب " دکن میں اردو " لکھہ کر شایع کی تھی - مولف کی پہلی مشق اور کوشش کا لحاظ کرتے ہوے ارباب نظر نے اس کی قدر کی، اور غالباً سرکار آصفیہ نے بھی اس کی قدر فرمانے میں دریغ نہیں کیا، اور یہ کیا کم احسان ہے کہ مولف " دکن میں اردو " کی درخواست پر اُن کے انگلستان جانے کے اخراجات برداشت کر لئے چنانچہ وہ انگلستان گئے اور وہاں ایک سال تک مختلف کتب خانوں میں دکھنی مخطوطات پر تحقیقی کام کرتے رہے - حیدرآباد واپس آنے کے دو سال بعد انھوں نے اپنی تحقیقات کو کتاب " یورپ میں دکھنی مخطوطات " کی شکل میں طبع کرکے شایع کیا ہے —

اس کے مرتب نصیرالدین ھاشمی صاحب بے شبہ لایق تحسین و مبارک باد ھیں کہ وہ اس قسم کے کاموں کا شوق رکھتے ھیں ' یہی وجہہ ھے کہ انھوں نے خود اپنے صرف سے بڑی تقطیع کے (۷۱۴) صفحوں کی ضخیم کتاب طبع کر کے شایع کی ھے - لایق مرتب سے ھمیں ھمدردی ھے انھوں نے جس موضوع پر اپنے شوق میں قلم اٹھایا ھے وہ ایسا ھے جو زیادہ ھامیت ' وسعت نظر اور قابلیت چاھتا ھے ، یہی وجہ ھے کہ ان سے بہت ھی افسوس ناک غلطیاں سرزد ھوگئی ھیں - مرتب کے شدید شوق کے مقابلے میں ھم ان کو ھرگز کھول کھول کر بیان نہ کرتے اور اس قدر کھری کھری تنقید نہ کرتے جو اس ترقی یافتہ علمی دور میں گوارا نہ ھو ، اگر وہ دکھنی ادب کی صورت کو مسخ و مجروح کر کے نہ دکھاتے اور برخود غلط ھوکر نازیبا ادعاے قابلیت کا اظہار نہ کرتے - مرتب خفا نہ ھوں اگر ان کی خامیاں اور کمزوریاں ذیل کی سطور میں دکھائی جائیں' ھم ان کے شوق کے مداح ھیں' لیکن اس وقت ھم ان دعاوی کی حقیقت روشن کرنا چاھتے ھیں جن کا اظہار مرتب نے بڑے طمطراق سے جابجا صراحتا اور کنایتاً کیا ھے اور اس بے دردی کا راز فاش کرنا چاھتے ھیں جو ھمارے قدیم واجب‌التعظیم اھل قلم کی دماغی پیداوار کے حق میں روا رکھی گئی ھے -

مرتب کی غلطیوں اور کمزوریوں کے تنوع کا نشان وار نہایت مختصر ذکر کیا جاتا ھے' اس کے بعد ان کے ثبوت میں ھم کسی قدر تفصیل سے کام لیں گے-

۱ - مرتب اپنے موضوع کے حدود سے واقف نہیں -

۲ - جن کتابوں پر قلم اٹھایا ھے ان کو پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے

۳ - جو کتابیں پڑھتے ھیں ان سے مطلب کی باتیں چننے سے معذور ھیں -

۴ - مصنفوں وغیرہ کے حالات کی تحقیق میں غلطیاں کی ھیں -

۵ - حوالوں کے لئے تاریخ و تذکرہ اور سوانح و ترجمہ کی کتابیں ان کے پیش نظر

رہی ہیں لیکن ان سے کما حقہ استفادہ نہیں کیا' اور کہیں کیا ہے تو غلطیاں کی ہیں -

۶ - فارسی بلحاظ ضرورت جانتے نہیں' اور اس زبان کی کتابوں کو جن سے اکثر اس کتاب کی ترتیب میں مدد لی ہے صحیح پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر ہیں -

۷ - عروض سے قطعاً ناواقف ہیں جس کے جاننے کی کم از کم اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے ضرورت ہے -

۸ - زبان اور قواعد کی ایسی غلطیاں کی ہیں جو عموماً چھوٹی جماعت کے بچے کرتے ہیں —

۹ - طرز بیان نہایت اکھڑا اکھڑا اور مبتدیانہ ہے اور جو انداز تحریر اس موضوع کے لئے درکار ہے اس سے ان کا قلم بالکل ناآشنا ہے -

۱۰ - جن کتابوں کو پڑھ اور سمجھ نہیں سکے ان پر بڑی آزادی سے تنقیدیں کی ہیں' جو نہایت ناقص اور قیاسی ہیں -

۱۱ - کہیں بے جا طوالت سے کام لیا ہے اور کہیں تفصیل طلب امور کے لئے ایجاز و اختصار پر اکتفا کیا ہے -

۱۲ - جن تحریروں اور مضامین سے مدد لی ہے اس کا اعتراف نہیں کیا اور بغیر حوالے دیے اس انداز میں لکھا ہے کہ گویا ان کی ذاتی تحقیق ہے -

۱۳ - خود ستائی سے کام لیا ہے اور دوسروں کے علمی کارناموں کی بالواسطہ حقارت کی ہے' جو اہل علم کی شان کے منافی ہے -

۱ - مرتب کا مقصد یہ ہے کہ ان مخطوطوں کا ذکر کیا جائے جو دکھنی زبان میں لکھے گئے ہیں - انہوں نے دکھن اور دکھنی کی تعریف نہیں کی و۲ اس کے حدود تعریف سے بالکل ناواقف ہیں یہی وجہ ہے کہ ان سے اس ضمن میں دو قسم کی غلطیاں سرزد ہوگئی ہیں —

(الف) ایسے مخطوطوں کو اس فہرست میں شامل نہیں کیا جو دکھنی زبان میں ہیں۔ مثلاً دیوان ابجدی، محمد اسمعیل خاں ابجدی ارکاٹ میں گزرا ہے، خود مرتب نے اس کے ارکاٹی شاعر ہونے کا اعتراف 'پہلی کتاب کے صفحہ ۴۲۶ پر کیا ہے' اس پر بھی اس کے دیوان کو دکھنی مخطوطوں کی فہرست سے خارج کردیا؛ حالانکہ انڈیا آفس کی فہرست کے نشان ۱۳۷ پر اس کا کسی قدر تفصیلی ذکر ہے'۔ احکام النساء کو بھی جو بعہد ٹیپو سلطان لکھی گئی ہے (انڈیا آفس نشان ۱۷) مرتب نے غیر دکھنی سمجھہ لیا —

(ب) بہت سے ایسے مخطوطوں پر بحث کی ہے جو دکھنی نہیں ہیں ان میں بعض تو ایسے ہیں جو نہ تو دکھنی زبان میں ہیں اور نہ دکھن میں رہ کر کسی غیر دکھنی نے لکھے ہیں، مثلاً:

مرثیہ عارف :

مرتب نے اس کی نسبت لکھا ہے '' چمنستان شعراء میں اس شاعر کا ذکر ہے'' چمنستان شعرا میں عارف تخلص کے دو شاعروں کا ذکر ہے ان میں کوئی بھی دکھن کا نہیں۔ ان میں پہلا اکبر آباد کا ہے دوسرا بلگرام کا۔ (ملاحظہ ہو تذکرہ میر حسن، سرو آزاد، چمنستان شعرا، نکات الشعرا) ۔

مرثیہ تقی :

مرتب نے صرف اس کا تخلص اور اس کے مرثیے کے تین شعر نمونے کے طور دیے ہیں اور اس طرح بغیر حوالہ و سند کے اس کو دکھنی قرار دے دیا ہے؛ حالانکہ تقی شمالی ہند کا وہ مشہور مرثیہ گو ہے جس کی نسبت میر حسن نے لکھا ہے:—

" سید نجیب الطرفین از مرثیہ گویان حضرت ابا عبداللہ الحسین سید محمد " تقی " عرف میر گھاسی، فقیر او را ندیدہ، لیکن اکثر اوصاف آں بزرگوار شنیدہ مولدش

شاہ جہان‌آباد الحال بطرت فرخ‌آباد استقامت دارد"۔ مرتب نے میر حسن کے تذکرہ کو ملاحظہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی' اس کو صرف اپنی ملکیت ظاہر کرنے اور فہرست ماخذات طویل کرنے کی غرض سے اپنے ماخذات کے سلسلہ میں درج کیا ہے۔ اس سے در گزر کیجیئے۔ کیا مرتب تقی کے ذیل کے شعر کو بھی دکھنی سمجھتے ہیں:

کربلا میں شہ کونین کے گھر شادی ہے

کیا اوسی گھر پہ یہ خونریزی و جلادی ہے

اگر یہ دکھنی ہے تو میر سودا اور میر حسن کی تصانیف بھی دکھنی ہیں'۔ اور پھر دکھنی' ریختہ اور اردو کا امتیاز بے معنی ہے۔

جنگ نامہ بھاؤ مرہٹہ و شاہ درانی :

اس مخطوطے کو دکھنی کہنا ستم ظریفی ہے' مرتب کے پاس اس کے دکھنی ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔ نظم کی زبان اور بیان کے تیور صاف بتا رہے ھیں کہ یہ کسی غیر دکھنی قلم کی تراوش ہے :

اس گردش سپہر کا دیکھو یہ کاروبار — کیا کیا کئے ہیں رنگ زمانے نے اختیار

دکھن سے لا جماعت کفار نا بکار — کی بند سلک ہند کی آتے ہیں * ایک بار

بانگ و صلواۃ و گاو کشی علم و اعتبار

جنکو تھا مرہٹا جو کہ آیا تھا یہاں — دلی میں کر عمل ہوا لاہور کو رواں

سب ہندیاں دواب میں' یک تھا نجیب خاں — قائم رہا تھا دین محمد پہ بے گماں

سو دل میں کافروں کے یہی کھہ (؟) رہا تھا خار

یہ وہ اشعار ہیں جن کو مرتب نے خود بطور نمونے کے نقل کیا ہے' اگر وہ زبان و بیان کی خصوصیات سے اس کے دکھنی اور غیر دکھنی ہونے میں امتیاز

* ھیں -

نه کرسکے' تو خود ان اشعار میں دو جگه اشارے هیں' پهلے بند کے تیسرے مصرعے میں لانے کا لفظ اور دوسرے بند کے پهلے مصرعے میں یهاں کا - صاف بتا رهے هیں که اس کا لکهنے والا شمالی هند میں بیٹهه کر لکهه رها هے —

مرثیه غلامی :-

غلامی کے متعلق لکها هے که " کسی تذکرے میں اس کا ذکر نهیں - مگر مولف اردو شه پارے نے تفصیل کے ساتهه ان کا ذکر کیا هے دور آصفیه کا یه بڑا زبردست مرثیه گو تها" غلامی کا دور آصفیه کے دکهنی شعرا میں کیسے شمار هوسکتا هے جب که وه سورت (گجرات) کا باشندہ تها' خود اردو شه پارے کی عبارت سے جس کا مرتب نے حواله دیا هے غلامی کا گجراتی هونا ظاهر هے اردو شه پارے کی عبارت هے " پانچویں مرثیے میں اس کے وطن کا پته چلتا هے کیونکه اس میں اس نے گجرات چهوڑ کر کربلا جانے کی خواهش ظاهر کی هے" غلامی کا ایک مشهور منظوم قصه " تمیم انصاری" هے جس میں اس نے صاف طور سے اپنے وطن کے متعلق لکها هے :

مرا مولود هے در شهر سورت کتی کنبهات میں چند مدت سکونت

غلامی نے خود اپنے مرثیه میں اپنے وطن کا ذکر کیا هے اور اس کا اعتراف اردو شه پارے کے مولف نے بهی کیا هے - مرثیے اور اردو شه پارے مرتب کی نظر سے گزر چکے هیں' اس پر بهی انهوں نے غلامی کو دکهنی قرار دیا -

بهرام گور و حسن بانو' (امین و دولت) :

اس مخطوطے کو مرتب نے کس بنا پر دکهنی قرار دیا ؟ اس کا ان کے پاس کوئی ثبوت نهیں - انهوں نے اس کو ابراهیم عادل شاہ ثانی کے عهد (۹۸۸ تا ۱۰۳۷) کا شاعر بتایا هے - اور قصه ۱۰۵۰ ھ میں لکها گیا هے' جیسا که خود مرتب نے قصے کے ایک شعر کو نقل کرکے دکهایا هے - ایسی صورت میں امین یا دولت عهد ابراهیمی کا شاعر کیوں کر هوسکتا هے - حق یه هے که مرتب زبان کی خصوصیات

سے بالکل ناواقف ہیں یہ کتاب بمبئی میں سنہ ۱۳۰۰ ھ میں چھپ چکی ہے' اور اس کا گجرات میں لکھا جانا مشہور ہے - امین در اصل گجرات کا شاعر تھا مرأۃ سکندری میں اس کا ذکر ہے' اردوے قدیم طبع ثانی میں بھی اس کے حالات درج ہیں—

ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ مرتب قدیم اردو زبان کی خصوصیات اور مختلف صوبوں کی زبانوں کے فروق سے قطعاً لا علم ہیں' وہ اس کو محسوس ھی نہیں کرتے ہیں —

اسی سلسلے میں اس بات کی طرف اشارہ کردینا ضروری ہے کہ مرتب نے بعض ایسے مخطوطوں پر بھی بحث کی ہے جو دکھن میں تو لکھے گئے ہیں لیکن خود ان کے لکھنے والے اپنی زبان کو دکھنی سے ممتاز سمجھتے تھے - یہ مسئلہ کسی قدر اہم ہے' اور اب لوگ قدیم اورنگ آبادی شاعروں اور مصنفوں کے دعوے کو تسلیم کریں یا نہ کریں' لیکن اس قدر حقیقت ہے کہ اورنگ آباد کی زبان دکھن کے بقیہ تمام حصوں سے مختلف تھی اور اب تک اس کے آثار پائے جاتے ہیں -

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اورنگ آباد کی زبان لب ولہجہ اور روز مرہ و محاورہ کے اعتبار سے دکھنی سے مختلف تھی اور خود قدیم اورنگ آبادی مصنفین اپنی زبان کو دکھنی نہیں کہتے تھے تو کیا ایسی حالت میں بھی ہم اورنگ آبادی مخطوطات کو دکھنی کہہ سکتے ہیں - ہمارا خیال ہے کہ ان کو دکھنی زبان میں شمار کرنا غلطی ہے - اورنگ آباد کی زبان اور خصوصاً قدیم زبان دکھن سے اس قدر نہیں ملتی جلتی تھی جتنی کہ دلی کی زبان سے - چنانچہ سراج' عاجز' کے کلام کو پڑھئے اور ان کا مقابلہ آبرو' حاتم وغیرہ کے کلام سے کیجئے' بہت ھی غیر محسوس فرق ہے - اس کے ساتھ ھی اورنگ آبادی مصنفین کے ان بیانات پر نظر رکھنی چاھئے : -

چمنستان شعراء میں شفیق اورنگ آبادی (۱۱۷۵ - ۱۱۷۶ کے درمیان)

نصرتی کے متعلق لکھتا ھے :-

" الفاظش بطور دکھنیاں بر زبانہا گراں می آید" —

عزیزاللہ ھمرنگ اورنگ‌آبادی اپنی تفسیر چراغ ابدی مصنفہ ۱۲۲۹ ھ کے دیباچہ میں لکھتا ھے:

"عرض کرتا ھے ھمرنگ ...... تفسیریں کلام‌اللہ کی زبان عربی اور فارسی میں واقع ھیں اور کم علمی بعض اھل ھند کی دریافت سے معنی ان کے مانع - اگرچہ بعض عزیزوں نے زبان دکھنی ھندی آمیز میں تفسیر جز اخیر کی لکھی ھے لیکن بسبب الفاظ دکھنی، لطف زبان ھندی کا پورا نہیں پاتا اور دل یاروں کا واسطے مطالعہ اوس کے رغبت کم لاتا، اس واسطے خاطر قاصر میں اس فقیر کے آیا کہ تفسیر جز اخیر کی زبان ھندی میں کہ بالفعل اورنگ‌آباد کے لوگوں کا محاورہ ھے لکھے"—

ان بیانات سے صاف ظاھر ھے کہ اورنگ‌آبادی شعرا اور ادبا اپنی زبان کو دکھنی نہیں کہتے تھے، ایسی حالت میں ان کو دکھنی شعرا کی صف میں لا کھڑا کرنا نامناسب ھے - مرتب کی نظر اگر ان بیانات پر نہیں پڑی تھی تو کیا انھوں نے ان کی زبان اور بیان کے انداز کو بھی نہیں پہچانا، معلوم ھوتا ھے کہ وہ معنوی خصوصیات اور لسانی رجحانات کو معلوم کرنے سے مطلق قاصر ھیں، چنانچہ اس لا علمی اور فقدان تمیز کی لپیٹ میں کئی مخطوطے آگئے، اوپر کئی مثالیں دی جاچکی ھیں - ایک اور سن لیجئے —

راگ مالا مصنفہ سیدعبد الولی 'عزلت' کو مرتب نے دکھنی زبان کی نظم سمجھہ لیا ھے ' پہلے تو سوال یہ ھے کہ ' عزلت ' کو مرتب کن وجوہ کی بنا پر

دکھنی قرار دیتے ھیں۔ وہ سورت کے باشندے تھے' اس میں شبہہ نہیں کہ ان کی عمر کا ایک حصہ حیدرآباد میں گزرا ھے لیکن ان پر زیادہ اثر قدیم اورنگ آباد اور دھلی کے شعرا کا ھے' جن کی صحبت میں ان کی عمر کے تقریباً ساٹھہ سال گزرے۔ حیدرآباد وہ اس وقت آئے جب کہ ان کی عمر اور شاعری میں پختگی آچکی تھی اور کسی نئے رجحان کے اثر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اور پھر راگ مالا تو انہوں نے خاص روز مرۂ شاہ جہاں آباد میں لکھی ھے۔ اگر مرتب کتب خانہ آصفیہ کے نسخے کو جس کا حوالہ انہوں نے دیا ھے دیکھنے کی زحمت گوارا فرماتے تو ان کو سر ورق اس کا ثبوت مل جاتا جہاں صاف لفظوں میں لکھا ھے :

"مثنوی راگ مالا بہ زبان ریختہ روز مرۂ شاہ جہاں آباد
از حضرت سید عبدالولی عزلت مدظلہ العالی" —

اس کے علاوہ بدقسمت شاعروں اور مصنفوں کی ایک پوری جماعت ھے جو اس ستم ظریفی کا تختہ مشق بن گئی ھے۔ یہ اس بات کی روشن دلیل ھے کہ مرتب مخطوطوں کی زبان اور بیان کی خصوصیات کو معلوم کرنے اور ان کے معنوی شواھد کا پتہ چلانے کی بہت کم قابلیت رکھتے ھیں' اور نہ اس قسم کی کھکیڑ اٹھانے کی ھمت کرتے ھیں۔ ان کی نظر سطح پر رھتی ھے' تہ تک نہیں جاتی' یہی وجہ ھے کہ جو کتاب ان کو قدیم کاغذ پر اور قدیم سیاھی میں اردو زبان کی نظر آتی ھے وہ فوراً اس پر دکھنی کہہ کر چپکتے ھیں —

۴ — مرتب ان کتابوں کو پڑھ اور سمجھہ نہیں سکے' جن پر انہوں نے بڑی بڑی بحثیں کی ھیں' جو اقتباسات انہوں نے دیے ھیں وہ تمام تر غلط نقل کئے گئے ھیں' اس کی بڑی وجہ یہ ھے کہ مرتب قدیم اردو کی لفظیات حتی کہ رسم خط سے بھی ناواقف ھیں اس مختصر تبصرے میں گنجائش نہیں کہ ان کی

بکثرت مثالیں دی جائیں ، ہر اقتباس میں متعدد غلطیاں ہیں، ہم چند ایسی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں جن سے بڑی اہم اور اصولی غلطیوں کا انکشاف ہوگا—

قصہ ابو شحمہ کے متعلق لکھا ہے:

" اصل قصۂ ابو شحمہ کا مصنف وہ مشہور و معروف امین ہے
جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں تھا اس کا ترجمہ
دوسرے امین نے سلطان ابوالحسن کے زمانے میں کیا ہے - اس
امین کے متعلق ہمیں کچھہ معلومات حاصل نہیں" —

اس دکھنی قصہ کا مترجم اولیا کوئی شاعر تھا، امین نہیں تھا قصہ میں پانچ بار شاعر نے اپنے تخلص کو ظاہر کیا ہے، دو مقام ہیں:

کہ اب سر توں سجدہ میں دھر ' اولیا '
قصہ یو توں جو موزوں کیا

دیکھا سر بسر جوں یو قصہ ہمہ
سرا سر کیا ' اولیا ' ترجمہ

اس غلطی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مرتب نے ذیل کا شعر صحت کے ساتھہ پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی انہوں نے اس طرح نقل کیا ہے :

یو تصنیف نصیحت ہے اللہ کا
کہی سو مدت پائے اللہ کا

اس قصے کے پانچ سے زیادہ نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں، ان سب میں یہ شعر اس طرح ہے: -

او تصنیف تھا نعمت اللہ کا
کہے سو مدد پائے اللہ کا

نعمت کو نصیحت پڑھ لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ غلطی ہوئی ہے۔ مرتب نے یہ کیوں کر معلوم کیا کہ مصنف اور مترجم دونوں کا تخلص امین ہے۔ اس کا کوئی قطعی ثبوت ان کے پاس نہیں، غالباً ذیل کے اس شعر پر جس کو انھوں نے غلط نقل کیا ہے یہ گمان ہوا ہے :—

تخلص انوں کا جو ناسی اہے
یو نامیں تخلص کر امین ہے

یہاں بھی مرتب غلط خوانی اور غلط فہمی کے شکار ہو گئے۔ یہ شعر در اصل اس طرح ہے :—

تخلص اونو کا سو ناسی اہے
یو ناسی تخلص گرامی اہے

مرتب نے جس طرح شعر نقل کیا ہے اس میں گرامی کی بجاے کر امین ہے، قدیم کاتب عموماً یاے معروف کو " ی " اور نون غنہ سے بدل دیتے تھے اور کاف کا صرف ایک ہی مرکز درج کرتے تھے، اس بات کو پیش نظر رکھ کر پڑھئیے تو کر آمین، گرامی ہوا اب مرتب کو خیال کرنا چاہئیے کہ مصنف و مترجم کا تخلص امین ہے یا کچھ اور۔ مرتب نے چند حروف کو دیکھ لیا جن کی صورت " کر امین " بن گئی تھی، اس کے ایک جز امین کو لے لیا اور یہ سمجھ لیا کہ یہی تخلص ہاتھ لگا۔ اس وقت یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ایسا کرنے سے شعر کے کوئی معنی بھی باقی رہتے ہیں یا شاعر نے یوں ہی بے معنی سہمل الفاظ یکے بعد دیگرے رکھ دیے ہیں—

مرتب کی تحقیق میں قصہ ملکۂ مصر کا مصنف سید محمد عاجز ہے، لکھتے ہیں —

"دکن میں عاجز تخلص کے دو شاعر ہوے ہیں ایک مغلیہ عہد میں جن کا نام سید محمد تھا" —

مرتب کو علم نہیں کہ اس نام کے کسی مشہور دکھنی شاعر کا تخلص عاجز نہیں تھا - اور قصہ ملکہ مصر تو عاجز کی تصنیف ہے ہی نہیں - یہ در اصل محمود کی تصنیف ہے جیسا کہ خود اس نے لکھا ہے:

اے محمود اب پیر کا ناوں لے
ختم کر درازی سو اب چھوڑ دے

مرتب نے اس شعر کو اس طرح نقل کیا ہے:

اے محمد داب پیر کا ناوں لے
ختم کر ورازی سوپ چھوڑ دے

مرتب کے نقل کردہ شعر میں 'محمود اب' کی بجاے 'محمد داب' 'درازی' کی بجاے 'ورازی' اور سو اب کی بجاے سوپ ہے - اس غلط نقل سے شعر کا مطلب خبط ہوگیا' دوسرے شاعر کا تخلص بھی معلوم نہ ہوسکا' اور پھر لطف یہ ہے کہ اسی شعر کی بنا پر جس کو وہ صحیح طور سے نہ پڑھ سکے یہ تنقیدی حکم لگایا ہے :

آخری شعر سے شاعر کا نام بھی ظاہر ہوتا ہے اگرچہ مولف اردوے قدیم نے اس کا نام محمد علی لکھا ہے' نہیں معلوم ان کا یہ خیال کس بنا پر ہے کیونکہ مولف صاحب نے اپنے ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے "—

انصاف کی جگہ ہے کہ جو شخص نہ تو صحیح پڑھ سکے اور نہ سمجھ سکے وہ کیوں کر حرف زنی اور لب کشائی کا حق رکھتا ہے :

مقیمی کی "چندر بدن و مہیار" کے متعلق لکھا ہے:

"اس قصہ کی تصنیف لیلی مجنوں کے قصے کو سن کر کی گئی ھے" -
"مقیمی نے اس امر کو صراحت صاف طور پر نہیں کی ھے کہ لیلی مجنوں کا قصہ جس کو دیکھہ کر اس نے اپنی تصنیف کی ھے کس کا طبع زاد تھا" —

اس خیال کی تائید میں مرتب نے مقیمی کا یہ شعر نقل کیا ھے:

قصہ مجھہ پرت کا کہا ٹیک ان
جو بسرے تو، لیلی و مجنوں کوں سن

مرتب اس شعر کو بالکل نہیں سمجھے، اس شعر سے قبل مقیمی نے چند شعر لکھے ھیں جن میں یہ بتایا ھے کہ اس کے دوست نے ایک عشقیہ داستان سنائی اور وہ ایسی کہانی ھے کہ جس کو سن کر تو لیلی مجنوں کے مشہور قصے کو بھول جاے، یہی مدعا اس شعر کا ھے، اس کے بعد پانچ اور شعر اپنے قصے کی تعریف میں لکھے اور چھٹے شعر میں بتایا ھے کہ اس نے نظم میں غواصی کے طرز بیان کا اتباع کیا ھے:

تتبع غواصی کا باندھیا ھوں میں
سخن مختصر ایا ملا کے ساندیا ھوں میں

اس کے چار نسخے ھماری نظر سے گزرے ھیں یہ شعر اسی طرح درج ھے، مرتب نے اس طرح نقل کیا ھے :-

بنا تو غواصی کا باندھا ھوں میں
سخن مختصر ملا کے ساندیا ھوں میں

یا تو یہ مخطوطے کے کاتب کی غلطی ھے یا مرتب نے غلط پڑھا ھے اگر یہ شعر صحیح تسلیم کرلیا جاے تو اس میں " تو " کا لفظ کیا معنی رکھتا ھے۔ مرتب نے اس کو محسوس نہیں کیا - اس کے سوا پوری نظم میں کہیں اس بات کی

طرف اشارہ تک بھی نہیں کہ غواصی نے لیلی مجنوں کی بنا ڈالی تھی ' محض لیلی مجنوں اور غواصی کے نام ایک نظم میں آجانے سے یہ نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے —

اسی طرح مرتب نے ملک خوشنود کے متعلق لکھا ہے " یوسف زلیخا اس کی پہلی تصنیف تھی جو ناپید ہے ' ھشت بہشت دوسری تصنیف ہے اس میں اپنی پہلی تصنیف کا ذکر کیا ہے " اس کتاب میں ملک خوشنود نے کہیں ذکر نہیں کیا اور نہ مرتب نے بتایا کہ کس مقام پر ذکر کیا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ مرتب کی نظر سے کہیں یوسف زلیخا کے الفاظ گزرے ہیں اسی بنا پر یہ فرض کرلیا ' اِس مثنوی میں کل (۳۲۲۵) اشعار ہیں مرتب کی نظر سے جو نسخہ گزرا ہے اس میں کل ایک ہزار شعر ہیں مکمل نسخہ میں کہیں یوسف زلیخا کا ذکر نہیں —

ان مثالوں سے بخوبی روشن ہے کہ قدیم مخطوطوں کی زبان ' رسم خط ' معانی و مطالب ' مرتب کی فہم سے باہر ہیں ' وہ اٹکل پچو نقل کردیتے ہیں اور محض الفاظ کی صورت کو دیکھ کر ان کے مفہوم کو سمجھے بغیر رائے قایم کردیتے ہیں —

۳ - مرتب نے جو کتابیں پڑھی ہیں ان سے کار آمد اور مطلب کی باتیں معلوم نہیں کیں ' اصل کتاب میں صاف طور سے لکھا ہے لیکن ان کی نظر اس پر نہیں پڑی اور محض قیاس سے کام لیا ہے ' اس قیاس سے بہت سی غلطیاں پیدا ہوگئی ہیں —

ملک خوشنود کی مثنوی کا نام ھشت بہشت بتایا ہے حالانکہ اس کا نام جنت سنگار ہے ' مرتب نے جو شعر تاریخ دکھانے کے لئے نقل کیا ہے ٹھیک اس سے قبل ہی یہ شعر ہے :-

اسولک بے بدل جیوں زرنگار ہے
جم اس کا ناؤں جلت سنگار ہے

عبرت و عشرت کی مدالل شمع و پروانہ کے متعلق لکھا ہے :-

" اس کا (بزمی بعہد جہانگیر) کا ترجمہ عبرت اور عشرت نے مثل شمع و پروانہ کے نام سے کیا ہے "

پہلے تو یہ مثل نہیں بلکہ مدالل ہے ' تقریباً دس نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں ' یہ کتاب چھپ چکی ہے ' ان سب میں مدالل ہی ہے اور بلوم ہارٹ نے بھی یہی لکھا ہے مرتب نے کن وجوہ کی بناء پر اس کو مثل کردیا ؟ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی ' مرتب کی اصل غلطی اور کوتاہی اس میں ہے کہ جہانگیری عہد کے شاعر بزمی کی پدماوت کو مدالل شمع و پروانہ کی اصل بتایا ہے اور لکھا ہے کہ عبرت و عشرت نے اس کا ترجمہ کیا ہے ' حالانکہ اس میں صاف طور سے درج ہے :-

رقم جو یہ ہے مضمون شعلہ بنیاد
میری روشن طبیعت کا ہے ایجاد
مگر مضمون ما قل خان رازی
کہ اس کی داستان فارسی کی
یتیمی کے طریق اس میں ہے داخل
کہ میں اس کے مقول کا ہوں ناقل
سو اس کی نظم کو دیکھہ ازسرنو
بندھا ہوئے کا مضمون یک یا دو
نہیں ہیگا یہ غیرت کا تقاضا
کہ مضمون لاکے باندھوں میں پرایا

میں غیروں کو ادب کرتا ہوں ارشاد
میں اپنے عصر کا ہوں آپ استاد

مرتب کی نظر ان اشعار پر نہیں پڑی اور محض قیاس کی بنا پر بزمی کا ترجمہ بتایا ہے ' حالانکہ بزمی کا کہیں ذکر تک اس میں نہیں -

" عقائد " مصنفہ باقر آگاہ کے متعلق لکھا ہے :-

" اس کی تصنیف بھی سنہ ۱۱۸۵ کے بعد اور سنہ ۱۲۰۰ کے ماقبل ہوئی ہے " یہ غلط ہے - مرتب نے دو اقتباسات دیے ہیں ان میں سے دو شعر ملاحظہ ہوں :-

کہا نہیں میں کبھی دکھنی میں اشعار
مجھے ہے شعر کہنے سوں بہت عار
ولے یو نظم بولیا بالضرورت
پڑے تا اس کو ہر اسی و عورت

آگاہ کے ان دو شعروں سے جن کو خود مرتب نے بھی نقل کیا ہے صاف ظاہر ہے کہ یہ آگاہ کی پہلی منظوم تصنیف ہے - سنہ ۱۱۸۵ ھ میں آگاہ نے تحفۃ النسا لکھی ہے جیسا کہ مرتب نے ذیل کا شعر نقل کر کے دکھایا ہے : —

گیارہ سو اوپر تھے پنج و ہشتاد
ہجرت سے بنا ہے تب یہ رکھ یاد

جب تحفۃ النسا جو آگاہ کی سب سے پہلی منظوم تصنیف " عقاید " کے بعد سنہ ۱۱۸۵ میں لکھی گئی ہے تو پھر مرتب نے بغیر غور کئے اور سمجھے یہ کیسے لکھ دیا کہ عقائد کا سنہ " ۱۱۸۵ کے ما بعد اور ۱۲۰۰ کے ماقبل " ہے - حالانکہ سنہ ۱۱۸۵ سے قبل اس کا لکھا جانا ثابت ہے —

ملک خوشنود کی مثنوی جنت سنگار کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں تین ہزار اور ڈھائی سو شعر ہیں ' حالانکہ خود مصنف نے صاف صاف تعداد اشعار بتلادی ہے —

کھیا یوں بیت کا نادر شمار ہے
جو ہے دو سو پچیس ہور تین ہزار ہے۔

منطق الطیر کے ترجمہ کا نام پنچھی باجہ کئی جگہ لکھا ہے ' اصل کتاب کا جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں ایک شعر ہے :—

ناؤں اس کا میں پنچھی باچا کیا
یادگاری خلق عالم پر رکھیا

اس کے باوجود باچا کو باجہ ہی لکھا اور لفظ کے معنی پر غور نہیں کیا ۔ منطق الطیر کا لفظی ترجمہ پنچھی باچا ہے ۔ مصنف نے جو نام لکھا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ منطق کو کوئی باجہ سمجھتے ہیں ۔ " سوداگر کی بی بی " کے مصنف کا نام سید عبداللہ بتایا ہے حالانکہ سیدی عبداللہ اس کا نام ہے ۔ مرتب نے دو شعر نقل کئے ہیں —

سیدی عبداللہ نے یو قصہ بنا		کیا خوش سخنہار کتیں سنا
سیدی عبداللہ کرکے میرا ہے ناؤں		تخلص قیاسی ککروال ناؤں

مرتب کی نظر کام کی باتوں پر پڑتی ہی نہیں ' وہ نہ معلوم کہاں گم رہتے ہیں کہ کام کی اور مطلب کی ' سب باتیں چھوڑتے چلے جاتے ہیں ' اور قیاس اور خیال کی روشنی میں کتابوں کو دیکھنا چاہتے ہیں ۔ پہلے تو ان کے قیاس کی بنیاد ہی کمزور ہوتی ہے ' اور دوسرے وہ صحیح سمجھتے بوی نہیں ' اس دو گونہ کمزوری نے بڑی خرابیاں پیدا کی ہیں —

م ۔ مصنفوں اور دیگر اشخاص کے حالات حتیٰ کہ ناموں تک میں غلطیاں کی ہیں ' کہیں تو محض قیاس سے کام لیا ہے اور کہیں تلاش کرنے میں کوتاہی کی ہے —

حضرت بندہ نواز گیسو دراز کا نام کئی جگہ آیا ہے اور تقریباً

ہر جگہ سید محمد حسین لکھا ہے - دکن کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ آپ کا اسم گرامی سید محمد حسینی ہے —

وجدی کا نام وجیہہ الدین اور وطن کرنول بتایا ہے - کسی تاریخ یا تذکرہ میں اس کا یہ نام نہیں - ہدایت اللہ خاں اس کا نام تھا جیسا کہ اردوے قدیم طبع ثانی میں وجدی کے ایک خاندانی شجرہ سے معلوم کرکے لکھا گیا ہے - وطن کے لئے اردوے قدیم کا حوالہ دیا ہے - اردوے قدیم کا دوسرا ایڈیشن مرتب کی کتاب سے دو سال قبل نکل چکا ہے ' اس میں صاف طور سے کیچ دھارور کو اس کا وطن بتایا ہے - مرتب نے تلاش و تحقیق کی دھن میں انگلستان کا دور دراز سفر تو فرمایا' لیکن خود حیدرآباد میں رہ کر ایک مطبوعہ کتاب کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی —

عاجز اورنگ آبادی کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا انتقال سنہ ۱۱۸۷ ھ میں ہوا - یہ بالکل غلط ہے' عاجز کی وفات کی تاریخ خود عاجز کے نام اور تخلص' عارف الدین خاں عاجز سے نکلتی ہے - جو ۱۱۷۸ ہے - یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ کتابت کی غلطی سے ۱۱۷۸' ۱۱۸۷ ہوگئے' لیکن اس میں شبہ کی مطلق گنجائش نہیں - مرتب کی نظر سے مثنوی لعل و گوہر مصنفہ عاجز مکتوبہ سنہ ۱۱۸۱ ھ گزری' جس کی بنا پر اس کی تاریخ ۱۱۸۰ ھ سے قبل قیاس کرلی' اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ کم از کم سنہ ۱۱۸۰ ھ تک عاجز کا زندہ رہنا تسلیم کرتے ہیں —

نصرتی کی وفات سنہ ۱۰۸۱ ھ میں بتائی ہے اور حوالہ اردو شہ پارے کا دیا ہے - یہ حوالہ بھی غلط ہے اور سنہ بھی غلط - مولف اردو شہ پارے نے اس سنہ سے قبل وفات کی تاریخ بتائی ہے - محبوب الزمن اور اردوے قدیم طبع ثانی میں اس کا سنہ وفات ۱۰۹۵ لکھا ہے - جو صحیح معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ نصرتی نے تاریخ اسکندری سنہ ۱۰۸۳ میں لکھی ہے —

کھنہار یو تاریخ اسکندری
لگی جس کی گفتار یوں سرسری
سہس اور اسی پر جو تھے تین سال
کرے یک میں ہر سب زمانے نے چال (؟)

وهیں نصرتی دهر کہ سرتے امس
لکھیا فتح نواب نامی کا جس

اگر مرتب کی نظر سے یہ مثنوی نہیں گزری تھی تو محبوب‌الزمن تو انہوں نے دیکھی اور اس کو اپنے ماخذات میں شامل بھی کیا ہے پھر بھی یہ غلطی کی ہے —

۵ - مرتب نے تاریخ و تذکرہ اور سوانح و ترجمہ کی کتابوں کے مطالعہ اور ان کی چھان بین میں بڑی سرگردانی کی ہے' لیکن وہ تاریخ سے بہت کم واقف ہیں اور حوالوں کی مختلف کتابوں سے انہوں نے کما حقہ استفادہ نہیں کیا' یہی وجہ ہے کہ اس قدر محنت اور ورق گردانی کے بعد بھی ان سے بڑی مضحکہ خیز غلطیاں ہوگئی ہیں —

صفحہ ۳۲۳ پر لکھا ہے: -

"شاہجہان کے صوبہ دار اورنگ‌زیب نے سنہ ۱۰۶۲ میں اس کو (موضع کھڑکی کو) اورنگ‌آباد خجستہ بنیاد سے موسوم کرکے اپنا صدر مقام اور مستقر بنایا" —

یہ غلط ہے - اورنگ زیب نے سنہ ۱۰۶۸ ھ میں اس کو اپنا مستقر بنایا اور اورنگ‌آباد خجستہ بنیاد نام رکھا - لفظ خجستہ سے تاریخ (۱۰۶۸) نکالی ہے -

اسی وجہ سے خجستہ بنیاد اس کے نام کا جزو بلکہ دوسرا نام ہوگیا تھا —
صفحہ ۳۲۲ پر لکھا ہے :

" شہنشاہ اکبر پہلا شخص ہے جس نے ۹۹۵ ھ میں دکن پر
حملہ کیا اس کے بعد شاہ جہاں نے پے در پے یورشیں کیں
اور آخر سنہ ۱۰۲۴ میں احمد نگر پر قبضہ کرلیا' اس طرح
اب مستقل طور پر سلاطین مغلیہ کا تعلق دکن سے ہوگیا"۔

مرتب نے لکھا ہے کہ اکبر کے بعد جس نے دکن کا رخ کیا وہ شاہ جہاں تھا۔ اکبر کے اخیر دور میں دکن کی مہم درپیش ہوئی ' سب سے زیادہ جہانگیر نے دکن کی طرف توجہ کی' وہ جب تک زندہ رہا دکن کی مہم کا سوال حل نہ ہوسکا ۔ اس کی پوری فوجی قوت اور عمر دکن کی کھلنہ و للنگ مہم کے سر کرنے کی آرزو میں صرف ہوگئی ۔ اگر دیکھا جائے تو دکن جہانگیر کی فوجوں کا گھر بن گیا تھا ۔ سنہ ۱۰۲۴ ھ سے مغلوں کا مستقل تعلق دکن سے ہرگز نہیں ہوا ' پہلے تو سنہ ۱۰۳۵ ھ (وفات ملک عنبر) تک دکن پر مغلوں کا حقیقی قبضہ رہا ہی نہیں' وہ دکن کے بعض مقامات پر قبضہ کر لیتے تھے' لیکن وہ محض عارضی اور چند روزہ ہوتا تھا ' حقیقت یہ ہے کہ ملک عنبر اپنی وفات (۱۰۳۵) تک شمال مغربی دکن کا خود مختار مالک بنا رہا اور اس نے کبھی مغلوں کے قدم دکن میں جمنے نہیں دئے —

صفحہ ۵۲۶ پر لکھا ہے :—

" عاجز نے اپنی یادگار میں ایک دیوان چھوڑا ہے
جو ان کے انتقال کے بعد مرتب ہوا ہے " —

عاجز کی وفات ۱۱۷۸ ھ میں ہوئی عاجز کا دیوان خواجہ خاں حمید

اورنگ‌آبادی نے سنہ ۱۱۶۵ ھ سے قبل مرتب کیا تھا ۔ چنانچہ وہ خود اپنے تذکرہ گلشن گفتار میں لکھتا ہے :

"ازاں جا کہ فقیر بہ ایشاں (عاجز) صحبت تمام دارد، و ہم سخن گوئی بہ برکت فیض ایشاں ۔ اکثر قصائد بے نقط وغیرہ معہ غزلیات دیوان فارسی ترتیب دادہ و اشعار متفرقہ ہندی نیز بہ دستور معروف جمع نمودہ دیوان ہندی ایشاں مرتب ساختہ" —

افضل بیگ اورنگ‌آبادی نے تحفۃالشعرا مولفہ ۱۱۶۵ھ میں لکھا ہے :

"دیوان فارسی و ریختہ ترتیب دادہ" اس سے بھی ظاہر ہے کہ سنہ ۱۱۶۵ سے قبل دیوان مرتب ہوچکا تھا ۔ اس کے علاوہ شفیق نے چمنستان شعرا مولفہ ۱۱۷۵ میں لکھا ہے "دیوان ریختہ‌ہایش ...... بہ نظر در آمد"۔

مرتب نے صاف طور سے گلشن گفتار اور چمنستان شعرا کا حوالہ دیا ہے، اس پر بھی یہ غلطی کی ہے ۔

مثنوی لعل و گوہر عاجز کی تاریخ تصنیف کو ۱۱۵۰ اور ۱۱۸۰ کے درمیان قرار دیا ہے یہ بھی غلط ہے ۔ مرتب نے عاجز کے حالات کے لئے چمنستان شعرا کا حوالہ دیا ہے ۔ لیکن ان کی نظر اس پر نہیں پڑی کہ اس میں لعل و گوہر کا ذکر موجود ہے اور یہ تذکرہ (۱۱۷۵) میں لکھا گیا ہے ۔ اس پر بھی قیاس کی بنا پر خود ہی ایک تاریخ مقرر کردی ۔ مرتب کے بیان کے لحاظ سے اس مثنوی کے سنہ ۱۱۷۹ ھ میں بھی لکھے جانے کا امکان ہے ہمارا خیال ہے کہ یہ مثنوی ۱۱۷۵ کے قبل اور ۱۱۶۵ کے مابعد لکھی گئی ۔ شفیق کے بیان سے تو ثابت ہے کہ ۱۱۷۵ سے

قبل لکھی گئی (۱۱۹۵) کا قیاس اس بنا پر ہے کہ حمید شاگرد و مرتب دیوان عاجز نے اس کا ذکر نہیں کیا اور نہ افضل بیگ نے - ان دونوں کے عاجز سے تعلقات تھے - اگر اس سے قبل وہ مثنوی لکھی جاتی تو جہاں انھوں نے چھوٹی چھوٹی نظموں کا ذکر کیا ہے اس مثنوی کا بھی ذکر کرتے - بہر حال ۱۱۹۵ اور ۱۱۷۵ کے درمیان اس کے تصنیف ہونے پر قیاس ہوتا ہے' جو اس وقت تک غلط نہیں کہا جاسکتا جب تک کہ کوئی قطعی ثبوت نہ ملے - اور اس قدر تو یقینی ہے کہ مرتب نے جو حدود قایم کئے ہیں وہ سراسر غلط ہیں —

دکن کی تاریخ سے ناواقفیت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ مرتب کرنول کا دوسرا نام محمد نگر بتاتے ہیں - کرنول کا دوسرا نام در حقیقت قمرنگر ہے - دکن کی معمولی تاریخوں میں بھی اس کا ثبوت مرتب کو مل جاے گا —

۹ - فارسی زبان کی اکثر تاریخوں اور تذکروں کے حوالے مرتب نے دیے ہیں اور ان سے بڑی مدد لی ہے' لیکن جگہ جگہ ایسی غلطیاں کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی میں وہ واجبی استعداد بھی نہیں رکھتے اس لئے اس ضمن میں ان سے بعض فاش غلطیاں سر زد ہوی ہیں —

صفحہ ۶۱۷ پر مفرح القلوب کے مصنف کے متعلق لکھا ہے :-

"کتاب کے (؟)ابتدا میں ایک طویل دیباچہ فارسی میں درج ہے - اس دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف عباداللہ ہے نہ کہ حسن علی عزت" —

اس میں بلوم هارت کی یہ غلطی بتائی گئی ہے کہ اس نے حسن علی عزت کو مفرح القلوب کا مصنف قرار دیا ہے - مرتب نے اصل کتاب کے دیباچے کو پڑھ کر اس غلطی کا انکشاف کیا ہے اور بتایا ہے کہ عباداللہ مصنف ہے - دیباچہ کی عبارت یہ ہے :-

"امر قضا توام (حکم ٹیپو سلطان) باضعف و احقر تہامی

خلقت حسن علی المتخلص بعزت کہ یکی از خادمان حضور
و بساط بوسان محفل نور علی نور است شرف صدور یافت
کہ لآلی آبدار و جواہر تابدار قوانین و قواعد مخترعہ
مذکورہ در سلک تحریر داشتہ تسطیر کشد تا این علم
شریف راحت افزا و این ہنر لطیف دلکشا کہ از قاف تا
قاف ...... مفقود و نایاب بود رواج یافتہ مسرت پیرائے
خاطر ہا گردد، ہر چند این کمترینِ عباداللہ استعداد و
قابلیت و طاقت حمل بارگران این امر خطیر نداشت"—

اس اقتباس کی پہلی ہی سطر میں مصنف نے اپنا نام بتادیا ہے ' لیکن مرتب اس کو نہیں سمجھے اور کمترینِ عباداللہ (خدا کے بندوں میں کمترین) کو مصنف سمجھہ لیا - کیا یہ فارسی سے ناواقفیت کا ثبوت نہیں ؟

صفحہ ۶۳۸ پر قادر کے متعلق لکھا ہے:

" جب پچاس سال سے متجاوز ہوے تو شیخ شہاب الدین
سہروردی سے بیعت کی اور خرقہ پہن کر دنیا سے کنارہ کشی
اختیار کرلی ...... " '' یہ شیخ شہاب الدین سہروردی
وہ مشہور بزرگ نہیں ہیں جو اس خاندان کے بانی خیال کئے
جاتے ہیں بلکہ کوئی دوسرے بزرگ ہیں - "

اسی سلسلے میں اس عبارت سے کچھہ اوپر لکھا ہے "قایم اور میر حسن نے اپنے تذکروں میں ان کا ذکر کیا ہے" —

مرتب کے پیش نظر قایم ارر میر حسن کے تذکرے ہیں' دونوں میں کم و بیش یہ الفاظ ہیں :

" چون سن شریفش از پنجاہ متجاوز گردید بردست یکے
از مشائخ آں دیار کہ نسبتِ وے بشیخ شہاب‌الدین
سہروردی می پیوست خرقہ پوشیدہ " —

اس سے قادر کا شیخ شہاب‌الدین سہروردی سے بیعت کرنے کا مفہوم کس طرح نکلتا ہے حالانکہ صاف طور سے قادر کے مرشد کا سلسلۂ نسب شیخ شہاب الدین سہروردی تک بتایا گیا ہے - قایم اور میرحسن کے تذکروں کو پیش نظر رکھتے ہوے اور ان کے حوالے دیتے ہوے بھی مرتب نے یہ غلطی کی ہے - کیا اسی کا نام تحقیق ہے ؟ —

یہ تو وہ مثالیں ہیں جن سے بڑی اہم غلطیوں کا انکشاف ہوتا ہے اس کے علاوہ بے شمار ایسی غلطیاں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتب فارسی میں بالکل کورے ہیں - اس کی بھی ایک دو مثالیں سن لیجئے :-

" چوں خاطر مبارکش بشعر ہندی میل پیش داشت ....
بسیار شعراے ہندی از بیجا پور برخواشتہ "

" عالم گیر .... از راہ اورنگ آباد سمت احمدنگر شناخت "

" قدر افزاے دہم عفت مستد آراے کشور عصمت "

ان جملوں میں پیش کی بجاے بیش ' برخواشتہ کی بجاے برخواستہ شناخت کی بجاے شتافت ' دہم کی بجاے دیہیم ' مستد کی بجاے مسند چاہیے - ورنہ سب جملے بے معنی اور مہمل ہیں —

باقر آگاہ کی ایک تصنیف کا نام تحفتہ الاحباب ہے - مرتب نے تحفتہ احباب لکھا ہے ' یہ نہ تو فارسی ترکیب ہے نہ عربی اور نہ اردو - اسی طرح صفحہ ۳۸۱ سطر ۳ پر تذکرہ نویس کی جمع تذکرے نویسین بنائی ہے ' پہلے تو تذکرے نویس ہی غلط ' پھر نویس کی جمع عربی قاعدہ کی رو سے نویسین

سراسر غلط ھے —

(۷) اس کتاب میں چونکہ اکثر ایسے مخطوطوں پر بحث کی گئی ھے جو منظوم ھیں اس لئیے عروض سے واقفیت بھی لازمی ھے - مرتب نے بے شمار اشعار نقل کئیے ھیں ' لیکن چونکہ وہ ان کو صحت کے ساتھہ نہیں پڑھ سکتے ھیں اس لئیے یونہی اٹکل پچو نقل کر دیا ھے ' اس وقت یہ نہیں سونچا کہ اس سے وزن بھی قایم رھے گا یا نہیں ' اکثر اشعار اس طرح نقل کئیے ھیں کہ وہ نہ صرف بحر سے گر گئیے ھیں بلکہ بے معنی اور مہمل بھی ھوگئیے ھیں - مرتب نے نہ تو وزن و بحر کی پروا کی ھے اور نہ معنی و مفہوم کی —

" جنگ بھاؤ مرھٹہ و شاہ درانی "

کے متعلق لکھا ھے " یہ نظم مسدس ھے " -

مرتب نے اس نظم کے آٹھہ بند نقل کئیے ھیں - ان میں سب کے سب مخمس ھیں ' ایک بند ھم مثال کے لئیے درج کرتے ھیں : —

سرچپ محمد خاں تھا بنگش تھا دست راس　　تھی حافظ رحیم سے رحمت کی دل میں آس
سردار خاں تھا پشت ھر اول کے آس پاس　　اور شہ پسند خاں تھا قریب جلوے خاص
درانیوں کے بیچ شہ اسداللہ افتخار

حیرت ھے کہ مرتب مخمس اور مسدس میں تمیز نہ کرسکے وزن و بحر کے نکات تو دور ھیں اشعار کے صاف سیدھے معانی و مطالب پر بھی ان کی نظر نہیں - ذیل میں چند مثالیں دی جاتی ھیں جن میں وزن و بحر اور معانی و مطالب کا قتل عام نظر آئیے گا - مرتب نے شعر نقل کیا ھے : —

(۱) کبھی اس جام سوں بزم وفامیں　　دماغ دل کتیں قسمیں رسا ھے

یہ شعر در اصل یوں ھے : —

کبھی اس جام سوں بزم وفا میں
دماغ و دل کتیں مستی رسا ھے

(ب) وصل پایا ھوں میں دولت مبارک منجھہ او پر رات یو خلل ھمائے

اس کا مصرعہ ثانی یوں ھے :—

منجھہ اوپر رات یو ظل ھما ھے

(ج) چلا آی عشق دل گھر ھے تیرا جو کچھہ طالب کی پیش اگی روا ھے

یہ شعر یوں ھے :—

چلا آ اے عشق دل گھر ھے تیرا
جو کچھہ طالب کے پیش آوے روا ھے

(د) وفاداران کی تیں و عین مقصود ھوسنا کا یکی آگی اژدھا ھے

یہ شعر یوں ھے :—

وفاداراں کے تئیں و عین مقصود
ھوسنا کاں کے آگے اژدھا ھے

(ہ) شود جوکی و خاکستر بمالہ بدشت محنت و عربت یکمالہ

یہ شعر یوں ھے :—

شود جوگی و خاکستر بمالہ
بدشت محنت و غربت سکالہ

(و) بہ چشم دور بیں و ذھن چالاک نظر کردہ بہ کرہ شہہا ی افلاک

مصرعہ ثانی یوں ھے :—

نظر کردہ بہ گردش ھاے افلاک

(ز) بلفظ ھندوی کو بتی منو ھر بود در فارسی معنش دل بر
جہالش سپہ ن نازنیں بود بلی سرمایہ عمرش ھمیں بود

ان میں دو مصرعے یعنی پہلا اور تیسرا اس طرح ہیں —

(۱) بلفظ ہندوی گوی منوہر ۔

(۳) خیالش بستۂ آں نازنیں بود

اس قسم کے بے شمار اشعار ہیں جن کے نقل کرنے اور پڑھنے میں مرتب نے وزن و بحر کے سقم اور معنی و مفہوم کی خرابی کا لحاظ نہیں کیا ۔ قلمی نسخوں سے الفاظ کی صورت نویسی کردی ہے ' اس راہ میں اگر وزن و بحر اور معنی و مفہوم بھی قربان ہوگئے تو پروا نہیں کی ۔ مرتب کا کام صرف صورت نویسی نہیں اگر اس کو وہ ضروری خیال کرتے ہیں تو ان کو نقل کرنے کی بجاے عکس لے کر کتاب میں درج کرتے ' جب مرتب ان مخطوطوں کی علمی تحقیق کر رہے ہیں اور ان پر تنقید فرما رہے ہیں تو ضرور ہے کہ وہ ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھیں جو علمی تحقیق اور اعلیٰ تنقید کے لئے لازمی ہیں اور کم سواد کاتبوں کی غلط نقل کو ایک محقق اور نقاد کی عقل سلیم پر ترجیح نہ دیں ۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ مرتب نے مخطوطوں کے نمونوں کو ان کی اصل حیثیت میں پیش کرنے کی پابندی اور " خاص کوشش " کی ہے ' اس لئے کہ صفحات ۶۱۶ ۔ ۶۱۷ پر قصہ بندہ کاں عالی کا جو اقتباس درج ہے اس میں مرتب نے اصل مخطوطے کے غلط لکھے ہوے الفاظ کی تصحیح کی ہے ۔ اصل مخطوطے کی عبارت حسب ذیل ہے (ملاحظہ ہو فہرست انڈیا آفس نشان $\frac{۸۴}{۲}$) : —

" اے یاراں و دوستاں اگر چہتے ہو کہ یہ نقل عجیب

کوسنا ثات کاں اشتیاق کے سنو کہ پچھلے دنوں بیچ

عیدالضحیٰ کے خلیفہ هاروں الرشید واستے تماشا اور سیر
کے بیچ شہر بغداد کے ایدھر اودھر پھرنا چاها اوس وقت
اوس کے ثات کوئی رفیق همراہ نہیں تھا"۔

اس عبارت میں ثات اور واستے کی املا غلط ھے مرتب نے " ساتھہ " اور " واسطے " لکھہ کر تصحیح کی ھے، اس سے معلوم ھوتا ھے کہ انھوں نے ایسی غلطیوں کو جو بہت آسان تھیں اور جن کو وہ محسوس کرسکتے تھے درست کردیا اور ان چیزوں کو جو ان کی فہم سے باھر تھیں بجنسہ قایم رکھا، اس کی مثالیں اس کثرت سے ھیں کہ ان کا حصر و شمار محال ھے۔

۸ - ذیل میں زبان و قواعد کی چند غلطیاں درج کی جاتی ھیں، پوری کتاب اس قسم کی غلطیوں سے بھری پڑی ھے، کوئی صفحہ ایسا نہیں جس میں بغیر کوشش کے اس نوع کی غلطی نہ نکلے :-

" میں نے اپنی کتاب کو ترتیب نہیں دی؟ "

" جب نشہ اتری (؟) اپنے گناھوں پر سخت نادم ھوے"

" جبرئیل نے (؟) وحی لائی (؟) "

" مینا سے مشورہ کی (؟) " راجہ (؟) اس مشورہ کو قبول کیا "

" دل دھی کی (؟) مشورہ دیا" آنسو کی (؟) دریا آنکھوں میں جوش مارنے لگی (؟) " بھوک و (؟) پیاس "

" علی عادل شاہ ثانی بیجاپور کی (؟) سوانح بیان کی گئی ؟ "

" اس کی (؟) سنہ تصنیف کے متعلق باوم هارت نے غلطی کی ھے "

" ایک اورنسخہ هندوستانی نظم میں علی بخش (؟) جن کو سید برکت علی بھی کہا جاتا ھے سنہ ۱۲۹۰ میں مرتب کیا تھا "

" اس کا تمتما یا ھوا (؟) چراغ گل ھو رھا تھا "

" داؤد خاں (؟) اپنے مستقر کرناٹک کو جاتے ہوے نیک نام آباد میں قیام کیا " اسرا (؟) بد دل ہو کر اس کو مقید کردئے (؟) "

" اس کی دلاوری اور شجاعت نے میسور کے راجہ کے دل میں گھرلی (؟) "

" اپنے میواھا نورس (؟) سے نونہالان چمن کو نہال کرے" قضائیت (؟) پر ممتاز کیا تھا "

یہ تو خیر زبان و قواعد کی غلطیاں ہیں - یہ ایسی ہیں جو عموماً چھوٹی جماعتوں میں بچے کیا کرتے ہیں - ہم نے ان پر استفہامی علامتیں بنادی ہیں ہر ایک کی تشریح و توضیح اور نوعیت کا ذکر ناظرین اردو کے سامنے تحصیل حاصل ہے' قواعد کی غلطیاں اور لغزشیں تو خیر دور رہیں مرتب نے معمولی الفاظ کی املا بھی صحیح نہیں لکھی —

صفحہ ۳۹۰ سطر ۱ " فتنہ فروع ہوا " بجائے فرو -

صفحہ ۴۷۶ س ۱۵ بھنجے بجاے بھانجے -

ص ۴۰۴ س ۷ " لوگ تعنے دیتے تھے" بجاے طعنے-

ص ۶۰۶ س ۱۳ ' ۱۴ رکساس بجاے راکشس -

ص ۳۸۹ س ۱۸ بوتھا بجاے بوڑھا یا بڈھا -

ص ۳۹۰ س ۱۵ " کڑپہ اور سدھوت برٹش انڈیا میں شامل اور صوبہ مدراس کے تحت ایک دسٹک ہے " یہ غالباً ڈسٹرکٹ کی خرابی ہے -

۹- مرتب کی' زبان کے اولین اور ابتدائی قواعد سے نا واقفیت کو دیکھتے ہوے ان کے اسلوب بیان کے باب میں زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں' وہ بہت ہی ناقص ہے' اس میں جا بجا نو مشقی کے آثار پاے جاتے ہیں - اس کتاب کا موضوع ادبی تحقیق ہے اس لئے نہایت پختہ طرز تحریر کی ضرورت ہے جو بات بیان کی جاے الفاظ اس کو عمدگی سے ظاہر کرسکیں' مرتب الفاظ کو مناسب جگہ بٹھانا اور ان کو صحیح مفہوم میں استعمال کرنا نہیں جانتے ہیں' ان کے جملوں اور فقروں کی

ساخت اور بناوٹ بھی نہایت بد وضع اور غلط ہے۔ روزمرہ اور محاورہ بھی خالص اردو کا نہیں کہیں کہیں تشبیہہ و استعارہ سے عبارت کو رنگین بنانا چاہا ہے لیکن اس میں بھونڈا پن آگیا ہے:

ص ۲۵۵ س ۱۲ " عام طور پر پگڑی باندی جاتی تھی اس کو کبھی پھنے بھی ہوا کرتے تھے"

ص ۱۴ س ۸ " اس کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوسکتا ہے کہ ان کا مصنف اپنی شعرای کے لحاظ سے کتنا بلند مرتبہ رکھتا تھا"

ص ۱۷۸ س ۱۲ " یوں خیال کرنا چاہئے کہ جس طرح دکھنی شعرا نے کوئی نہ کوئی مثنوی ضرور لکھی ہے اسی طرح مرثیہ بھی کہا کرتے -

ص ۳۷ س ۳ "یہ مثنوی مصنف کی ۵ساعی پیدا وار ہے اس لئے کسی فارسی مثنوی کے ساتھہ مقابلہ کرکے ترجمہ کی خوبی بھی ظاہر نہیں کی جاسکتی"

ص ۲۷۶ س ۱ "آنکھہ غمزہ کے گھر میں سازش کرنی والی تھیں "

ص ۲۷۵ س ۱۷ " دور دور سے نجومیوں کو طلب کرکے زائچہ دیکھا گیا ان لوگوں نے سعد و نحس دو علامتیں دیکھہ کر کہنے لگے" -

ص ۲۴ س ۱۱ شاہ جہاں نے گولکنڈہ پر پیش قدمی کی مگر صلح ہوگئی"

ص ۱۹ س ۱۱ " جہاں (؟) اور جہانبانی میں اپنا (؟) نظیر آپ تھا وہاں (؟) علم و فن کے لحاظ سے بھی کافی شہرت رکھتا تھا" -

ص ۲۹ س ۱ جہاں (؟) وہ شاعری کی حیثیت سے اعلیٰ درجہ کا شاعر خیال کیا جاتا ہے وہیں (؟) بہترین نثار کی حیثیت سے بھی پیش ہوسکتا ہے" -

ص ۲۵۵ س ۱۹ " امرا کے کھانے کے وقت ملازم تواں سے مکھی اڑایا کرتے "

ص ۲۵۶ س ۱۸ " اس خصوص میں وہ زمانہ مابعد کی مثنویوں میں سبقت رکھتی ہے"

ص ۲۱۲ س ۱۰ "وہ عورت ایک جوان کو اس امر پر راضی کرکے لے گئی کہ وہ اس کی دختر کو شادی کرلے گا " -

ص ۲۱۶ س ۱۳ ایک چور فلاں بوڑھی کی لڑکی کو آتھ ھزار اشرفی کے مہر سے نکاح کرنے والا ھے " -

ص ۳۰۳ س ۵ " مگر یہی ایک کتاب اس کی یادگار نہیں بلکہ دیگر تصانیف بھی ھوے ھیں " -

ص ۵۰۵ س ۵ " خدا اس بہار کو سدا بہار بنائے اور تاجدار آصفی کے زیر سایہ یہ پھولے پھلے اور اپنے میوہائے نورس سے نونہالان چمن کو نہال کرے" -

ص ۳۲۴ س ۲ " اب ھم تفصیل کے ساتھ اس زمانے کے مخطوطات کا حال درج کرتے ھیں جو چمنستان یورپ کے علمی گلشنوں میں محفوظ ھیں" -

۱۰ مرتب نے بڑی ستم ظریفی کی ھے کہ ان کتابوں پر نہایت آزادی اور بے تکلفی سے تنقیدیں کی ھیں جن کو نہ تو وہ صحیح پڑھ سکے اور نہ سمجھ سکے یہ تنقیدیں بالکل خیالی اور قیاسی ھیں' ان کو پڑھ کر اس مادر زاد اندھے کا لطیفہ یاد آتا ھے جس نے کھیر کا رنگ معلوم کرنے کی کوشش کی اور بالآخر اس کو ٹیڑھی کہہ کر مطمئن ھوگیا —

نصرتی کے متعلق لکھا ھے :

> " اگرچہ نصرتی کے قصائد کو زبان اور صفائی کے لحاظ سے زمانہ ما بعد کے قصائد سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا مگر اس زمانے کے نظر کرتے ھوے ان کو صاف اور سلیس کہا جاسکتا ھے اور ھر منصف مزاج زبان کی صفائی کے لحاظ سے ان کی وقعت کو کم نہیں کرسکتا " -

مرتب نے نمونے کے لئے جو اشعار نقل کئے ھیں ان میں سے ایک کو بھی صحیح طریقے سے نہیں پڑھا' سب میں غلطیاں موجود ھیں' ان کے اس طرح نقل کردینے سے اکثر اشعار مہمل و بے معنی ھوگئے ھیں - اس پر بھی مرتب نے یہ رائے صادر فرمائی ھے - نصرتی کے قصائد کی زبان اس قدر ٹھیٹ دکھنی اور ادق ھے کہ شاید ھی دکھنی زبان کی کسی دوسری کتاب کی ھو' یہ قصیدے در اصل علی نامہ کے اجزا ھیں جو اس میں جگہ جگہ بر محل درج ھیں مرتب کو غالباً یہ معلوم نہیں کہ نصرتی کی دوسری تصنیف گلشن عشق کے مقابلے میں علی نامہ کیوں زیادہ مشہور نہیں ھوا' چاھئے تو یہ تھا کہ علی نامہ جس میں ایک مشہور بادشاہ کے سوانح وغیرہ بڑی حدتک صحت کے ساتھ بیان کئے گئے ھیں زیادہ مقبول ھوتا' لیکن ایسا نہیں ھوا اور مثنوی گلشن عشق زیادہ مقبول و مطبوع ھوگئی گلشن عشق کے نسخے دکن کے تقریباً ھر قصبے میں ملتے ھیں- مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے بھی اس کی بڑی شد و مد سے تعریف کی ھے' علی نامہ کو یہ شہرت اور مقبولیت اس وجہ سے نہیں ھوئی کہ اس کی زبان زیادہ ادق اور ناقابل فہم ھے ' باقر آگاہ نے لکھا ھے کہ لوگ " ملک الشعرا نصرتی کو نہیں مانتے اور قدر اوس سحر حلال کی نہیں جانتے' بڑی دستاویز اون کی یہ ھے کہ زبان اوس کی کج مج ھے " تقریباً یہی رائے مولف بساتین السلاطین کی ھے (ملاحظہ ہو اس کتاب کا صفحہ ۴۳۰)—

باقر آگاہ کا یہ اقتباس ایک دوسری جگہ خود مرتب نے نقل کیا ھے لیکن اس کے مفہوم پر غور نہیں کیا - اس کا صاف مطلب یہ ھے کہ اکثر لوگ آج سے کم و بیش پونے دو سو سال قبل نصرتی کی زبان کو ادق سمجھتے تھے - یوں بھی مرتب کو سوچنا چاھئے کہ قصیدہ کي زبان کہیں صاف اور سلیس ھوتی ھے ؟ فارسی کی تقلید میں تو قصیدے کے لئے یہ عیب سمجھا جاتا تھا اور اب بھی

اکثر لوگ سمجھتے ھیں - علی نامہ اور خاص کر قصائد کی زبان میں صفائی اور سلاست نام کو نہیں - گلشن عشق در اصل نصرتی کی استادانہ مہارت اور شاعرانہ کمال کا عمدہ نمونہ ہے —

دکھنی اور لکھنوی مرثیوں کا مقابلہ کیا ہے :-

"غالباً اس امر میں شک و شبہہ کی گنجائش نہیں کہ مرثیوں کی ابتدا دکن سے ہوئی مگر زمانہ مابعد میں شاعری کی اس صفت ؟ (صنف) نے جو ترقی ایک فن کی حیثیت سے لکھنؤ میں حاصل کی وہ دکھنی مرثیوں کو حاصل نہیں ہوئی - لیکن کہا جاسکتا ہے جو بات مرثیہ پن کی دکھنی مرثیوں کو حاصل رہی وہ لکھنو کے مرثیوں میں نہیں پائی جاتی' دکھنی مرثیوں کا مقصد مجلس عزا کو رلانا تھا وہ اپنے کلام میں سوز و گداز رنج و غم کے مضامین اس طرح بیان کرتے تھے کہ اصل شہادتوں کا سماں پیش ہوجاتا تھا " -

اس غیر مربوط غیر مدلل اور مبہم بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے دکھنی مرثیوں کا مطالعہ گہری نظر سے نہیں کیا' اور لکھنو کے مرثیوں سے تو وہ بالکل نا آشنا ہیں - موازنے کے لئے دکھن اور لکھنؤ کے کون کون مرثیہ گو مرتب کے پیش نظر رہے ہیں ؟ اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں - دکھن اور لکھنو کے مرثیوں کا موازنہ غیر اصولی اور ایک زائد بات ہے - اگر موازنہ مقصود ہے تو میر اور سودا کے زمانے تک کے دھلی کے اور ان کے ہم عصر لکھنو کے مرثیہ گو شعرا کا مقابلہ دکھن کے شعرا سے ہوسکتا ہے - اس وقت تک دکھنی مرثیوں کا اثر تھا - چنانچہ اس کی شہادت سودا کے اس مرثیے سے ملتی ہے جس کو

اس نے "دکھنی آمیز" زبان میں کہا ہے اسی وقت سے مرثیہ کی صنف میں انقلاب ہونے لگا اور رفتہ رفتہ اس کی صورت ہی بدل گئی ۔ انیس و دبیر نے تو انتہائی کمالات ختم کردیے ہیں ایسی حالت میں دکھن اور لکھنو کو ایک دوسرے کے مقابلے میں لا کھڑا کرنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مرتب کسی اسکول کے مرثیوں کی خصوصیات سے بھی واقف نہیں

صفحہ ۴۶۴ پر آگاہ کے متعلق لکھا ہے :

آگاہ نے جس زمانہ میں اپنی تصنیفات آغاز کیں، اس وقت ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیل گئی تھی، ... ... سوسائٹی کو نقصان پہنچ رہا تھا اور دن بدن حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی، اس نقص کو معلوم کرنے والا، اس مرض کو دریافت کرنے والا اس کے علاج پر کمر ہمت باندھنے والا اور اپنے تصنیفات سے اس کا علاج کرنے والا، آگاہ اور صرف آگاہ تھا ۔ آگاہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کو ضروری و لازمی تصور کیا اور ان کے لئے کتابیں لکھیں، اس نے اپنی تصانیف میں صاف طور سے اس امر کی صراحت کی ہے کہ ان کا مقصد خاص طور سے صنف لطیف کی بہبودی ہے چنانچہ ہشت بہشت کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: ... اکثر عورتاں اور تمام امیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں اس لئے یہ عاصی مطلب قسم اول کا بہت اختصار کے ساتھ لے کر دکھنی رسالوں میں بولا ہے ... "۔

" ولے یو نظم بولیا بالضرورت
پڑے تا اس کو ہر امی و عورت "

پہلے تو سوال یہ ہے کہ کیا مرتب آغاہ کو کوئی زبردست حکیم ' فلسفی یا سیاسی مصلح اور رہنما سمجھتے ہیں ؟ اور کیا وہ ان کی تصانیف کو انقلاب انگیز اور عصر آفرین جانتے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ وہ مذہبی عالم تھے اور ان کے مشاغل علمی تھے ' لیکن وہ اتنے بڑے سیاسی مصلح یا مفکر نہیں تھے کہ سیاسیات یا معاشرت و تمدن کی خرابی کو محسوس کرتے اور اس کا درماں معلوم کرتے ' ان کی جن تصانیف کی طرف مرتب نے اشارہ کیا ہے بے شبہ وہ ضروریات دین کی واقفیت کے لئے لازمی ہیں ان کا تعلق چند مذہبی مسائل سے ہے عام تعلیم یا اصلاح تمدن و معاشرت سے اس کو کوئی راست اور قریبی تعلق نہیں —

اس کے سوا کیا مرتب کا یہ بیان صحیح ہے کہ آغاہ نے سب سے پہلے خاص صنف لطیف کی بہبودی کے لئے کتابیں لکھی ہیں خود آغاہ نے لکھا ہے جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے ظاہر ہے کہ وہ بالضرورت " امی و عورت " کے لئے لکھ رہے ہیں کسی صنف کی تخصیص نہیں —

کیا ہوں میں بیان اس نظم اندر
عقائد اہل سنت کا سرا سر

یہ اس کتاب (عقائد) کا ایک شعر ہے جس کا ایک شعر مرتب نے اپنے خیال کے ثبوت میں پیش کیا تھا ۔ اس میں صنف لطیف کی تعلیم کا ذکر کہاں ہے ؟

اس قسم کی کتابیں زمانہ دراز سے لکھی جا رہی تھیں ' خود دکنی زبان میں متعدد کتابیں موجود ہیں مرتب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۵۰۵ پر شوہر نامہ کا ذکر کیا ہے ۔ مصنف شوہر نامہ نے آغاہ سے زیادہ وسیع معنوں میں تعلیم کا ذکر کیا ہے :—

اے دکھنی زبان کے بچن بول بول
سنو مومناں میں دیا ہوں جو کھول
سیکاؤ علم عورتاں کو ککر
کیا شوہروں پر خدا نے امر
ہر ایک مرد اوپر تو یو فرض ہے
سیکانا زنوں کوں علم فرض ہے

یہ اقتباس مرتب نے خود صفحہ ۵۰۶ پر درج کیا ہے اور یہ تصنیف ۱۱۵۶ کی ہے ' یعنی آکاہ کی تصانیف کے آغاز سے تقریباً ۳۰ سال قبل کی - ٹیپو سلطان کے زمانے میں احکام النسا لکھی گئی انڈیا آفس کی فہرست نشان (۱۷) پر اس کا ذکر ہے یہ بھی عورتوں کی تعلیم سے متعلق ہے - اس کے علاوہ آکاہ کی تصانیف سے کم و بیش سو سال قبل کی بھی ایسی تصانیف دکھنی زبان میں ملتی ہیں جو محض عورتوں کی تعلیم کے لئے لکھی گئی ہیں ' اس کے بعد بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہا چنانچہ حضرت شاہ راجو قدس سرہ کے جملہ رسائل اور خصوصا سہاگن نامہ وغیرہ اسی موضوع سے تعلق رکھتے ہیں - ان شہادتوں کی موجودگی میں کیا تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ مرتب کی رائے میں اور تنقید میں توازن اور سنجیدگی ہے' ادبی تنقید میں وہ عقیدت کے جذبات سے مغلوب اور وہم و گمان سے متاثر ہوجاتے ہیں - پڑھ کر اور سمجھ کر معائب و محاسن معلوم کرنے سے قاصر ہیں - اس کی جگہ انہوں نے قیاس اور خیال کو دے دی ہے —

۱۱ - بعض مخطوطوں کی تحقیق میں بہت ہی طوالت سے کام لیا ہے اور ان کے اصل و ماخذ کے سراغ لگانے کی غلط اور بے فائدہ کوشش کی ہے - بعض ایسے مخطوطوں کے متعلق بے تحقیق کئے نہایت اختصار و ایجاز سے کام

لیا جن پر کما حقہ روشنی ڈالنے کے لئے ضرورت تھی کہ زیادہ تلاش و جستجو سے کام لیا جاتا —

غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال کو فارسی نثر کے ایک قصے کا ترجمہ بتایا ہے اور دکھنی نظم اور فارسی نثر کا مقابلہ کیا ہے اس کوشش میں دس صفحے سیاہ کردیے ہیں اور اس کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں "دکھنی سیف الملوک فارسی کا لفظی ترجمہ نہیں بلکہ مضمون کو اخذ کرلیا گیا ہے اور نام وغیرہ بھی تبدیل کردیے گئے ہیں" ...... "حقیقت یہ ہے کہ یہ ترجمہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا" —

مرتب کو اس وقت ہوش آیا جب کہ فارسی اور دکھنی قصوں کی عبارتوں میں اختلاف عظیم نظر آیا اور بہ ادنیٰ تغیر روئداد قصہ کے سوا کوئی امر دونوں میں مشترک نظر نہ آیا - مرتب نے بے فائدہ کوشش کی ہے - غواصی نے دراصل ایک فارسی مثنوی کا ترجمہ کیا ہے اس کے تین نسخے ہماری نظر سے گزرے' مصنف کا پتہ نہیں چلا - ان سے ہم نے غواصی کی سیف الملوک کا مقابلہ کیا - بہت ہی خفیف اختلاف ہے اور اصل و ترجمہ بالکل قریب ہیں - نام وغیرہ بھی بالکل ایک سے ہیں - ان صفحات میں گنجائش نہیں کہ مقابلہ کیا جاے - مرتب نے جلد اور مخطوطوں کے باب میں خواہ مخواہ طوالت سے کام لیا ہے' اور جہاں ضرورت تھی وہاں چپ سادھ گئے - صفحہ ۲ پر ایک معراج نامہ کا ذکر کیا ہے' اس کے مصنف وغیرہ کے متعلق تو مرتب نے تحقیق کی ہی نہیں' حتیٰ کہ اس کا نام تک نہیں لکھا - یہ معراج نامہ دراصل سید بلاقی کی مشہور نظم ہے - ہندوستان کے اکثر حصوں میں مقبول رہ چکی ہے' خصوصاً دکن میں تو اس کے نسخے بے حد و بے شمار ملتے ہیں ہماری نظر سے ۲۵ سے زاید نسخے گزرے ہیں حیدرآباد میں آے دن قدیم کتابوں کے تاجروں کے ہاتھ اس کے نسخے لگتے رہتے ہیں - سید بلاقی کی کئی تصانیف ہیں اور وہ بڑا مقبول عام شاعر رہ چکا ہے اس کی مقبولیت

کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ معراج نامہ کے نسخے دکن کے اکثر مسلمانوں کے گھروں میں اب تک موجود ہیں - یہ موقع تھا کہ مرتب اپنی تحقیق سے اس کے حالات روشنی میں لاتے - اب تک کسی نے اس پر تفصیل سے نہیں لکھا - مرتب تو یہ کہہ کر ٹال گئے کہ یورپ کا نسخہ ناقص ہے اس لئے مصنف کا نام وغیرہ تک نہیں لکھا - اس ذرا سے نقص کی وجہ سے مرتب یہ معلوم کرنے سے قاصر رہے کہ یہ وہی مشہور و معروف معراج نامہ ہے جس کے نسخے کتب خانۂ کلیہ جامعہ عثمانیہ اور کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہیں - دونوں فہرستیں مرتب کے ماخذات میں داخل ہیں' اس پر بھی مرتب نے لکھ دیا "مصنف کا نام تاریخ وغیرہ نامعلوم" حالانکہ اول الذکر فہرست کے صفحے ۶۲ پر مخطوطے کے وہی ابتدائی دو شعر درج ہیں جو مرتب نے بھی نقل کئے ہیں' اسی سلسلہ میں سنہ تصنیف' نام مصنف و غیرہ سب کچھ درج ہے' اس پر بھی مرتب نے اس کو اٹھا کر دیکھا تک نہیں' اور یہ سمجھ لیا کہ تحقیق کا حق ادا ہوگیا - اسپر نگر نے صفحہ ۶۰۳ پر اس کا ذکر کیا ہے' اس میں شاعر کا نام موجود ہے - اسپرنگر کی فہرست بھی مرتب کا ماخذ ہے —

امین مصنف بہرام گور و حسن بانو کے متعلق لکھا ہے :-

"اس امین کے کچھ حالات معلوم نہیں ہوے' مثنوی کی تصنیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں موجود تھا' مگر اس کو دربار شاہی سے کسی قسم کا تعلق نہیں وہ فقیر منش صوفی بزرگ ہے" —

اس امین کے متعلق بے تحقیق کے مرتب نے یونہیں قیاسی پادر ہوا باتیں لکھ دی ہیں' اس امین کو جیسا کہ لکھا جاچکا ہے دکن سے کوئی

تعلق نہیں - اردوے قدیم میں مراۃ سکندری کے حوالے سے اس کے حالات لکھے ھیں۔ مرتب کی کتاب سے دو سال قبل اردوے قدیم کا دوسرا ایڈیشن شایع ھوچکا ھے، مرتب اس کو دیکھتے اور اس میں کوئی غلطی ھوتی تو اس کو دور کرتے نہ یہ کہ بے حوالہ و سند بے سرو پا قیاسی باتوں کو علمی تحقیق و انکشات کے طور پر نافذ کرانے کی کوشش کرتے، طرفہ تماشا یہ کہ اس مثنوی کے متعلق لکھدیا —

" جہاں تک میرے معلومات ھیں اس کا کوئی نسخہ ھندوستان میں نہیں ھے "

مرتب کی معلومات صرف یورپ تک محدود ھونی چاھئیں ھندوستان کا نام انہوں نے کس برتے پر لیا جب کہ ان کی فضاے معلومات کی وسعت بمبئی تک بھی نہیں، جہاں یہ کتاب سنہ ۱۳۰۰ ھ میں چھپ چکی ھے اور اب بھی کبھی کبھی حیدرآباد کے تاجروں کے ھاں بکنے آجاتی ھے - اردوے قدیم میں اس کے طبع ھونے کا ذکر ھے مرتب کم از کم اس کو دیکھہ لیتے —

۱۲ - یہ بڑی ھمت اور اخلاقی جرأت کی بات ھے کہ اس مدد اور فایدہ کا اعتراف کیا جاے جو دوسروں سے پہنچے۔ عالی ظرف اھل قلم کا یہ شیوہ نہیں کہ دوسروں کی محنتوں سے فایدہ اٹھائیں اور اس کا اعتراف کرنے سے شرمائیں۔ یہ ایک قسم کا غصب ھے جس کو دوسروں کی مقام کے حق میں تنگ نظر روا رکھتے ھیں - مرتب سے ھمیں شکایت ھے کہ انھوں نے بعض مقامات پر حوالے نہیں دئے —

ذوقی کے متعلق لکھا ھے صفحہ ۳۴۴ :-

" ذوقی کا نام سید شاہ حسین تھا، ان کے مرشد شاہ محمد خاں نے ان کو بحرالعرفان کا خطاب دیا

تھا ...... ان کی مختلف مثنویاں مشہور ہیں جن میں وصال العا شقین زیادہ شہرت رکھتی ہے "

ذوقی کے نام، خطاب، اس کی وصال العا شقین اور دوسری مثنویوں کا علم مرتب کو کیونکر ہوا؟ اس کا انہوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا، وہ اس کو اپنی ذاتی تحقیق سمجھتے ہونگے اور اس کے ماخذ کو بھول گئے ہونگے، ہم ان کو یاد دلاتے ہیں کہ یہ انہوں نے رسالہ اردو سے لیا اور اس کا حوالہ دینا اپنی شان کے منافی سمجھا —

صفحہ ۳۲۳ پر ایک اور مقام ہے :—

" سلطنت کے مستقر کے باعث شمالی ہند اورعلی الخصوص دھلی کے امرا، روساء، علما، شعرا، کثرت سے اورنگ‌آباد میں آباد ہوگئے اور پھر گولکنڈہ اور بیجاپور کے باشندے بھی جوق جوق یہاں آکر مقیم ہوگئے اس طرح اورنگ‌آباد نہ صرف سلطنت مغلیہ کے حکومت و سیاست کا مرکز بنا بلکہ نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی تہذیب و تمدن کا سنگم بھی بن گیا اورنگ آباد کے دار الحکومت تمدن و تہذیب کا گہوارہ علم و فن کا مرکز علماء فضلا کا مسکن بن جانے کے باعث اردو شاعری کو (جو گولکنڈہ اور بیجاپور کی تباہی کے بعد یتیم و یسیر کی سی حالت ہوگئی تھی) یہاں قدم جم گئے "

اس کا ماخذ بھی مرتب کو ہم بتا دیتے ہیں - مجلہ عثمانیہ جلد اول سے لیا ہے۔ اس اصل عبارت کو توڑ مروڑ کر نقل کیا ہے کہ حوالہ دینے کی ذلت نہ اٹھانی پڑے لیکن ایسا کرنے میں زبان کی جو غلطیاں کی ہیں

ان کو محسوس نہیں کیا —

صفحہ ۱۹ پر مرتب نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے متعلق لکھا ہے :

" اس کا کلیات ۱۰۲۵ھ میں مرتب ہوا ... . کلیات میں اصناف سخن سے مثنویاں، قصیدے، ترجیع بند، مراثی، غزل، رباعی سب کچھ موجود ہے"

سلطان محمد قلی اور اس کے بھتیجے سلطان محمد کا ذکر مولف محبوب الزمن نے بھی کیا ہے لیکن ان دونوں کے دیوانوں کو بر عکس ایک دوسرے سے منسوب کردیا، اور کلام کی تفصیل اور تدوین کلیات کا کچھ حال نہیں لکھا - اس کو سب سے پہلے شاعر کی حقیقی حیثیت میں رسالہ اردو میں رو شناس کرایا گیا ہے اس میں تدوین کلیات کی تاریخ اور کلام کی تفصیل سب کچھ درج ہے - کسی دوسری جگہ اس کا تفصیلی ذکر نہیں - مرتب نے اس سے فایدہ اٹھاکر اس کی تاریخ اور تفصیل تو بیان کی لیکن حوالہ نہیں دیا -

یہ چند مثالیں ہم نے دی ہیں اور بھی ایسے مقامات ہیں جہاں مرتب نے دوسروں کی متاع تحقیقی پر غاصبانہ قبضہ کرلیا ہے، مرتب کو یہ معلوم ہونا چاہئیے کہ تخت و تاج کا غصب آسان ہے لیکن دوسروں کی معلتوں پر قبضہ جمانا مشکل ہے، غصب سلطنت کی سیاست سب کا منہ بند کرسکتی ہے، لیکن علمی غصب مصنف کو پایہ اعتبار سے گرا دیتا ہے -

۱۳ - بلند پایہ عالم اور مصنف کبھی خود ستائی سے کام نہیں لیتا، وہ نہایت عجز و انکسار اور متانت و بردباری سے اپنے خیالات اور معلومات کو پیش کرتا ہے - مرتب نے اس کا بہت کم خیال کیا ہے، ان کو جہاں کہیں موقع ملا اپنی بڑائی جتانے میں تامل نہیں کیا اور کہیں کہیں تو اس قدر تجاوز کیا ہے کہ جس سے دوسروں کے علمی کارناموں کی تحقیر ہوگئی ہے —

مرتب نے لکھا ھے : ۔

" ھماری تالیف (دکن میں اردو) اس نوعیت کی پہلی تالیف تھی اس کے بعد اردوے قدیم، پنجاب میں اردو، تاریخ ادب اردو وغیرہ کتابیں عالم وجود میں آئیں —

مرتب نے اپنی کتاب کا تقدم زمانی جتانے میں بڑی بے باکی سے کام لیا ھے ۔ کیا محبوب الزمن جو صرف دکھن کے شعرا پر مشتمل ھے زمانے کے لحاظ سے متقدم نہیں ، کیا کریم الدین فیلن کا تذکرہ اور آب حیات بعد کی کتابیں ھیں ۔ اور تو اور اردوے قدیم جس کا نام انھوں نے گنایا ھے کیا ان کی کتاب کے بعد لکھی گئی ۔ اس کتاب کا مکمل خاکہ اس وقت بن چکا تھا جب مرتب کسی مکتب میں الف بے تے کی مشق کرتے ھوں گے ، انھوں نے اس کا دیباچہ نہیں دیکھا جس میں صاف طور سے لکھا ھے کہ اردوے قدیم کو ۱۹۱۰ ء میں بالاقساط لسان العصر لکھنؤ کے تین نمبروں میں شایع کیا گیا تھا —

ایک جگہ مرتب نے لکھا ھے :—

" بیسیوں ایسے مخطوطات ھیں جن کا کوئی نسخہ
ھندوستان میں نہیں کم از کم حیدرآباد کے کتب خانے اور
انجمن ترقی اردو کا کتب خانہ ان سے خالی ھے —

مرتب اگر بخت و اتفاق کے پروں پر اُڑ کر یورپ تشریف لے گئے تو اس سے یہ حق کیسے پیدا ھوجاتا ھے کہ وہ دوسرے کتب خانوں کو حقیر اور بے مایہ سمجھیں ، مرتب کو کم از کم یہ معلوم ھونا چاھئے کہ یورپ میں اردو زبان کی یہ کتابیں محض اتفاق سے پہنچ گئیں ، یہ مال غنیمت ھے جو یورپ کے بیت المال میں داخل ھے ، کسی خاص مقصد سے ان کو جمع نہیں کیا گیا ۔ جس ملک کی زبان ھو اور جس میں اس کے اتنے چرچے رہ چکے ھوں اور

جس کی اس قدر وسیع آبادی ہو، کیا اس ملک میں اس کی اپنی زبان کی اتنی کم کتابیں ہیں ؟۔ اس پر مرتب نے غور نہیں کیا ' ان کو محض یہ جتانا مقصود تھا کہ چونکہ وہ یورپ تشریف لے گئے تھے اس لئے اوروں کے مقابلے میں خاص امتیاز و اعزاز کے مستحق ہیں اور اسی لئے ان کی جنبش قلم نادر شاہی فرمان کا اثر رکھتی ہے' اور کتب خانوں کا تو مجھے علم نہیں لیکن میں اس کتب خانہ سے بخوبی واقف ہوں جس کو مخدومی مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ نے انجمن ترقی اردو کے لئے جمع کیا ہے' اور جس سے میں عرصے سے استفادہ کر رہا ہوں اس میں ایسی نادر و نایاب کتابیں ہیں کہ مرتب نے کبھی ان کا نام بھی نہیں سنا ' اس کا اندازہ اس مضمون سے بھی ہوگا جس کو ہم اپنی ان یاد داشتوں کی مدد سے لکھ رہے ہیں - جن کو ہم نے اسی کتب خانے میں مرتب کیا ہے —

اسی قسم کی شیخی کا اظہار مرتب نے خاور نامہ کے متعلق کیا ہے :-

" یہ اردو زبان کی سب سے پہلی ضخیم مثنوی ہے نہ تو اس سے پہلے اور نہ آج تک ایسی ضخیم مثنوی اردو میں لکھی گئی ہے ... . یہ سب سے پہلی رزمیہ مثنوی ہے اور پھر پہلی ہی نہیں بلکہ آخری بھی' کیونکہ آج تک ایسی ضخیم رزمیہ مثنوی اردو میں نہیں لکھی گئی "

مرتب کی نظر سے یہ مثنوی یورپ میں گزری تو اس راے کا نہایت فخریہ اعلان فرما دیا ' ان کی نظر میں اردو ادبیات کی وسعت نہیں - کیا ان کی نظر سے حملہ حیدری گزری جس کو باذل و نجف کی مثنوی

سے ذوالفقار علی خاں صفا اور مرزا نے ترجمہ کیا ہے اور جس میں کم و بیش ۳۷ ہزار اشعار ہیں' اور کیا شیدا کی اعجاز احمدی کا مکمل نسخہ نظر سے گزرا جس میں ساٹھہ ہزار اشعار ہیں - مرتب کو جب ان کتابوں کا علم نہیں تو اپنی راے کے تفاخر آمیز اعلان کا کیا حق ہے ؟ وہ اپنے محدود علم کا حوالہ دیتے ہوے اس کا ذکر کرتے - معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت میں ضبط نہیں' وہ فوراً چلو بھر پانی میں گز بھر اچھلتے ہیں —

مرتب نے اپنی شان اور تفاخر کے جتانے میں بعض مصنفوں کے حالات کو تشنہ اور ادھورا چھوڑنا گوارا کیا ہے لیکن دوسروں کی تحریروں کے حوالے سے ان کو مکمل کرنا پسند نہیں کیا - اس کی بھی مثالیں اس کتاب میں موجود ہیں —

مرتب نے بڑا غضب کیا کہ ان خطوط کو جو ان کے قیام یورپ کے دوران میں وہاں کے کتب خانوں کے نگرانوں نے ان کو لکھے ہیں مع ترجمہ کتاب کے شروع میں لگادیا ہے - وہ خطوط نہ تو ادبیات اردو کے کسی عالم اور ماہر کے ہیں اور نہ کسی غیر معمولی مشہور ادیب اور صاحب نظر کے - ان میں بھی محض اظہار شکریہ ہے جس کے رسماً اہل یورپ اور خصوصاً انگریز بہت عادی ہیں - یہ در اصل اس دلچسپی کا صلہ ہے جو ان کے محفوظ کئے ہوے نسخوں کے حق میں ظاہر کی گئی ہے - ذیل کے دو خطوں کو مرتب کیا کوئی علمی سند سمجھتے ہیں :—

" مسٹر نصیرالدین ہاشمی نے کتب خانہ (بوڈلین)
کے تمام اردو مخطوطات کا معائنہ کیا اور مندرجہ
فہرست مخطوطات کے متعلق جو توضیحات کی گئی
ہیں ان کی صحت کی تصدیق کی"

"مسٹر نصیرالدین ہاشمی نے آج صبح اس میوزیم (فٹزولیم کیمبرج) کا معائنہ کیا اور دوران میں امیر خسرو کے چوتھے نسخے کے مطالعہ پر اس کے کاتب کا نام شناخت کیا جو کسی قدر محو ہوجانے کے باعث ہمارے یہاں کے مرتب فہرست سے نظر انداز ہوگیا تھا "

کیا ان خطوط کا حاصل کرنا اور ان کو خاص اہتمام سے کتاب کے شروع میں درج کرنا خودستائی نہیں —

کہا کیا بیاں کیا جاے ' ہماری فرصت کی رات تھوڑی ہے اور مرتب کی بدحواسیوں کے سوانگ بہت —

کتاب کے شروع میں ڈاکٹر سید محی‌الدین قادری زور ایم - اے (عثمانیہ) پی ایچ ' ڈی (لندن) مددگار پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ کا پانچ صفحوں کا مقدمہ ہے - اس میں ڈاکٹر صاحب نے چند ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو ہمارے اختلاف راے کا باعث ہیں —

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے :-

" گذشتہ دس پندرہ برسوں نے ادبیات اردو کی تاریخ کو اس قدر وسیع بلکہ غیر محدود کر دیا ہے کہ اگر آج اردو شعر و شاعری کے تذکرہ نویس زندہ ہوجائیں تو اپنے تذکروں کو خرافات سمجھیں " —

تاریخ ادبیات کا موضوع بڑی حد تک جدید ہے ' قدیم تذکرہ نویسی کا مقصد یہ نہیں تھا جو ہم تاریخ ادبیات کا سمجھتے ہیں - تذکروں کو اس نقطہ نظر سے دیکھنا ایک اصولی غلطی ہے - اس میں شبہ نہیں ہمارے قدیم تذکروں سے نہ تو تاریخ ادب پر کماحقہ روشنی پڑتی ہے اور نہ تنقید

ادب کا پورا حق ادا ہوتا ہے ' اس پر بھی تاریخ ادب کے لئے ان کی مدد ناگزیر ہے اور اگر یہ تذکرے نہ ہوتے تو ہمارے ادب کی تاریخ بڑی حد تک تاریکی میں رہتی - اس اعتبار سے ان کی اہمیت کو نظر انداز کرنا ظلم ہے اور ان کو خرافات سمجھنا عجیب قسم کی جسارت ہے —

ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے :-

" اس میں کوئی شک نہیں کہ دکن کے علاوہ گجرات
کا بھی قدیم کلام دستیاب ہوا ہے ' مگر ایک تو وہ
قلیل ہے اور دوسرے اس میں ادبی اور شعری عنصر
کا ناقابل فروگذاشت فقدان ہے " —

ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے تو بالکل قیاسی ہے ' ان کی نظر سے غالباً شعرائے گجرات کا بہت کم کلام گزرا ہے اگر کچھہ مخطوطے گزرے بھی ہیں تو " دکھنیات " کے شوق میں ان کو گجراتی کے حدود سے خارج کردیا - اس کی مثالیں " اردو شہ پارے " میں موجود ہیں - " ادبی اور شعری عنصر کا ناقابل فروگزاشت فقدان " ڈاکٹر صاحب کو کن کتابوں سے معلوم ہوا حالانکہ اردو شہ پارے * میں خلاصی سورتی (گجراتی) کے متعلق لکھا ہے :-

" اپنے ہم عصروں ہاشم علی اور رضا اور دیگر
ساتھیوں کے مقابلے میں وہ حقیقت نگاری کے لحاظ سے
بہت اچھا شاعر تھا اس کے خیالات بہت اعلیٰ تھے
کربلا کے دلشکن واقعات کو اس نے اس انداز میں بیان
کیا ہے کہ پڑھنے والا ان کو حقیقی تاریخی واقعات

---

* اس کتاب پر ہم ایک مفصل تنقیدی مضمون لکھنے والے ہیں —

سمجھنے لگتا ھے ' بعض دفعه وہ ولي کی طرح ترقی
یافته اور میٹھی زبان استعمال کرتا ھے ' غالباً یه
پہلا شاعر ھے جس نے نظم میں صاف ستھری (؟) اور
فطری معاملوں کا اضافه کیا ھے اس دلفریب اسلوب
بیان اور پرواز تخیل کی وجه سے اسے قدیم دکھنی
شعرا کی صف اول میں جگه ملتي ھے "

یه غلامي کی نسبت راے ھے جس کو چند سطور قبل ڈاکٹر صاحب نے گجرات کا متوطن بتایا ھے " پانچویں مرثیے میں اس کے وطن کا پته چلتا ھے کیونکه اس میں اس نے (غلامی نے) گجرات چھوڑ کر کربلا جانے کی خواهش ظاهر کی ھے " هم نے بھی اسے اوپر کسی مقام پر سورت گجرات) کا باشندہ ثابت کیا ھے - کیا اس راے کے باوجود ڈاکٹر صاحب کا خیال ھے که گجراتی شعرا کے کلام میں ادبي و شعري عنصر ناقابل فروگزاشت فقدان ھے - کیا اس تضاد آرا سے ان کے قول میں سنجیدگی کے آثار پاے جاتے ھیں —

کتاب زیر تبصرہ پر راے زنی کرتے ھوے ڈاکٹر اصب نے لکھا ھے :-

" یه تو صرف دکن کے کار ناموں کا تذکرہ ھے' شمالی ھند
کے اردو ادب کے متعلق بھی یورپ کے کتب خانوں میں اھم
اور کمیاب مواد موجود ھے اور مجھے یقین ھے که جب
تک اس سے مدد نه لی جائے گی اردو زبان و ادب کی
کوئی تاریخ مکمل نه ھو سکے گی " —

اس سے معلوم ھوتا ھے که ڈاکٹر صاحب کو ادبیات اردو کے ذخیرہ کا علم نہیں اور نه انہوں نے ھماری ادبي و شعری پیداوار کا اندازہ

کیا ہے - یورپ کے کل کتب خانوں میں بہت ہی کم کتابیں ہیں اور وہ بھی کچھ ایسی نادر و نایاب نہیں کہ تاریخ ادب کے لئے ان کی مدد نا گزیر ہو ' اور کتب خانوں کی نسبت تو میں نہیں کہہ سکتا البتہ مخدومی مولوی عبدالحق صاحب مد ظلہ کے کتب خانہ کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس میں یورپ کے کل اردو مخطوطوں کی تعداد سے پندرہ گنا زیادہ کتابیں موجود ہیں جو خاص مقصد سے جمع کی گئی ہیں - یورپ میں بعض کتابوں کا پہنچ جانا محض اتفاقی بات ہے کسی خاص غرض اور مدعا کے تحت نہیں —

ڈاکٹر صاحب کو اگر بخت و اتفاق کتابوں کی طرح یورپ لے گئے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے سہ سالہ قیام کے تعلق کی بنا پر وہاں کے محدود ذخیرہ کتب کو تاریخ ادبیات اردو کی تکمیل کے لئے ناگزیر بتائیں —

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو اس بے التفاتی اور کس مپرسی کا شکار تھی کہ اس کی کتابوں کی نقلیں تک زیادہ تعداد میں نہیں کی گئیں اور اس کے ادب کا ذخیرہ اس قدر کم اور حقیر ہے کہ یورپ کے کتب خانوں کی چند الماریوں میں بھی آسانی سے سما سکتا ہے ' کیا ڈاکٹر صاحب کی رائے کو دیکھ کر " اردو شاعری کے محدود موضوعات کا مضحکہ اڑانے " میں اغیار دریغ کریں گے - یہ بظاہر بہت چھوٹی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور ان کے بیان کرنے سے شرم بھی آتی ہے ' مجبوری ہے ' جو محسوس نہ کرے اس کو محسوس کرانے میں قباحت نہیں —

مرتب کتاب سے ہمیں شکایت نہیں ' وہ بیچارے باضابطہ اعلیٰ تعلیم سے محروم ہیں ' ان سے جامعاتی تعلیم کے اثرات اور کردار کی امید رکھنا فضول ہے ' لیکن مقدمہ نگار تو ہماری جامعہ کے فارغ التحصیل ہیں لندن

سے بھی کوئی زیادہ معمولی ڈگری حاصل نہیں کی ہے اور اس وقت یونیورسٹی کالج میں استاد بھی ہیں - ان سے ان لغزشوں کا ہونا تعجب خیز ہے - خصوصاً کتاب زیر تنقید کے متعلق ان کی یہ رائے "ہاشمی صاحب کی یہ کوشش اردو زبان کے جدید تحقیقی و تنقیدی کارناموں میں ایک بے نظیر جگہ حاصل کرلے گی" بہت ہی حیرت ناک ہے جس کتاب کی ترتیب و تبویب اصولی نہیں، تحقیق صحیح اور نہ تنقید سنجیدہ، نہ ایجاز مناسب نہ اطناب موزوں، املا درست نہ انشا صحیح، اس کی تعریف میں غلو کرنا ایک عالم محقق اور خصوصاً جامعہ عثمانیہ کے استاد کے لئے بہت ہی نا زیبا ہے —

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اس تنقید کا انداز کسی قدر تلخ ہے، لیکن میں مجبور تھا - مرتب کی کمزوری نے جو بیدردانہ سلوک ہمارے وطنی اسلاف کے دماغی اور عقلی کارناموں کے حق میں روا رکھا ہے وہ اس کا مقتضی تھا - جس مجرم سے قانون ملک اور مذہب تعرض نہیں کرتا ہے سوسائٹی اس کی سرزنش تضحیک و تحقیر سے کرتی ہے—

خاتمہ پر اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس مضمون میں جن کتابوں کے حوالے اور اشارے ہیں وہ سب ہمارے شفیق اور بزرگ استاد مخدومی مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کے کتب خانے کی ہیں - مجھے اس کتب خانے سے باہر جاکر مدد لینے کی ضرورت نہیں پڑی - مولوی صاحب قبلہ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے کتب خانہ سے استفادہ کرنے میں میرے لئے ہمیشہ سے جو سہولت آزادی اطمینان اور فرصت بہم پہنچائی ہے وہ خود ان کو بھی نصیب نہیں —

تبصرے

ادب

معاشیات

تاریخ و تمدن

متفرق

اُردو کے جدید رسالے

—(*)—

تبصرے

ادب

شمیم

(ناول - مصنفہ فیاض علی صاحب بی - اے (علیگ) -
قیمت ہر دو حصہ چار روپے - مجلد - صدیق بک ڈپو ' لکھنؤ)

یہ ناول نئی طرز کا ہے - جدید تہذیب نے ہمارے تمدن میں جو تغیر پیدا کیا ہے اس کی جھلک اس میں نظر آتی ہے - شمیم اور نسیم کا کیریکٹر خوبی سے دکھایا ہے - شمیم اور ایک امریکن لکھی پڑھی لڑکی استھر کی محبت ' اس کا یکایک غائب ہو جانا اور مدت تک لا پتا رہنا ' عزیز و اقربا کے اصرار پر شمیم کا شادی کرنا ' پھر استھر کا سراغ لگنا ' اس کی رہائی شمیم کی بیوی کی مدد سے اور شمیم اور استھر کی شادی یہ سب منظر خوب دکھائے ہیں - لیکن مشکل اُس وقت آ پڑتی ہے جب شمیم کو معلوم ہوتا ہے کہ استھر زندہ ہے اور اس سے زیادہ مشکل یہ پڑی ہے کہ ایک بیوی کے ہوتے استھر شمیم سے شادی کرنے پر کس طرح رضا مند ہو جاتی ہے - یہ راز ہم افشا نہیں کرنا چاہتے - ناظرین کو خود پڑھ کر

اس کا فیصلہ کرنا چاہئیے کہ ناول نویس اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں - استھر اور اس کے دوست مسٹر سینٹلی اور مسز ستینلی اس سے قبل شمیم کی ملاقات اور گفتگو سے مسلمان ہوگئے ہیں - اس میں جو مباحثہ اسلام کی خصوصیات اور خوبیوں پر ان میں آپس میں ہوا ہے وہ کچھ زیادہ موثر اور اعلیٰ درجہ کا نہیں ہے - آخر میں شمیم جب ترکوں کی حیرت انگیز بہادری اور یونانیوں کے شرمناک مظالم کی درد ناک داستان سنتا ہے تو اس کی اسلامی غیرت اور مذہبی حمیت جوش میں آتی ہے اور وہ ترکوں کی مدد کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور استھر اور شمیم دونوں ترکوں کی فوج میں جاپہنچتے ہیں اور فتح اور کامرانی کے ساتھ واپس آتے ہیں یہ ٹکڑا بہت سرسری اور بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے —

ناول کی زبان بہت شستہ ہے اور دوستوں کی بے تکلف گفتگو بڑی خوبی سے لکھی ہے - اگرچہ نفسیاتی گہرائی کم ہے لیکن حسن بیان اور جذباتی کیفیات کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے - اردو میں ایسے ناول کم لکھے گئے ہیں —

مطلع انوار

(مجموعہ نظم جناب مہاراج بہادر برق دہلوی -
صفحات ۱۹۲ قیمت ایک روپیہ)

مولانا حالی نے اردو نظم کی اصلاح کا جو بیج بویا تھا آج اس کے پھل پھول ہر طرف نظر آرہے ہیں - اگرچہ وہ بلا واسطے (بلکہ بالواسطہ بھی) مغربی ادب سے واقف نہیں تھے لیکن زمانے کے رنگ کو جیسا وہ سمجھے تھے اب بھی ہم میں سے بہت کم سمجھتے ہیں - انھوں نے اپنی تحریر اور خصوصاً اپنی نظموں سے ایک انقلاب پیدا کردیا اور ایسی ایسی چیزیں لکھہ گئے ہیں جن کی نظیر مدتوں تک اردو میں پیدا نہ ہوگی - نئے رنگ میں لکھنے والے شاعر سب کے سب کسی نہ کسی نوع سے اسی برگزیدہ ہستی کے خوشہ چین یا زیر بار منت ہیں - جناب برق نے خود اس کا اعتراف کیا ہے اور اُسی روش پر گام زن ہوے ہیں - اس مجموعے میں جو اُن کی

نظموں کا گلدستہ ہے رنگ رنگ کے پھول نظر آتے ہیں اور بعض ان میں سے بہت ہی دلکش ہیں - میراں بائی ' یتیموں کی فریاد ' کار خیر وغیرہ نظمیں پڑھنے کے قابل ہیں —

شروع میں جناب رواں نے مقدمہ اور جناب اصغر (گونڈوی) نے دیباچہ لکھا ہے اور شاعر کے کلام کی خوبیوں کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے —

نیرنگ

(مصنفہ ایس - آر - کے - مکتبۂ جامعۂ اسلامیۂ دہلی صفحات ۳۵۷ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے)

مغربی تعلیم اور ادب کا ایک اثر ہندوستان کی زبانوں پر یہ بھی ہوا ہے کہ لوگ پرانی قسم کے قصے کہانیاں چھوڑ کر ناول اور چھوٹے چھوٹے فسانے لکھنے کی طرف متوجہ ہوگئے ہیں۔ نیرنگ بھی اسی قسم کے مختصر فسانوں کا مجموعہ ہے - یہ فسانے زیادہ تر معاشرتی اور اخلاقی ہیں - فسانوں کے خاص اشخاص زیادہ تر یورپ کے تعلیم یافتہ ہندوستانی اور خوش حال گھرانوں کے لوگ ہیں - ہماری معاشرت میں جدید تعلیم اور حالات سے جو انقلاب رونما ہے اس کی جھلک جگہہ جگہہ ان فسانوں میں نظر آتی ہے - لایق مصنفہ نے ان حالات کا بغور مشاہدہ کیا ہے اور انہیں صاف اور شستہ زبان میں سلیقے سے بیان کیا ہے خاص کر صنف نازک کے خیالات اور ان کی سیرت کے بیان کرنے میں قوت بیان اور قوت مشاہدہ کا ثبوت دیا ہے اور عجیب انداز سے ان کی فوقیت اور برتری ظاہر کی ہے۔ بعض فسانے بہت پر اثر اور دلگداز ہیں —

سب رس

(مصنفہ ملا وجہی مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب معتمد اعزازی انجمن ترقی اُردو، درمیانی تقطیع، صفحات علاوہ مقدمہ و فرہنگ (۳۰۰)، قیمت مجلد چارروپے سکۂ انگریزی غیرمجلد ۳ روپے ۸ آنےسکۂ انگریزی انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہے-)

ادبیات اُردو کا بہت بڑا ذخیرہ قدیم زبان میں ہے، اس کا بڑا حصہ ایسا ہے، جو بہت ہی قابل قدر ہے اور ہماری توجہ کا بطور خاص مستحق، لیکن چونکہ کمیاب ہے اور عام لوگوں کی دسترس سے باہر، اور ایسی قدیم زبان میں ہے کہ اس کا سمجھنا دشوار اس لئے اس کو روشناس کرانا آسانی سے ممکن نہیں- انجمن ترقی اُردو کے فاضل معتمد جناب عبدالحق صاحب مدظلہ کا بڑا احسان ہے کہ وہ ایسے ادب کی بقا کا سامان خاص انہماک اور شیفتگی سے کر رہے ہیں- چنانچہ حال ہی میں انہوں نے تین سو چھہ سال قبل کی نثر کی ایک کتاب سب رس مرتب کرکے شایع کی ہے اس سے قبل رسالہ اُردو میں ایک تفصیلی مضمون چھپا تھا —

اس کتاب کا مصنف گولکنڈہ کے قطب شاہی دربار کا مشہور شاعر وجہی ہے، اس میں تصوف و اخلاق کے اسرار و رموز کو ایک مجازی قصے کے پیرا‌ے میں بے نقاب کیا گیا ہے، یہ کتاب اپنی رویداد کی دلچسپی، مضمون کی اہمیت اور زبان و بیان کی سلاست و پختگی کے اعتبار سے قدیم نثر اُردو کا لاثانی نمونہ ہے، جو لوگ زبان کی تحقیق اور قدیم ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے —

کتاب کو پانچ مختلف نسخوں کی مدد سے بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے، قدیم کتاب کو پہلے تو صحیح پڑھنا ہی دشوار ہے اور پھر اس کے معانی و مطالب پر آگاہی پانا تو تقریباً محال، چنانچہ اس کا ثبوت ہمیں آے دن اُن نام نہاد ادیبوں اور انشا پردازوں کی کتابوں سے ملتا ہے جو قدیم ادب کی تاریخ سے متعلق چھپتی رہتی ہیں، اس کتاب کے دیکھنے سے واضح ہوگا کہ فاضل مرتب کو قدیم زبان پر خاص عبور اور تبحر ہے، انہوں

نے اس کو بڑی عمدگی سے حل کیا اور تحقیقی کام کرنے والوں اور عام ناظرین پر اس کے معانی و مطالب کے دروازے کھول دئیے —

کتاب کے شروع میں ایک طویل مقدمہ ہے جو بجائے خود ہمارے ادب کا عمدہ نمونہ ہے اس کے سوا اس میں مصنف کے نام اس کی دیگر تصانیف اور کتاب کے اصل و مآخذ پر بڑی تحقیقی بحث کی ہے' اور اس کے موضوع و مبحث اور زبان و بیان پر عالمانہ انداز میں تنقیدی روشنی ڈالی ہے' اس زمانے کی زبان کے چند ایسے قواعد تحقیق کر کے لکھ دیے ہیں جن کی کتاب کے سمجھنے میں خاص ضرورت ہے - اور محققین زبان و ادب کے لئے چند ایسی باتیں سجھائی ہیں جن سے زبان و ادب کی تحقیق وتنقید میں بڑی مدد مل سکتی ہے —

آخر میں مشکل و متروک الفاظ کی فرہنگ ہے جس کی مدد بغیر کتاب کے معانی و مطالب آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتے - یہ فرہنگ بھی بڑی تحقیق و تفتیش اور چھان بین کے بعد مرتب ہوئی ہے' اب نہ تو ان الفاظ کے بولنے اور سمجھنے والے ہیں اور نہ لغات میں وہ ملتے ہیں - قدیم ادبیات کے محقق کا امتحان اسی میں ہے' آج کل کثرت سے قدیم ادب کے متعلق کتابیں لکھی جا رہی ہیں لیکن ان کے لکھنے والے چند سطروں کو بھی صحیح طریقہ سے پڑھ اور سمجھ نہیں سکتے' فاضل مرتب کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے قدیم متروک اور مشکل الفاظ کے معنی اصل و مآخذ کی تحقیق کے ساتھ لکھ کر ہمارے لئے اس مشہور کتاب کا مطالعہ آسان کردیا اور ایسی فرہنگ لکھ دی ہے جس کی مدد سے دوسری قدیم کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے میں نہ صرف عام ناظرین بلکہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بھی بڑی سہولت ہوگئی —

اگر قدیم ادب کی کتابوں کو اس طرح حل نہ کیا جائے اور ان کی لفظیات کو اصل و مآخذ کی تحقیق کے ساتھ نہ لکھا جائے تو ہمارے لئے ان کے مضامین و مطالب کے دروازے بند ہیں اور اگر چند دنوں یہی حالت رہی تو ہم کو صدیوں کی دماغی جد و جہد اور کد و کاوش کے ثمرے سے محروم ہونا پڑے گا اور ہم اپنے اسلاف کی عزیز ارث کو کھو بیٹھیں گے —

مخدومی مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کا علمی تبحر ' جامعیت اور اسلوب تحریر سفارشی ہے کہ وہ زیادہ وسعت اور سرگرمی سے اس کام میں کارفرما ہوں لیکن ان کی گوناگوں مصروفیتوں اور ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے زیادہ اصرار اور تقاضے سے شرم آتی ہے '

کتاب اچھی چھپی ہے لیکن چونکہ زبان زیادہ قدیم ہے اور اس کی لفظیات اور قواعد بڑی حد تک غیر مانوس و متروک اس لئے کہیں کہیں طباعت وغیرہ کی چند غیر اہم غلطیاں رہ گئی ہیں ' ان کو بھی ایک مختصر غلط نامے کی شکل میں درج کر دیا گیا ہے —

(چ)

معاشیات

کسب معیشت

(مترجمہ شہدا محمد صاحب - صفحات ۱۱۴ - پتہ - پرانی حویلی - حیدر آباد دکن)

یہ جارج کیری اگلستن کی کتاب " How to make a living " کا ترجمہ ہے - اس کتاب میں روز مرہ کے اخراجات اور خانہ داری کی مالی دشواریوں کے متعلق مشورے ہیں اس میں کسب معیشت کے طریقوں ' پیشوں کا انتخاب اور اسی قسم کے دوسرے مسائل پر بحث کی گئی ہے - کفایت شعاری کی عادت یقیناً بہت مفید ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا واقعی اس کے لئے جس قدر ایثار اور ضبط نفس کی ضرورت ہے کیا اسے اور کسی مقصد کے

لئے اٹھار رکھنا بہتر ہوگا یا نہیں ؟ —

کلاہ دلکش است اما بہ درد سر نمی ارزد -

ترجمہ سلیس ہے - مسلمان نوجوانوں کو اس قسم کی کتابیں ضرور پڑھنی چاہئیں اس لئے کہ انھیں آئے دن ان دشواریوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے جس کی نسبت اس کتاب میں مفصل بحثیں کی گئی ہیں —

مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب

(مترجمہ قاضی محمد حسین صاحب - صفحات ۲۱۷ -
مطبوعہ برقی مشین پریس - مراد پور بانکی پور پٹنہ)

یہ کمارپا صاحب کی انگریزی تصنیف کا ترجمہ ہے - اس کتاب کا ہندی ' گجراتی اور تلنگی میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے - خوشی کی بات ہے کہ اردو میں بھی ہوگیا - اس کتاب میں ہندوستان کے افلاس کے اسباب سے بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ مالیات عامہ کو ملک کے مفاد کے لئے نہیں بلکہ کسی مخصوص گروہ کے لئے بے دردانہ طریقہ سے خرچ کرنے کی وجہ سے ہندوستان کی معاشی زندگی پر کس قدر برا اثر پڑا ہے - فصل اول میں ہندوستان کی انیسویں اور بیسویں صدی کی عام معاشی حالت ' اخراجات ملکی ' محاصل ملکی اور قرضجات حکومت کے متعلق نہایت مفید معلومات جمع کی گئی ہیں - فصل دوم میں کرانچی کانگریس کی منتخبہ کمیٹی متعلق قرضجات حکومت کی رپورٹ کا خلاصہ درج ہے - اس کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہند نے جو قرضے لئے ہیں ان میں بیشتر شاہی اغراض کے لئے ہیں نہ کہ ہندوستان کے مفاد کے لئے - مصنف نے یہ بات ثابت کی ہے کہ ان قرضوں کا بار صرف ہندوستان پر نہیں بلکہ اخلاقاً اور قانوناً برطانیہ پر بھی عاید ہوتا ہے - یہ کتاب ان غریب ہندوستانیوں کے نام معنون کی گئی ہے —

" جو دھوپ اور گرمیوں کی مصیبت اٹھاتے ہیں ' جن
کا اسراف یہ ہے کہ وہ دنیا کی مسرف ترین حکومت

کا بار اٹھائے ہوئے ہیں ' جن کی سخاوت یہ ہے کہ
وہ اپنی بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر حکومت کا مالیہ
ادا کرتے ہیں ' اور جو اپنے کندھوں پر برطانیہ کی
عظمت کا بوجھہ اٹھائے ہوئے ہیں "

ترجمہ سلیس اور عام فہم ہے -

پیام عمل

(مصنفہ محمد عزیز اسرائیلی صاحب' درمیانی تقطیع صفحات ۲۸۰ لکھائی چھپائی اوسط درجہ کی کاغذ اچھا قیمت دو روپے ملنے کا پتہ مختار پرنٹنگ ورکس نیا گاؤں لکھنؤ -

---

ہندوستانی مسلمانوں کی بہ حیثیت مجموعی جو زبوں اور! نا گفتہ بہ حالت ہے اس سے کون واقف نہیں ؟ ان کے اخلاقی' دماغی، مالی اور معاشرتی امراض کا کس کو علم نہیں ؟ ہر با خبر مسلمان اس کو سو نچتا اور سمجھتا ہے - دردمند دل رکھنے والے ان خرابیوں کے ازالہ کی کوششیں کرتے ہیں —

جناب محمد عزیز اسرائیلی صاحب نے اس کو محسوس کرکے یہ کتاب لکھی ہے اس کے پانچ باب ہیں پہلے میں ہندی مسلمانوں کے زوال وانحطاط کی تاریخ اور موجودہ ہندوستان کی سیاسیات میں ان کی حیثیت کا ذکر ہے - دوسرے باب میں مالی، اخلاقی اور ذہنی کمزوریوں کا ذکر ہے تیسرے میں معاشرتی خرابیوں کا چوتھے میں ان مذہبی عقاید کا تذکرہ ہے ' جن کی غلط تاویل و تعبیر سے جد و جہد، عملی سر گرمی اور جوش عمل پر اوس پڑگئی ہے اور ترقی کی راہیں مسدود ہوگئی ہیں - پانچواں باب مصنف کے نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے - کتاب کا اصلی مقصد اسی باب میں پیش ہوا ہے - باقی ابواب درحقیقت اس کی تمہید تھے - اس میں مصنف نے اپنے خیال کے مطابق ہندی مسلمانوں

کی قومیت کی تنظیم کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کیا ہے اور ان کی موجودہ خرابیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کی تدبیریں سجھائی ہیں —

مصنف نے کتاب کو نہایت عمدگی سے مرتب کیا ہے ان کی نظر سے کوئی چیز نہیں بچی اور ہندی مسلمانوں کے موجودہ حالات کو بالکل بے نقاب کردیا ہے اور ان ضروریات کو موثر طریقہ سے واضح کیا ہے جن کی بجاآوری کے بغیر ہندی مسلمانوں کی قوم کا پنپنا دشوار ہے - جو لائحہ عمل انہوں نے پیش کیا ہے - وہ کچھ نیا نہیں - برسوں سے مفکرین اور مصلحین اس کی اہمیت کو جتا رہے ہیں - اس میں بعض ایسے امور ہیں جن پر بحث مباحثہ اور غور و فکر کی ضرورت ہے - اور وہ خصوصاً جن کا تعلق مذہب سے سمجھا جاتا ہے یہ مشتبہ ہے کہ مصنف کا لائحہ عمل کس حد تک لائق تسلیم اور قابل عمل ہے - لیکن یہ کھلی حقیقت ہے کہ ایک ایسی تنظیم کی ضرورت ہے - جو مسلمانوں کی قومیت کی عمارت کو کھڑا کردے - اس کتاب کا مطالعہ ان لوگوں کو ضرور کرنا چاہئیے جو مسلمانوں کی سیاسی حیثیت اور اہمیت کو نافذ کرانا چاہتے ہیں اور ان کی فلاح و بہبود کے دل سے خواہاں ہیں —

(چ)

تاریخ و سیرت

تاریخ مولد النبی

مولفہ مولوی علی شبیر صاحب صدر منتظم ہائی کورٹ حیدرآباد دکن ' بڑی تقطیع ' صفحات ۵۴ ' مولف کے پتے سے مل سکتی ہے -

---

اس کتاب میں رسول اکرم کے مکان و زمان ولادت کے تاریخی حالات

و واقعات درج ہیں، مولف نے عربی، اردو انگریزی کی مختلف ۱۵ مستند کتابوں کی مدد سے اس کو مرتب کیا ہے، اس کے دوحصے ہیں، پہلے میں آں حضرت صلعم کی جاے ولادت کا صحیح یقین اور اس کے تاریخی حالات و واقعات ہیں - دوسرے میں ولادت کے وقت، روز، تاریخ اور سال پر بحث کی ہے اس سلسلہ میں یوم میلاد کے جشن منانے کا بھی تاریخی تذکرہ کیا ہے، ایک ضمیمہ بھی ہے جس میں جشن میلاد کی ان مختلف صورتوں کا ذکر ہے جو دوسرے اسلامی ممالک میں رہ چکی ہیں اور ہیں —

یہ رسالہ اس وقت لکھا گیا ہے جب کہ مولد النبی کا سفاکانہ انہدام وقوع میں آیا اور جس سے اکثر ہندی مسلمانوں کے دل ہل گئے - آنحضرت صلعم کی جاے ولادت اور زمان ولادت کے حالات اس قدر منضبط صورت میں دوسری جگہہ نہیں ملیں گے- مولف نے اس کو عمدگی سے مرتب کیا ہے اور صاف ستھری زبان میں لکھا ہے —

(چ)

خادمات خلق

مترجمہ سیدہ خاتون صاحبہ مرحومہ بنت خواجہ غلام الثقلین، چھوٹی تقطیع، صفحات ۱۲۱، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت دس آنے ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی -

---

اس میں یورپ اور امریکہ کی ان دس پاک سیرت خواتین کی سچی کہانیاں ہیں جنھوں نے دوسروں کی بے غرض خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور فلاح خلق کی خاطر حقیقی ایثار و محبت سے کام لیا اور اپنی بے لوث قربانیوں سے بڑے درخشاں کارنامے انجام دئے، ہمارے ملک کی خواتین کے لئے اس کا مطالعہ سبق آموز ثابت ہوگا —

سیدہ خاتون صاحبہ مرحومہ کا ترجمہ، ہندوستانی نسواں کی تعلیمی حالت کے مد نظر بہت کامیاب ہے اس میں زبان کی سلاست اور بیان کی پختگی کے آثار پاے جاتے ہیں، اگر اجل مہلت دیتی تو مرحومہ ہمارے ملک کی نامور انشا پرداز خواتین کی صف اول میں جگہہ پاتیں —

(چ)

خطبات گارساں دتاسی

چودھواں خطبہ

۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ م

(مترجمہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ، ڈی ۔ لٹ (پیرس) پروفیسر جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد دکن)

حضرات !

گزشتہ سال سرکاری رپورٹوں کی بنا پر میں نے آپ صاحبوں سے بیان کیا تھا کہ ہندوستانی زبان کو خوب فروغ ہو رہا ہے ۔ امسال پھر میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اس زبان کی روز افزوں ترقی کی رفتار بدستور جاری ہے ۔ اس ضمن میں ' سرچارلس ٹریولین ' خاص کر شکریہ کے مستحق ہیں جن کی ان تھک کوششوں کی بدولت ہندوستانی کو یہ مرتبہ نصیب ہوا ۔ موصوف کی دلی خواہش ہے کہ ہندوستانی زبان کی اصلاح کی جائے ۔ وہ چاہتے ہیں کہ عربی فارسی کے مغلق الفاظ کو جو مسلمان فاتحین کے اثر سے ہندوستانی میں داخل ہو گئے ہیں ، اس زبان سے خارج کر دیے جائیں ، اس لئے کہ ہندی کے ایسے الفاظ کثرت سے موجود ہیں جو بآسانی ان عربی فارسی لفظوں کی جگہ لے سکتے ہیں ۔ " سرچارلس ٹریولین " نے مجھے

لکھا ہے کہ ہندوستانی زبان میں آج کل یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ انگریزی کے الفاظ کو کثرت سے استعمال کیا جائے۔ اس رجحان سے ہندوستانیوں اور انگریزی قوم کے، موجودہ تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہماری افریقی مقبوضات میں وہاں کے باشندوں نے فرانسیسی زبان کے بہت سارے لفظوں کو اپنی زبان میں بلا تکلف استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ان لفظوں کا عربی میں ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اہل ہند نے اپنے ہاں انگریزی زبان کے بہت سے لفظ رائج کر لئے ہیں۔ بعض اوقات تو ان کی اپنی زبان میں لفظ موجود ہوتا ہے جب بھی وہ ہم معنی انگریزی لفظ کو ترجیح دیتے ہیں۔ انگریز لوگ وقت کی بہت قدر کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں مثل مشہور ہے کہ: "وقت دولت ہے"۔ اہل مشرق اس دولت کی زیادہ قدر نہیں کرتے۔ چنانچہ ہندوستان میں لفظ "ٹائم" کی اہمیت لفظ "سماں" یا لفظ "دور" سے مختلف سمجھی جاتی ہے۔ * اس طرح لفظ "کنبہ" یا "خاندان" کی جگہ عام طور پر لفظ "فیملی" استعمال ہوتا ہے۔ گویا کہ آخرالذکر لفظ گھربار کے مفہوم کو زیادہ واضح طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح مطبع کی جگہ "پریس" دھوم دھام کی جگہ "پریڈ" گنہگار کی جگہ "گلٹی" استعمال ہوتے ہیں — اور بہت سارے انگریزی الفاظ پیش کئے جا سکتے ہیں جنہیں اہل ہند خود اپنے لفظوں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور بہتر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مرزا پور کا اخبار "خیر خواہ ہند" اس قسم کی ہندوستانی میں ہوتا ہے جس میں انگریزی الفاظ کثرت سے کھپائے جاتے ہیں۔ مشنریوں کی

---

* ایک ہندوستانی خاتون اگر اپنے شوہر کو دفتر کے وقت کی یاد دلاتی کرانا چاہتی ہیں تو یوں کہتی ہیں "تمہارے آفس جانے کا ٹائم ہے" —

خلفاے اربعہ

مولفہ مولوی خواجہ عبدالحی فاروقی صاحب، چھوٹی تقطیع صفحات ۱۴۸، قیمت دس آنے ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ، دہلی



اس میں خلفاے راشدین کے حالات و واقعات زندگی کا ذکر مختصراً نہایت جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے، ضروری مواد کو عمدگی سے جمع اور مرتب کیا گیا ہے، اس کتاب کے ذریعے بہت ہی کم وقت میں رسول اکرم کے ہر چہار یاران باصفا کے پاکیزہ اور سبق آموز سوانح کا علم ہوسکتا ہے اور خلافت راشدہ کا واضح خاکہ پیش نظر ہوجاتا ہے —
(چ)

متفرق

اسمار الاسرار

(تصنیف حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز قدس سرہ بہ تصحیح و تحشیہ مولوی سید عطا حسین صاحب ایم - اے - صفحات ۳۵۲ قیمت درجۂ اول چار روپے، درجہ دوم تین روپے - اعظم اسٹیم پریس چار مینار - حیدر آباد دکن)

حضرت گیسو دراز بندہ نواز سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ اعظم میں سے

ہیں اور دکن میں صدہا سال سے اُن کے فیوض کا سلسلہ جاری ہے - سلسلۂ چشتیہ میں انہیں ایک خاص امتیاز یہ حاصل ہے کہ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف بھی ہیں - ان کی تصانیف کی تعداد ایک سو سے زیادہ بیان کی جاتی ہے اور ان سب میں اسمارالاسرار بہت بڑے پایہ کی کتاب ہے - چنانچہ بعض بزرگوں کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں فن تصوف و سلوک و معارف میں اس سے بہتر کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی —

جوحضرات اس فن سے شوق رکھتے ہیں انہیں مولوی سید عطا حسین صاحب کا شکر گذار ہونا چاہئے - مختلف قدیم قلمی نسخوں سے مقابلہ اور تصحیح کرنے کے بعد یہ نسخہ مرتب کیا ہے - قدیم قلمی کتابوں کے مقابلہ اور تصحیح میں جو دقتیں پیش آتی ہیں اس کا اندازہ کچھ وہی کرسکتے ہیں جنہیں اس قسم کے صبر آزما کام کرنے کا کبھی موقع ہوا ہے - مولوی سید عطا حسین صاحب سے بہتر کوئی اس کام کو نہیں کرسکتا تھا - لیکن کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ باوجود اس قدر محنت کے کتاب میں کثرت سے غلطیاں رہ گئیں اور غلط نامہ لگانے کی ضرورت پڑی - ہمارے مطابع کی حالت ایسی ہے کہ کسی کتاب کی صحت کی طرف سے اطمینان نہیں ہو سکتا اور ایسی حالت میں شکایت بے سود ہے —

خمخانۂ اُمید

(مصنفہ مولوی سید بشارت علی " بشارت " دہلوی
چھوٹی تقطیع، صفحات ۱۴۴ ، ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ جامعہ
ملیہ ، قرول باغ ، دہلی -

اس میں بیشتر مصنف کی ان نظموں کا مجموعہ ہے جو نعت و منقبت میں کہی گئی ہیں چند اور نظمیں بھی ہیں جن کے ذریعہ اسلامیوں کو ہمت

و استقلال عزم و جرأت اور ایثار و محبت کی ترغیب دینے کی کوشش کی گئی ہے - نظموں کی زبان صاف سلیس ہے اور سلسلۂ بیان بھی مربوط - مصنف نے اس کتاب کی آمدنی کا چوتھائی حصہ محمد علی میموریل فنڈ میں دینے کا وعدہ کیا ہے - کتاب کی قیمت درج نہیں —

(م)

نصاب تعلیم ابتدائی و دستورالعمل

جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی

یہ دو کتابیں جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی کی طرف سے شایع ہوئی ہیں - نصاب تعلیم (ابتدائی) میں ہر مضمون کا نصاب، اس کی تعلیم کا ڈھنگ اور مفصل ہدایات دی ہیں - یعنی ایک چھینک سے لے کر تالیف و دستکاری تک کی تمام کیفیت آگئی ہے - اس میں صرف لکھنے پڑھنے ہی کے قواعد نہیں بتائے گئے بلکہ صفائی کے آداب، بات چیت کے آداب، نشست و برداست کے قواعد، اخلاق حسنہ، عملی کام، تجسس و تلاش، تالیف و دستکاری سب کچھ آگیا ہے اور ہر چیز کے متعلق نہایت تفصیلی ہدایات بہت ہی صفائی کے ساتھ درج ہیں - یہ کتاب صرف مدرس اور طالب علم ہی کے کام کی نہیں بلکہ وہ ایسی خوبی کے ساتھ لکھی گئی ہے کہ ہر شخص جسے تعلیم سے کچھ بھی تعلق ہے اسے بڑے شوق سے پڑھے گا اور پڑھنے کے بعد خوش ہوگا اور اس قلیل اور فی‌الحال بے سرمایہ جماعت کی ہمت کی داد دے گا - کتاب سوا سو صفحے کی ہے —

دستورالعمل میں جامعہ کے ابتدائی اور انتظامی معلومات، جامعہ کے مقاصد اور خصوصیات، اس کی کارکن مجالس، عہدہ دار و اراکین و منتظمین،

قواعد و ضوابط متعلق تعلیم و تربیت، اعلیٰ تعلیم و یونیورسٹی کا نصاب اور قواعد امتحانات وغیرہ بہت تفصیل سے درج ہیں - یہ گویا جامعہ کا تفصیلی کیلنڈر ہے - یہ کتاب بھی بہت جامعیت سے لکھی گئی ہے —

جدید رسالے

گلچین

(اڈیٹر سید ابو محمد ثاقب - لاہور - سالانہ چندہ تین روپے)

یہ نیا ماہانہ لاہور سے ماہ اگست سے شایع ہونا شروع ہوا ہے - قابل اڈیٹر " مقصد " کے تحت میں تحریر فرماتے ہیں کہ اگرچہ پنجاب اور خصوصاً لاہور سے سیکڑوں رسالے شایع ہو رہے ہیں مگر " اس امر کا انتہائی افسوس ہے کہ ان رسائل میں ایک رسالہ بھی ایسا نہیں جو اپنی زبان کے صحیح ہونے کا دعویٰ کرسکے " .... " گلچین اس خاص کمی کو دور کرے گا " .... " گلچین کا سب سے اہم اور سب سے بڑا مقصد زبان کی صحیح خدمت اور ادب کی حقیقی اصلاح ہوگی"- یہ بہت نیک اور اعلیٰ مقصد ہے - پہلے نمبر میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس سے اس رسالے کو دوسروں پر کوئی خاص فوقیت اور فضیلت ہو - لیکن ہمیں توقع ہے کہ فاضل اڈیٹر اپنے مقصد کی تکمیل میں کوئی دقیقہ

اٹھا نہ رکھیں گے اور اپنے کلچیں کو اردو زبان کی خدمت کے لئے وقف کردیں گے —

مسلمہ

(اڈیٹر حمیرا - جالندھر شہر' سالانہ چندہ ایک روپیہ)

یہ ماہانہ رسالہ عورتوں کے لئے اسی سال جالندھر شہر سے جاری ہوا ہے - مسلمان لڑکیوں اور عورتوں کے ائے اس میں تاریخی' علمی اور مفید اور دلچسپ مضامین ہوتے ہیں - حجم ۳۲ صفحے ہے - سالانہ چندہ اس قدر کم' مقصد ایسا اچھا اور مضامین کار آمد' اس لئے امید ہے کہ پڑھی لکھی لڑکیاں اور بیبیاں اسے ضرور شوق سے مطالعہ کریں گی —

سنیاسی

(اڈیٹر حکیم عارف - گجرات پنجاب - سالانہ چندہ عام خریداروں سے دو روپے)

اگرچہ اس رسالہ کا اصل مقصد جڑی بوٹیوں کی تحقیق اور علاج معالجہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں تاریخ' شعر و شاعری' ظرافت' سیاسیات' اخلاق سب ہی کچھ آگیا ہے حکیم صاحب کا مسلک صلح کل ہے اور ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے بڑے حامی ہیں —

البصیرۃ

سید عالم عبداللہ مولوی کامل و منشی فاضل :- چن پٹن ضلع بنگلور - سالانہ چندہ ایک روپیہ

یہ رسالہ مہدوی جماعت کی تعلیم و افادہ کے لئے شائع ہو ہے - چن پٹن ضلع بنگلور میں اس قوم کی اچھی خاصی جماعت ہے - امید ہے کہ وہ لوگ اس کی امداد میں کوشش کریں گے - رسالے میں مذہبی مضامین

ہوتے ہیں کچھ تو عام اسلامی مسائل پر اور کچھ خاص مہدوی مذہب وغیرہ کے متعلق —

کابل

(کابل، افغانستان - انجمن ادبی، جادۂ ارگ -
سالانہ چندہ نیم پونڈ)

یہ ماہانہ کابل افغانستان سے شایع ہوتا ہے - انجمن ادبی (کابل) کا رسالہ ہے اور بڑے سلیقے اور اهتمام سے مرتب کیا جاتا ہے، مضامین ادب، فلسفہ، تاریخ پر ہوتے ہیں - رسالہ ٹائپ (نسخ) میں حسن و خوبی کے ساتھ چھپتا ہے اور عکسی تصاویر کا بھی اچھا انتظام کیا گیا ہے - خوشی کی بات ہے کہ سال نو کے رسالے میں ہندوستان کے دو زندہ نامور شاعروں یعنے اقبال و ٹیگور کا ذکر ہے - یہ دونوں مضمون انجمن کے فاضل مدیر شہزادہ احمد علی خان درانی کے لکھے ہوے ہیں —

انجمن ادبی علم و فن کی اشاعت میں قابل قدر کام کر رہی ہے - اسے قائم ہوے ابھی ایک سال ہوا ہے لیکن اس سال جو کام اس نے کیا ہے وہ بہت ہی امید افزا ہے - علاوہ مدارس کی بعض درسی کتابوں کے متعدد کتابیں انگریزی اور فرانسیسی سے ترجمہ ہوئی ہیں - یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اردو زبان کی بھی بعض کتابیں انجمن نے اپنی زبان میں ترجمہ کرائی ہیں - یہ مولانا شبلی مرحوم کی شعرالعجم، الفاروق، ٹیگور کی گیتان جلی (مترجمہ حضرت نیاز فتح پوری) ہیں - تاریخ افغانستان اور تاریخ ادبیات افغانستان کی بھی انجمن کی زیر نگرانی تالیف ہوئی ہیں - ہمیں امید ہے کہ یہ انجمن اپنے ملک میں صحیح علمی اور ادبی ذوق پیدا کرے گی اور اپنی زبان کے ذریعے سے علوم و فنون کی اشاعت میں وہی کام کرے گی جو جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد اس ملک میں کر رہی ہے —

اردو

سنہ ۱۹۳۲ ع

بارھویں جلد

فہرستِ مضامین

(الف) مقالے

(ب) نظمیں



سائنس

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو
زبان میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو ... بحثیں
ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً
فوقتاً ہونگے، ان کو کسی قدر تفصیل کے بیان کیا جائے - ان تمام مسائل
... الامکان صاف اور سلیس ... بیان کرنے کی کوشش کی جاتی
اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات ... روشنی
اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں —

سالانہ چندہ سات روپے سکۂ انگریزی (آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ)
نمونہ کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ انگریزی (یا دو روپے سکۂ
عثمانیہ) — طلباء کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق ...
... پل صاحب (یا ہیڈ ماسٹر صاحب) انہیں پانچ روپے چار آنے سکۂ
انگریزی (چھ روپے سکۂ عثمانیہ) سالانہ چندہ میں دیا جاتا ہے —

اُمید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی
سرپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد دکن

ctober 1934 No

The Urdu

arterly Journal

OF

. an -i-Taraqqi-e-Urdu

EDITED BY

HAQ, B. A. (ALIG.)

ORARY SECRETARY

qqi -e- Urdu, Aurangabad. (Deccan.)